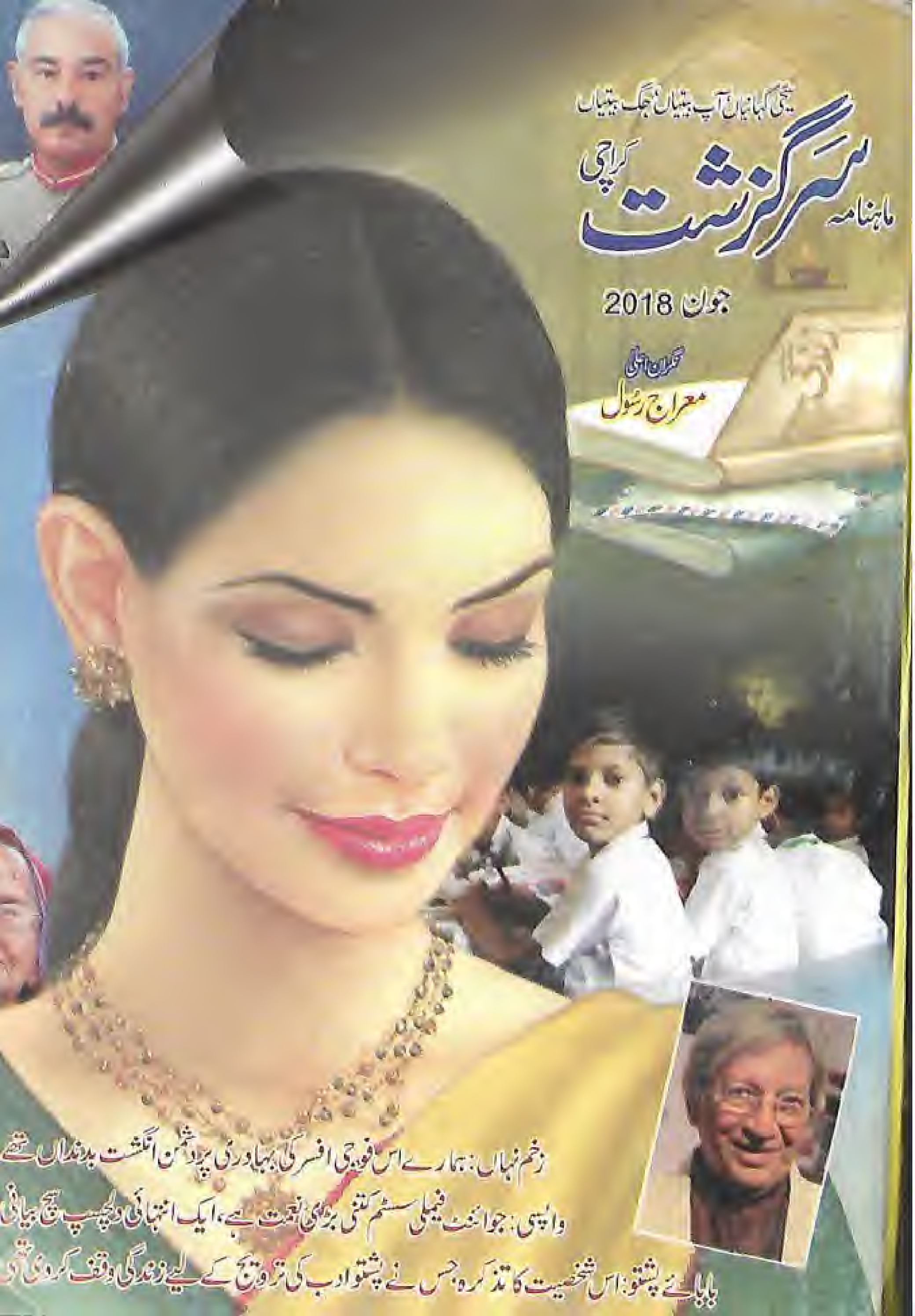


سچی کہانیاں آپ بیتیاں جگ بیتیاں
ماہنامہ سرگزشت کراچی
جون 2018
نگران اعلیٰ
معراج رسول
زخم نہاں: ہمارے اس فوجی افسر کی بہادری پر دشمن انگشت بدنداں تھے
واپسی: جوائنٹ فیملی سسٹم کتنی بڑی نعمت ہے، ایک انتہائی دلچسپ سچ بیانی
بابائے پشتو: اس شخصیت کا تذکرہ جس نے پشتو ادب کی ترویج کے لیے زندگی وقف کردی

مسحور کن کہانیاں و دلچسپ مستقل سلسلے لیے جون 2018 کا معطر شمارہ......

ماہنامہ

پاکیزہ

کراچی

شیریں حیدر اور **رفعت سراج** کے شاہکار ناول......

محبت لفظ ہے لیکن...... **حیا بخاری** کا دل گداز ناولٹ......

نگہت سیما نے ایمن مرتضیٰ کو دکھلائی ایک خوب صورت راہ

اپنے ناولٹ...... **کوئی شہر یار وفائوں کا ہیں**......

ڈاکٹر ذکیہ بلگرامی اور

اختر شجاعت کے بصیرت افروز مقالے......

ڈراما نگاری میں معتبر نام لیجنڈ **حسینہ معین** سے کرائی

ہما بیگ نے دلچسپ ملاقات

رمضان المبارک اور عید الفطر کی مناسبت سے **عقیلہ حق، شمع تفسیر،**

حنا بشریٰ ،مریم شیراز ،نزہت جبیں ضیا کی متاثر کن تحریریں

اس کے علاوہ

اس کے ساتھ، ساتھ ہماری دیگر محنتی رائٹرز کی حسین کہانیاں جن میں **طیبہ عنصر مغل ،**

خولہ عرفان، فہمی فردوس، تمثیلہ زاہد، شمسہ الطاف شامل ہیں

علاوہ ازیں شعر و شاعری، دلچسپ اور سبق آموز تراشے، خوش ذائقہ پکوان اور سب سے بڑھ کر

گوشۂ ظرافت کی صورت معیاری طنز و مزاح...... صرف آپ جیسے باذوق قارئین کے لیے......





07 سرگزشت
پیر صاحب
ادارہ
ایک صفحہ میں مکمل، مختصر مختصر ایک نادر روزگار کا تعارف

08 گفت و شنید
شہر خیال
مدیر اعلیٰ
آپ کی باتیں، آپ کے خیال، آپ کے مشورے اور آپ کے سوال

15 شخصیت
فلم کا قلم کار
تنویر ریاض
بالی ووڈ کے ایک نامور قلم کار کی داستان

35 مشعل راہ
بابائے پشتو
شوکت رحمن خٹک
پشتو ادب کے لیے اس نے زندگی وقف کردی تھی

41 وطن کے محافظ
زخم نہاں
زویا اعجاز
پاکستانی فوج میں ہی ایسے جری ملتے ہیں

55 فلم نگری
بے مثال
انور فرہاد
اداکاری میں اس کا کوئی ہمسر نہیں

71 جرم و سزا
نشان
سید احتشام
اس نے کس بے دردی سے قتل کیا تھا

77 کھیل کھلاڑی
فتح و شکست
اعتزاز سلیم وصلی
کرکٹ کے شائقین کے لیے تحفہ

85 معلومات
ناقابل یقین
کوثر اسلام
ایسے واقعات جن کی توجیح نہیں دی جا سکتی

89 سفر کہانی
شمشال سے ٹورنٹو
ندیم اقبال
جادو بیانی کا شہکار، ایک الگ انداز کا سفرنامہ

107 عزم و حوصلہ
ستاروں پہ کمند
منظر امام
پاکستان کے کم عمر نامور شخصیتیں

115 شکار کتھا
آدم خور
انجم فاروق ساحلی
بیک وقت دو شیروں سے مقابلہ تھا

127 مہم جوئی
پیدل مارچ
طارق عزیز خان
وہ سب پاپیادہ نئے جہاں کی تلاش میں نکلے تھے

132 شوبز
ماڈل گرل
اے آر بھٹی
اس نے ماڈل بننے کے لیے کیسی کیسی قربانیاں دیں

137 جہد مسلسل
حقیقی اداکار
عمر جٹ
انسان کو آگے بڑھنے کے لیے کیسے کیسے کام کرنا پڑتے ہیں

140 معاشرت
ناسور
ڈاکٹر عبدالرب بھٹی
ایک معصوم نوجوان کی خون رنگ لہو گرما دینے والی داستان

169 پہلی سچ بیانی
واپسی
سائرہ
جوائنٹ فیملی کتنی بڑی نعمت ہے

179 دوسری سچ بیانی
سزا
ماثرہ جنید
وہ ایک ایسی لڑکی تھی جسے سہیلیاں شکاری کہتی تھیں

187 تیسری سچ بیانی
جرم چھپتا نہیں
اسد عباس
انہوں نے کس انوکھے انداز سے جرم کیا تھا

196 چوتھی سچ بیانی
یادوں کا زہر
محسن کمال
یاد ماضی عذاب ہے، وہ بھی عذاب گزیدہ تھا

199 پانچویں سچ بیانی
خلش
محمد فاروق انجم
اس نے ایک لڑکی کی زندگی تباہ کردی تھی

217 چھٹی سچ بیانی
زہریلا مسیحا
محمد سلیم کرد
اونٹ پاگل ہو کر کتنا خطرناک ہو جاتا ہے

221 ساتویں سچ بیانی
تبدیلی
ناصر سلیم کرد
وہ بابا بننے کی ٹریننگ لینے گیا تھا

227 آٹھویں سچ بیانی
خواہشوں کا سراب
ثمینہ طاہر بٹ
وہ خواہشوں کی تکمیل کے لیے سراب میں پھنس گئی

247 نویں سچ بیانی
ہانٹیڈ
تنزیلہ احمد
آسیب نے اسے جکڑ رکھا تھا

***** سوغات
پارچے
قارئین / ادارہ
دنیا بھر سے مختلف موضوعات پر معلومات انکشافاتی پارچے

جلد 28 ❖ شمارہ 05 ❖ جون 2018ء

ماہنامہ سرگزشت کراچی

مدیرۂ اعلیٰ : عذرا رسول

مدیر : پرویز بلگرامی

نائب مدیرہ : نبیلہ اظہر

❖❖❖

منیجر اشتہارات

محمد شہزاد خان

0333-2256789

❖❖❖

سرکولیشن منیجر

سید منیر حسین

0333-3285269

❖❖❖

قیمت فی پرچہ 70 روپے ❖ زرِسالانہ 900 روپے

پبلشر و پروپرائٹر: عذرا رسول

مقامِ اشاعت: C-63 فیز II ایکس ٹینشن ڈیفنس کمرشل ایریا مین کورنگی روڈ کراچی 75500

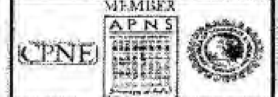
پرنٹر: جمیل حسن

مطبوعہ: ابنِ حسن پرنٹنگ پریس ہاکی اسٹیڈیم کراچی

خط و کتابت کا پتا ❖ پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200

Phone :35804200

E-mail: jdpgroup@hotmail.com



بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قارئین کرام!

السلام علیکم!

ہر اس معاشرے کو بہتر قرار دیا جاتا ہے جو علم و ادب میں دلچسپی رکھتا ہو اور علم کی ترویج کے لیے کاغذ ضروری شے ہے۔ بغیر کاغذ کے کتابیں و رسائل کا چھپنا ناممکن ہے۔ ڈالرز کی قیمت میں ہوشربا اضافے کے باعث کاغذ کی قیمتیں پہلے ہی آسمان کو چھو رہی تھیں، اس پر ستم کہ اب بازار ہی سے غائب ہے۔ اس بحران سے نمٹنے کی ہم پوری کوشش کر رہے ہیں۔ ہمیں پوری اُمید ہے کہ ہمارے قارئین ہم سے بھرپور تعاون کریں گے۔ ہم نے پوری کوشش کی ہے کہ صفحات کی کمی پر بھی اتنا ہی مواد فراہم کریں جتنا دیتے آئے ہیں۔ اس کے لیے ہم نے پرچے کے لے آؤٹ میں کچھ تبدیلیاں بھی کی ہیں۔ انشاء اللہ بحران ختم ہوتے ہی ہم اپنی روایت پر لوٹ آئیں گے۔

معراج رسول

پیر صاحب

1857ء کے گیارہ محرم کی رات میں انہوں نے پٹنہ بہار کے نزدیک قصبہ پھلواری شریف میں آنکھیں کھولیں۔ پھلواری شریف کوئی آج کا قصبہ تو ہے نہیں۔ ابوالفضل نے ''آئینِ اکبری'' میں بھی اس پرگنہ کا ذکر کیا ہے۔ لکھا ہے کہ اس پرگنہ میں شیخ، مغل اور راجپوت آباد ہیں۔ شیوخ کے گھرانے میں بزرگانِ دین کی تعداد زیادہ ہے۔'' اسی گھرانے میں حکیم شاہ محمد داؤد کے گھر ان کی ولادت ہوئی جب وہ پیدا ہوئے تو حضرت شاہ علی حبیب نصر قدس سرہ نے اپنے بزرگوں کا تاج ان کے سر پر رکھ دیا۔ نانی بی بی بتول نے اسی رات خواب دیکھا کہ بڑے حضرت یعنی مجیب اللہ قدس سرہ نے اس بچے کو اٹھا کر حضور شاہ علی حبیبؒ کی گود میں دے دیا ہے۔ وقت گزرتا رہا، ابتدائی تعلیم گھر پر ہی حاصل کی پھر اعلیٰ تعلیم کے لیے فرنگی محل بھیج دیے گئے۔ وہاں تاج الہند مولانا شیخ عبدالحئی قدس سرہ سے درس لیا۔ تعلیم مکمل ہوئی تو ہل من مزید کے لیے شیوخ سے رجوع کیا۔ 1302 ہجری تا 1304 ہجری میں شیخ الدلائل فی الحرم النبویؐ حضرت شیخنا سید محمد رضوان، سید محمد امین رضوان اور دیگر محدثین حرمین سے واصل ہوئے۔ علم کی پیاس کبھی کم ہوئی ہے؟ وہ بھی العطش العطش کرتے ہوئے ایک کے بعد ایک محدثین سے فیض اٹھاتے رہے۔ سہارنپور کے مولانا احمد علی محدث کو حدیث سنانے ان کے حضور پہنچے تو وہاں حضرت شاہ سلیمان تونسوی کے مرید و خلیفہ مولانا شاہ قدرت اللہ سے ملاقات ہوئی جو ڈیرا اسماعیل خان کے لیے اور اسی غرض سے مولانا احمد علی محدث کے پاس آئے ہوئے تھے، مولانا شاہ قدرت اللہ سے جو عمر میں ان سے کافی بڑے تھے مگر ہم درس ہونے کی وجہ سے دوستی ہوگئی۔ عشاء اور تہجد کے درمیان دونوں میں خوب باتیں ہوتیں، کافی بے تکلفی ہوگئی تھی۔ مولانا کا تعلق مسلک چشت سے تھا اس کا اثر ان پر بھی پڑنے لگا۔ یوں تو وہ اپنی خالہ اور امی سے بزرگانِ چشت کے واقعات بچپن سے سنتے آئے تھے کیونکہ وہ دونوں شیخ الاسلام فرید گنج شکر کی اولاد سے تھیں۔ مولانا کی صحبت نے انہیں سلسلہ چشتیہ سے مزید قریب کر دیا۔ ''عاشقانِ خواجگان چشت را۔ از قدم تا سر نشانے دیگر اوست'' وقت گزرتا رہا کہ 1920ء میں زیارات کا قصد کیا اور عراق کی جانب چل پڑے۔ وہاں نقیب الاشراف سید عبدالرحمٰن سجادہ نشین آستانہ غوث پیرانِ پیر کے مہمان ٹھہرے اور سلسلہ قادریہ کی اجازت حاصل کی پھر ولی کلِ ولی شیر خدا علی ابن ابی طالب پر حاضری دی۔ مہمان ٹھہرے، علم حاصل کیا اور آگے بڑھ گئے۔ وہاں سے کربلا مقدس پہنچے۔ سلام گزار ٹھہرے۔ مہمان رہے اور واپس ہند آ گئے۔ کچھ دن گھر میں ٹھہرے اور پھر سفرِ اجمیر پر روانہ ہوگئے۔ اسی ڈبے میں کلکتہ کے کچھ روسا بھی ہم سفر تھے۔ اٹاوہ اسٹیشن پر ٹرین بدلنے کے لیے سب اترے پھر دوسری ٹرین میں سوار ہوئے۔ اس افراتفری میں ایک صاحب کا بکس پلیٹ فارم پر چھوٹ گیا۔ اس بکس میں نقدی وغیرہ تھی وہ روہانسے ہو رہے تھے کہ انہوں نے سمجھایا کہ آپ خواجہ صاحب کے مہمان بن کر جا رہے ہیں۔ انہی پر چھوڑ دیں، وہ صاحب خاموش ہوگئے۔ جب وہ سب اجمیر پہنچے تو وہاں تار برقی منتظر تھا۔ کسی صاحب نے ٹیلی گرام کر کے بتایا کہ آپ کا بکس پلیٹ فارم پر چھوٹ گیا تھا جسے لے کر میں فلاں تاریخ کو اجمیر پہنچ رہا ہوں۔ اب تو ان صاحب کی حالت دیدنی تھی۔ وہ علم کی تلاش میں شہر شہر گھومتے رہے پھر واپس گھر آ کر ایسے بیٹھے کہ خانقاہ سے اٹھے تو قبر میں ہی آرام کیا۔ یہ روداد ہے خانقاہ پھلواری شریف کے شاہ سلمان پھلواروی کی جن کے مریدوں کی کثیر تعداد ہندوپاک، برما و بنگلہ دیش میں پھیلی ہے۔

☆☆☆



شہرِخیال

مدیراعلیٰ



☆ رانا محمد شاہد بورے والا کا تبصرہ۔ ''مئی کا سرگزشت اس دفعہ کچھ لیٹ ملا۔ سرورق دلکش تھا۔ اداریے میں معراج رسول صاحب نے پھر ایک نئی کہانی کے ذریعے یہ بتانے کی کوشش کی ہے کہ انسان آہستہ آہستہ خود کو ان تمام خوبیوں سے محروم کرتا جارہا ہے جو کہ انسان اور انسانیت کی بقا کے لیے ضروری ہیں۔ بلکہ اب تو تہذیب وتمدن جیسی خوبیاں بھی مغرب کی اندھی تقلید میں ہم کھوتے جارہے ہیں۔ کیا ''می ٹو'' ہماری تہذیب کا حصہ ہے؟ شہرت اور دولت کے لیے اپنے ہی کردار کو بازار میں لے آنا اور میڈیا میں ہونے والی گفتگو سے خیال کرنا کہ بدنام اگر ہوں گے تو کیا نام نہ ہوگا۔ مغرب کی اندھی تقلید میں اندھا ہونا اور کسے کہتے ہیں؟ پھر کیسے ممکن ہے کہ ایک چیز مغرب میں پاپولر ہورہی ہو اور ہم اسے اندھا دھند نہ اپنائیں۔ ویلنٹائن ڈے اور اب می ٹو جیسی تحریکوں نے ہمارے معاشرے کو سدھارنے کی بجائے مزید ذلتوں میں دھکیل دیا ہے۔ مغرب سے درآمد شدہ الفاظ ہوں یا ادھار کے مانگے ایسے سلوگن، گویا معاشرہ اخلاقی طور پر زوال پذیر ہے۔ کسی نے اس حوالے سے بہت خوب لکھا کہ می ٹو کا ہیش ٹیگ لگا کر اپنی گزری کہانیاں بیان کرنا چوراہے میں گندے کپڑے دھونے کے سوا کچھ نہیں۔ اس دفعہ منشی محمد عزیز مے کرسیٔ صدارت پر تھے۔ ان کا تبصرہ طویل ہونے کے ساتھ ساتھ معلوماتی بھی تھا۔ خصوصاً ''شہرِخیال'' کی تاریخ انہوں نے خوب بیان کی۔ یک لفظی داستان کے حوالے سے ان کی تجویز اچھی لگی۔ حکیم الامت علامہ اقبال کے حالاتِ زندگی کو ایک صفحے میں آپ نے خوب سمویا۔ یہی اس صفحے کی خوبی ہے۔ آصف علی لہڑی مستقل طور پر سرگزشت کے لیے لکھیں، کوشش کریں کہ اردو کے الفاظ کو اولیت دیں۔ سدرہ بانو تا گوری کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ ویسے جب تک آپ کو یہ شمارہ ملے گا۔ رمضان کا پہلا ہفتہ چل رہا ہوگا تو ہماری طرف سے بھی سبھی پڑھنے والوں کو رمضان کی مبارک باد اور دعا گو ہوں کہ اللہ تعالیٰ ہم سب کو اس مہینے کی برکات سے فائدہ اٹھانے کی ہمت وتوفیق دے، (آمین)۔ اعجاز حسین سہتار کا تبصرہ بھی اچھا لگا۔ خصوصاً محی الدین نواب کے حوالے سے ان کے خیالات دل کے قریب لگے۔ محی الدین نواب سچ مچ کہانیوں کے نواب تھے۔ انہوں نے 500 سے زائد ناول ، طویل ومختصر کہانیاں لکھیں۔ محی الدین نواب کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر بے شمار خوش نصیب گھر بیٹھے رائٹر بن گئے۔ انہوں نے اپنے ایک انٹرویو میں کہا تھا کہ جب وہ کوئی کہانی ، ناول یا افسانوی داستان لکھنے بیٹھتے ہیں تو وہ اس کے تمام پہلوؤں پر گہری نظر رکھتے ہیں۔ عوام کے دلوں تک پہنچنے کے لیے ضروری ہے کہ ان کے دل کی بات کی جائے۔ اپنی ماں کی طرح خوب صورت نظمیں لکھ کر لکھنے کا آغاز کرنے والے پابلونرودا کی زندگی کی کہانی ڈاکٹر ساجد امجد کے دلچسپ اندازِ بیاں کے ساتھ اچھی لگی۔ محنت، کوشش اور جدوجہد آخر کار انسان کو منزل عطا کردیتے ہیں۔ وسیم بن اشرف ایک ولی کامل کی زندگی کے حالات بتارہے تھے۔ کفر کے اندھیرے کو ایمان کی روشنی عطا کرنے والے اللہ کے ان ولیوں کی زندگیاں سب انسانوں کے لیے سرچشمہ ہدایت ہیں۔ سب سے مشکل کام اپنے نفس سے جنگ کرنا ہے اور یہ کام اللہ کے ان ولیوں سے بہتر کون کرسکتا ہے۔ زویا اعجاز نے سپاہی مقبول حسین کی عظیم قربانی کو بڑے اچھے انداز میں لکھا اور یہ حقیقت ہے کہ سپاہی مقبول حسین جیسے لوگوں کی قربانیوں کا ثمر ہی ہے کہ یہ ملک آج بھی قائم ودائم ہے۔ کرب واذیت کی ایسی داستان مقبول حسین نے صرف اور صرف وطن کی محبت وچاہت میں لکھی۔ انور فرہاد ماضی کی معروف اداکارہ نشو کی زندگی کے مختلف گوشوں سے پردہ اٹھا رہے تھے۔ یہ نئی خبر تھی کہ ان کی تین شادیاں ہیں۔ ہم تو ان کی ایک شادی اور ایک بیٹی صاحبہ ہی سمجھتے رہے۔ ماضی کی ہی معروف اداکاراؤں شبنم اور بابرا شریف پر بھی تفصیلی تحریر دیں۔ سلمیٰ اعوان نے

ایک منفرد قلم کار کی زندگی پر منفرد تحریر لکھی۔ ندیم اقبال کا سفرنامہ بھی دلچسپ انداز میں آگے بڑھ رہا ہے۔''

☆ اویس شیخ کا نامہ ٹوبہ ٹیک سنگھ سے۔ ''اس بار اداریہ میں آپ نے جن برائیوں کا ذکر کیا وہ معاشرے میں ''ناسور'' بن چکی ہیں۔ اس کی سب بڑی وجہ ہمارا خدا سے اعتماد اور قرآن سے ناطہ ٹوٹ چکا ہے۔ بے حسی اور بے حیائی کا دور دورہ ہے۔ یہ وہ سماجی برائیاں ہیں جنہیں ختم کرکے یہ ہمیں قرآن وسنت سے رہنمائی لینی ہوگی کہ ہم سے کہاں بھول ہوئی؟ حکیم الامت میں مسلم امہ کے عظیم شاعر کا تذکرہ منفرد انداز میں کیا گیا۔ مجھے ان کے کلام میں شکوہ جواب شکوہ نظمیں بہت پسند ہیں۔ ''سفیرِامن'' پڑھی۔ آخری صفحہ نے تو چونکا دیا، ملک کے سپہ سالار کو ان کی گولیوں سے بھون دیا گیا؟ بڑے اچنبھے کی بات تھی ''خورشید روحانیت'' سچ بیانیوں کے بعد سب سے پہلے پڑھی۔ بہت ایمان افروز تحریر تھی۔ ولی کی ولایت اور کرامات سے کسی طرح بھی انکار نہیں کیا جاسکتا۔ وسیم بن اشرف نے خوب لکھا۔ ''بے تیغ سپاہی'' پر لکھنے کے لیے میرے پاس الفاظ نہیں ہیں تاہم یہ ضرور کہنا چاہتا ہوں مقبول حسین ہوں، کیپٹن اسفند یار بخاری، میجر اسحاق شہید ہوں یا میجر بلال شہید ان کی داستانیں آبِ زر سے لکھے جانے کے قابل ہیں۔ یہ ملک آج انہی شہداء کی وجہ سے قائم ودائم ہے۔ مجھے سب سے زیادہ رشک جس پاکستانی شہید فوجی پر آتا ہے وہ راشد منہاس ہیں۔ انہوں نے کس جذبے کے ساتھ جہاز کا رخ زمین کی طرف موڑا ہوگا؟ بہرحال کمال کردیا زویا اعجاز صاحبہ نے (قارئین کی دلچسپی کو مدنظر رکھ کر اس طرح کی کہانیاں ہم برابر پیش کرتے رہیں گے تاکہ وہ لوگ جو ایئر کنڈیشنڈ کمرے میں بیٹھے ہیں انہیں پتا لگے کہ محافظینِ وطن کس طرح اپنی قربانی دے کر عوام کے لیے امن قائم رکھتے ہیں) ''شاعرِ زندگی'' ڈاکٹر ژواگو کی حالاتِ زندگی بہت رومانٹک بھی رہی اور تھوڑی سی تلخ بھی۔ ''ناسور'' کی پہلی چھ اقساط پڑھیں پھر چھوڑ دیں۔ پسند نہیں آئی۔ سچ بیانیوں کا ذکر کروں تو ''زبان کا زہر'' خاص تاثر نہ چھوڑ سکی۔ روایتی سی کہانی تھی۔ ''مداوا'' میں ایک بات تو طے تھی کہ ہم حقیقت اور سچائی سے ہرگز ہرگز نہیں بھاگ سکتے چاہے اس کے لیے کتنی بھی راہ فرار اختیار کرلیں۔ ''باغی'' پڑھ کر اندازہ ہوا دنیا میں ابھی ایسے والدین موجود ہیں جو اپنی اولاد کی زندگیوں میں عذاب برپا کرنے میں کوئی کسر نہیں چھوڑتے۔''

☆ آفتاب احمد نصیر اشرفی نے کورنگی کراچی سے لکھا ہے۔ ''ملکی حالات کی وجہ سے طبیعت میں عجیب سی بے زاری اور بے چینی پیدا ہوگئی ہے۔ چھ ماہ میں شہرِخیال کے لیے صرف دوسرا خط اس بات کو ظاہر کرتا ہے کہ ذرائع ابلاغ سے ہم نے وقتی دوری اختیار کررکھی ہے اور اس کی وجہ یہ ہے کہ قوم کو اپنے ووٹ کے نہ تو تقدس کا خیال ہے اور نہ اس کی اہمیت کا۔ مداریوں کے شعبدوں پر تالیاں بجانے کا عمل سیاسی شعبدہ بازوں پر بھی جاری ہے۔ ڈھول کی تھاپ پر بے زبان گھوڑوں کی طرح ناچنے کا عمل قوم سیاسی جھگڑوں کی صورت میں دے رہی ہے جو ثابت کررہا ہے کہ عقل وشعور کا استعمال اب کے انتخابات میں بھی نہیں ہوگا کیونکہ عقل و شعور کا استعمال انسان کرتے ہیں لیکن بقول آپ کے کہ ہم میں انسانوں والی صفات ناپید ہوکر رہ گئی ہیں اپنے ذاتی مفاد ہم کو جڑ بنا کر اکائی سے بہت دور لے جارہے ہیں اور اکائی کے بغیر بحیثیت قوم ہماری کوئی شناخت ہے اور نہ حیثیت۔ حب الوطنی اور غداری میں تمیز تاریخ کیا کرتی ہے، چند مخصوص سوچیں اور نظریات نہیں۔ ڈاکٹر صاحب ایک مرتبہ پھر شکریہ۔ وسیم بن اشرف آپ کا بھی خورشید روحانیت کے لیے شکریہ۔ دل کی آنکھوں کے ساتھ چومنے کے لائق اس تحریر کو جتنا بھی سراہا جائے کم ہے لیکن چند تاریخی حقائق توجہ کے طالب ہیں جیسا کہ صفحہ نمبر 52 پر حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ کا ذکر حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت کے مشہور خلیفہ کے طور پر درج ہے، جب کہ حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ جو کہ ریاست سمنانی کے بادشاہ تھے نے حکمِ خداوندی پر لبیک کہتے ہوئے اپنی بادشاہت چھوڑ کر فقیری اختیار کی اور مرشد کامل کی تلاش میں سفر بنگال اختیار کیا تو راستے میں ملتان کے قریب ان کی ملاقات حضرت مخدوم جہانیاں جہاں گشت سے ہوئی جن کی صحبت بابرکت سے انہیں بہت فیض حاصل ہوا۔ تاریخ میں اس ملاقات کا تذکرہ بدرجہ اتم موجود ہے۔ حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ بنگال میں ایک بزرگ علاؤ الحق والدین گنج بناتؒ کے دستِ حق پر بیعت ہوئے اور تاریخ میں اشرف الاولیاء کہلائے اور غالباً بنگال کے انہی بزرگ کامل کا تذکرہ صفحہ نمبر 52 پر موجود ہے کہ ان کی نمازِ جنازہ مخدوم جہانیان جہاں گشتؒ نے پڑھائی تھی۔ حضرت مخدومؒ نے سلسلہ چشتیہ میں حضرت نصیر الدین چراغ دہلویؒ سے خرقہ خلافت پایا تھا اور اس کے علاوہ عرب وعجم کے اکابرین مشائخ سے بھی آپ نے استفادہ کیا تھا۔ اشرف الاولیاء حضرت سید اشرف جہانگیر سمنانیؒ سلسلہ اشرفیہ کے بانی ہیں اور ہمارے نام کے ساتھ جو اشرفی ہے وہ اسی سلسلے کے ساتھ وابستہ ہونے کا شرف ہے۔ زویا اعجاز ''بے تیغ سپاہی'' کے ساتھ بہت اچھی لگیں۔ قوم کے سپوت مقبول حسین کو شاندار خراج تحسین تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ انجم فاروق ساحلی کی ریچھ شائع ہوگئی۔ اب توقع ہے کہ کچھ نیا اور منفرد بھی لکھیں گے۔ برِاعظموں کا ٹکراؤ اور راس امید حیران کن معلومات پر مبنی تھیں۔ ندیم اقبال کی جادو بیانی عروج پر ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' دستاویز بنتی جارہی ہے۔ ''ناسور'' حسبِ دستور رہی ہے۔ ''شہرِخیال'' میں منشی محمد عزیز مے چھائے ہوئے ہیں۔ سرگزشت کی تاریخ کھنگال رہے ہیں۔ مبارک باد کے مستحق ہیں۔ ایک چھوٹی سی جسارت ہماری طرف سے وہ یہ کہ 1996ء کا سالانہ تجزیہ مختصراً ہی صحیح مزنی احمد نے تحریر

کیا تھا جو دوسرے نمبر پر شائع ہوا تھا اور مزید یہ کہ ہمارا پہلا تبصرہ جولائی 1995ء میں شائع ہوا تھا۔“

☆ **منشی محمد عزیز میئے لندن سے۔** ”محکمہ ڈاک کی مہربانی سے مئی کا شمارہ ایک دن تاخیر سے 24 اپریل کو ملا اور مصروفیت کی وجہ سے زیادہ پڑھ بھی نہیں سکا ہوں۔ تاہم اپنے دوستوں کی تحریریں پڑھنا نہیں بھولے۔ ماشاءاللہ تازہ ترین شمارے کا سرورق پچھلے سے بڑھ کر ہوتا ہے اور کمال ہوتا ہے۔ اداریہ میں اس بار انکل ایک انسان کی کہانی بیان کرتے نظر آئے۔ انسان! جسے اللہ تعالیٰ نے اشرف المخلوقات بنا کر بھیجا تھا اور وہی انسان اس حد تک پستی میں گر چکا ہے کہ درندوں کو بھی مات دیتا ہے۔ یک صفحی داستان شاعرِ مشرق علامہ اقبال کو خراجِ عقیدت پیش کرنے کی بھرپور کوشش ہے۔ شہرِ خیال کی صورت مجھ عاجز کے نام تھی۔ آپ کی محبتوں کا مقروض ہوں۔ بہت شکریہ۔ سرگزشت کی ابتدائی معلومات کے تحت یہ بتادوں کہ ستمبر 2008ء سے پہلے خیال کا رقبہ چھ صفحات ہوتا تھا۔ ستمبر سے مدیرِ اعلیٰ نے کمال محبت کا مظاہرہ کرتے ہوئے اس کے صفحات میں اضافہ کرتے ہوئے شہرِ خیال کے لیے آٹھ صفحات مختص کردیے۔ جنوری 2006ء سے اداریہ کا آغاز ہوا اور اسی ماہ سے شہرِ خیال کی ابتداء میں گزشتہ ماہ کے سرورق کی تصویر لگانے کا آغاز بھی ہوا تھا۔ علمی آزمائش کا آغاز اگست 2005ء سے ہوا تھا اور کسی بھی خاص نمبر میں علمی آزمائش اور بیت بازی نہیں لگائی جاتی۔ پنڈی بھٹیاں کے خالد حسین چیمہ مرحوم سرگزشت کے تبصرہ نگاروں میں سے تھے۔ ان کا پہلا خط اپریل 1995ء کے شہرِ خیال میں لگا تھا اور 25 اگست 2007ء کو ان کی وفات تک ان کے کل اڑسٹھ خطوط شہرِ خیال کی زینت بنے تھے۔ کراچی کے سعید احمد چاند کا نام بھی سرگزشت کے باقاعدہ تبصرہ نگاروں میں ہوتا تھا۔ ان کا پہلا خط جون 2006ء کے سرگزشت میں شائع ہوا اور ان کی وفات یکم جولائی 2016ء تک ان کے باسٹھ خطوط شہرِ خیال کی زینت بنے تھے۔ ثمینہ شاہد مرحومہ بہترین تبصرہ نگار تھیں۔ ان کی وفات 17 جولائی 2002ء تک کل سولہ خطوط شہرِ خیال میں شائع ہوئے تھے۔ گزشتہ ماہ شائع ہونے والی گزشتہ رپورٹ میں تھوڑی سی ترمیم کہ 2015ء کی سالانہ رپورٹ وحید ریاست بھٹی کے علاوہ ناصر حسین رند صاحب نے بھی مرتب کی تھی جو کہ شہرِ خیال کی ابتداء میں شائع ہوئی تھی۔“

☆ **قیصر خان، کچی کلاں بھکر سے لکھتے ہیں۔** ”یک صفحی میں عظیم شاعر اور مصنف کے بارے میں جاننے کو ملا، صدارت ہمارے پیارے دوست نزاہت افشاں کو ملی، بہت بہت مبارک۔ شہرِ خیال سے غیر حاضر دوستوں میں محمد عامر ساحل، عمران جونانی، معظم علی، عمران خان بھکر، سید انور عباس شاہ بھکر، فقیر غلام حسین ضیا، بھکر، رضا احمد اعوان ڈاکٹر روبینہ نفیس انصاری، ڈاکٹر قرۃ العین اور جن کے نام لکھ نہیں پایا سب اپنی اطلاع کریں۔ ڈاکٹر ساجد امجد صاحب ایک شاہکار مضمون لے کر حاضر تھے۔ بہت پیارا مضمون تھا۔ میڈم زویا اعجاز نے تو جنوبی پنجاب کے ادیبوں کا حق ادا کردیا۔ اتنے بڑے شاعر کے بارے میں بہت دردناک لکھا۔ یوسف رضا گیلانی خود مصنف تھے اور چیک دو لاکھ کا دیا جو چھ ماہ کیش نہ ہوا اور پھر اسکول والوں نے رشوت دے کر کیش کروایا۔ شاکر صاحب کی شکایات حل کرے جب کہ ہمارے سابقہ پی ایم شوکت عزیز نے آسٹریلیا کرکٹ ٹیم کو 50 لاکھ دیئے تھے بس ایسے ہی خوامخواہ۔ ”ادراک“ ہندو کا قبولِ اسلام کرنا ایک بہت بڑی فتح ہے کہ اسلام ایک بے مثال مذہب ہے اور جو عقل سمجھ رکھتے ہیں وہ سمجھ جاتے ہیں۔ اللہ تعالیٰ نے بہت کرم کیا کملا داس سے کملا ثریا بننے میں۔ ”ٹمک لاہوری“ اتنے بڑے ادیب اور شاعر کو ہم نے پہلی بار پڑھا وہ واقعی بے مثال انسان تھے۔ ندیم اقبال انکل کا سفرنامہ، ڈاکٹر عبدالرب بھٹی صاحب کی کہانی ”ناسور“ انور فرہاد کا ”فلم نگری“ سے انمول موتی چن لانا قابلِ تعریف ہے۔ سچ بیانیوں میں ”اناس کے پھول“ بہت عمدہ تھی فریبی واقعی جرم کراتی ہے لیکن بروقت فیصلہ اور توبہ انسان کو اللہ تعالیٰ سے ملا دیتی ہے۔“

☆ **پروفیسر کیو اے قاسمی کا تبصرہ نور پور تھل سے۔** ”سسپنس کا پچھلے اٹھائیس سال سے خاموش قاری ہوں۔ اسی طرح ماہنامہ جاسوسی اور سرگزشت بھی گاہے بگاہے مطالعہ کرلیتا ہوں۔ ماہ اپریل کے سرگزشت میں اپنے ایک دیرینہ دوست اور مستقل تبصرہ نگار حاجی اعجاز حسین سٹھار کی زبانی معلوم ہوا کہ سرائیکی شاعر شاکر شجاع آبادی کی کہانی (آپ بیتی) چھپی ہے تو بے اختیار انہیں کہنے پر مجبور ہو گیا کہ مہربانی فرما کر ماہ اپریل کا شمارہ ہمیں دے دیں تاکہ اپنے من پسند شاعر کے حالات کے بارے میں کچھ آگاہی ہوسکے۔ کچھ عرصہ پہلے پروین شاکر کے بارے میں بھی آپ کے شمارے میں پڑھنے کا اتفاق ہوا تھا اور یہ ایک حسین اتفاق ہی سمجھیں کہ میرے دونوں پسندیدہ شاعر کے نام کے ساتھ شاکر آتا ہے۔ میرا مطلب ہے (پروین شاکر اور شاکر شجاع آبادی) شاکر شجاع آبادی کے بارے میں پڑھا دل بہت افسردہ ہوا کہ ہمارے ملک کا ایک نامور شاعر حالات سے نبرد آزما ہے لیکن حالات جیسے بھی رہے اس مردِ خوددار نے غیرت کا دامن ہاتھ سے نہیں چھوڑا اور یہ باعزت خوددار اور باہمت شخص اپنے ذمے کا کام مستقل لگن اور جانفشانی سے کرتا رہا۔ اگر ہم بنظرِ غائر دیکھیں تو بہترین ادب کی تخلیق ہمیشہ گھٹن، کٹھن اور حبس زدہ حالات میں ہی ہوئی ہے۔ چاہے ساغر صدیقی ہوں، مجید امجد ہوں یا مرزا غالب کے تلخ حالات ہوں۔ آغاز میں فاطمہ ثریا بجیا کے بارے میں پڑھا۔ بہت کچھ جاننے کو ملا لیکن ایک تشنگی کا احساس باقی رہا اگر ان کے بھائی انور مقصود کے بارے میں بھی ضمناً تھوڑا بہت لکھ دیا جاتا تو مزید بہتر ہوتا۔ فیروز نظامی پر لکھی گئی تحریر بھی اچھی تھی۔ ہماری فلمی

تاریخ اسی طرح کے بہت سے نامور موسیقاروں سے بھری پڑی ہے۔ ”اناس کے پھول“ موضوع کے اعتبار سے ایک اچھی تحریر تھی جس نے ہمارے ایمان اور احساس جھنجوڑنے میں کافی موثر کام کیا۔“

☆ **عبداللہ چاند کا خلوص نامہ ملتان سے۔** ”منی کہانی اچھی تھی آج خود کے بارے میں اچھا سوچیں گے تو کل بھی اچھا ملے گا۔ شاد عظیم آبادی کی روداد زبردست تھی۔ شہرِ خیال کے باسی بھی اپنے خوب صورت تبصروں میں زبردست کارکردگی دکھا رہے تھے جیسے نزاہت افشاں، مرزا طاہر الدین، حنیف ادیب، اعجاز حسین سٹھار، عبدالحکیم شمر، ظفر ندیم وہرہ، امیر حمزہ، سید امتیاز حسین بخاری، ناصر حسین رند، شکریہ آپ کا اور سب کا۔ ندیم اقبال اور نازلی ناز یہ کے تبصرے بھی عمدہ رہے۔ فاطمہ ثریا بجیا کمال کی ہنرمند خاتون تھیں۔ ہر مقصد کو ہمت و جرأت سے پایۂ تکمیل تک پہنچایا۔ بجیا ادب کی مایہ ناز خاتون تھیں جنہیں ہمیشہ یاد رکھا جائے گا۔ شاکر شجاع آبادی عظیم شاعر ہیں ان کا نام سن کر ہی دل میں احترام امڈ آتا ہے۔ جہاں پر بھی ان کی تصویر نظر آتی ہے اور شاعری پڑھنے کو ملتی ہے تو کسمپرسی کا ہی احساس ہوتا ہے۔ شاکر کے منطقی سوالات کے جواب ہر کسی کے پاس ہیں مگر سوال یہ ہے کہ جواب دے کون؟ ”شمشال سے ٹورنٹو“ کے سفرنامے کا اپنا ہی مزہ ہے مگر کبھی کبھی ندیم اقبال انکل پاکستان کی جو حقیقی تصویر پیش کرتے ہیں تو اس پر ہم آہ بھر کے رہ جاتے ہیں کہ ہمارے پاکستان میں ایسی بے انصافی اور غربت کیوں ہے۔ ”ناسور“ کسی نہ کسی شکل میں سامنے آہی جاتا ہے، چاہے وہ ہمدردی کے لبادے میں ہو یا سچ میں غنڈہ گردی میں۔“

☆ **وقار احمد کراچی سے لکھتے ہیں۔** ”السلام علیکم محترمہ عذرا رسول، میری ایک چھوٹی سی کاوش ہے۔ (محترم! آپ کی تحریر سرگزشت کے مزاج کی نہیں ہے) لکھنے کی اور پہلی دفعہ ہے یہ میری اپنی ہی کہانی ہے لیکن اگر قابلِ اشاعت ہو تو انہی فرضی ناموں سے ہی جاری کیا جائے کیونکہ میں ابھی آن ڈیوٹی ہوں۔“

☆ **سیدہ شاہدہ شاہ جہلم کا خط۔** ”ایک نئی سچ بیانی ”اک ذرا سی بھول“ کے ساتھ حاضر ہوں۔ یہ کہانی مجھے اس وقت ملی جب میں اپنی این جی اوز کی طرف سے ڈسٹرکٹ جیل جہلم میں معائنے کے لیے گئی تھی۔ پسند آجائے تو کسی نزدیکی اشاعت میں جگہ دے کر مشکور فرمایئے گا (اس پرچے سے فارغ ہو کر پڑھ لوں گا)۔“

☆ **اعجاز حسین سٹھار نور پور تھل سے۔** ”سرگزشت سے جیسے رفاقت نبھانے کے دعوے ہمارے ہیں ڈاکخانہ والے اس کا عملی مظاہرہ کرتے ہیں۔ دو دن ضرور مہمان رکھ کر اس کی ٹہل سیوا کرتے ہیں یہی وجہ ہے کہ یہ ہمیں نخرے دکھاتا اور آنکھ مچولی کھیلتا ہے، یوں ہم وقت کی کمی کے پیشِ نظر خط مخصوص تاریخ تک دفتر پہنچانے کے چکر میں چند کہانیاں ہی پڑھ پاتے ہیں بعد میں احساس ہوتا ہے کئی اہم مضامین، کہانیاں اور مہربان دوستوں کے خطوط پر تبصرہ نہ کرسکے ہیں۔ بہرحال منشی محمد عزیز میئے، نزاہت افشاں، ساگر تلوکر، عبدالحکیم، اعجاز حسین لدھیانہ اور امیر حمزہ اشرف نے سراہا، سب شکریہ قبول کریں۔ اب ہم ایک نام کے دو تبصرہ نگار شامل ہو رہے ہیں اگر میرے نام کے ساتھ سٹھار لکھیں گے تو فرق واضح ہوگا۔ صرف اعجاز حسین لکھنے سے ابہام پیدا ہوگا پھر میرا مکمل نام بھی یہی ہے جو تبصرہ کے ساتھ شائع ہو رہا ہے۔ ”بے تیغ سپاہی“ پڑھ کر سوچ رہا ہوں کیا مقبول حسین کی روایت کو کوئی دہرا سکے گا؟ بھلا آج کے نازک، شرمیلے اور مختلف ہیروز کا اسٹائل اپنانے والے نوجوان تھپڑ تک برداشت نہ کرسکیں گے۔ موٹر سائیکل دوڑاتے ہوئے کرتب دکھانے والے جب والدین کی امیدوں پر پورے نہ اتر سکے تو قوم کی امیدوں پر کہاں کھرے اتریں گے۔ قوم اور ملک کی عزت پر جان دینا اور دشمن کی سختیاں برداشت کرنے میں اللہ کی غیبی مدد شامل ہو کر جسم کو پتھر بنا دیتی ہے۔ ایسے غازیوں کے لیے سراہنا اور داد کا لفظ ریت کے ذرہ برابر ہے۔ بس دعا ہے رب تعالیٰ انہیں دنیا اور آخرت میں اتنا صلہ دے کہ وہ سنبھل نہ سکیں۔ ”کوپرا کا ریچھ“ نے شکار، تجسس اور لہو گرمانے کا بندوبست کردیا۔ ریچھ تو کم از کم انسانوں کے لیے بے ضرر ہی پڑھتے سنتے آئے ہیں یہاں اس کی عجیب درندگی کا تماشا دیکھنے کو ملا۔ شاید کسی حادثے نے اسے چیر پھاڑ کی طرف راغب کیا ہے۔ ”دو آتشہ“ میں نشو کے حسن و جمال، مخمور جوانی اور کامیابیوں کے متعلق پڑھ کر اس عمر میں بھی نشہ چھا گیا ہے اور میں شہر سے دور ہونے، معلومات کی کمی اور محدود وسائل کی وجہ سے ان کی کوئی فلم نہ دیکھ سکا۔ مسلسل فلمیں دیکھنے سے کسی اداکار کی صلاحیتوں، ہنر اور کارکردگی سے متعلق معلومات ملتی ہیں لیکن میں محض اخبارات کے فلمی صفحات اور مختلف میگزینوں میں مضامین پڑھ کر خوش رہا لیکن جیسی بھرپور اور مکمل معلومات انور فرہاد دے رہے ہیں جہاں وہ داد کے مستحق ہیں وہاں فلمی دنیا کا قابلِ فخر سرمایہ ہیں۔ ”شمشال سے ٹورنٹو“ میں بچپن کی محبت، مداری کا تماشا اور قدم قدم مزاح کے تڑکے نے دل خوش کردیا۔ اصل کمال ندیم اقبال کا ہے جو پرانی یادوں کو سینے سے لگائے پھرتے ہیں اور پورے ماحول، چہل قدمی اور مصروفیات کو مکمل جزئیات کے ساتھ تحریر کی صورت قارئین کی تفریحِ طبع کے لیے پیش کر رہے ہیں۔ سفرنامہ کو انہوں نے نئی شکل اور رنگ دیا ہے۔ ”ناسور“ میں نعمان جب کسی مہم سے سرخرو لوٹتے ہیں تو نیا سیاپا شروع ہو جاتا ہے۔ اب سچ بیانیوں کا جائزہ لیتے ہیں کہ ہمارے ارد گرد

جیتی جاگتی زندگی میں کیا ہو رہا ہے۔ ''زبان کا زہر'' کی رقیہ بیگم کے پورے جسم میں زہر بھرا ہوا تھا۔ جب پھنکارتی تو کچھ چھینٹے دوسروں پر پڑتے تھے بلکہ اولاد، بچے اور قریبی رشتے تک لپیٹ میں آجاتے تھے۔ ایسی سڑیل عورتوں سے دامن نہیں بچایا جاسکتا کہ رشتہ نازک ہوتا ہے لیکن صبر کی بھی ایک حد ہوتی ہے پھر جب دن رات کے معمولات لگے بندھے ہوں، آرام کے وقت خوامخواہ الٹی سیدھی باتیں سننے کو ملیں تو اچھا بھلا نارمل انسان بھی بوکھلا جائے گا۔ ''مداوا'' میں جمال نے غلطی نہیں بلکہ جرم کیا تھا لیکن خوش قسمت ہونے کے ساتھ نیک نیت تھا، مصیبتیں منہ کھول کر آئیں لیکن ناکام لوٹ گئیں، بگڑے حالات سنور گئے اور انہونی ہوگئی، اب سارا کریڈٹ نازش کو جاتا ہے جس نے وریشہ کو گلے لگا کر فراخ دلی کا ثبوت دیا ہے یوں چاہیے کہ قدرت کسی مصلحت کے تحت مشرق کو مغرب سے ملا دیتی ہے۔ ''باغی'' میں کرن حق سچ پر تھی لیکن باپ اڑیل کہ اولاد کو اپنی ہٹ دھرمی کی سولی چڑھا دیا۔ اس کے سینے میں دل کی جگہ روڑے بھرے تھے جن پر سردی، گرمی، رونا دھونا اور جذبات اثر پذیر نہ ہوتے تھے۔ جتنے ظلم، زیادتیاں کیں اس سے کئی گنا بڑھ کر بددعائیں سمیٹیں۔ جب کرن نے گھر چھوڑا تو اس نے کوئی کارروائی نہ کی حالانکہ اسے باؤلا ہو جانا تھا۔''

☆لبنیٰ سعید کا ای میل۔ ''سرگزشت بہت اچھا ڈائجسٹ ہے۔ میں اس ڈائجسٹ کے لیے لکھنا چاہتی ہوں میں کچھ کہانیاں لکھ کر مختلف جگہوں پر اشاعت کے لیے بھیج چکی ہوں۔ میری ایک بچی کہانی ایک سہ ماہی مجلہ میں چھپ چکی ہے۔ مہربانی کرکے آپ یہ بتادیں کہ آپ کہانی کا معاوضہ دیتے ہیں، کہانی کم از کم کتنے صفحوں یا الفاظ پر مشتمل ہو (ادارے کے ہر پرچے میں مصنفین کو اعزازیہ دیا جاتا ہے۔ کہانی الفاظ یا صفحوں میں مقید نہیں ہوتی، پلاٹ جتنا بڑا ہوگا کہانی خود اتنی پھیلے گی۔ جملے چست درست ہوں، پلاٹ اچھا ہو تو کہانی اپنی جگہ خود بنالیتی ہے۔ کہانی الفاظ کی محتاج نہیں ہوتی، الفاظ کی ضرورت کہانی ہے۔ کہانی بھیج دیں پڑھ کر بتادوں گا)''

☆ندیم اقبال کا ای میل مشی گن امریکا سے۔ ''میں ان تمام احباب کا شکر گزار ہوں جنہیں سفرنامہ پسند آرہا ہے۔ سرگزشت کا بھی شکر گزار ہوں کہ اس کی وجہ سے مجھے اتنے اچھے احباب ملے۔ خاص طور سے مشکور ہوں سید امتیاز حسین بخاری چکڑالوی، نزاہت افشاں، محمد ہمایوں تتولی، ظفر ندیم وہرہ، ساگر تلوکر، عبدالحکیم شمر، اعجاز حسین لدھیانہ، پیاری سی گڑیا سدرہ بانو ناگوری، امیر حمزہ اشرف، اعجاز حسین سٹھار، رانا محمد شاہد کے علاوہ اور بھی بہت سارے احباب جن کا نام اس وقت ذہن میں نہیں ہے۔ آپ سب کی پسندیدگی ہی مجھے مہمیز کررہی ہے جو میں آگے ہی آگے بڑھتا جارہا ہوں۔ میرا یہ سفرنامہ تیزی سے اختتام کی طرف گامزن ہے۔ انشاء اللہ آپ سب دوستوں کی حوصلہ افزائی جاری رہی تو نیا سفرنامہ بھی شروع کردوں گا کیونکہ میری زندگی کا بڑا حصہ سفر میں ہی گزر رہا ہے۔ اب مئی کے شمارے پر بھی کچھ باتیں ہوجائیں۔ ''سفیر امن'' اور ''بے تیغ سپاہی'' بہت بہت پسند آئی۔ ڈاکٹر ساجد امجد اور زویا اعجاز کو مبارک باد، خورشید روحانیت بھی ایمان افروز تھی۔ ''دوآتشہ'' تو ہے ہی ایک موسٹ سینئر قلمکار کے قلم سے اس لیے اچھی تحریر میں کوئی شک نہیں۔ سچ بیانیوں میں باغی کا لب ولہجہ غضب کا ہے۔ ''زبان کا زہر'' اور ''مداوا'' بھی بہترین تحریریں ہیں۔ فضہ خان کی ''شک'' بھی پسند آئی۔ ''بنیاد کا تھیم'' بھی بہت عمدہ تھا۔''

☆غضنفر عباس مرزا، اسلام آباد سے لکھتے ہیں۔ ''عالمی ڈائجسٹ کے شروع کے شماروں میں ایک کہانی بعنوان حکیم بڈھن کے نام سے شائع ہوتی تھی جس میں بہزاد لکھنوی کے متعلق بھی ہوتا تھا کہ حکیم بڈھن ایک چائے خانہ میں بیٹھتے تھے لوگ ان کے پاس مصرع طرح لے کر آتے تھے کہ حضور کل مشاعرے میں غزل پڑھنی ہے۔ عطا ہو جائے۔ حکیم بڈھن وہ مصرعہ بہزاد لکھنوی کو دیتے تھے اور وہ وہیں غزل مکمل کرکے دے دیتے تھے۔ جناب ساجد امجد صاحب سے التماس ہے کہ وہ بہزاد لکھنوی کے متعلق لکھیں کہ وہ کتنی بڑی شخصیت تھے تاکہ نئی نسل کو بیان کے متعلق معلوم ہو جائے۔ خداوند کریم ان کو حضورؐ پاک کے جوار رحمت میں جگہ دے۔ وہ عاشق رسول تھے۔ ''اے جذبۂ دل گر میں چاہوں ہر چیز مقابل آجائے منزل کی طرف دوگام چلوں اور منزل سامنے آجائے'' یہ ایک شعر اس کا ثبوت ہے۔ انور بہزاد مرحوم جب خبریں پڑھتے تو مجھے بہزاد لکھنوی یاد آتے تھے۔''

☆رضا احمد اعوان نے دریا خان بھکر سے لکھا ہے۔ ''مئی کا گرما گرم شمارہ میرے سامنے ہے۔ سب سے پہلے انور فرہاد کو دیکھا کہ اس بار جناب ہمارے لیے کیا لے کر آئے تو ''دوآتشہ'' پر نظر پڑی۔ واہ بہت خوب! ایک ہی نشست میں ''دوآتشہ'' پڑھ ڈالی کیونکہ یہ ہماری فیورٹ اداکارہ تھی۔ عطیہ اشرف جو بعد میں پی ٹی وی کے ڈراموں کی طرف آگئی تھی، پہلے فلموں میں کام کرتی تھی۔ اس کے بارے میں بھی آگاہ کریں کہ آج کل کن حالات میں زندگی بسر کررہی ہے؟ ''دوآتشہ'' میں شبنم کے ساتھ جو شرمناک سلوک کیا گیا ہم جانتے ہیں، ان افراد میں ایک ٹرانسپورٹ کمپنی کا مالک بھی ملوث تھا جو آج بھی مشہور معروف ہے۔ بہرحال ایک اداکارہ کے ساتھ جو شرمناک کھیل کھیلا گیا تھا اس پر آج بھی ہر پاکستانی شرمندہ ہے۔ کشمیری نوجوان مقبول حسین پر زویا اعجاز کی تحریر ''بے تیغ سپاہی'' خاصے کی چیز تھی۔ ''براعظموں کا ٹکراؤ'' سید احتشام کا خشک مضمون تھا۔ البتہ ''شمشال سے ٹورنٹو'' اور ''ناسور'' پر دونوں مصنفین کی گرفت مضبوط ہے اور

دونوں اپنے اندر دلچسپی برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ سچ بیانیوں میں ''شک'' اور ''بنیاد'' بے حد پسند آئیں۔ تبصروں میں اعجاز حسین سٹھار، رانا محمد شاہد اور عبدالحکیم کے تبصرے جامع تھے۔''

☆محمد احمد رضا انصاری کوٹ ادو سے لکھتے ہیں۔ ''پچھلے ماہ اپنی سستی کی وجہ سے حاضر نہ ہوسکے۔ آج کل آج کل کرتے پتا ہی نہیں چلا کب دس تاریخ گزر گئی۔ اس بار کوشش کرکے خط لکھ رہے ہیں (پھر بھی لیٹ ہے لیکن جگہ دے دی گئی) سرگزشت کو تھوڑا تھوڑا کرکے تقریباً ختم کرچکے ہیں۔ سرورق دلکش و دلنشین تھا۔ ننھی پری کا معصومانہ انداز دل کو بھایا۔ اداریہ سبق آموز تھا۔ ''معبر خیال'' میں سب نے زبردست لکھا۔ بہت خوب بجیا کے حالات زندگی کے بارے میں پہلی بار کوئی مضمون پڑھا۔ دلچسپ تھا ''اماوس کا مسافر'' ہمارے خطے کے ایک مشہور شاعر ہیں۔ شاکر شجاع آبادی سے میں معذرت کے ساتھ کہنا چاہوں گا کہ کیوبا سے فرار ایک ایسی کہانی ہے جو پہلے بھی پڑھ چکا ہوں۔ (ولید چیمہ کو پہلی بار جگہ دی گئی ہے اگر آپ کسی طرح ثبوت بھی فراہم کردیں تو بہتر ہوگا۔ ہم نے نئے مصنفین کی حوصلہ افزائی شروع کی تو ایسی شکایات موصول ہونے لگیں۔ اگر اس کہانی کی فوٹو اسٹیٹ بھیج دیں تو مصنف کے خلاف ایکشن ضرور لیا جائے گا۔ ایسی حرکت پر ادارہ خاموش نہیں رہتا اور اسے بلیک لسٹ کردیا جاتا ہے۔ ہم آپ کے جواب کے منتظر ہیں) ''اناس کا پھول'' رلا دینے والی سچ بیانی تھی۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' زبردست انداز میں آگے بڑھ رہی ہے۔ ہر قسط لاجواب ہوتی ہے۔ خدا کرے زور قلم اور زیادہ۔ ''ناسور'' پر کوئی تبصرہ نہیں کیوں کہ ہم اسے پڑھ ہی نہیں رہے۔ اب تھک چکے ہیں ہم ایسی ایک جیسے موضوع کی کہانیاں پڑھ پڑھ کر۔ یکسانیت سے بھرپور فضول لگتی ہیں مجھے تو۔''

☆رانا سجاد کا تبصرہ مظفر گڑھ شاہ جمال سے۔ ''پھر حاضر ہونے کی جسارت کررہا ہوں ایک طویل عرصے کے بعد کیوں کہ اس عرصے میں سرگزشت سے ناطہ عارضی طور پر ٹوٹ گیا تھا، صرف پڑھنے کی حد تک محدود تھا۔ وجہ یہ تھی کہ شمارہ کافی تاخیر سے ملتا جس سے خط بھی لکھا نہ جاسکتا تھا۔ اس لیے یہ غیر حاضری رہی۔ اب سلسلہ شروع کیا ہے تو انشاء اللہ تعطل نہیں آئے گا۔ سب سے پہلے ''ناسور'' پڑھی اس کے بعد باقی تحریریں شروع کی ہیں۔ اپریل کے شمارے میں فاطمہ ثریا بجیا کے بارے میں تحریر پڑھی ہمیشہ کی طرح لاجواب، بس ایک کمی شدت سے محسوس ہوئی کہ ان کے ساتھ ان کے بھائی انور مقصود کا بھی تھوڑا حوالہ آجاتا تو...... بہرحال عمدہ تحریر، بڑی ہمہ جہت شخصیت، میرا تاثر تو یہ تھا کہ وہ صرف ڈراما نگار ہیں لیکن اب اندازہ ہوا کہ وہ کتنے شعبوں میں مہارت رکھتی تھیں۔ معذرت کہ شہر خیال کے ساتھیوں کا تذکرہ تو رہ گیا۔ نزاہت افشاں کا عمدہ تبصرہ تھا۔ مرزا طاہر الدین بیگ، حنیف ادیب، سدرہ بانو ناگوری بھی حاضر ہوئیں۔ سوشل میڈیا کے حوالے سے آپ کی بات سے اتفاق کرتا ہوں۔ اعجاز حسین سٹھار صاحب کیسے ہیں آپ؟ طویل عرصے کے بعد آپ سے مخاطب ہورہا ہوں۔ خوب صورت اور جامع تبصرہ تھا۔ باقی تمام ساتھیوں کے تبصرے بھی پسند آئے۔ محترم سر ندیم اقبال بھی آئے۔ یقین مانیے ان کے سفرنامے آفاقی صاحب کی یاد دلاتے، وہی نوک جھوک وہی ہلکے پھلکے انداز میں معلومات قاری کے ذہن میں انڈیلنا، واہ۔ ندیم اقبال صاحب کے سفرنامے نے تو سماں باندھ دیا ہے۔ مبارک باد قبول کیجیے۔ شدت سے بسا اوقات کینیڈا آنے کو جی چاہتا ہے، سرائیکی وسیب کے بے مثال شاعر شاکر شجاع آبادی۔ کاش ہمارے ارباب اختیار ان کے لیے کچھ کرلیں (ایک صاحب نے فون کرکے بتایا کہ ان کی کوشش جاری ہے پنجاب حکومت نے امداد کی یقین دہانی کرائی ہے) زویا اعجاز کو خراج تحسین کہ ہمارے علاقے کے اس شخص بے مثال کے بارے میں آگاہ کیا۔ ''ادراک'' پڑھ کر دل کو بہت خوشی حاصل ہوئی۔''

☆عبدالجبار رومی انصاری بورے والا سے لکھتے ہیں۔ ''اداریے کی منی کہانی سمجھانے لائق ہی ہوتی ہے۔ ہر انسان اپنے آپ کو سمجھ لے تو یقیناً بہت بڑی بات ہوگی، دور کیوں جائیں گے۔ یک صفحی سرگزشت ہی دیکھ لیں حکیم الامت کہہ رہے۔ ''میں اصل کا خاص سومناتی'' جو اس سوچ میں تھے کہ انسان کیا ہے۔ اور پھر اصل کے خاص کو پایا تو علامہ اقبال بن گئے جن پر دنیائے اسلام فخر کرتی ہے اور جنہوں نے خود کو ''گدائے عالم'' اور در پاک کا بھکاری کہا تو وہ میر سید جلال الدین سے مخدوم جہانیاں جہاں گشت بن گئے۔ انسان کی خوبیاں ہی اسے عام انسانوں سے معتبر و اعلیٰ بنا دیتی ہیں اور وہ اللہ کے مخلوق کے ساتھ ساتھ اللہ کو بھی محبوب ہوجاتا ہے اور پھر روحانیت کا خورشید بن کر ایک عالم کو منور کردیتا ہے اور پھر یوں بھی ہوتا ہے کہ دشمن کے نرغے میں آکر وطن کا سپاہی پاکستان زندہ باد کی صدا بلند کرتا ہے اور زبان سے محروم کردیا جاتا ہے۔ بلند ہمت مرد مجاہد، وطن کے رازوں کا امین روایات کا پاسدار، سپاہی مقبول حسین حب الوطنی کی اعلیٰ مثال قائم کرکے پاکستان کا وارث اور قابل فخر ہیرو بن جاتا ہے، حیران کن معلومات دلچسپی کا باعث ہوتی ہیں جنہیں پڑھ کر عقل دنگ رہ جاتی ہے جیسے براعظموں کا ٹکراؤ کہیں خشکی سمندر میں بدل جاتی ہے اور کہیں پہاڑ بن جاتے ہیں۔ یہ سب چھپی ہوئی قدرت کی نشانیاں ہیں اور قدرت ہی انسان کو تحقیق و جستجو پر معمور کرتی ہے جس سے نئے نئے راز افشاں ہوتے ہیں۔ شمشال سے ٹورنٹو بہت عمدہ جارہی ہے۔ کہیں نہ کہیں گھروں میں بڑوں کے منفی رویے بھی گھر کا

ماحول خراب کیے رہتے ہیں لیکن بات یہی کہ بزرگ اور بچے ایک سے ہی ہوتے ہیں تو انہیں بھی گھر سے نکالنے کی بجائے خوش وخرم رکھنا چاہیے جیسے ''زبان کا زہر'' میں سین نے اپنی ساس کو ساتھ رکھ کے اچھا کیا۔ کالی طاقتوں کی کہانی ''اگھوری'' نے بھی سہا ہی دیا آخر کوئی عامل تو اس بلا کو زیر کرے گا ہی۔ آخری کہانی اچھی تھی۔''

☆ سید امتیاز حسین شاہ بخاری چکڑالوی سرگودھا سے رقمطراز ہیں۔ ''نئی آب وتاب دیدہ زیب ٹائٹل اور حیرت انگیز معلومات، دلچسپ تحریروں، کہانیوں، مضامین اور اقتباسات کے ساتھ نظر افروز ہوا۔ شمارہ بروقت ملنے پر بے پایاں خوشی ہوئی سب سے پہلے آپ کا فکر انگیز اداریہ کہانی پڑھی۔ واقعی انسان ہونا بہت ہی مشکل ہے اگر کسی میں انسانی خوبی ہے تو بہت ہی بڑی بات ہے۔ حکیم الامت کے بارے میں سیر حاصل تحریر تھی اور ایک نئے انداز سے بھرپور تحریر تھی۔ علامہ اقبال نے اپنی شاعری کے ذریعے مردہ قوم میں ایک نئی روح پھونک دی اور ان کو بیدار اور باوقار قوم بنا دیا اور آزادی سے ہمکنار کر دیا۔ اقبال پر جتنا بھی لکھا جائے کم ہے۔ وادی ''شہرِ خیال'' میں داخل ہوا تو منشی محمد عزیز مے لنڈن مسندِ صدارت پر فائز تھے۔ ان کا تبصرہ بھرپور اور معلومات افزا تھا۔ ڈھیر مبارک باد۔ یاد آوری کا شکریہ۔ ''خورشید روحانیت'' ایک ولی کامل کا مختصر سا تذکرہ، وسیم بن اشرف کی ایک باکمال اور زبردست تحریر تھی۔ ''بے تیغ سپاہی'' زویا اعجاز کی زبردست محب الوطنی پر مبنی تحریر تھی جس کی تعریف نہ کرنا بدذوقی ہے۔ شاعرِ زندگی میں سلمیٰ اعوان نے خوب پردہ اٹھایا۔ فلم نگری ''دل آشنا'' میں محترم انور فرہاد نے فلمی دنیا کی پاکستانی اداکارہ نشو کا کامیاب اور مفصل تعارف کرایا ہے جو کہ میں نے ایک ہی نشست میں دو گھنٹے میں پڑھا، ہر لفظ پر لطف اندوز ہوتا گیا۔ ندیم اقبال اس بار نئے انداز سے سحر بیانی سے دلوں کو مسخر کر رہے ہیں اور ان کی تحریر دکھی دلوں کو سکون دے رہی ہے۔ ہر لفظ ہر سطر میں جادو بیانی ہے جو دل کو موہ لیتی ہے اور معلومات میں اضافہ کرکے ذہن کو پُرسکون بنا دیتی ہے ان کے احساسات وجذبات محبت وخلوص کو بخوبی اجاگر کرتی ہے۔''

☆ ساگر تلور کرفرام چشمہ کی گل افشانی۔ ''سرگزشت طویل ترین انتظار کے بعد کیم مئی کو ملا۔ (پچیس تاریخ تک اگر شمارہ نہ ملے تو فوراً ادارہ کو مطلع کریں) ''شہرِ خیال'' میں منشی عزیز خوب صورت اور معلوماتی تبصرے کے ساتھ کرسی صدارت پر براجمان تھے۔ بہت مبارک ہو واقعی کرسی آپ کی بنتی تھی۔ نزاہت افشاں اور اعجاز حسین کے تبصرے محفل میں نمایاں رہے۔ احمد صغیر صدیقی کی موت کا دکھ ہوا۔ رسالوں کے ادیب اتنی گمنامی کی موت کیوں مر جاتے ہیں۔ سوچ سوچ کر کڑھتا ہوں۔ سفیر امن معلوماتی تحریر اچھی لگی۔ انہی صفحات پر نواب صاحب اور کاشف زبیر اور دوسرے لکھاری جو فوت ہو گئے ہیں ان کو جگہ دی جائے تو قارئین کو لطف آ جائے گا۔ ''خورشید روحانیت'' حضرت مخدوم کے واقعات عقیدت کے ساتھ پڑھے۔ ''بے تیغ'' سپاہی مقبول حسین کی وطن سے محبت اور محبت میں کاٹی گئی سزائیں پڑھ کر دل سے صدا نکلی کہ محبت ہو تو ایسی ہو۔ مقبول حسین ہمارا قومی ہیرو اور پاکستان کے ماتھے کا جھومر ہے۔ سلام مقبول حسین سلام (صرف زبانی نہیں، عملی طور پر بھی ہمیں اپنے ہیروز کے لیے کچھ کرنا چاہیے۔ نئی پود کو بتانے کی ضرورت ہے کہ ہماری فوج کے جوان ایسے بہادر ہوتے ہیں۔ کبھی غلطی سے بھی دشمنوں کی چال میں آ کر انہیں کوئی بھی برا نہ کہے)۔''

☆ عبدالحکیم ثمر کراچی سے رقمطراز ہیں۔ ''انسان اور ان کی صفات کی تلاش میں سرگرداں دیکھ کر سوچا کیوں نہ میں بھی آپ کی اس مہم میں آپ کا ساتھ دوں۔ لہٰذا ابتداء میں نے اپنے آپ سے کیا کہ کیا میں انسان ہوں؟ کیا مجھ میں انسان والی صفات موجود ہیں؟ کئی بار سوچا سوچتا ہی رہا لیکن پلے کچھ نہ پڑا اچانک کہیں دور سے میرے اندر ایک آواز آتی سنائی دی۔ ''ہاں! میں بھی انسان ہوں لیکن ان صفات سے عاری جو انسانوں کی معراج ہے۔ مجھ میں احکام شریعت کے بجائے مکاری، عیاری، حرص وطمع کوٹ کوٹ کے بھرا ہوا ہے کیونکہ آج کا انسان جینوئن نہیں، ری میک ہے۔'' سرگزشت میں شامل تمام نگارشات اپنی مثال آپ ہیں ان کے تخلیق کار بھی قابل تحسین ہیں۔ سرگزشت واحد مجلہ ہے جو ہر ذوق کی نمائندگی کرتا ہے۔ ''حکیم الامت'' ایک صفحہ لیکن مکمل تسکین! ''سفیر امن'' ڈاکٹر ساجد امجد کیا کہوں؟ ان کا نام ہی کافی ہے۔ خورشید روحانیت، وسیم اشرف کا ایمان افروز تحفہ۔ زویا اعجاز کی ''بے تیغ سپاہی'' حب الوطنی کا بے مثال نمونہ ہے۔ بے شک وارث جاید ادکا ہو یا روایات کا اسے ہمیشہ پلکوں پے ہی بٹھایا جاتا ہے۔ ''شمشال سے ٹورنٹو'' کے اس اپی سوڈ میں ندیم اقبال تفریح کے بھرپور موڈ میں نظر آئے۔ دلکش حسین نظارے، دل پر دستک دیتی حسین خدوخال، کہیں ٹانگیں، کہیں باہنیں، کہیں زلفیں، کہیں کہیں آنکھیں، کہیں شوخیاں، کہیں خرمستیاں، کہیں آدھی ادھورے پیرہن ندیم اقبال صاحب اپنے ساتھیوں سمیت بھرپور لطف اندوز ہوتے رہے، خوب، بہت خوب ندیم صاحب۔''

تاخیر سے موصول خطوط:

نزاہت افشاں، فتح جنگ۔ ارباب علی کوئٹہ۔ نازش سلیم، مظفر گڑھ۔ صالح عبدالحمید، ساہیوال۔ نزہت جبیں، فیصل آباد۔ ظہیر الدین، یو اے ای۔ اکبر حسین، سرگودھا۔ اشرف علی، پشاور۔ سدرہ بانو ناگوری، کراچی



فلم کار قلم کار

تنویر ریاض

وہ دیارِ غیر میں بے یارومددگار تھا لیکن اس کے لیے یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ بچپن سے فقروفاقہ اس کا ہمراہی رہا کیونکہ باپ لاابالی تھا، کہیں ٹک کر نہ بیٹھتا نتیجتاً پورے خاندان کی زندگی ڈولتی کشتی بنی رہی۔ وہ خود سے اتنا مایوس ہوچکا تھا کہ خودکشی کی سوچنے لگا لیکن باپ کی چرب زبانی نے اسے خودکشی سے روک لیا اور اس نے قلم تھام لیا جس نے اس کی زندگی کا نقشہ ہی بدل دیا۔

ہالی ووڈ کی ایک بڑی شخصیت کا زندگی نامہ

میری عمر سترہ برس تھی اور ان دنوں شکاگو کے ایک ڈرگ اسٹور میں ڈلیوری بوائے کے طور پر کام کرتا تھا۔ جب میں نے خودکشی کرنے کا ارادہ کیا تو یہ ملازمت اس لحاظ سے بڑی مناسب معلوم ہوئی کہ مجھے وہاں سے مناسب مقدار میں خواب آور گولیاں چرانے میں آسانی رہتی گو کہ صحیح طور پر اندازہ نہیں تھا کہ خودکشی کے لئے گولیوں کی کتنی مقدار درکار ہوگی تاہم میں نے بیس گولیاں جیب میں رکھ لیں۔ میں نے کہیں پڑھ رکھا تھا کہ وہسکی کے ساتھ خواب آور گولیاں لینے سے یقینی طور پر موت واقع ہو جاتی ہے۔ اس کام کے لئے میں نے ہفتے والے دن کا انتخاب کیا تھا کیونکہ اس روز میرے والدین ویک اینڈ منانے گھر سے باہر چلے جاتے تھے اور چھوٹا بھائی رچرڈ ایک دوست کے ساتھ رہتا تھا۔ اس طرح اپارٹمنٹ میں تنہا ہوتے ہوئے میں اپنے پلان پر آسانی سے عمل کرسکتا تھا۔

یہ 1934ء کی بات ہے جب امریکا اپنی تاریخ کے بدترین بحران سے دوچار تھا۔ اسٹاک مارکیٹ بیٹھ چکی تھی اور ہزاروں بینک دیوالیا ہو رہے تھے۔ سب لوگ اپنا اپنا کاروبار لپیٹ رہے تھے۔ تیرہ ملین سے زائد لوگ اپنی ملازمتوں سے محروم ہو چکے تھے اور اجرتوں کی شرح تیزی سے گرتی جا رہی تھی۔ لکھ پتی خودکشی کر رہے تھے اور اعلیٰ افسران سڑکوں پر سیب بیچنے پر مجبور ہو گئے تھے۔ دوسرے لوگوں کی طرح میرے لئے بھی اس دنیا میں کوئی کشش باقی نہ رہی تھی اور میں مایوسی کی گہری دلدل میں اترتا جا رہا تھا اور مجھے زندہ رہنے کا کوئی جواز نظر نہ آ رہا تھا۔

میں اپنی فیملی کے ساتھ راجرز پارک میں واقع تیسری

منزل کے ایک چھوٹے سے اپارٹمنٹ میں رہتا تھا۔ ہمارے گھر میں غربت اپنی انتہا کو چھورہی تھی اور اسی غربت سے تنگ آ کر میں نے اپنی زندگی ختم کرنے کا فیصلہ کیا تھا۔ شام چھ بجے اسٹور بند کر کے جب گھر پہنچا تو میدان خالی تھا۔ میں نے کچن میں جا کر وہسکی کی بوتل نکالی اور اس کی تھوڑی سی مقدار گلاس میں ڈال کر اسے ہونٹوں سے لگا لیا پھر میں نے خواب آور گولیاں ہتھیلی پر رکھیں اور انہیں پھانکنے ہی والا تھا کہ ایک آواز نے مجھے چونکا دیا ”یہ تم کیا کر رہے ہو؟“

میں نے پیچھے مڑ کر دیکھا اور خواب آور گولیاں میرے ہاتھ سے پھسل کر نیچے جا گریں۔ میرے والد بیڈ روم کے دروازے پر کھڑے تھے۔ وہ میرے قریب آ کر بولے ”مجھے معلوم نہیں تھا کہ تم نشے میں ہو۔“

میں انہیں حیرانی کے عالم میں دیکھتے ہوئے بولا۔ ”میں...... میں سمجھا کہ آپ جا چکے ہیں۔“

”میں کچھ بھول گیا تھا۔“ وہ مجھے گھورتے ہوئے بولے۔ ”تم کیا کر رہے ہو؟“

”کچھ نہیں۔“ میں نے گھبراتے ہوئے کہا۔

”ان کی نظر خواب آور گولیوں کی شیشی پر گئی اور وہ چونکتے ہوئے بولے ”او گاڈ! یہ سب کیا ہے۔ تم پاگل تو نہیں ہو گئے۔“

”میں...... میں خودکشی کرنا چاہتا ہوں۔“ میں نے ہمت سے کام لیتے ہوئے کہا ”آپ مجھے نہیں روک سکتے۔ آج نہیں تو کل میں اپنی زندگی کا خاتمہ ضرور کر لوں گا۔“

وہ کچھ دیر خاموش کھڑے رہے پھر ایک گہری سانس لے کر بولے ”یہ تمہاری زندگی ہے۔ اس کے ساتھ تم جو چاہو سلوک کرو۔“ یہ کہہ کر وہ ایک لمحے کے لئے رکے پھر ہچکچاتے ہوئے بولے ”اگر تمہیں جلدی نہ ہو تو میرے ساتھ ٹہلنے کے لئے چل سکتے ہو؟“

وہ ایک سیلز مین تھے اور ان کا خیال تھا کہ وہ اپنی لچھے دار باتوں سے میرے پلان کو تبدیل کرنے میں کامیاب ہو جائیں گے۔ میں نے ایک لمحے کے لئے سوچا پھر کہا۔ ”چلیں۔“

پانچ منٹ بعد ہم دونوں سڑک پر چہل قدمی کر رہے تھے۔ خون منجمد کر دینے والی سردی کی وجہ سے باہر سناٹے کا راج تھا۔ کچھ دیر خاموش رہنے کے بعد میرے باپ نے کہا۔ ”تم خودکشی کرنا کیوں چاہتے ہو؟“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ بات کہاں سے شروع کروں اور انہیں کیسے بتاؤں کہ میں اپنے آپ کو کتنا بے بس اور تنہا محسوس کر رہا ہوں۔ میں ایک بہتر زندگی گزارنے کا خواہش مند تھا۔ مجھے ایک شاندار مستقبل کی تمنا تھی۔ میں نے جاگتی آنکھوں سے خواب دیکھے تھے لیکن میرے مقدر میں ڈلیوری بوائے بننا لکھا تھا۔ کالج میں داخلہ لینے کے لئے میرے پاس پیسے نہیں تھے۔ میں نے مصنف بننے کا خواب دیکھا اور درجنوں کہانیاں لکھ کر بھیجیں لیکن وہ سب مسترد ہو گئیں۔ بالآخر میں نے فیصلہ کر لیا کہ اس طرح روتے دھوتے زندگی گزارنے کا کوئی فائدہ نہیں۔

میں انہی سوچوں میں گم تھا کہ والد کی آواز نے مجھے چونکا دیا ”تم نہیں جانتے کہ کل کیا ہونے والا ہے۔ زندگی بھی ایک سسپنس سے بھرپور ناول ہے۔ جب تک تم اس کا اگلا صفحہ نہ پلٹو، نہیں جان سکتے کہ وہاں کیا لکھا ہوا ہے۔“

”جانتا ہوں کہ کل کیا ہونے والا ہے۔“ میں نے بے زاری سے کہا ”کچھ بھی نہیں...... کچھ نہیں ہوگا۔“

”تم واقعی کچھ نہیں جانتے۔ ہر نیا دن ایک مختلف صفحے کی مانند ہے اور وہ تمہیں حیران کر سکتا ہے۔“

”مجھے ان کی بات میں وزن نظر آیا۔ واقعی ہر آنے والا نیا دن ناول کے اگلے صفحے کی مانند ہے۔ ہم دونوں ٹہلتے ٹہلتے ایک دوسری سڑک پر آ گئے۔ پھر میرے والد نے کہا۔ ”میں تمہیں خودکشی کرنے سے نہیں روکتا لیکن مجھے افسوس ہوگا اگر تم اس کتاب کو اتنی جلدی بند کر دو گے اور اگلے صفحے پر جو کچھ لکھا ہے اس کی دلچسپی سے محروم رہ جاؤ گے۔“

میرے والد بہت اچھے سیلز مین تھے۔ میں خود ہی اپنی زندگی ختم کرنے کے بارے میں سنجیدہ نہیں تھا کیونکہ اگلے بلاک تک پہنچتے پہنچتے میں اپنا پلان ملتوی کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔

☆☆☆

میری پیدائش شکاگو میں ہوئی جبکہ میری ماں نتالی مارکوس روس میں پیدا ہوئی تھیں۔ دس سال کی عمر میں وہ اپنی ماں ریٹا کے ساتھ امریکا آ گئی تھیں۔ وہ بے حد خوبصورت تھیں۔ گو کہ انہوں نے باقاعدہ تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن ان کا مطالعہ بے حد وسیع تھا۔ انہیں کلاسیکل موسیقی اور کتابوں سے دلچسپی تھی۔ کسی شہزادے سے شادی کرنا اور دنیا بھر کی سیر کرنا ان کا خواب تھا۔ غریبوں کے خواب کی تعبیر بھی الٹی ہی ہوتی ہے۔ نتالی کے سپنوں کا شہزادہ اوٹو شیکلل کی صورت میں آیا جو شکاگو کا اسٹریٹ فائٹر تھا اور چھٹی جماعت میں ہی اسکول چھوڑ چکا تھا۔ نتالی اس کی خوبصورتی اور مردانہ وجاہت پر مرمٹی۔ دونوں ہی اپنے اپنے خوابوں کے اسیر تھے۔ نتالی

ساری دنیا گھومنا چاہتی تھی جب کہ اوٹو راتوں رات امیر بننے کا سپنا دیکھا کرتا تھا۔ نتالی کی فیملی میں دو بھائی سام اور ایل جبکہ تین بہنیں پولین، نتالی اور فران تھیں جبکہ شیکلل فیملی دو بھائیوں ہیری، اوٹو اور پانچ بہنوں روز، بیس، ایڈا، ملڈریڈ اور ٹلی پر مشتمل تھی۔ دونوں گھرانوں میں کوئی مماثلت نہیں تھی اور کئی معاملات میں وہ ایک دوسرے کی ضد تھے۔ اس کے باوجود قسمت کی خوبی دیکھیے کہ ہیری کی شادی پولین اور اوٹو کی نتالی سے ہوئی۔ ٹلی کو ایل مارکوس نے پسند کر لیا اور جو کسر باقی رہ گئی تھی وہ سام مارکوس نے پولین کی سہیلی سے شادی کر کے پوری کر دی۔

میرے والد اوٹو انتہائی فضول خرچ واقع ہوئے تھے۔ وہ اکثر درجن بھر مہمانوں کو کسی مہنگے ریستوران میں مدعو کرتے اور بل آنے پر انہی میں سے کسی ایک سے ادھار لے کر ادائیگی کرتے جبکہ میری ماں کو ادھار لینے کی عادت نہ تھی۔ ان میں بہت زیادہ احساس ذمے داری تھا۔ جیسے جیسے میں بڑا ہوتا گیا تو مجھے یہ اندازہ لگانے میں کوئی دشواری محسوس نہ ہوئی کہ وہ دونوں ایک دوسرے کے لئے انتہائی ناموزوں تھے۔ وہ دونوں ایک دوسرے سے ہر وقت لڑتے رہتے تھے۔ بعض اوقات ان کے درمیان اتنا زیادہ جھگڑا ہوتا کہ میں گھبرا کر پبلک لائبریری چلا جاتا اور کتابوں میں سکون تلاش کرنے کی کوشش کرتا۔

ایک دن جب میں اسکول سے گھر واپس آیا تو وہ دونوں بری طرح لڑ رہے تھے۔ میں گھبرا کر مدد کے لئے آنٹی پاؤلین کے پاس چلا گیا۔ وہ انتہائی مہربان، ذہین اور محبت کرنے والی عورت تھیں۔ میں نے انہیں سارا ماجرا کہہ سنایا تو وہ بولیں ”میں بتاتی ہوں کہ تمہیں کیا کرنا چاہئے۔ وہ دونوں تم سے بہت محبت کرتے ہیں اور تمہیں دکھ پہنچانا نہیں چاہتے اگر آئندہ وہ لڑیں تو تم ان سے کہہ دینا کہ وہ تمہارے سامنے جھگڑا نہ کیا کریں۔ کیا تم ان سے یہ بات کہہ پاؤ گے؟“

میں نے اثبات میں سر ہلایا اور گھر واپس آ گیا۔ آنٹی پاؤلین کی بتائی ہوئی ترکیب کارگر ثابت ہوئی۔ ایک دن وہ دونوں حسب معمول ایک دوسرے پر زور زور سے چلا رہے تھے کہ میں ان کے پاس گیا اور بولا ”پلیز! میرے سامنے جھگڑا نہ کریں۔“

یہ سنتے ہی ان دونوں کو بریک لگ گیا۔ والدہ بولیں۔ ”تم ٹھیک کہہ رہے ہو ڈارلنگ آئندہ ایسا نہیں ہوگا۔“

والد نے بھی ان کی ہاں میں ہاں ملائی ”مجھے افسوس ہے سڈنی! ہم دونوں کو کوئی حق نہیں پہنچتا کہ تمہارے سامنے اپنے مسئلے لے کر بیٹھ جائیں۔“

ہم ایک شہر سے دوسرے شہر منتقل ہوتے رہتے کیونکہ میرے والد کو ہمیشہ کام کی تلاش رہتی۔ جب کوئی مجھ سے ان کے کام کے بارے میں پوچھتا تو میرا جواب ہمیشہ مختلف ہوتا۔ ٹیکساس میں وہ جیولری شاپ میں ملازمت کرتے تو شکاگو میں کپڑے کی دکان پر اور اری زونا میں انہیں چاندی کی کان میں کام مل جاتا۔ دو سال میں ایک مرتبہ وہ مجھے کپڑوں کی خریداری کے لئے لے جاتے۔ جہاں ہم ایک ٹرک سے اچھے اور سستے سوٹ خریدتے۔ میرا بھائی رچرڈ 1925ء میں پیدا ہوا۔ اس وقت میری عمر آٹھ برس تھی۔ ان دنوں ہم انڈیانا کے قصبے گیری میں رہا کرتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ بھائی کے آنے کی خبر سن کر مجھے کتنی خوشی ہوئی تھی۔ وہ میری زندگی کا یادگار لمحہ تھا۔ میرے ذہن میں ایسے کئی منصوبے جنم لینے لگے جن پر آگے چل کر ہم دونوں کو عمل کرنا تھا۔ ہماری حالت خانہ بدوشوں جیسی تھی۔ سترہ سال کی عمر کو پہنچنے تک ہم آٹھ شہروں میں رہائش اختیار کر چکے تھے جب کہ میں نے آٹھ گرامر اور تین ہائی اسکولوں میں تعلیم حاصل کی تھی۔ آئے دن کی نقل مکانی کی وجہ سے میں کوئی کام بھی پورا نہ کر سکا۔ ایک مرتبہ والدہ نے نہ جانے کس طرح پیسوں کا انتظام کر کے مجھے ایک سیکنڈ ہینڈ پیانو لا کر دیا۔ وہ چاہتی تھیں کہ میں میوزک کی کلاس اٹینڈ کروں۔ یہ سلسلہ چند مہینے ہی جاری رہ سکا کیونکہ اس کے بعد ہم ڈیٹرائیٹ شفٹ ہو گئے۔ مجھے بچپن سے ہی کتابیں پڑھنے کا شوق تھا جبکہ میرے والد نے زندگی میں کبھی کسی کتاب کو ہاتھ بھی نہیں لگایا تھا اس لئے جب وہ مجھے آوارہ گردی کرنے یا بیس بال کھیلنے کے بجائے گھر میں بیٹھ کر پبلک لائبریری سے لائی ہوئی کتابیں پڑھتے دیکھتے تو ان کی پریشانی بڑھ جاتی۔ انہیں اندیشہ تھا کہ اس طرح میری آنکھیں خراب ہو سکتی ہیں۔ وہ چاہتے تھے کہ میں بھی اپنے کزن سیمور کی طرح دوسرے لڑکوں کے ساتھ فٹ بال کھیلوں۔ میں نے دس سال کی عمر میں پہلی نظم لکھی اور والد سے کہا کہ وہ اسے بچوں کے میگزین وی وزڈم میں بھیج دیں۔ انہیں یقین تھا کہ یہ نظم مسترد ہو جائے گی۔ اس لئے انہوں نے شرمندگی سے بچنے کے لئے اس پر میرے انکل ایل کا نام ڈال دیا۔ دو ہفتے بعد انکل ایل بڑے حیران ہوئے جب انہیں میگزین کی جانب سے پانچ ڈالر کا چیک ملا۔

بارہ سال کی عمر میں پہلا ڈراما لکھا۔ اس وقت میں شکاگو کے مارشل فیلڈ گرامر اسکول میں ساتویں جماعت کا طالب علم تھا۔ ٹیچر نے وہ ڈراما پڑھا تو بولی ”کیا تم یہ ڈراما

اسٹیج کرنا چاہو گے۔"

میں نے رضامندی کا اظہار کیا تو اس نے وعدہ کیا کہ وہ میرے ڈرامے کے لئے آڈیٹوریم کا بندوبست کر دے گی۔ میری پوری کلاس اس ڈرامے میں کام کرنے کی خواہش مند تھی جبکہ میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ پروڈیوسر اور ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ اپنے ڈرامے میں ایکٹنگ بھی کروں گا۔ میں نے کبھی کسی ڈرامے کی ڈائرکشن نہیں دی تھی لیکن جانتا تھا کہ مجھے کیا کرنا ہوگا۔ میں نے کاسٹنگ شروع کردی۔ اسکول کے اوقات کے بعد آڈیٹوریم میں ریہرسل کی اجازت مل گئی تھی اور ڈرامے کے لئے ضروری سامان کا بھی انتظام ہوگیا تھا۔ یہ میری زندگی کا خوش گوار موڑ تھا۔ میں جانتا تھا کہ یہ ایک شاندار کیریئر کا آغاز ہے جب میں چھوٹی عمر میں ڈراما لکھ سکتا ہوں تو ایک دن میرا ڈراما براڈوے میں بھی ضرور دکھایا جائے گا۔

ڈراما دیکھنے کے لئے پرنسپل سمیت تمام اسٹاف موجود تھا جبکہ آڈیٹوریم پوری طرح بھر چکا تھا۔ پردہ اٹھا۔ پہلے منظر میں ایک لڑکا اور لڑکی، میاں بیوی کے روپ میں صوفے پر بیٹھے باتیں کر رہے تھے۔ اس کے بعد میری انٹری تھی لیکن لڑکے نے ایک مکالمہ اس طرح بولا کہ الفاظ آپس میں گڈمڈ ہوگئے اور اس کے نتیجے میں جو تیسرا لفظ وجود میں آیا، اسے سن کر میری ہنسی چھوٹ گئی اور مجھے اپنے آپ پر قابو نہ رہا۔ لڑکا اور لڑکی بے چینی سے میری آمد کے منتظر تھے لیکن میں مسلسل ہنسے جا رہا تھا۔ ڈراما اسی جگہ رک گیا اور ہال میں بیٹھے لوگ بے چینی سے پہلو بدلنے لگے۔ میری ٹیچر سے ضبط نہ ہوسکا۔ وہ ہال کے وسط میں کھڑے ہوکر چلّائی! "سڈنی! یہاں آؤ۔"

میں ڈگمگاتے قدموں سے چلتا ہوا اسٹیج پر آیا لیکن میری ہنسی اسی طرح جاری تھی۔

"اسٹاپ اِٹ!" ٹیچر نے مجھے حکم دیا۔

میں نے اپنی ہنسی پر قابو پانے کی کوشش کی لیکن جیسے ہی وہ مہمل لفظ میرے ذہن میں آیا، میں دوبارہ ہنسنے لگا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ سب لوگ ایک ایک کرکے اپنی نشستوں سے کھڑے ہوگئے اور تھوڑی ہی دیر میں ہال خالی ہوگیا۔ اس طرح میرا ڈراما شروع ہونے سے پہلے ہی اپنے انجام کو پہنچ گیا۔

میں نے مارشل فیلڈ گرامر اسکول سے تعلیم مکمل کرنے کے بعد ایک ڈرگ اسٹور میں ملازمت کرلی۔ والدہ کو کسی فرم میں کیشیئر کی جاب مل گئی تھی جبکہ والد اپنے تصوراتی منصوبوں کو عملی جامہ پہنانے کے لئے شہر شہر گھوم رہے تھے پھر وہ ہم سب کو لے کر اریزونا کے قصبے کرک لینڈ چلے آئے۔ ان کا کہنا تھا کہ وہاں انہیں چاندی کی کان کا ٹھیکا مل گیا ہے اور بہت جلد ہمارے دن پھر جائیں گے لیکن ایسا کچھ نہ ہوا۔ ہم نے وہاں بڑی مشکل سے تین مہینے گزارے اور پھر ایک دن یہ انکشاف ہوا کہ اس علاقے میں چاندی کی کوئی کان تھی ہی نہیں۔ انکل ہیری کو جب ہمارے حالات کا علم ہوا تو انہوں نے ہمیں اپنے پاس ڈینور بلالیا۔ انہوں نے بروکریج کمپنی کھولی تھی اور چاہتے تھے کہ میرے والد ان کے ساتھ مل کر کام کریں۔

1930ء کے آخر میں تیرہ سال کی عمر میں مجھے ایسٹ ہائی اسکول میں داخلہ مل گیا۔ یہ میری زندگی کا انتہائی خوش گوار تجربہ تھا۔ اس اسکول کی ٹیچرز شفیق اور مہربان تھیں اور شاگردوں سے دوستانہ انداز میں گفتگو کرتی تھیں۔ ایک دن جم کلاس کے دوران میرا پاؤں پھسلا اور میری کمر کے نچلے حصے میں شدید چوٹ آئی۔ ڈاکٹر نے بتایا کہ دو تین روز بستر پہ سیدھا لیٹنے سے میں ٹھیک ہوجاؤں گا۔ مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ کمر کی یہ تکلیف میری آئندہ زندگی پر کس طرح اثر انداز ہوگی۔

1933ء کے موسم بہار کی ایک خوش گوار صبح میرے والد کمرے میں آئے اور بتایا کہ ہم شکاگو واپس جا رہے ہیں۔ مجھے بعد میں والدہ سے معلوم ہوا کہ میرے والد اور ہیری چچا میں اختلافات ہوگئے تھے۔ شکاگو واپس آنے کے بعد زندگی اسی پرانی ڈگر پر چل پڑی۔ والد ایک بار پھر سڑک پر آگئے اور والدہ کو کسی ڈپارٹمنٹل اسٹور میں سیلز کلرک کی نوکری مل گئی۔ میرا کالج جانے کا خواب بکھر گیا کیونکہ ہمارے پاس فیس دینے کے لئے پیسے نہیں تھے۔ ڈینور سے واپس آنے کے بعد غربت کا احساس پہلے سے زیادہ بڑھ گیا۔ میں ساری عمر فارمیسی میں ڈیلیوری بوائے کے طور پر نہیں گزار سکتا تھا۔ اسی لئے خودکشی کرنے کا فیصلہ کیا تھا لیکن والد اپنی چرب زبانی کی بدولت مجھے اس فیصلے سے باز رکھنے میں کامیاب ہوگئے لیکن ان کے الفاظ کھوکھلے ثابت ہوئے۔ زندگی کی کتاب کے کئی ورق پلٹنے کے باوجود مجھے کوئی ایسی تحریر نظر نہیں آئی جو میرے لئے امید کی کرن ثابت ہوتی۔

ایک دن مجھے انکل سام کا خیال آیا اور میں ملازمت کے سلسلے میں ان کے پاس چلا گیا۔ انہوں نے مجھے چیک روم میں ہینگ بوائے کی جاب دے دی۔ یہ کام کچھ مشکل نہ تھا۔ ہوٹل میں آنے والے گاہک اپنے کوٹ اور ہیٹ خاتون اٹینڈنٹ کے حوالے کرتے جو انہیں ایک ٹوکن دیتی اور میں

ان چیزوں کو اسی نمبر کے ریک میں لٹکا دیتا تھا اور جب گاہک واپس جانے لگتے تو اسی ترتیب سے ان کی اشیا واپس کر دی جاتیں۔ اب میں اسکول سے واپس آنے کے بعد سیدھا بسمارک ہوٹل چلا جاتا جہاں میری ڈیوٹی شام 5 بجے سے رات بارہ بجے تک ہوتی تھی اور اس کے عوض مجھے تین ڈالر روزانہ ملتے جو میں والدہ کو دے دیتا۔

انہی دنوں مجھے بالکل اچانک ہی ایک اسکالرشپ مل گیا جس کے لئے میں نے ایک سال پہلے درخواست دی تھی۔ اس طرح میں اپنے خاندان کا پہلا فرد تھا جس نے کالج میں داخلہ لیا۔ میں نے سوچا کہ کیا کالج کے ساتھ ساتھ ہوٹل اور فارمیسی کی جاب بھی کرسکوں گا کیونکہ اسکالرشپ ملنے کے باوجود ہمیں پیسوں کی ضرورت تھی۔ لہٰذا داخلہ کی کارروائی مکمل ہونے کے بعد میں یونیورسٹی کے کیفے ٹیریا میں گیا اور وہاں مجھے بس بوائے کا کام مل گیا لیکن یہ بھی میری ضرورتیں پوری کرنے کے لئے ناکافی تھا۔ اسی ادارے کا ایک اخبار ڈیلی نارتھ ویسٹرن، کے نام سے شائع ہوتا تھا۔ میں اس کے ایڈیٹر سے ملا لیکن اس کے پاس کوئی جگہ خالی نہیں تھی۔ اس کے باوجود میں اسے قائل کرنے میں کامیاب ہوگیا کہ اس کے اخبار میں شوبزنس کا صفحہ بھی ہونا چاہئے جس کے لئے فلمی شخصیات کے انٹرویوز کرنے کی ذمّے داری میں نے سنبھال لی۔

اب میں بیک وقت کئی کام کر رہا تھا۔ ہوٹل میں ہینگ بوائے، فارمیسی میں ڈیلیوری بوائے، یونیورسٹی کیفے ٹیریا میں بس بوائے اور ڈیلی نارتھ ویسٹرن کے لئے انٹرویوز کرنے کے علاوہ میں نے یونیورسٹی میں بھی زیادہ سے زیادہ مضامین لئے تھے اس کے باوجود ایک تشنگی سی تھی۔ ایک ہفتہ بعد ڈیبیٹنگ ٹیم کے لئے ٹرائلز ہوئے تو میں بھی اس میں حصہ لینے کے لئے پہنچ گیا۔ دوسرے دن میرا نام منتخب ہونے والوں کی فہرست میں شامل تھا۔ یہ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ ڈیبیٹنگ ٹیم میں نئے لڑکوں کو منتخب نہیں کیا جاتا لیکن ٹرائل کے دوران میری غیر معمولی پرفارمنس کو دیکھتے ہوئے انہوں نے یہ اصول بدل دیا۔ اس طرح میں اپنی کتابِ زندگی کا ایک اور ورق پلٹنے میں کامیاب ہوگیا۔

اس تمام مصروفیت کے باوجود میں اپنے اندر ایک خلا محسوس کر رہا تھا۔ ذہن میں عجیب عجیب خیالات آتے رہتے تھے۔ جب میں یونیورسٹی میں دوسرے طالب علموں کو دیکھتا تو یہی سوچتا کہ یہ سب گمنامی کی زندگی گزار رہے ہیں۔ جب یہ مرجائیں گے تو کسی کو یاد بھی نہیں رہے گا کہ اس کرۂ ارض پر ان کا بھی وجود تھا لیکن میں اپنے لئے ایسا نہیں چاہتا تھا۔ میری خواہش تھی کہ کوئی ایسا کام کروں جس کی بدولت لوگ ہمیشہ مجھے یاد رکھیں۔ ہمارے لئے پیسوں کا حصول مشکل ہوتا جا رہا تھا۔ والدہ ہفتے میں چھ دن اسٹور پر کام کرتیں جبکہ میں پڑھائی کے ساتھ ساتھ ہر رات ہوٹل میں ہینگ بوائے کی ڈیوٹی کرتا اور ہر سنیچر کی سہ پہر ڈرگ اسٹور میں ڈیلیوری بوائے کے طور پر کام کرتا لیکن تنگی بڑھتی جا رہی تھی اور ہمارے لئے بعض اوقات کرایہ ادا کرنا بھی مشکل ہوجاتا۔

ایک رات میں نے والد اور والدہ کی باتیں سن لیں۔ والدہ کا خیال تھا کہ آمدنی بڑھانے کے لئے انہیں کوئی پارٹ ٹائم ملازمت کرلینی چاہئے۔ میں ان کی باتیں سن کر پریشان ہوگیا۔ وہ پہلے ہی سارے دن کی تھکی ہاری گھر آتیں۔ ہمارے لئے رات کا کھانا بناتیں اور اپارٹمنٹ کی صفائی کرتیں۔ اس سے زیادہ کام کرنا ان کے لئے ممکن نہ تھا۔ اب مجھے ہی کچھ کرنا تھا لہٰذا اگلی صبح میں نے نارتھ ویسٹرن کو الوداع کہہ دیا تاکہ کوئی کل وقتی ملازمت کرسکوں لیکن میری یہ کوشش بھی رائیگاں گئی۔ میں اشتہاری ایجنسیوں، اخبارات اور ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا لیکن میرے لئے کہیں کوئی جاب نہ تھی پھر میرا تبادلہ مینڈل برادرز کے ہوٹل واقع ہیرڈ شیری میں کردیا گیا۔ اسی دوران والد کو ایک پارٹ ٹائم ملازمت مل گئی۔ ایک دن میرے پاس مسٹر ینگ آئے اور انہوں نے مجھے ملازمت سے برطرفی کا پروانہ پکڑا دیا۔ وجہ یہ بتائی گئی کہ اخراجات کم کرنے کے لئے ملازمین کی چھانٹی کی جا رہی تھی۔ میں چونکہ سب سے آخر میں بھرتی ہوا تھا اس لئے میرا نمبر پہلے آگیا۔ مجھے یوں لگا جیسے کسی نے میرا دل مٹھی میں لے لیا ہو۔ اب مجھے فوری طور پر کوئی دوسری ملازمت تلاش کرنی تھی لیکن کون تھا جو میری مدد کرتا۔ پھر مجھے والد کے پرانے دوست چارلی فائن کا خیال آیا جو ایک بڑی مینوفیکچرنگ کمپنی میں اچھی پوسٹ پر تھا۔ اگلے روز والد مجھے اسٹیوارٹ وارنر فیکٹری لے گئے جو دنیا بھر میں آٹو موبائل گیئرز بنانے والی سب سے بڑی کمپنی تھی۔ چارلی نے مجھے اس شعبہ میں ملازمت دے دی جہاں چھوٹے آرڈرز پر کام ہوتا تھا جہاں مجھے آرڈر کے مطابق گیئرز کی تیاری سے لے کر انسپیکشن تک تمام مراحل کی نگرانی کرنا تھی۔ وہاں روزانہ چھ گیئرز تیار ہوتے تھے اور باقی وقت لوگ خالی بیٹھ کر گزارتے تھے۔ میں نے ایک مہینے میں پچاس فیصد پروڈکشن بڑھا دی اور اس کا صلہ مجھے چودہ ڈالر کے چیک کی صورت میں ملا۔

ایک دن کام سے گھر واپس آتے وقت میری نظر شکاگو ٹریبیون میں شائع ہونے والے ایک اشتہار پر گئی۔ پال

ایش نامی بینڈ لیڈر شوقیہ فنکاروں کا ایک مقابلہ کروا رہا تھا لہٰذا میں بھی سنیچر والے دن پال ایش سے ملنے شکاگو تھیٹر پہنچ گیا اور اس کے منیجر سے مقابلے میں حصہ لینے کی خواہش ظاہر کی۔ وہ بولا۔ ”ہمیں ایک اناؤنسر کی ضرورت ہے کیا تم یہ کام کر سکو گے؟“

”کیوں نہیں۔“ میں نے سر ہلا دیا حالانکہ مجھے اس بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔

”تمہارا نام؟“ اس نے رجسٹر کھولتے ہوئے کہا۔

”میں اپنا نام بتاتے بتاتے رک گیا۔ مجھے خیال آیا کہ شیکٹل ہرگز ہرگز شو بزنس کے لیے مناسب نہیں ہے۔ اکثر لوگ اس کے ہجے صحیح نہیں کر سکتے اور اس کی ادائیگی میں بھی انہیں مشکل پیش آتی ہے۔ میں نے اس اثنا میں کئی دوسرے ناموں کے بارے میں سوچا پھر میرے ذہن میں ایک نام ابھرا اور میری زبان سے بے اختیار نکلا۔ ”شیلڈن...... سڈنی شیلڈن۔“

”اوکے۔“ اس نے رجسٹر میں میرا نام لکھا اور بولا۔ ”اگلے سنیچر کو شام چھ بجے آ جانا، تمہیں اسٹوڈیو سے براڈ کاسٹ میں حصہ لینا ہے۔“

میں دوڑتے قدموں گھر آیا تاکہ انہیں یہ بریکنگ نیوز دے سکوں اور جب میں نے انہیں نئے نام کے بارے میں بتایا تو وہ مسکرائے بنا نہ رہ سکے۔ اگلے چند روز بڑی بے آرامی میں گزرے۔ میں یہ مقابلہ جیتنے کا متمنی تھا۔ ایسی صورت میں پال ایش مجھ سے معاہدہ کر سکتا تھا اور میں اس کے ساتھ امریکا کے مختلف شہروں میں گھومنے کے قابل ہو جاتا۔ ہفتے کی شام میں مقررہ وقت پر شکاگو تھیٹر پہنچ گیا۔ مجھے ایک چھوٹے سے اسٹوڈیو میں پہنچا دیا گیا، جہاں مقابلے کے دیگر شرکاء موجود تھے۔ ان میں کامیڈین، سنگر، پیانو بجانے والی لڑکی اور اکارڈین پلیئر سمیت سبھی طرح کے لوگ شامل تھے۔ ڈائریکٹر نے مجھے اشارے سے اپنے پاس بلایا اور ایک پرچہ پکڑاتے ہوئے بولا۔ جب میں اشارہ کروں تو تمہیں مائیکروفون پر آ کر یہ جملے بولنا ہوں گے۔“

میں نے ایک نظر پرچے پر ڈالی۔ ”لکھا تھا ”گڈ ایوننگ خواتین و حضرات! پال ایش اسپچر کانٹیسٹ میں خوش آمدید! میں ہوں آپ کا اناؤنسر سڈنی شیلڈن! ہم آپ کی خدمت میں ایک دلچسپ شو پیش کر رہے ہیں، ہمارے ساتھ رہیے۔“

پندرہ منٹ بعد ڈائریکٹر نے اسٹوڈیو میں لگی گھڑی کی طرف دیکھا اور مجھے بولنے کا اشارہ کیا۔ میں نے اپنی لائنیں بخوبی ادا کر دیں اور پھر ایک ایک کر کے دوسرے شرکاء کو بلاتا رہا۔ سبھی لوگوں نے عمدہ پرفارمنس دی لیکن آخر میں خاتون پیانسٹ نے معاملہ خراب کر دیا۔ میں نے جیسے ہی اس کا نام اناؤنس کیا، اس نے رونا شروع کر دیا اور کمرے سے باہر چلی گئی۔ اس کی وجہ سے تین منٹ کا خلا پیدا ہو گیا جو بحیثیت اناؤنسر مجھے پُر کرنا تھا۔ میں نے ایک بار پھر مائیکروفون پر بولنا شروع کر دیا۔ ”خواتین و حضرات! ہم سب اپنا کیریئر شوقیہ فنکار کے طور پر ہی شروع کرتے ہیں اور وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ پروفیشنل بنتے چلے جاتے ہیں۔“

میں اپنی دُھن میں بولے جا رہا تھا کہ ڈائریکٹر نے مجھے خاموش رہنے کا اشارہ کیا۔ میرا خیال تھا کہ میں نے شو کو بچا لیا ہے۔ اس پر وہ میرا شکر گزار ہو گا اور شاید اس کے صلے میں کوئی جاب آفر کر دے لیکن وہ غصے سے بولا۔ ”تم نے پندرہ سیکنڈ سے زیادہ لے لیے، تم سے یہ سب بولنے کے لیے کس نے کہا تھا؟“

میرا ریڈیو کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہو گیا تھا لیکن میں نے ہمت نہ ہاری اور ملازمت کے حصول کے لیے مختلف ریڈیو اسٹیشن کے چکر لگاتا رہا پر کوئی کامیابی نہیں ہوئی۔ میں نے ایک دن گھر میں بیٹھے بیٹھے پیانو پر ایک دُھن موزوں کی اور اس کے لیے ایک گانا بھی لکھا۔ بسمارک ہوٹل کے آرکسٹرا لیڈر فل لیونٹ سے میری تھوڑی بہت جان پہچان تھی۔ میں نے وہ گانا اسے دکھایا تو وہ بولا۔

”اگر تمہیں اعتراض نہ ہو تو ہم اسے اپنے آرکسٹرا کے ساتھ استعمال کر سکتے ہیں۔“

اگلی شام جب میں ہوٹل میں آنے والے مہمانوں کے کوٹ اور ہیٹ مقررہ جگہ پر لٹکا رہا تھا۔ میں نے ہوٹل کے آرکسٹرا پر اپنا گانا سنا اور میرے پورے بدن میں سنسنی دوڑ گئی کیونکہ یہ آرکسٹرا پورے ملک میں نشر کیا جا رہا تھا اس لیے یقیناً بہت سے لوگوں نے اسے سنا ہو گا۔ گھر پہنچ کر میں باتھ روم سے فارغ ہوا تھا کہ فل لیونٹ کا فون آ گیا۔ ”وہ کہہ رہا تھا۔ ”شیلڈن! ہارمس میوزک کمپنی کے ایک پبلشر نے تمہارا گانا نیویارک میں سنا ہے، وہ اسے استعمال کرنا چاہتا ہے۔ کیا تم ابھی اور اسی وقت یہاں آ سکتے ہو۔ وہ تمہارا انتظار کر رہا ہے۔“

میں نے مختصر الفاظ میں والد کو اپنی ساری کہانی بتائی اور ان کی کار لے کر ہوٹل کے لیے روانہ ہو گیا۔ فل لیونٹ آرکسٹرا ترتیب دینے میں مصروف تھا لیکن مجھے بتایا گیا کہ کوئی شخص منیجر کے کمرے میں میرا انتظار کر رہا ہے۔ میں منیجر کے کمرے میں داخل ہوا تو اپنے سامنے ایک خوش پوش شخص کو بیٹھا پایا جس کی عمر پچاس کے لگ بھگ ہو گی۔ مجھے دیکھتے ہی

وہ بولا۔ ”میرا نام برنٹ ہے اور میں ٹی بی ہارمس کے لیے کام کرتا ہوں۔ انہوں نے تمہارا گانا سنا اور اب اسے ریکارڈ کرنا چاہتے ہیں لیکن اس میں ایک مسئلہ ہے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ تمہارے گانے کو متعارف کروانے کے لیے بڑا نام نہیں ہے۔ وہ چاہتے ہیں کہ کوئی اہم شخصیت اس گانے پر کام کرے۔“

میری سمجھ میں نہیں آیا کہ اس کی بات کا کیا جواب دوں کیونکہ میں کسی ایسے شخص کو نہیں جانتا تھا لیکن برنٹ نے میری مشکل حل کر دی اور کہنے لگا۔ ”ہوریک ہیڈ، ڈریک ہوٹل میں آرکسٹرا بجاتا ہے اگر تم اسے اپنا گانا دکھاؤ تو شاید وہ اس پر کام کرنے کے لیے تیار ہو جائے۔“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور اسی وقت ہوریک سے ملنے ڈریک ہوٹل کی جانب چل دیا۔ میں نے اسے برنٹ سے ہونے والی گفتگو سے آگاہ کیا۔ اس نے میرا گانا دیکھا اور پچاس پرسنٹ پر میرے ساتھ کام کرنے پر آمادہ ہو گیا۔ دوسرے دن برنٹ نے مجھے بتایا کہ ہوریک اس گانے کے پانچ ہزار ڈالر مانگ رہا ہے جبکہ اس کی کمپنی کسی نئے گانے کے لیے اتنی بڑی رقم کبھی نہیں دیتی۔ جب یہی بات میں نے ہوریک کو بتائی تو وہ بولا۔ ”تم بے فکر رہو اگر ہماری بات چیت کامیاب نہ ہو سکی تو میں خود اس گانے کو ریکارڈ کروں گا۔“

ہوریک نے ٹھیک ہی کہا تھا۔ اگلے چند ہفتوں تک وہ میرے گانے کو اپنے شو میں مسلسل بجاتا رہا لیکن اسے ریکارڈ کرنے کی نوبت نہیں آئی۔

اس کے باوجود میں نے ہمت نہیں ہاری اور مزید بارہ گانے لکھ ڈالے۔ میرا خیال تھا کہ نیویارک بھیجنے کے لیے یہ تعداد کافی ہو گی۔ میری اتنی استطاعت نہ تھی کہ ذاتی طور پر نیویارک جا کر متعلقہ لوگوں سے مل سکتا۔ والدہ کا کہنا تھا کہ ڈاک سے بھیجے گئے ان گانوں کو کوئی بھی دیکھنا گوارا نہیں کرے گا۔ میں نے انہیں بتایا کہ شکاگو کی تین نوکریاں چھوڑ کر میرے لیے نیویارک جانا ممکن نہیں بہرحال سب لوگوں کی یہی رائے تھی کہ مجھے نیویارک ضرور جانا چاہیے اور جب تک میرے گانے نہیں بکتے مجھے وہیں کوئی ملازمت کرنا ہو گی۔

میں ساڑھے چار دن کا سفر طے کر کے بس کے ذریعے نیویارک پہنچا تو میری جیب میں صرف تیس ڈالر تھے۔ میں نے فوری طور پر وائی ایم سی اے کا رخ کیا جہاں مجھے چار ڈالر ہفتہ پر رہنے کے لیے جگہ مل گئی۔ مجھے فوری طور پر ملازمت چاہیے تھی۔ میں نے اس سلسلے میں وہاں کے منیجر سے رابطہ کیا تو اس نے مجھے بتایا کہ آر کے او جیفرسن میں ایک جگہ خالی ہے۔ میں دوسرے دن تھیٹر پہنچ گیا ان کے پاس اُشر کی جگہ خالی تھی جو سینما ہال کے اندھیرے میں لوگوں کو ان کی نشستوں تک پہنچا سکے۔ منیجر نے کچھ سوالات کیے اور چودہ ڈالر فی ہفتہ پر ملازم رکھ لیا۔ میری ڈیوٹی ہفتے میں چھ دن شام ساڑھے چار بجے سے نصف شب تک تھی۔ میرے لیے یہ اوقات بڑے مناسب تھے۔ اس طرح مجھے صبح میں میوزک کمپنیوں کے چکر لگانے کا موقع مل سکتا تھا۔

دوسرے دن صبح میں ٹی بی ہارمس کے دفتر پہنچ گیا۔ اپنا تعارف کروانے کے بعد ان سے گانے کے بارے میں بات کی تو وہ بولے۔ ”وہ گانا بہت زیادہ سنا جا چکا ہے اور ہوریک ہیڈ اسے مسلسل بجا رہا ہے اگر تمہارے پاس کوئی نئی چیز ہو تو لے آؤ۔“

دوسرے دن صبح نو بجے میں ایک بڑا سا لفافہ لے کر کمپنی کے دفتر پہنچ گیا۔ مسٹر ناسکر نے وعدہ کیا کہ مجھے زیادہ انتظار نہیں کرنا پڑے گا۔ جیسے ہی انہیں موقع ملا وہ ان گانوں کو دیکھ لیں گے۔ انہوں نے مجھے اگلے روز آنے کے لیے کہا۔ چوبیس گھنٹے بعد میری قسمت کا فیصلہ ہونے والا تھا۔ میں ایک ایک پل گن کر گزار رہا تھا۔ صبح ہوتے ہی میں نے پھر کمپنی کے دفتر کا رخ کیا۔ مسٹر ناسکر نے لفافہ میری طرف بڑھاتے ہوئے کہا ”تم نے گانے تو بہت اچھے لکھے ہیں لیکن بدقسمتی سے یہ ویسے نہیں جن کی ہمیں فی الحال ضرورت ہے۔“

میں نے اپنی زندگی میں اس سے زیادہ مایوس کن جملہ نہیں سنا تھا۔ میں نے وہ لفافہ اٹھایا اور سردہ قدموں سے چلتا ہوا دفتر سے باہر آ گیا۔ دن کا بقیہ حصہ میں نے دوسرے دفاتر کے چکر لگانے میں گزار دیا لیکن ہر جگہ مجھ سے ایک ہی سوال کیا گیا۔

”کیا اس سے پہلے تمہارا کوئی گانا ریکارڈ ہوا ہے۔“

”نہیں سر لیکن میں......“

”ہم کسی نئے نغمہ نگار سے کام نہیں کرواتے۔ جب تمہارا کوئی گانا ریکارڈ ہو جائے تب آنا۔“

ایک روز میں نے وائی ایم سی اے کی لابی میں ایک شخص کو کچھ لکھتے دیکھا۔ اس کے انداز سے ہی ظاہر ہو رہا تھا کہ وہ کوئی نغمہ نگار ہے۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا کہ کیا وہ کوئی گانا لکھ رہا ہے۔ اس نے اثبات میں سر ہلایا تو میں نے اس کی طرف ہاتھ بڑھاتے ہوئے کہا ”میرا نام سڈنی شیلڈن ہے اور میں بھی گانے لکھتا ہوں۔“

اس نے گرم جوشی سے مصافحہ کرتے ہوئے کہا۔ ”میں سڈنی روز نیتھل ہوں۔“

یہ ایک طویل دوستی کا آغاز تھا۔ وہ صبح ہم دونوں نے

باتیں کرتے ہوئے گزار دی اور یوں لگ رہا تھا کہ ہم دونوں ایک دوسرے کو جنم جنم سے جانتے ہیں۔ بعد میں ہم دونوں نے مل کر کچھ گانے لکھے جن کی تعریف تو بہت کی گئی لیکن کسی سے کوئی معاہدہ نہیں ہوا۔ اس دوران سڈنی کو ایک ملازمت مل گئی۔ اس نے تجویز پیش کی کہ کیوں نہ ہم دونوں کسی بہتر جگہ شفٹ ہو جائیں اور اس طرح ہم ایک ہفتہ بعد 32 ویں اسٹریٹ پر واقع گرانڈ یونین ہوٹل چلے گئے۔ جہاں ہمیں دو بیڈ روم اور ایک لونگ روم پر مشتمل سوٹ مل گیا جو وائی ایم سی اے کے ایک چھوٹے سے کمرے کے مقابلے میں بہت بہتر تھا۔

انہی دنوں میری ملاقات میکس رچ نامی شخص سے ہوئی۔ اس نے میرے گانے سنے اور دوسرے دن دس بجے مجھے اپنے دفتر آنے کی دعوت دی۔ میں نے سڈنی روز تھل کو اس ملاقات کے بارے میں بتایا تو وہ بہت خوش ہوا۔ ”مبارک ہو! میکس رچ ایک بڑا نام ہے اور وہ تمہارے لئے کچھ بھی کرسکتا ہے۔“

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ میں بستر پر لیٹا یہی سوچتا رہا کہ کیا واقعی ایسا ممکن ہے۔ میکس رچ کو کیا پڑی ہے کہ وہ مجھ جیسے غیر معروف شخص سے لکھوائے گا جس کا ابھی تک ایک بھی گانا ریکارڈ نہیں ہوا ہے۔ اس نے مجھے محض ہمدردی میں بلایا ہے اور نتیجہ مایوسی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ دوسرے دن دس بجے میں میکس رچ سے ملنے کے بجائے شکاگو جانے والی بس میں سوار ہو چکا تھا۔

گھر کے حالات ویسے ہی تھے جیسا میں چھوڑ گیا تھا۔ میں نے دوبارہ بسمارک چیک روم میں ملازمت کرلی اور دن کے اوقات میں ایک ہوٹل میں کار پارکنگ کا کام کرنے لگا۔ ایک دن ہمارے فیملی فرینڈ چارلی فائن اور اس کی بیوی ویرا ڈنر پر آئے۔ ویرا نے بتایا کہ وہ اگلے ہفتے کیلی فورنیا جارہی ہے۔ کیلی فورنیا، ہالی ووڈ۔ میرے ذہن میں ایک جھماکا سا ہوا۔ یوں لگا جیسے اچانک ہی ایک نیا دروازہ کھل گیا ہے۔ میں نے ویرا کے ساتھ جانے کی خواہش ظاہر کی تو وہ تیار ہوگئی۔ والدہ نے اس شرط پر مجھے جانے کی اجازت دی کہ اگر تین ہفتے تک ہالی ووڈ میں کوئی کام نہ ملا تو میں واپس آجاؤں گا۔ میں نے بخوشی یہ شرط قبول کرلی کیونکہ مجھے امید تھی کہ ہالی ووڈ میں کوئی نہ کوئی کام ضرور مل جائے گا۔

”پانچ دن بعد میں، ویرا اور اس کی بیٹی کارل کے ساتھ کار ڈرائیو کرتا کیلی فورنیا جارہا تھا۔ سیکرامینٹو پہنچ کر میں نے ان دونوں سے اجازت مانگی اور ایک رات سستے ہوٹل میں قیام کرنے کے بعد بس کے ذریعے سان فرانسسکو روانہ ہو گیا جہاں سے مجھے لاس اینجلس کے لیے دوسری بس ملتی۔ جب وہاں پہنچا تو میرے پاس ایک سوٹ کیس اور پچاس ڈالر تھے۔ مجھے بورڈنگ ہاؤس میں ساڑھے چار ڈالر ہفتہ کے حساب سے ایک کمرا مل گیا جس میں صبح کا ناشتا بھی شامل تھا۔ یہ بورڈنگ ہاؤس ہالی ووڈ کے علاقے میں سن سیٹ بلے وارڈ سے چند بلاک کے فاصلے پر تھا۔ وہاں میری ملاقات گریسی سیڈل نامی ایک چالیس سالہ پرکشش خاتون سے ہوئی۔ اس نے مجھے وہاں مقیم کئی لوگوں سے ملوایا۔ وہ سب ہالی ووڈ میں اپنی قسمت آزمانے آئے ہوئے تھے۔ ان سب کا یہی خیال تھا کہ نئے لوگوں کو یہاں کام ملنا بہت مشکل ہے۔ پروڈیوسر نئے ٹیلنٹ کے نہ ملنے کا رونا روتے ہیں لیکن کسی باہر والے شخص کو اسٹوڈیو کے گیٹ سے اندر جانے کی اجازت نہیں۔

میں کئی روز تک مختلف اسٹوڈیو کے چکر لگاتا رہا لیکن اندر جانے میں کامیاب نہ ہوسکا۔ والدہ کی دی ہوئی مہلت گزرتی جارہی تھی اور اس کے ساتھ پیسے بھی تیزی سے کم ہو رہے تھے۔ مجھے جب کہیں نہ جانا ہوتا تو اپنے کمرے میں بیٹھ کر کہانیاں لکھا کرتا پھر ایک دن گریسی نے اعلان کیا کہ اب اس کرائے کے ساتھ مفت ناشتا نہیں ملے گا۔ ہم میں سے کوئی بھی کچھ کہنے کی ہمت نہ کرسکا کیونکہ وہ پہلے ہی بہت کم کرایہ لے رہی تھی۔ اسی شام گریسی نے باتوں باتوں میں بتایا کہ اس کی بہن کو ایم جی ایم میں ریڈر کی ملازمت مل گئی ہے۔ میں نے اس سے اس کام کی تفصیل جاننا چاہی تو اس نے بتایا کہ پروڈیوسرز کے پاس اتنا وقت نہیں ہوتا کہ وہ پوری کتاب یا ڈراما پڑھیں۔ اس لیے وہ یہ کام ریڈر کے حوالے کردیتے ہیں جو انہیں کہانی کا خلاصہ لکھ کر دیتے ہیں۔ اگر پروڈیوسر کو وہ خلاصہ پسند آجائے تو پھر وہ مکمل کتاب یا ڈراما پڑھتا ہے۔

میں نے انہی دنوں ایک کتاب پڑھی تھی اور تین منٹ بعد اپنے کمرے میں بیٹھا اس کا خلاصہ ٹائپ کر رہا تھا۔ دوسرے دن میں نے اس کی کاپیاں کروائیں اور چھ مختلف اسٹوڈیو میں بھیج دیں۔ میرا خیال تھا کہ دو تین روز میں کہیں نہ کہیں سے جواب ضرور آئے گا۔ چوتھے روز والدہ کا خط ملا۔ انہوں نے شکاگو واپسی کے لیے بس کا ٹکٹ بھیجا تھا جو آنے والی اتوار تک کے لیے کارآمد تھا۔ جمعرات تک ساری امیدیں دم توڑ چکی تھیں۔ میں نے گریسی کو بتا دیا تھا کہ اتوار کی صبح میری واپسی ہے۔ اس مشفق اور مہربان خاتون نے مجھے تسلی دی اور کہا۔ ”خواب دیکھنا کبھی نہ چھوڑنا۔“

دوسرے دن علی الصباح ٹیلی فون کی گھنٹی بجی۔ ایک ایکٹر نے فون اٹھایا اور مخاطب کی آواز سن کر مجھ سے بولا۔

”سڈنی! تمہارا فون ہے۔“

میں نے لپک کر ریسیور اس کے ہاتھ سے لے لیا۔ دوسری طرف سے ایک خاتون بول رہی تھی۔ ”میں ڈیوڈ سیلزنک کی سیکریٹری اینا ہوں۔ مسٹر سیلزنک ایک ناول کا خلاصہ کروانا چاہتے ہیں لیکن اس وقت ہمارا ریڈر موجود نہیں ہے اور ہمیں شام چھ بجے تک ان چار سو صفحات کے ناول کا خلاصہ چاہیے جو عموماً تیس صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ کیا تم شام چھ بجے تک یہ کام کرسکتے ہو؟“

یہ ناممکنات میں سے تھا کہ میں اسٹوڈیو جا کر چار سو صفحات کا ناول پڑھتا پھر کسی اچھے سے ٹائپ رائٹر پر اس کا تیس صفحوں کا خلاصہ ٹائپ کرتا اور شام چھ بجے تک ان کے حوالے کر دیتا لیکن میری زبان سے بے اختیار نکل گیا۔ ”جی ہاں، یہ کام ہو جائے گا۔“

”ٹھیک ہے تم کلورسٹی میں واقع ہمارے اسٹوڈیو سے یہ کتاب لے سکتے ہو۔“

میں نے گھڑی پر نظر ڈالی۔ ساڑھے نو بج رہے تھے اور کلورسٹی تک ڈیڑھ گھنٹے کا راستہ تھا۔ اگر میں گیارہ بجے تک اسٹوڈیو پہنچ جاتا تو میرے پاس یہ کارنامہ انجام دینے کے لیے سات گھنٹے تھے لیکن میں اپنے ذہن میں ایک منصوبہ تیار کرچکا تھا۔

استقبالیہ پر بیٹھی ایک لڑکی سے میں نے اپنی آمد کا مقصد بیان کیا تو اس نے اپنی دراز میں سے ایک کتاب نکال کر میری طرف..... بڑھا دی۔ میرے پاس اتنا وقت نہیں تھا کہ اس سے سیلزنک یا اس کی سیکریٹری کے بارے میں پوچھتا۔ میں وہاں سے سیدھا ایم جی ایم اسٹوڈیوز پہنچا اور سڈنی سنگر سے ملنے کی خواہش ظاہر کی جو میرے کزن سیمور کی سابقہ بیوی تھی اور ایم جی ایم میں خاتون ڈائریکٹر ڈوروتھی آرزنیر کی سیکریٹری کے طور پر کام کر رہی تھی۔ وہ مجھے وہاں دیکھ کر حیران ہوگئی اور جب میں نے اسے اپنی آمد کا مقصد بتایا تو اس کی حیرانی مزید بڑھ گئی۔ وہ یہ یقین کرنے کے لیے تیار ہی نہ تھی کہ شام چھ بجے تک یہ کام مکمل ہوسکتا ہے لیکن جب میں نے اسے اپنے طریقہ کار کے بارے میں بتایا تو وہ میری مدد کرنے پر رضامند ہوگئی۔ ہم آمنے سامنے بیٹھ گئے۔ اس نے ٹائپ رائٹر سنبھالا اور میں کتاب پر نظریں دوڑانے لگا۔ جہاں مجھے کوئی قابل ذکر بات نظر آتی میں اسے لکھوا دیتا۔ وقت تیزی سے گزر رہا تھا اور چار بجے تک ہم آدھی کتاب کر پائے تھے۔ میں نے اپنی رفتار اور بڑھا دی۔ سڈنی سنگر کی انگلیاں بھی تیزی سے ٹائپ رائٹر پر چل رہی تھیں۔ چھ بجنے میں دس منٹ پر ہم اپنا کام ختم کرچکے تھے۔ جب اس نے آخری صفحہ میری جانب بڑھایا تو میں تشکر آمیز لہجے میں بولا۔ ”میں تمہاری کیا خدمت کرسکتا ہوں؟“

”ایک لنچ ہی کافی ہوگا۔“ وہ مسکراتے ہوئے بولی۔

میں نے کاغذات لفافے میں ڈالے اور وہاں سے دوڑ لگا دی۔ اینا میرا انتظار کر رہی تھی۔ میں نے اسے کتاب اور ٹائپ شدہ صفحات پکڑائے تو وہ ان پر ایک نظر ڈالتے ہوئے بولی۔ ”ویری گڈ، تم نے وقت پر کام مکمل کرلیا۔“ یہ کہہ کر اس نے ایک لفافہ میری طرف بڑھا دیا جس میں دس ڈالر تھے۔ میں نے اس کا شکریہ ادا کیا اور بولا۔ ”جب بھی میری ضرورت ہو تو میں حاضر ہوں۔“

”سوری۔“ اس نے بے رخی سے کہا۔ ”ہمارا مستقل ریڈر کل واپس آجائے گا۔ ویسے بھی مسٹر سیلزنک باہر کے لوگوں سے کام کروانا پسند نہیں کرتے۔ تمہیں غلطی سے بلا لیا گیا تھا۔۔۔ کیونکہ تم ہمارے مستقل ریڈرز کی فہرست میں نہیں ہو۔“

میرا ایک اور خواب ٹوٹ گیا تھا۔

میں اپنے کمرے میں آکر سوچنے لگا کہ اس ناکامی کو کامیابی میں کیسے تبدیل کیا جائے۔ اس کے لیے بھی ضرور کوئی نہ کوئی راستہ ہوگا پھر میرے ذہن میں ایک خیال آیا اور میں نے والدہ کو فون کرکے بتایا کہ مجھے کام مل گیا ہے اور اب کچھ دنوں بعد گھر آؤں گا۔ دوسرے دن بس اسٹیشن گیا اور اپنا ٹکٹ کیش کروالیا۔ بقیہ دن میں نے مختلف اسٹوڈیوز کو خط لکھنے میں گزارا اور سیلزنک کے کام کا حوالہ دیتے ہوئے انہیں اطلاع دی کہ اگر وہ اس نوعیت کا کام کروانا چاہتے ہیں تو میں اس کے لیے تیار ہوں۔

دو دن بعد مجھے ٹیلی فون کالز آنا شروع ہوگئیں۔ ”ٹوئنٹیتھ سنچری فوکس والے مجھ سے ایک ناول کا خلاصہ لکھوانا چاہ رہے تھے جب کہ پیرا ماؤنٹ کے پاس ایک ڈراما تھا۔ مجھے ہر خلاصے کے پانچ سے دس ڈالر ملتے تھے اور میں دن میں زیادہ سے زیادہ ایک خلاصہ لکھ سکتا تھا لیکن یہ کوئی باقاعدہ کام نہیں تھا۔ مجھ سے صرف اسی صورت میں رابطہ کیا جاتا جب ان کے پاس کام زیادہ ہوتا جب کہ مجھے مستقل آمدنی کی ضرورت تھی پھر خدا نے میری سن لی اور مجھے یونیورسل اسٹوڈیو میں اسٹاف ریڈرز کی جاب مل گئی۔ میری تنخواہ سترہ ڈالر فی ہفتہ مقرر ہوئی۔ میری ڈیوٹی ہفتہ میں چھ دن صبح نو سے چھ بجے تک تھی۔ یونیورسل اسٹوڈیو میں بی کلاس فلمیں بنائی جاتی تھیں۔ اسٹوری ایڈیٹر ٹارزن سیڈ نے مجھے کام کی نوعیت سمجھا دی۔ مجھے درجنوں کے حساب سے

خاموش فلموں کے اسکرپٹ پڑھنے تھے اور ان میں سے بولتی فلموں کے لیے مناسب کہانیوں کا انتخاب کرنا تھا۔ تقریباً تمام ہی اسکرین پلے انتہائی فضول تھے لیکن مجھے ہر ہفتے سترہ ڈالر کا چیک مل رہا تھا اور میں ان سے بھی زیادہ بڑے اسکرپٹ پڑھنے کے لیے تیار تھا۔ میں نے والدین کو بتا دیا کہ قدرت مجھ پر مہربان ہوگئی ہے اور اب میں ہالی ووڈ میں مستقل جاب کر رہا ہوں۔

خوشی کا یہ وقفہ بہت مختصر ثابت ہوا۔ ٹھیک ایک ماہ بعد یونیورسل اسٹوڈیو بک گیا اور نئی انتظامیہ نے بہت سے دوسرے لوگوں کے ساتھ مجھے بھی فارغ کر دیا۔ میں نے ایک بار پھر اخبارات میں "ضرورت ہے" کے اشتہارات دیکھنا شروع کر دیے۔ اس دوران میں نے چھوٹے موٹے کام کیے لیکن کہیں بھی نہ ٹک سکا۔ اس کے ساتھ ساتھ میں اسٹوڈیوز سے بھی رابطے میں رہا اور جب ان کے پاس کام کا بوجھ زیادہ ہوتا تو اس کا کچھ حصہ مجھے بھی مل جاتا لیکن کبھی کبھی ملنے والے یہ دس ڈالر میرے لیے ناکافی تھے۔ ایک بار پھر قسمت کی دیوی مجھ پر مہربان ہوئی اور مجھے ٹوئنٹیتھ سنچری فوکس اسٹوڈیو میں تیس ڈالر ہفتہ کی جاب مل گئی۔

وہاں کا ماحول یونیورسل سے قدرے مختلف تھا اور معیار پر کوئی سمجھوتا نہیں کیا جاتا تھا۔ پروڈکشن ہیڈ ڈیرل زینوک انتہائی ذہین شخص تھا اور اسٹوڈیو میں بننے والی فلموں کے ہر شعبے سے اپنے آپ کو منسلک رکھتا تھا۔ اس کے دل میں لکھنے والوں کی بڑی قدر تھی اور وہ کہا کرتا تھا کہ کامیاب فلم کا انحصار تین باتوں پر ہوتا ہے۔ کہانی، کہانی اور کہانی۔ اس لیے لکھنے والوں کو معلوم ہونا چاہیے کہ اس کی کتنی اہمیت ہے۔ اس اسٹوڈیو میں بارہ اسٹاف ریڈرز تھے اور ان میں سے زیادہ تر اسٹوڈیوز کے اعلیٰ عہدیداروں کے رشتے دار تھے۔ ایک دن مجھے بتایا گیا کہ اب میں صرف وہ ناول یا ڈرامے پڑھوں گا جن کی مسٹر زینوک کو ضرورت ہوگی۔ یہ میرے لیے ایک اور خوشی کی خبر تھی۔ اس طرح مجھے وہ تمام بہترین ناول اور ڈرامے پڑھنے کا موقع مل سکتا تھا جو مسٹر زینوک کی خدمت میں پیش کیے جاتے۔

مسٹر زینوک ہمیشہ دوسرے اسٹوڈیوز پر سبقت لے جانے کی کوشش میں رہتے۔ اس لیے بعض اوقات مجھے رات گئے تک کام کرنا پڑتا لیکن میں اس سے لطف اندوز ہو رہا تھا۔ انہی دنوں کچھ لوگوں نے ریڈرز گلڈ کے نام سے ایک تنظیم بنائی اور مجھے اس کا نائب صدر منتخب کیا گیا۔ اسٹوڈیو مالکان سے مذاکرات کے نتیجے میں اسٹاف ریڈرز کی کم از کم بنیادی تنخواہ ساڑھے اکیس ڈالر فی ہفتہ مقرر کروانے میں کامیاب ہو گئے۔ گریسی کے بورڈنگ ہاؤس میں ایک نیا رائٹر بین رابرٹس آیا اور ہم دونوں مل کر کام کرنے کے بارے میں سوچنے لگے۔ چند ہی دنوں میں ہم نے ایک مکمل کہانی لکھ ڈالی اور اسے مختلف اسٹوڈیوز میں بھیج دیا لیکن کہیں سے کوئی جواب نہ آیا۔ اس طرح ہم دونوں نے مزید تین چار کہانیاں لکھیں لیکن کوئی نتیجہ برآمد نہیں ہوا پھر میرے ذہن میں ایک مسٹری کا خیال آیا جسے ہم نے "ڈینجرس ہالی ڈے" کے نام سے لکھا۔

ایک ہفتے بعد بین رابرٹس نے اطلاع دی کہ اس کہانی کو ٹیڈ رچمنڈ نے پانچ سو ڈالر میں خرید لیا ہے۔ وہ پی آر سی میں کام کرتا ہے۔ یہ ایک بہت ہی چھوٹا اسٹوڈیو تھا لیکن ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں تھی۔ ہمیں ہالی ووڈ میں داخل ہونے کے لیے ایک راستہ چاہیے تھا۔ اس وقت مجھے رے کروسیٹ کا خیال آیا جس نے مجھ سے وعدہ کیا تھا کہ ایک نہ ایک دن وہ مجھے ضرور کسی اسٹوڈیو سے متعارف کروائے گا۔ میں نے اسے ٹیلی فون کر کے ٹیڈ رچمنڈ اور پی آر سی کے بارے میں بتایا تو اس نے ان دونوں کے بارے میں لاعلمی ظاہر کی۔ مجھے بڑی حیرت ہوئی کہ ہالی ووڈ کا ٹاپ ایجنٹ اس اسٹوڈیو کے بارے میں نہیں جانتا۔ اس نے پوچھا کہ کیا میں نے ڈیل فائنل کر لی ہے۔ میں نے اسے بتایا کہ ابھی ابتدائی بات چیت ہوئی ہے۔ اس نے کہا کہ وہ تھوڑی دیر بعد مجھے فون کرے گا۔ دو گھنٹے بعد اس نے بتایا کہ میری کہانی پیرا ماؤنٹ نے ایک ہزار ڈالر میں خرید لی ہے اور ہمیں اس کا اسکرین پلے بھی نہیں لکھنا ہوگا۔ ہالی ووڈ میں یہ رواج عام تھا کہ اگر کسی اسٹوڈیو کو یہ معلوم ہو جائے کہ فلاں کہانی کوئی دوسرا اسٹوڈیو خرید رہا ہے تو وہ اس کی زیادہ قیمت لگاتے تھے لیکن مجھ میں ٹیڈ رچمنڈ کو انکار کرنے کی ہمت نہ تھی۔ رے نے مجھے سمجھایا کہ یہ کوئی غیر معمولی بات نہیں، اگر میں ٹیڈ رچمنڈ کو ساری صورتِ حال بتا دوں تو وہ مان جائے گا۔"

میں نے رچمنڈ کو کئی بار فون کیا لیکن اس سے رابطہ نہ ہو سکا۔ شام کو جب بات ہوئی تو میں اس پر برس پڑا۔

"میں کم از کم چھ مرتبہ تمہیں فون کر چکا ہوں لیکن تم نے میری کسی کال کا جواب نہیں دیا۔"

"سوری میں مصروف تھا۔"

"کم از کم تمہیں فون تو کرنا چاہیے تھا۔ تمہاری طرف سے جواب نہ ملنے پر ہم نے وہ کہانی پیرا ماؤنٹ کو بیچ دی۔"

"لیکن میں تو اس کو شیڈول بھی کر چکا ہوں اور......"

"پریشان ہونے کی ضرورت نہیں۔" میں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے کہا۔ "ہمارے پاس اس سے بھی اچھی ایک اور کہانی ہے۔ اس میں ڈراما، رومانس، سسپنس اور ایکشن سبھی کچھ ہے، تم چاہو تو اس پر بات ہو سکتی ہے۔"

"ٹھیک ہے تم کل صبح آٹھ بجے ایلیکس کے دفتر میں ملو۔" ایلیکس پی آر سی کا ایگزیکٹو ہیڈ تھا۔

میں نے بین کو ساری صورتِ حال بتائی اور ایک ایسی کہانی لکھنے بیٹھ گئے جس میں ڈراما، رومانس، سسپنس اور ایکشن سبھی کچھ ہونا چاہیے تھا۔ صبح پانچ بجے تک ساؤتھ آف پناما کا اسکرپٹ تیار ہو چکا تھا۔ میں نے دو گھنٹے کی نیند لی اور صبح سات بجے غسل اور ناشتے سے فارغ ہو کر ایلیکس کے دفتر کی جانب روانہ ہو گیا۔ وہ دونوں بے چینی سے میرا انتظار کر رہے تھے۔ میں نے اسکرپٹ کی دو کاپیاں کروا لی تھیں۔ انہوں نے ورق الٹنا شروع کیے۔ کہیں کہیں وہ رک کر لائنوں پر نظر ڈالتے۔ اسکرپٹ ختم کرنے کے بعد ایلیکس بولا۔

"واقعی بہت اچھی کہانی ہے۔"

ٹیڈ رچمنڈ نے گرہ لگائی۔ "تم ٹھیک کہہ رہے ہو۔ یہ "ڈینجرس ہالی ڈے" سے بہتر ہے۔"

"ہم اس کہانی کے پانچ سو ڈالر دیں گے اور تمہیں اس کا اسکرین پلے بھی لکھنا ہوگا۔"

مجھے اپنی سماعت پر یقین نہیں آیا۔ یہ معجزہ نہیں تو اور کیا تھا۔ ہم چوبیس گھنٹوں میں دو کہانیاں بیچنے میں کامیاب ہو چکے تھے۔

میں نے فوکس کی ملازمت چھوڑ دی اور بین کے ساتھ مل کر پوری تن دہی سے کہانیاں لکھنے میں مصروف ہو گیا۔ اس دوران ہم نے مزید تین فلموں کی کہانیاں فروخت کیں جن میں سے ہر ایک کے عوض پانچ سو ڈالر ملے جو ہم دونوں نے آپس میں بانٹ لیے۔ اب ہمیں اسکرین رائٹر تسلیم کر لیا گیا تھا۔ اس کے بعد ہم نے لیونارڈ فیلڈ نامی پروڈیوسر کے لیے ایک کہانی لکھی جس کا معاوضہ چھ سو ڈالر ملا۔ فلم کامیاب رہی اور لیونارڈ نے ہم دونوں سے پانچ سو ڈالر فی ہفتہ پر کنٹریکٹ کر لیا۔ ہم نے اس کے ساتھ ایک سال تک کام کیا۔ کنٹریکٹ ختم ہونے پر میں اپنی فیملی سے ملنے شکاگو چلا آیا۔

رچرڈ نے گرامر اسکول پاس کر لیا تھا اور ہائی اسکول میں داخلہ لینے کی تیاری کر رہا تھا۔ والدین کی لڑائیاں ہمیشہ کی طرح جاری تھیں۔ اس لیے میں رچرڈ کو اپنے ہمراہ ہالی ووڈ لے آیا۔ اب میں اس قابل تھا کہ اس کے اخراجات برداشت کر سکتا۔ اس کے تین ماہ بعد میرے والدین میں طلاق ہو گئی۔ میرے خیال میں یہ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا۔ تھوڑے ہی عرصے بعد والدہ نے فون کر کے بتایا کہ اس نے کھلونے بنانے والے ایک شخص مارٹن لیب سے شادی کر لی ہے اور اس کے چند روز بعد میرے والد نے بھی اپنی دوسری شادی کی خبر سنائی۔

جنگ شروع ہو چکی تھی۔ میں نے لازمی بھرتی کے قانون کے تحت ائرفورس میں درخواست دے دی۔ میری نظر میں معمولی سی خرابی تھی اس لیے لڑاکا جہاز کے پائلٹ کی ٹریننگ کے لیے منتخب نہ ہو سکا۔ انہوں نے مجھے سول ائر پٹرول میں بھیج دیا۔ میری ٹریننگ رچ فیلڈ نامی ایک قصبہ میں ہوئی تھی جس کی آبادی ساڑھے چھ ہزار نفوس پر مشتمل تھی۔ میں نے فیری پلین کے پائلٹ کے طور پر ٹریننگ شروع کر دی جو تین ماہ تک جاری رہی۔ اس کے بعد ایڈوانس ٹریننگ کا مرحلہ شروع ہونا تھا لیکن فلائٹ اسکول میں جگہ نہ ہونے کے سبب ہمیں یہ کہہ کر واپس بھیج دیا گیا کہ ضرورت پڑنے پر کسی وقت بھی بلایا جا سکتا ہے۔

اصولاً مجھے اپنے بلاوے کا انتظار کرنا چاہیے تھا لیکن خالی بیٹھنا میری سرشت میں شامل نہیں تھا چنانچہ میں نے کیلی فورنیا میں اپنے ایجنٹ لوئیس ہچر کو فون کر کے بتایا کہ میں نیویارک میں ہوں اور سیکنڈری فلائنگ اسکول شروع ہونے تک فارغ ہوں۔ اس نے مجھے اپنے پارٹنر جولیس زگر سے ملنے کا مشورہ دیا جو نیویارک آفس کا سربراہ تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اوپیرا اسٹار جین کپورا اور اس کی بیوی مارٹا ایگرتھ، براڈوے میں ایک شو کرنا چاہتے ہیں۔ دی میری وڈو ایک مشہور اوپیرا تھا جو دنیا بھر میں کئی جگہ دکھایا جا چکا تھا۔ اب وہ اس میں کچھ تبدیلیاں کر کے براڈوے میں دکھانا چاہ رہے تھے۔ میرا نیویارک میں قیام عارضی تھا اور نہ ہی اس سے پہلے میں نے براڈوے کے لیے کچھ لکھا تھا اس کے باوجود میں ان دونوں میاں بیوی سے ملنے چلا گیا۔ وہ فوراً ہی کام شروع کرنا چاہ رہے تھے۔ مجھے فوراً ہی بین رابرٹس کا خیال آ گیا۔ ہم دونوں مل کر یہ ڈراما شروع کر سکتے تھے اور اگر مجھے درمیان میں چھوڑ کر جانا پڑ جاتا تو بین اسے مکمل کر لیتا۔ یہی سوچ کر میں نے وہ ڈراما لکھنے پر رضامندی ظاہر کر دی۔

بین نیوجرسی میں مختصر دورانیے کی ٹریننگ فلمیں بنا رہا تھا۔ اس کی واپسی شام تک ہوتی۔ ڈنر کے بعد ہم کام کرنے بیٹھتے اور رات ایک دو بجے تک لکھتے رہتے۔ جب میں نے پہلا ایکٹ لکھ کر پروڈیوسر کو دکھایا تو وہ اسے پسند نہیں آیا البتہ

ڈرامے کے ڈائریکٹر اور کوریوگرافر نے اس کی بہت تعریف کی۔ میرا حوصلہ بڑھ گیا اور میں نے دوسرا ایکٹ لکھنا شروع کر دیا۔ مجھے یہ بات بالکل سمجھ نہیں آئی کہ ڈرامے کی پروڈیوسر یولینڈا کو ہم سے کیا بیر تھا۔ وہ ہماری لکھی ہوئی ہر چیز کو مسترد کر دیا کرتی تھی جب کہ ڈائریکٹر، کوریوگرافر اور دیگر سبھی لوگ ہمارے کام کو پسند کررہے تھے۔ ایک دن ریہرسل کے دوران کوریوگرافر نے مجھے بتایا کہ اس کا دوست ونٹون فریڈے ایک ڈراما پروڈیوس کر رہا ہے اور اس سلسلے میں مجھ سے ملنے کا خواہش مند ہے۔ فریڈے، براڈوے کا بہت مشہور پروڈیوسر تھا اور اس کے کریڈٹ پر کئی کامیاب ڈرامے تھے۔ گو کہ وہ گے بولٹن سے ڈرامے لکھواتا تھا لیکن وہ انگریز تھا اور اسے اس ڈرامے کے لیے امریکن رائٹر کی ضرورت تھی۔ اس نے مجھے گے بولٹن سے ملوایا۔ میرا خیال تھا کہ شاید وہ مجھے پسند نہ کرے لیکن اس کا رویہ بے حد دوستانہ تھا۔ اس نے اس بات پر خوشی کا اظہار کیا کہ ہم دونوں مل کر کام کریں گے۔ ہوٹل واپس آ کر میں نے یہ خوش خبری بین رابرٹس کو سنائی تو وہ حیران ہوئے بغیر نہ رہ سکا۔ بس مجھے ایک ہی دھڑکا لگا ہوا تھا کہ کہیں فلائٹ اسکول سے بلاوا نہ آ جائے۔ میں چاہتا تھا کہ وہ وقت آنے سے پہلے میں یہ دونوں ڈرامے مکمل کرلوں۔

میری مصروفیت بڑھ گئی تھی۔ صبح میں ایک ڈراما لکھتا اور سہ پہر میں دوسرا پھر رات کو بین کے ساتھ مل کر اس کی نوک پلک درست کرتا۔ ایک دن جیک پاٹ کی ریہرسل کے دوران ڈائریکٹر رائے ہارگریو نے مجھے بتایا کہ اس کا کوئی دوست ایک میوزیکل ڈراما کرنا چاہ رہا ہے جس کے لیے اسے کسی رائٹر کی تلاش ہے۔ میں پہلے ہی دو ڈرامے لکھ رہا تھا اور کسی بھی وقت میرا بلاوا آ سکتا تھا۔ اس کے باوجود میں نے رضامندی ظاہر کر دی۔ اس پروڈیوسر کا نام رچرڈ کولمار تھا جس کی شادی معروف کالم نگار ڈوروتھی کل گیلن سے ہوئی تھی۔ رچرڈ چاہتا تھا کہ میں ڈوروتھی کے ساتھ مل کر یہ ڈراما لکھوں، جب میں نے اسے بین کے بارے میں بتایا تو اس نے کوئی اعتراض نہیں کیا، اس طرح ہم بیک وقت تین ڈرامے لکھ رہے تھے۔

میں نے ابھی تک یونی فارم پہن رکھی تھی اور فلائٹ اسکول سے بلاوے کا انتظار کر رہا تھا لیکن بہت زیادہ مصروف ہو جانے کی وجہ سے میری خواہش تھی کہ مجھے دو تین ماہ کی مہلت مل جائے لیکن تقدیر مجھ پر مسکرا رہی تھی۔ رچرڈ سے ملنے کے ٹھیک دو گھنٹے کے بعد مجھے ایک فون کال موصول ہوئی۔

”میں میجر بیکر بول رہا ہوں، تمہیں کل صبح نو بجے برونکس میں واقع آرمی ہیڈ کوارٹر میں کیپٹن برنس کو رپورٹ کرنی ہے۔“

میرا دل ڈوبنے لگا۔ اس سے زیادہ برا وقت میری زندگی میں کبھی نہیں آیا تھا۔

دوسرے دن میں نے کیپٹن برنس کو رپورٹ کی تو اس نے مجھے بتایا کہ جنگ کی موجودہ صورت حال کے مطابق انہیں صرف فائٹر پائلٹ کی ضرورت ہے اور کمزور نظر ہونے کی وجہ سے میں اس کے لیے اہل نہیں ہوں۔ وارٹریننگ اسکول بند کرنے کا فیصلہ کر لیا گیا اور مجھے یہ اختیار حاصل ہے کہ انفنٹری یونٹ میں رپورٹ کروں یا مجھے ڈرافٹ بورڈ میں واپس بھیج دیا جائے۔

میرے لیے ڈرافٹ بورڈ میں واپس جانا بہتر تھا کیونکہ انہیں کسی دوسری جگہ بھیجنے میں کم از کم ایک مہینا لگتا اور اس دوران میں بین کے ساتھ مل کر اپنے ڈراموں پر اچھا خاصا کام کر سکتا تھا لیکن صرف تین دن بعد ہی میرا بلاوا آ گیا۔ ایک بار پھر میرا طبی معائنہ ہوا اور اس بار کمر کی تکلیف کے باعث مجھے ان فٹ قرار دے دیا گیا۔ میری یونی فارم اتر گئی اور میں ایک بار پھر سویلین بن گیا۔ اب میں ڈرامے لکھنے کے لیے آزاد تھا۔

4 اگست 1943ء کو میجسٹک میں ”دی میری وڈو“ کا افتتاح ہوا اور اسے انتہائی کامیاب ڈراما قرار دیا گیا۔ یہ ڈراما براڈوے میں ایک سال تک دکھایا گیا اور اس کے بعد مزید دو سال تک مختلف شہروں میں چلتا رہا۔ 13 جنوری 1944ء کو میرا دوسرا ڈراما ”جیک پاٹ“ ایلون تھیٹر میں اوپن ہوا۔ اسے بھی نقادوں نے بے حد پسند کیا۔ اب مجھے شدت سے ڈریم وتھ میوزک کا انتظار تھا۔ بین اور میں اس ڈرامے پر خوب محنت کر رہے تھے۔ میں دن میں ڈوروتھی کے ساتھ بیٹھ کر لکھتا اور شام کو بین میرے پاس ہوٹل چلا آتا جہاں ہم رات گئے تک کام کرتے رہتے، اس ڈرامے کا افتتاح بھی بڑی شان وشوکت سے ہوا لیکن بدقسمتی سے پہلے ہی شو میں... کچھ ایسے واقعات پیش آئے جن کی وجہ سے ڈرامے کی ساکھ بری طرح متاثر ہوئی۔ پہلے ڈرامے کی ہیروئن ویرا زورینا جو عالمی شہرت یافتہ بیلے ڈانسر تھی، اپنے رقص کے دوران پھسل گئی اور اس کے دو سین بعد جب ویرا زورینا اور ڈرامے کا ہیرو رونالڈ گراہم اسٹیج کے وسط میں کھڑے رومانی مکالمے ادا کر رہے تھے کہ ہال کی بجلی چلی گئی۔ شاید ہی براڈوے کی تاریخ میں ایسا ہوا ہو۔ یہ ڈراما صرف چار ہفتے ہی چل سکا لیکن اس دوران ہمیں مزید تین ڈرامے مل گئے۔

کچھ ہی دنوں بعد مجھے ایک اجنبی کا فون موصول ہوا جس نے اپنا نام بش جکیٹ بتایا۔ اس نے مجھے دوسرے روز لنچ پر مدعو کیا۔ وہ ہنگری کا رہنے والا تھا اور خود بھی ڈرامے لکھتا تھا۔ اس کے پاس ایک آئیڈیا تھا جس پر وہ مجھ سے ڈراما لکھوانا چاہ رہا تھا۔ میں نے بین سے بات کی تو اس نے معذرت کرلی۔ وہ اپنی کمپنی کے ساتھ کہیں اور جا رہا تھا چنانچہ مجھے اکیلے ہی یہ کام کرنا پڑا۔ ہم نے چار مہینے میں یہ ڈراما مکمل کرلیا۔ فیمیل لیڈ کے لیے ہم نے پیگی کو نکلین کو چنا البتہ میل لیڈ کے انتخاب میں دشواری پیش آ رہی تھی۔

ایک دن ایک نوجوان ایکٹر آیا۔ میں نے اسے اسکرپٹ کے پانچ صفحات پڑھنے کے لیے دیے۔ اس نے پیگی کے ساتھ مل کر دو منٹ میں وہ لائنیں پڑھ ڈالیں۔ میں نے رسمی انداز میں اس کا شکریہ ادا کیا تو وہ مایوس ہو کر جانے لگا۔ میں نے اسے آواز دے کر بلایا اور کہا کہ اسے سلیکٹ کر لیا گیا ہے۔ وہ نوجوان کوئی اور نہیں بلکہ مشہور زمانہ کرک ڈگلس تھا۔

پہلے یہ ڈراما واشنگٹن ڈی سی میں اسٹیج کیا گیا اور لوگوں نے ہماری توقعات کے مطابق اسے پسند کیا لیکن نیویارک آنے سے پہلے پروڈیوسر نے اس کا نام بدل دیا۔ 31 جنوری 1945ء کو براڈوے میں اس کا پہلا شو ہوا لیکن حیرت انگیز طور پر نقادوں نے اسے سخت تنقید کا نشانہ بنایا۔ میں صدمے کی وجہ سے تین دن ہوٹل میں بند رہا اور اس دوران میں نے کوئی ٹیلی فون اٹینڈ نہیں کیا۔ میرے کانوں میں نقادوں کے الفاظ گونج رہے تھے شاید وہ ٹھیک ہی کہہ رہے تھے۔ میں براڈوے کے ڈرامے لکھنے کے لیے ایک غیر موزوں شخص تھا اور مجھے جو کامیابیاں ملیں وہ محض تقدیر کا کھیل تھا۔ میں نے ہالی ووڈ واپس جانے کا فیصلہ کرلیا۔

مجھے بیورلے ہلز میں ایک چھوٹا سا اپارٹمنٹ کرائے پر مل گیا جس میں ایک بیڈ روم، لونگ روم اور کچن وغیرہ سب کچھ تھا۔ میں نے ولیم مورس ایجنسی سے معاہدہ کرلیا۔ انہوں نے مجھے بتایا کہ ایڈی کنیٹر کو ایک اسکرپٹ کی تلاش ہے وہ اس وقت تک نصف درجن فلمیں بنا چکا تھا اور اس کا شمار ملک کے مقبول کامیڈینز میں ہوتا تھا۔ اس نے مجھے بتایا کہ اسٹوڈیو والے اس کے تین اسکرپٹ مسترد کر چکے ہیں اور اب اس کے پاس بالکل وقت نہیں ہے اگر آئندہ تین ماہ میں اسکرپٹ منظور نہ ہوا تو اسٹوڈیو سے اس کا معاہدہ ختم ہو جائے گا۔

میں نے اسکرپٹ پر کام شروع کر دیا اور مقررہ وقت ختم ہونے سے تین دن پہلے میں یہ اسکرپٹ مکمل کر چکا تھا۔ دوسرے دن یہ اسکرپٹ منظور ہو گیا۔ اب مجھے اس کی نوک پلک درست کرنا تھی لیکن یہ اسکرپٹ مجھے واپس نہیں ملا۔ ایک دن میرے ایجنٹ نے مجھے فون کیا اور بولا ”لگتا ہے انہوں نے تمہیں نظرانداز کر دیا ہے۔ میری اطلاع کے مطابق کنیٹر اپنے رائٹرز سے اس اسکرپٹ کی نوک پلک ٹھیک کروا رہا ہے۔“

میں تقدیر کے اس مذاق پر مسکرانے کے سوا کچھ نہ کر سکا۔

دوسرے دن ایجنٹ سام نے فون کر کے بتایا کہ میرے ایک اسکرپٹ کے لیے دو آفرز آئی ہیں۔ ان میں سے ایک والٹر وینگر ہے اور دوسرا ڈیوڈ سیلزنک، یہ نام سنتے ہی میرا دل زور زور سے دھڑکنے لگا اور مجھے وہ دن یاد آ گیا جب میں نے سیلزنک کے لیے دس ڈالر میں ایک ناول کا خلاصہ لکھا تھا۔ وینگر نے چالیس ہزار ڈالر اور سیلزنک نے پینتیس ہزار ڈالر کی پیشکش کی تھی۔ میں نے آنکھ بند کر کے سیلزنک کی آفر قبول کر لی۔ دوسری صبح میری سیلزنک سے ملاقات ہوئی تو اس نے کہانی کی تعریف کی اور بولا۔ ”مجھے یقین ہے کہ تمہارا اسکرین پلے اس سے بھی بہتر ہوگا۔“

مجھے آر کے اسٹوڈیو میں ایک کمرا مل گیا اور میں نے فوراً ہی اسکرپٹ پر کام شروع کر دیا۔ اسی دوران میری ملاقات جین ہارڈنگ سے ہوئی وہ ایک خوش شکل اور ذہین لڑکی تھی۔ ہم دونوں نے باقاعدگی سے ملنا شروع کر دیا اور صرف دو مہینے بعد شادی کر لی۔ میرے پاس ہنی مون منانے کے لیے وقت نہیں تھا کیونکہ اسٹوڈیو والوں نے کاسٹنگ شروع کر دی تھی اور مجھ سے اصرار کیا جا رہا تھا کہ جلد از جلد مسودہ ان کے حوالے کر دوں۔

ایک مہینے بعد ہی مجھے اور جین کو اندازہ ہو گیا کہ ہم سے غلطی سرزد ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کی شخصیتوں اور دلچسپیوں میں بہت زیادہ تضاد تھا۔ اس کے بعد ہم نے آئندہ نو ماہ تک اس شادی کو بچانے کی کوشش کی اور بالآخر علیحدگی کا فیصلہ کر لیا۔ جب طلاق ہوئی تو اس روز میں نے زندگی میں پہلی بار شراب کو ہاتھ لگایا۔

زندگی میں خوشی اور غم ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ بیوی سے طلاق ہو جانے کے باوجود میں نے اپنے کام پر توجہ جاری رکھی۔ ایک دن سیلزنک نے مجھے خوش خبری سنائی کہ کیری گرانٹ کو میرا اسکرپٹ پسند آیا اور وہ فلم میں کام کرنے پر تیار ہو گیا ہے۔ سیلزنک نے یہ بھی بتایا کہ اس نے شیرلے ٹیمپل

اور میرنا لوئے کو بھی اس فلم میں کاسٹ کرلیا ہے۔ شوٹنگ شروع ہونے میں ایک ہفتہ باقی تھا کہ کیری گرانٹ نے بتایا کہ ابھی تک سیکنڈ میل لیڈ کے لیے کسی ایکٹر کا انتخاب نہیں ہو سکا ہے۔ اس وقت تک نصف درجن ایکٹرز کا ٹیسٹ ہو چکا ہے لیکن کوئی بھی اس کیریکٹر کے لیے موزوں نہیں ہے پھر وہ اچانک بولا۔ ”کیا تم اس کے لیے تیار ہو؟“

میں نے کبھی ایکٹنگ کے بارے میں نہیں سوچا تھا لیکن اس وقت بے اختیار میرے منہ سے ہاں نکل گیا۔ کیری مجھے اپنے ساتھ سیٹ پر لے گیا جہاں میرا ٹیسٹ سین ہونا تھا۔ اس سین میں صرف میں اور کیری تھے۔ کیمرا اسٹارٹ ہوا اور ڈائریکٹر نے مجھے بولنے کا اشارہ کیا۔ میں کچھ دیر تک کھڑا کیری کو دیکھتا رہا پھر نہ جانے مجھے کیا ہوا، کچھ کہے بغیر مڑا اور اسٹیج سے باہر آ گیا۔ اس طرح میرا ایکٹنگ کیریئر شروع ہونے سے پہلے ہی ختم ہوگیا۔

فلم کی ریلیز سے پہلے اس کا نام بدل کر ”دی بیچلر اینڈ دی بوبی سوکسر“ رکھ دیا گیا۔ اس فلم کی نمائش چھ ہزار نشستوں والے ریڈیو سٹی میوزک ہال میں ہوئی جو اس وقت دنیا کا سب سے بڑا تھیٹر تھا۔ یہ فلم سات ہفتے تک زیر نمائش رہی اور تھیٹر کی تاریخ میں سب سے زیادہ کمانے والی فلم کہلائی۔ مجھے آسکر کے لیے نامزد کیا گیا۔ ہالی ووڈ میں ایک شاندار کیریئر میرا منتظر تھا۔

چند روز بعد ایجنٹ سام نے مجھے فون کیا اور کہا کہ میں نے تمہارے لیے ایم جی ایم سے بات کرلی ہے، وہ تم سے پرائیڈ اینڈ پریجوڈائس لکھوانا چاہتے ہیں۔ اس کے لیے تمہارے پاس دو ہفتے کا ٹائم ہے۔ ایم جی ایم کے ساتھ کام کرنے کا تصور ہی بڑا خوش کن تھا۔ اس وقت میری عمر انتیس سال تھی اور میں ایم جی ایم میں داخل ہو چکا تھا۔ مجھے ایک چھوٹا کمرا اور معاونت کے لیے ایک سیکریٹری کی خدمات دی گئیں۔ ابھی میں نے کام شروع بھی نہیں کیا.... تھا کہ ایجنٹ سام میرے پاس آیا اور بولا کہ آرتھر فریڈ مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ اس شخص میں بلا کی خود اعتمادی تھی اور اس کے ساتھ کام کرنا بہت مشکل تھا۔ اس کے پاس ایک اسکرپٹ تھا جس کے پلاٹ سے وہ مطمئن نہیں تھا۔ میں نے اسے بتایا کہ پرائیڈ اینڈ پریجوڈائس پر کام کررہا ہوں تو وہ بضد ہوگیا کہ مجھے اسکرپٹ پر کام کرنا ہوگا۔ مجھے اس کی پیشکش قبول کرنے میں کچھ تامل تھا لیکن جب اس نے ارونگ برلن کا نام لیا تو میں نے رضامندی ظاہر کردی۔ جب ہم نے ”ایسٹر پریڈ“ پر کام شروع کیا تو اس وقت ارونگ برلن کی عمر ساٹھ برس تھی لیکن اس میں نوجوانوں جیسا جوش و جذبہ پایا جاتا تھا۔ جب یہ اسکرپٹ تکمیل کے آخری مرحلے پر پہنچا تو ایجنٹ سام نے یہ خوش خبری سنائی کہ ایم جی ایم والے مجھ سے ایک طویل المیعاد معاہدہ کرنا چاہتے ہیں۔ میں خوشی سے اچھل پڑا۔ یہ تو ہالی ووڈ کے ہر رائٹر کا خواب تھا۔ سام نے کہا کہ وہ تمام معاملات طے کرکے مجھے مطلع کر دے گا۔

میں نے اسکرپٹ مکمل کرکے آرتھر فریڈ کے حوالے کیا اور اس کے ردِعمل کا انتظار کرنے لگا۔ ایک ہفتے بعد اس نے مجھے اپنے دفتر میں بلایا وہاں جوڈی گارلینڈ اور جین کیلی بھی موجود تھے۔ ان سب لوگوں نے میرے اسکرپٹ کی تعریف کی اور شوٹنگ کا پروگرام طے پا گیا لیکن دو دن پہلے والی بال کھیلتے ہوئے گرین کیلی کا بازو اتر گیا لہٰذا اس کی جگہ فریڈ آسٹیر کو لے لیا گیا۔ ایسٹر پریڈ زبردست کامیابی سے ہمکنار ہوئی اور اس نے متعدد ایوارڈ جیتے۔ اس کی کامیابی کا اندازہ یوں لگایا جاسکتا ہے کہ گزشتہ ستاون سالوں سے ہر ایسٹر کے موقع پر یہ فلم ٹیلی وژن سے دکھائی جاتی ہے۔

فروری 1948ء میں مجھے موشن پکچرز اکیڈمی ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔ لوگ مبارکبادیں دے رہے تھے لیکن مجھے ایوارڈ ملنے کی قطعی امید نہیں تھی کیونکہ مقابلے پر وہ رائٹرز تھے جنہوں نے بہت اچھی اور کامیاب فلمیں لکھی تھیں۔ میرا ارادہ تو ایوارڈ کی تقریب میں شرکت کرنے کا بھی نہ تھا لیکن دوستوں کے اصرار پر وہاں چلا گیا۔ میں اپنی سیٹ پر سکون سے بیٹھا تقریب سے لطف اندوز ہورہا تھا کہ اچانک میرا نام پکارا گیا۔ ”دی بیچلر اینڈ دی بوبی سوکسر“ لکھنے پر میں بہترین رائٹر کے ایوارڈ کا حق دار قرار پایا تھا۔ کچھ دیر کے لیے میں اپنی نشست پر منجمد ہوگیا پھر جب میرا نام دوبارہ پکارا گیا تو بے یقینی کے عالم میں چلتا ہوا اسٹیج تک پہنچ گیا۔ ایوارڈ وصول کرنے کے بعد جب مجھ سے کچھ بولنے کے لیے کہا گیا تو میری سمجھ میں نہیں آیا کہ کیا کہوں۔ میں نے بڑی مشکلوں سے چند الفاظ ادا کیے اور واپس اپنی نشست پر آ گیا۔

ایک ہفتہ بعد ایجنٹ سام میرے پاس آیا اور اس نے بتایا کہ وہ بینی تھو کے دفتر سے آرہا ہے جو میٹرو کا ڈیل میکر تھا۔ وہ مجھ سے سات سال کا معاہدہ کرنا چاہ رہے تھے اور وہ سب کچھ دینے کے لیے تیار تھے جو ہم ان سے طلب کرتے۔ اس وقت مجھے آسکر کی طاقت کا صحیح معنوں میں اندازہ ہوا۔ معاہدے میں یہ شق بھی شامل تھی کہ مجھے سال میں ایک مرتبہ تین مہینے کی چھٹی ملے گی اور اس دوران میں کوئی بھی کام

کرنے کے لیے آزاد ہوں گا۔ میں نے سال گزرنے کے بعد یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا اور بحری جہاز کے ذریعے لندن کے لیے روانہ ہوگیا۔ میرا قیام سیوائے ہوٹل میں تھا۔ جنگ ختم ہو چکی تھی لیکن لندن ابھی تک اس کے اثرات کی لپیٹ میں تھا۔ کچھ دن لندن میں گزارنے کے بعد پیرس چلا گیا۔ وہاں کی خوبصورت شامیں زندگی بھر نہیں بھلائی جاسکتی تھیں لہٰذا میں نے ہر سال یورپ کی سیر کرنے کا فیصلہ کرلیا۔

تین مہینے دیکھتے ہی دیکھتے گزر گئے۔ میں واپس ہالی ووڈ آ گیا۔ اسی سال اگست میں ڈور شیری نے آر کے او سے استعفا دے دیا اور ایم جی ایم میں ہیڈ آف پروڈکشن بن کر آ گیا۔ میرا سابقہ باس اب موجودہ باس بن چکا تھا۔ میں نے ایک نئے اسکرپٹ ”نینسی گوز ٹو ریو“ پر کام شروع کردیا تھا۔ اسی دوران ایک ایجنٹ نے مجھے ایک خوبصورت سویڈش اداکارہ سے متعارف کروایا۔ میں اس کا فرضی نام انگرڈ رکھے لیتا ہوں۔ ملاقاتیں بڑھنے لگیں اور ہمارے بیچ رومانس شروع ہوگیا۔ چند روز ہی گزرے ہوں گے کہ صبح چار بجے کے قریب ڈور بیل بجی میں نے دروازہ کھولا تو ایک اجنبی ہاتھ میں گن لیے اندر چلا آیا اور مجھے جان سے مارنے کی دھمکی دینے لگا۔ اس کا کہنا تھا کہ میں اس کی بیوی سے عشق لڑا رہا ہوں۔ میں نے اسے بڑی مشکل سے ٹھنڈا کیا اور یقین دلایا کہ میں کبھی بھی شادی شدہ عورتوں سے افیئر نہیں چلاتا۔ پانچ منٹ بعد وہ مجھے اپنی کہانی سنا رہا تھا۔ وہ رائٹر تھا اور اسے ہالی ووڈ میں کام کی تلاش تھی۔ میں نے وعدہ کیا کہ اس کے لیے میٹرو میں بات کروں گا۔ وہ میرا شکریہ ادا کرکے چلا گیا۔ میں نے دوبارہ سونے کی کوشش کی لیکن کچھ دیر بعد ایک بار پھر دروازے کی گھنٹی بجی، اس مرتبہ اس کی بیوی انگرڈ آئی تھی۔ لگتا تھا کہ اسے بری طرح مارا گیا ہے۔ اس کا چہرہ سوجا ہوا تھا اور ہونٹوں سے خون بہہ رہا تھا۔ میں نے اسے گھر میں بلا لیا اور ڈاکٹر کو فون کرکے اس کی مرہم پٹی کروائی۔ شام ہوتے ہی انگرڈ وہاں سے چلی گئی اور پھر میں نے اسے کبھی نہیں دیکھا۔

1948ء میں مجھے مشہور زمانہ کلاسک چارلی ز آنٹ پر براڈوے کے لیے ڈراما لکھنے کی آفر ہوئی۔ میں نے ڈور شیری کو اس بارے میں بتایا تو اس نے منع کردیا اور اس کے بجائے مجھے اینی گیٹ یور گن کا اسکرین پلے لکھنے کی پیش کش کردی۔ یہ ڈراما براڈوے پر پہلے ہی کامیاب ہو چکا تھا اور تین سال تک مسلسل دکھایا گیا تھا۔ اس سے زیادہ پُرکشش بات یہ تھی کہ مجھے ایک بار پھر اپنے پسندیدہ ارونگ برلن کے ساتھ کام کرنے کا موقع مل رہا تھا لہٰذا میں نے ڈور شیری کی پیشکش قبول کرلی۔ یہ فلم 1950ء میں ریلیز ہوئی تو اخبارات اس کی تعریفوں سے بھرے ہوئے تھے۔ اس فلم پر مجھے رائٹرز گلڈ آف امریکا اسکرین ایوارڈ ملا۔ اسی سال ویرائٹی نے سب سے زیادہ آمدنی والی فلموں کی فہرست شائع کی جس میں میری لکھی ہوئی تینوں فلمیں ”دی بیچلر اینڈ دی بوبی سوکسر، ایسٹر پریڈ اور اینی گیٹ یور گن“ شامل تھیں۔

اس کے بعد کینیتھ میکینا نے مجھے ایک اور فلم ”رچ ینگ اینڈ پریٹی“ لکھنے کے لیے کہا۔ اس فلم میں جین پاول، ڈینئل ڈیریکس اور وینڈیل کورے جیسے اداکار شامل تھے۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر بے حد کامیاب رہی۔ اس کے بعد یکے بعد دیگرے دو فلمیں اور لکھیں۔

”جسٹ دِس ونس“ میرے کیریئر کی ایک یادگار فلم ہے۔ ہم اس کے مرکزی کردار کے لیے کیری گرانٹ کو لینا چاہ رہے تھے لیکن اس نے انکار کردیا۔ ایک سال بعد جب فلم ریلیز ہوئی تو اس نے فون پر مجھے کہا۔ ”سڈنی، تمہارا خیال درست تھا۔ مجھے یہ فلم کرنی چاہیے تھی۔ فروری 1952ء میں کینیتھ میکینا نے براڈوے کے ایک مشہور ڈرامے Remains to be seen کا اسکرین پلے لکھنے کے لیے کہا۔ میں نے تین ماہ میں اسکرپٹ مکمل کرلیا۔ پروڈیوسرز ایک اہم کردار کے لیے لوئیس کیلرن کو کاسٹ کرنا چاہ رہے تھے لیکن اس نے رول چھوٹا ہونے کی وجہ سے انکار کردیا۔ اسے منانے کی ذمّے داری مجھے سونپی گئی اور میں نے اسے کسی نہ کسی طرح راضی کرلیا۔ بدقسمتی سے یہ فلم زیادہ کامیاب نہ ہوسکی۔

ایک روز ڈور شیری نے مجھے اپنے آفس میں بلایا اور کمپنی میں پروڈیوسر کی جاب آفر کی۔ میں فوری طور پر کوئی جواب نہ دے سکا اور اپنے کمرے میں آ کر سوچنے لگا کہ ابھی میری عمر صرف چونتیس سال ہے، میں ایک آسکر جیت چکا ہوں اور اب دنیا کے سب سے بڑے موشن پکچرز اسٹوڈیو نے مجھے پروڈیوسر کی جاب آفر کردی ہے۔ میری جگہ کوئی دوسرا ہوتا تو خوشی کے مارے پاگل ہو جاتا لیکن میں سوچ میں پڑ گیا کیونکہ مجھے پروڈکشن کے بارے میں کچھ بھی معلوم نہیں تھا۔ ڈور شیری سے غلطی ہوگئی ہے، میں اسے منع کردوں گا۔

اس رات مجھے دیر تک نیند نہیں آئی۔ بارہ بجے کے قریب بستر سے اٹھا اور ٹہلنے کے لیے باہر چلا گیا۔ مجھے وہ رات یاد آئی جب میرے والد مجھے ساتھ لے کر ٹہلنے کے لیے

لے گئے تھے اور کہا تھا۔ ''ہر دن ایک مختلف صفحے کی مانند ہوتا ہے جب تک تم صفحہ نہ پلٹ لو، نہیں جان سکتے کہ اس میں کیا لکھا ہے۔ میں نہیں چاہتا کہ تم اتنی جلدی کتاب بند کر دو اور مستقبل میں پیش آنے والے واقعات سے لطف نہ اٹھا سکو۔''

صبح اٹھ کر میں نے فیصلہ کر لیا کہ کم از کم ایک کوشش ضرور کرنی چاہیے اگر ناکام ہو گیا تو دوبارہ لکھنا شروع کر دوں گا۔ مجھے ایک بڑا دفتر دے دیا گیا اور وہاں معلوم ہوا کہ ایم جی ایم کا پروڈیوسر بننا کتنا آسان ہے۔ اسٹوری ڈپارٹمنٹ ... پروڈیوسر کو کتابوں اور ڈراموں کے خلاصے بھیجتا اور پروڈیوسر ان میں سے اپنی مرضی کا خلاصہ منتخب کر لیتا۔ اسی طرح اسے رائٹرز، ڈائریکٹرز اور ایکٹرز کی فہرستیں فراہم کی جاتیں تاکہ وہ اپنی فلم کے لیے مناسب لوگوں کا انتخاب کر سکے۔ مجھے روزانہ کئی ڈرامے، اسکرین پلے اور اوریجنل کہانیاں موصول ہوتیں لیکن ان میں سے کسی نے مجھے متاثر نہیں کیا۔ میں نے سوچ رکھا تھا کہ بحیثیت پروڈیوسر میری پہلی فلم ایسی ہونی چاہیے جس پر میں فخر کر سکوں۔

انہی دنوں میری ملاقات ایک ایکٹریس جورجا کرٹ رائٹ سے ہوئی۔ وہ بہت ہی خوبصورت نقوش کی مالک تھی اور اس کی براؤن آنکھوں میں ذہانت کی چمک تھی۔ میں نے اسے ڈنر پر مدعو کیا تو وہ تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد تیار ہو گئی۔ اس کے بعد ہم روز ملنے لگے اور یوں لگا جیسے میں اس سے محبت کرنے لگا ہوں۔ تین مہینے بعد میں نے اسے شادی کی پیشکش کر دی۔ میں نے والدہ اور مارٹی کو ہالی ووڈ بلایا تاکہ وہ بھی جورجا سے مل سکیں۔ والدہ نے اس سے ڈھیروں سوالات کیے اور آخر میں فیصلہ سنا دیا کہ وہ میرے لیے بہترین بیوی ثابت ہوگی۔ ہم دونوں نے یورپ میں ہنی مون منانے کا پروگرام بنایا۔ اس سے پہلے میں بیورلے ہلز میں ایک مکان خرید چکا تھا۔ میں نے تین ماہ کی سالانہ چھٹی لی اور ہنی مون منانے یورپ کے لیے روانہ ہو گیا۔ ہم لندن، پیرس، روم اور وینس گئے۔ ہنی مون سے واپس آنے کے بعد میں ایک بار پھر اپنے کام کے لیے تازہ دم ہو چکا تھا۔

1952ء میں مجھے ''ڈریم وائف'' کے نام سے ایک پروجیکٹ ملا۔ اسکرین پلے مکمل ہو گیا تو کاسٹنگ کا مرحلہ آیا۔ میں کیری گرانٹ اور ڈیبورا کیر کو کاسٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ خوش قسمتی سے اس بار کیری نے انکار نہیں کیا اور ساتھ ہی ان ڈائریکٹرز کی فہرست بھی بھیج دی جن کے ساتھ وہ کام کرنا چاہ رہا تھا لیکن ان میں سے کوئی ڈائریکٹر فارغ نہ تھا۔ جب میں نے یہ مسئلہ کیری کے سامنے رکھا تو اس نے تجویز پیش کی کہ میں خود ہی اس فلم کی ہدایات دوں۔ میں نے یہ بات ڈور شیری کو بتائی تو اس نے بھی کیری کی تجویز کی تائید کی اور مجھے اس فلم کا ڈائریکٹر مقرر کر دیا لیکن ساتھ ہی اس نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ اس فلم کا پروڈیوسر وہ خود ہوگا۔ مجھے اس پر کوئی اعتراض نہ ہوا لیکن یہ نہیں جانتا تھا کہ یہ فیصلہ میرے کیریئر کو تباہ کر دے گا۔

فلم کی شوٹنگ شروع ہونے سے پہلے مجھے کچھ لوگوں نے ڈرایا کہ کیری ڈائریکٹر کے کام میں مداخلت کرتا ہے اور اس نے میرا نام اسی لیے تجویز کیا تھا کہ وہ مجھ پر حاوی ہو سکے۔ میں نے اس معاملے میں کوئی تکلف نہیں کیا اور اسے صاف صاف بتا دیا کہ ہر فلم میں صرف ایک ہی ڈائریکٹر ہوتا ہے۔ اس نے میری بات سے اتفاق تو کیا لیکن شوٹنگ کے پہلے دن سے ہی ہمارے درمیان مشکلات شروع ہو گئیں۔ اس نے ہر کام میں کیڑے نکالنا شروع کر دیے۔ کبھی وہ سیٹ پر اعتراض کرتا کبھی اسکرپٹ پر تو کبھی وارڈ روب پر۔ میں نے تنگ آ کر اپنے اسسٹنٹ سے کہا کہ اگر یہی صورتِ حال رہی تو میں یہ فلم چھوڑ دوں گا۔ اس نے مجھے انتظار کرنے کا مشورہ دیا اور آہستہ آہستہ حالات معمول پر آ گئے۔ فلم کی شوٹنگ ختم ہوئی تو کیری نے مجھ سے کہا ''سڈنی، آئندہ کبھی مجھے کاسٹ کرنا چاہو تو صرف فون کر دینا اسکرپٹ بھیجنے کی ضرورت نہیں۔ اس فلم کی نمائش ریڈیو سٹی میوزک ہال میں ہوئی جو ہر ڈائریکٹر کا خواب ہوتا ہے۔ اس لمحے میں نے اپنے آپ کو خوش قسمت محسوس کیا کہ میری ہی پہلی فلم کی نمائش اس ہال میں ہو رہی تھی۔

میں نے ایک بار پھر جورجا کے ساتھ یورپ کی سیر کا پروگرام بنایا۔ تین دن بعد ہم دونوں نیویارک چلے گئے جہاں سے ہمیں کوئن میری، نامی جہاز پر سوار ہونا تھا۔ لندن میں ہم نے پانچ روز قیام کیا اور وہاں سے پیرس چلے گئے۔ وہاں ہماری ملاقات براڈوے کے مشہور ہدایت کار جیڈ ہیرس سے ہوئی اور اس نے مجھ سے ایک ڈراما لکھنے کی فرمائش کی۔ میں نے اسے اپنی اگلی منزل میونخ کے بارے میں بتایا تو وہ ہمارے ساتھ چلنے پر تیار ہو گیا۔ ہم نے وہاں پہنچ کر ایک ہوٹل میں قیام کیا اور تفریح کے ساتھ ساتھ کام بھی کرتے رہے۔ ہم نے جرمنی کے مختلف خوب صورت مقامات کی سیر کا پروگرام بنایا لیکن جیڈ کو کوئی بھی جگہ پسند نہیں آئی اس کا رویہ میرے لیے ناقابلِ برداشت ہوتا جا رہا تھا۔ ڈرامے پر کام کی رفتار بھی بہت سست تھی اور جیڈ اسٹوری لائن پر کام کرنے کے

بجائے لکھے ہوئے سین پر بحث کرنے میں وقت ضائع کر رہا تھا۔ ایک روز تنگ آ کر میں نے جورجا سے کہہ دیا۔ ''ہم اس شخص کے بغیر میونخ واپس جا رہے ہیں۔''

جورجا نے میری تائید کی اور جب جیڈ کام شروع کرنے کے لیے میرے پاس آیا تو میں نے اسے بھی اپنے پروگرام سے آگاہ کر دیا۔ وہ بولا ''ٹھیک ہے، میں بھی تمہارے ساتھ کام کرنا نہیں چاہتا۔''

میونخ پہنچ کر ایک بار پھر میری کمر میں تکلیف شروع ہو گئی اور مجھے دو دن کے لیے بستر پر لیٹنا پڑ گیا پھر کسی نے مجھے ایک فزیوتھراپسٹ پال ہارن کے بارے میں بتایا جس کے بارے میں مشہور تھا کہ دنیا بھر سے بڑے بڑے لوگ اس کے پاس علاج کے لیے آتے ہیں۔ اس نے میرا معائنہ کیا اور یقین دلایا کہ اس کے علاج سے میں بالکل ٹھیک ہو جاؤں گا جبکہ ماضی میں بھی ڈاکٹرز یہ کہہ چکے تھے کہ اس مرض کا واحد علاج آپریشن ہے۔ تین ہفتے تک میرا علاج ہوتا رہا اور ایک دن اس نے مجھے خوش خبری سنائی کہ میں بالکل ٹھیک ہوں، واقعی اس کے بعد مجھے کمر کی تکلیف کبھی نہیں ہوئی۔

ہالی ووڈ واپس آیا تو ڈور شیری نے خبر سنائی کہ ''ڈریم وائف'' کا پری ویو اپچشن تھیٹر میں ہو رہا ہے۔ ہم سب بے چینی سے نقادوں کی رائے کا انتظار کر رہے تھے۔ ہال لوگوں سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا۔ فلم شروع ہوئی اور ہماری نظریں اسکرین پر جم کر رہ گئیں۔ جورجا نے میرا ہاتھ مضبوطی سے تھام لیا اور بولی۔ ''ونڈر فل۔''

فلم ختم ہونے پر سنیما ہال تالیوں سے گونج اٹھا۔ دوسرے دن اخبارات کے تبصرے کچھ اور ہی کہانی سنا رہے تھے۔ انہوں نے میری ہدایت کاری پر بے رحمی سے تنقید کی تھی۔ کچھ دیر بعد ایم جی ایم کے پبلسٹی انچارج نے مجھے فون پر بتایا کہ اس فلم کی نمائش روک دی گئی ہے کیونکہ ڈور شیری اس فلم کا پروڈیوسر ہے اور وہ کسی فلاپ فلم پر اپنا نام نہیں دیکھنا چاہتا جب کہ اس نے خود ہی اس فلم کا پروڈیوسر بننے میں دلچسپی ظاہر کی تھی اور اب وہی اسے تباہ کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میں نے اسی لمحے اس کے ساتھ مزید کام نہ کرنے کا فیصلہ کیا۔ چند ماہ قبل وہ کھل کر کہہ چکا تھا کہ وہ مجھے کسی دوسرے اسٹوڈیو میں نہیں جانے دے گا لیکن اب اس کے رویے میں واضح تبدیلی رونما ہو چکی تھی اور میرا فیصلہ سن کر اس نے مجھے روکنے کی کوئی کوشش نہیں کی۔ مجھے دوسری جاب ملنے میں کوئی پریشانی نہیں ہوئی۔ بہرحال میں آسکر ایوارڈ یافتہ تھا اور میرے کریڈٹ پر کئی کامیاب فلمیں تھیں لیکن بعد کے واقعات سے ثابت ہوا کہ یہ میری خوش فہمی تھی۔

میں نے بیورلے ڈرائیو میں ایک دفتر کرائے پر لیا اور اپنے ایجنٹ کو موجودہ صورتِ حال سے مطلع کر دیا لیکن کئی دن گزر جانے کے باوجود مجھے کوئی کام نہ ملا۔ اس دوران جورجا نے ایک ٹیلی وژن شو میں کام شروع کر دیا لیکن اس سے ہمارے اخراجات پورے نہیں ہو سکتے تھے۔ 30 جولائی 1953ء کو ''ڈریم وائف'' پورے ملک میں خاموشی کے ساتھ نمائش کے لئے پیش کر دی گئی۔ اس فلم کی کوئی پبلسٹی نہیں کی گئی اور نہ ہی دھوم دھام سے پریمیئر ہوا۔ جب قومی اخبارات کے تبصرے آئے تو میں حیران رہ گیا۔ نیویارک ٹائمز سے لے کر چھوٹے بڑے سبھی اخبارات نے اس فلم کی تعریف میں زمین آسمان کے قلابے ملا دیے لیکن یہ سب کچھ میرے لئے ایسا ہی تھا جیسے کسی کی لاٹری نکل آئے لیکن اس کا ٹکٹ گم ہو گیا ہو۔

ایک صبح میرے ایجنٹ نے فون پر بتایا کہ پیراماؤنٹ کا پروڈکشن ہیڈ ڈون ہارٹ مین مجھ سے ملنا چاہتا ہے۔ میں وقتِ مقررہ پر اس کے پاس پہنچ گیا۔ اس نے مجھے ایک فلم لکھنے کی دعوت دی جسے میں نے قبول کر لیا۔ پیراماؤنٹ کا ماحول خاصا دوستانہ تھا اور یہاں ایم جی ایم کے مقابلے میں کم دباؤ تھا۔ ''یو آر نیور ٹو ینگ'' باکس آفس پر بے حد کامیاب رہی اور میں نے اس خوشی میں ایک نیا مکان خریدا جس میں سوئمنگ پول بھی تھا۔ اس کے بعد ڈون ہارٹ مین نے مجھے ایک اور فلم ''دی لیڈی ایز'' کا اسکرین پلے لکھنے کے لئے دے دیا۔ ابھی اس کی شوٹنگ درمیان میں ہی تھی کہ ڈون نے براڈوے کا ایک ڈراما ''اینی تھنگ گوز'' بھی خرید لیا اور اس کا اسکرین پلے لکھنے کی ذمے داری مجھے سونپی گئی۔ جب یہ فلم نمائش کے لئے پیش ہوئی تو اسے بے حد پسند کیا گیا۔ جن دنوں میں اس فلم کے اسکرپٹ پر کام کر رہا تھا جورجا ٹوئنٹیتھ سنچری فوکس کی ایک فلم میں کام کر رہی تھی، اس نے مجھے بتایا کہ وہ ماں بننے والی ہے۔ یہ خبر سن کر میری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہ تھا۔ اسی دوران ہارٹ مین نے مجھے ایک اور اسکرین پلے دیا۔ اس بار میں نے جیری ڈیوس کو اپنے ساتھ ملا لیا۔ وہ بے روزگار تھا اور میں اس کی مدد کرنا چاہ رہا تھا۔ یہ فلم بھی باکس آفس پر بے حد کامیاب رہی۔

14 اکتوبر 1955ء کو ہمارے یہاں بیٹی پیدا ہوئی۔ اس کا نام میری رووین شیلڈن رکھا گیا۔ اس کے لئے لورا نامی میڈ کا انتظام کیا گیا تھا جو بہت ہی شفیق اور مخلص عورت تھی۔ انہی دنوں رابرٹ اسمتھ نامی ایک رائٹر نے مجھے بستر

کی ٹون پر ایک فلم بنانے کا آئیڈیا دیا۔ بسٹر کی ٹون خاموش فلموں کا بہت بڑا اداکار تھا اور اس کا مقابلہ چارلی چپلن سے کیا جاتا تھا لیکن بولتی فلموں کی آمد کے بعد اس کا ستارہ گردش میں آ گیا۔ میں نے ہارٹ مین سے بات کی تو اسے بھی یہ آئیڈیا پسند آیا۔ ہم نے کہانی پر کام شروع کر دیا۔ اس سلسلے میں ہم نے بسٹر کی ٹون سے ملاقات کی اور اسے فلم کا ٹیکنیکل ایڈوائزر بنا لیا۔ فلم مکمل ہوئی تو ہم سب بہت خوش تھے۔ پیراماؤنٹ کے ساتھ میرا کنٹریکٹ ختم ہونے والا تھا لیکن انہوں نے میرے ایجنٹ سے نئے کنٹریکٹ کی بات کر لی تھی۔ فلم کا افتتاح بہت اچھے انداز میں ہوا لیکن اسے باکس آفس پر ناکامی کا منہ دیکھنا پڑا۔ نقادوں نے اس کے اسکرپٹ کو تنقید کا نشانہ بنایا۔ شاید وہ اپنی جگہ درست تھے کیونکہ ہم نے یہ اسکرپٹ بہت جلدی میں لکھا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پیراماؤنٹ والوں نے مجھ سے نیا کنٹریکٹ کرنے سے انکار کر دیا اور میں ایک بار پھر فارغ ہو گیا۔

میں روزانہ کسی فون کال کا انتظار کرتا لیکن قسمت مجھ سے روٹھ گئی تھی۔ میں کئی مہینے تک بے کار بیٹھا رہا اور مالی مسائل پیدا ہونا شروع ہو گئے۔ مجھے مکان کی قسطیں ادا کرنے کے ساتھ ساتھ ملازمین کی تنخواہیں بھی دینا ہوتی تھیں۔ مجبوراً ہم نے لورا کو فارغ کرنے کا فیصلہ کیا لیکن وہ ہمارا ساتھ چھوڑنے پر آمادہ نہ ہوئی پھر ایک دن ایسا بھی آیا جب میرے پاس مکان کی قسط دینے کے لئے بھی پیسے نہ تھے۔ اس دوران جورجا مسلسل میرا حوصلہ بڑھاتی رہی لیکن میں اپنے مستقبل سے مایوس ہو چکا تھا۔ اگلے ہفتے ہمیں مکان خالی کرنا پڑا، اور ہم کرائے کے اپارٹمنٹ میں چلے گئے۔ ایک بار پھر میں خودکشی کے بارے میں سوچنے لگا لیکن میرے لئے جورجا اور میری کو چھوڑنا آسان نہ تھا۔

میں نے ٹیلی وژن کے بارے میں سوچا اور ایک پائلٹ اسکرپٹ لے کر پروڈیوسر ڈیسی ارناز کے پاس چلا گیا۔ اسے اسکرپٹ پسند آیا اور وہ اسے بنانے پر تیار ہو گیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ سی بی ایس پر ایک شو ختم ہونے والا ہے اور ہم اس کی جگہ یہ شو شروع کر سکتے ہیں۔ میں نے گھر جا کر جورجا کو یہ خوش خبری سنائی اور ڈیسی کی کال کا انتظار کرنے لگا۔ دوسرے دن اس نے مجھے بتایا کہ سی بی ایس نے اس شو کو مزید ایک سال جاری رکھنے کا فیصلہ کیا ہے اور ہمارے لئے ان کے پاس کوئی سلاٹ نہیں ہے۔ میں ایک بار پھر مایوسی کے سمندر میں غوطے لگانے لگا۔

کئی دنوں بعد مجھے براڈوے سے ایک پروڈیوسر کی کال آئی۔ اسے میرے پرانے دوستوں ڈوروتھی اور ہربرٹ فیلڈ نے میرے بارے میں بتایا تھا۔ وہ لوگ ریڈ ہیڈ نامی ڈرامے پر کام کر رہے تھے اور مجھے بھی اپنے ساتھ شامل کرنا چاہ رہے تھے۔ میں پروڈیوسر رابرٹ فرایئر کے کہنے پر جورجا اور میری کے ساتھ نیویارک چلا گیا البتہ لورا نے معذرت کر لی، وہ اپنی فیملی کو چھوڑ کر کہیں نہیں جا سکتی تھی۔ میں نے ڈوروتھی اور ہربرٹ کے ساتھ مل کر کام شروع کر دیا۔ ڈائرکشن کے لئے بوب فوس کا انتخاب کیا گیا جو ڈائریکٹر ہونے کے ساتھ ساتھ کوریوگرافر بھی تھا۔ ڈراما دیکھنے کے لیے والدہ، مارٹی، رچرڈ اور اس کی بیوی بھی آئی۔ 3 فروری 1959ء کو یہ ڈراما اسٹیج ہوا اور بے حد کامیاب رہا۔ اس ڈرامے کو سات کیٹگریز کے لیے نامزد کیا گیا جن میں سے پانچ پر اسے ایوارڈز ملے۔

اس کے بعد میں نے ”رومن کینڈل“ کے نام سے ایک رومانٹک کامیڈی لکھی اور میرے ایجنٹ نے اسے مختلف اسٹوڈیوز اور براڈوے پروڈیوسرز کو بھیج دیا۔ میری خوشی کی انتہا نہ رہی جب معلوم ہوا کہ براڈوے کے چار پروڈیوسرز اسے اسٹیج کرنے میں دلچسپی رکھتے تھے۔ براڈوے کا ٹاپ ڈائریکٹر موس ہارٹ اس ڈرامے کو ڈائریکٹ کرنا چاہ رہا تھا۔ ایجنٹ نے ایک اور خبر یہ سنائی کہ ہالی ووڈ کا ڈائریکٹر ولیم وائلر اس ڈرامے پر فلم بنانا چاہتا ہے۔ مجھے موس ہارٹ اور وائلر میں سے کسی ایک کا انتخاب کرنا تھا۔ میں نے ایجنٹ سے کہا کہ ڈرامے کے لیے موس ہارٹ سے بات کر لو اور فلم کے لیے وائلر کا انتخاب ٹھیک رہے گا لیکن ڈرامے کا پروڈیوسر سام اینگل بضد تھا کہ فلم بنانے کے حقوق بھی اسے دیے جائیں۔ مجبوراً ہمیں ایک اور پروڈیوسر اینتھلی رینیے سے رابطہ کرنا پڑا۔ یہی میری زندگی کی سب سے بڑی غلطی تھی۔ وہ ہالی ووڈ یا براڈوے کے بارے میں کچھ نہیں جانتی تھی۔ پہلے اس ڈرامے کو دوسرے شہروں میں دکھایا گیا جہاں لوگوں نے اسے پسند کیا۔ اس دوران میں ڈرامے پر مسلسل کام کرتا اور اسے بہتر بنانے کی کوشش کرتا رہا لیکن براڈوے میں اسے کامیابی نصیب نہ ہوئی اور نقادوں نے اس پر بڑی بے رحمی سے تنقید کی اور اس ڈرامے کے صرف پانچ شوز ہی ہو سکے۔ دوسرے دن میرے ایجنٹ نے فون کر کے بتایا کہ ولیم وائلر نے اس فلم کو ڈائریکٹ نہ کرنے کا فیصلہ کیا ہے۔

ایک سہانی صبح مجھے فون پر جانی پہچانی آواز سنائی دی۔ پیراماؤنٹ سے ڈون ہارٹ مین بول رہا تھا۔ ”میرے پاس

ایک پروجیکٹ ہے اور میں چاہتا ہوں کہ تم اسے لکھو۔“ اس فلم کا پروڈیوسر ہال ویلس تھا جبکہ ڈین مارٹن اور شرلے میکلین کو مرکزی کرداروں کے لئے چنا گیا تھا۔ میں نے پروڈیوسر سے ملاقات کی اور اسکرپٹ پر کام شروع کر دیا۔ ایک دن میں اسٹوڈیو سے گھر واپس آیا تو جورجا نے خوش خبری سنائی کہ وہ دوبارہ ماں بننے والی ہے اس وقت ہماری بیٹی میری پانچ سال کی ہو چکی تھی۔ بدقسمتی سے ہماری دوسری بیٹی الیگزینڈرا پیدائشی طور پر معذور تھی۔ ڈاکٹروں نے اسے کیئر سینٹر میں رکھنے کا مشورہ دیا جہاں اس کی بہتر نگہداشت ہو سکتی تھی۔ میں نے کئی ڈاکٹروں سے اس بارے میں مشورہ کیا لیکن کہیں سے تسلی بخش جواب نہ ملا اور ایک دن الیگزینڈرا اس دنیا سے رخصت ہو گئی۔ میری خود کو بہت زیادہ تنہا محسوس کر رہی تھی لہٰذا ہم نے اس کا ساتھ نبھانے کے لئے ایک بچہ گود لینے کا فیصلہ کر لیا۔ ڈاکٹر واٹسن نے میری ملاقات ایک ایسی لڑکی سے کروائی جس کا بوائے فرینڈ اسے چھوڑ کر چلا گیا تھا اور وہ امید سے تھی۔ تین ہفتے بعد اس نے ایک خوبصورت بچی کو جنم دیا اور قانونی کارروائی مکمل کرنے کے بعد ہم اسے گھر لے آئے۔ اس بچی کا نام الزبتھ رکھا گیا، ہم اس بچی کو پا کر بہت خوش تھے۔ میری کو بھی ایک کھلونا مل گیا تھا لیکن الزبتھ ابھی چھ ماہ کی بھی نہ ہوئی تھی کہ ڈاکٹر واٹسن نے فون پر بتایا کہ بچی کو اس کی ماں واپس لینا چاہتی ہے۔ میرا خون کھول اٹھا۔ ”یہ کیسے ہو سکتا ہے۔ ہم نے اسے باقاعدہ اڈاپٹ کیا ہے۔“

”قانون کے مطابق ماں چھ ماہ کے اندر اپنا فیصلہ تبدیل کر سکتی ہے“ ڈاکٹر واٹسن نے بتایا۔ ”بچی کے ماں باپ نے شادی کا فیصلہ کیا ہے اور وہ بچی کو اپنے ساتھ رکھنا چاہتے ہیں۔“

دوسرے دن وہ لوگ بچی کو لے گئے اور ہم دیکھتے ہی رہ گئے۔

ایک دن مجھے ایم جی ایم سے پروڈیوسر پینڈرو برمن نے فون پر بتایا کہ وہ براڈوے کے ڈرامے جمبو پر فلم بنانا چاہ رہا ہے اور چاہتا ہے کہ میں اس کا اسکرپٹ لکھوں۔ مرکزی کردار کے لیے اس کے ذہن میں رچرڈ برٹن کا نام تھا جو ان دنوں براڈوے کے ایک ڈرامے میں کام کر رہا تھا۔ ہم اس سے ملنے براڈوے گئے۔ میں نے اسے کہانی سنائی تو وہ فلم میں کام کرنے پر رضامند ہو گیا لیکن اس کے ایجنٹ نے پچاس ہزار ڈالر زیادہ مانگے جس پر پروڈیوسر تیار نہ ہوا۔ رچرڈ برٹن نے قلوپطرہ سائن کر لی اور الزبتھ ٹیلر کے ساتھ اس کا رومانس شروع ہو گیا۔ ہم نے اس کی جگہ اسٹیفن بائیڈ کو لے لیا۔ جب فلم ریلیز ہوئی تو اسے رائٹرز..... گلڈ ایوارڈ کے بہترین اسکرین پلے کے لیے نامزد کیا گیا۔

انہی دنوں مجھے اے بی سی ٹیلی ویژن پر ”دی پیٹی ڈیوک شو“ کے لیے ہائر کر لیا گیا۔ پہلے میں اس کے لیے تیار نہ تھا لیکن پیٹی سے ملنے کے بعد مجھے اپنا ارادہ تبدیل کرنا پڑا۔ پروڈیوسرز سے پہلی ملاقات ہوئی تو میں نے انہیں کہہ دیا کہ مجھے کسی دوسرے رائٹر کی ضرورت نہیں اور یہ شو میں خود ہی لکھوں گا۔ وہ حیران تھے کہ یہ کیسے ممکن ہے۔ انہیں ہر ہفتے کے حساب سے انتالیس شوز کرنے تھے لیکن میں نے انہیں یقین دلایا کہ ایسا ممکن ہے۔ میں نے ایڈوانس میں چھ شوز لکھ لیے تب ان کی شوٹنگ شروع ہوئی۔ جس دن پہلا شو آن ایئر ہوا ہم سب بے چینی سے فیڈ بیک کے منتظر تھے۔ توقع کے مطابق حوصلہ افزا نتائج سامنے آئے اور اس شو کی ریٹنگ بڑھتی گئی۔

دی پیٹی ڈیوک شو کا پہلا سال مکمل ہونے پر مجھے اسکرین جمز کی طرف سے ٹی وی شوز لکھنے کی آفر ہوئی جسے این بی سی سے ٹیلی کاسٹ ہونا تھا۔ میں نے اس اسکرپٹ پر کام شروع کر دیا اور اس طرح اب میں ہفتے میں دو مختلف شوز لکھنے لگا۔ پیٹی ڈیوک شو کی شوٹنگ نیویارک جب کہ ”ڈریم آف جینی“ کی شوٹنگ لاس اینجلس میں ہوتی تھی۔ 1965ء میں رنگین ٹیلی ویژن شروع ہوا لیکن ڈریم آف جینی، بلیک اینڈ وائٹ میں چلتا رہا۔ کیونکہ اسے رنگین بنانے کے لیے ہر شو پر چار سو ڈالر زائد خرچ کرنا پڑتے۔ سیکنڈ سیزن میں اسے بھی رنگین بنا دیا گیا۔ کام بڑھ جانے کی وجہ سے میں نے دوسرے رائٹرز کو ہائر کرنا شروع کر دیا لیکن میں ان کے کام سے مطمئن نہیں تھا۔ ”جینی“ کا پہلا سیزن بہت اچھا رہا لیکن پیٹی ڈیوک شو کے حوالے سے آئے دن کوئی نہ کوئی مسئلہ کھڑا ہو رہا تھا۔ جب حالات قابو سے باہر ہو گئے تو اے بی سی نیٹ ورک نے اسے بند کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ 1967ء میں مجھے ایمی ایوارڈز کے لیے نامزد کیا گیا۔ ستمبر 1967ء میں میرے والد کو دل کا دورہ پڑا۔ میں انہیں دیکھنے اسپتال پہنچا لیکن وہ جانبر نہ ہو سکے۔

”آئی ڈریم آف جینی“ کے چار سال مکمل ہو چکے تھے کہ مجھے حکم ملا، جینی اور ٹونی کی شادی کر دی جائے۔ مجھے اس سے اختلاف تھا لیکن اس کے بغیر یہ شو پانچویں سال میں داخل نہیں ہو سکتا تھا پھر وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ناظرین نے اس تبدیلی کو پسند نہیں کیا اور پانچویں سال کے اختتام پر

اس شو کو بند کرنا پڑا۔ 1970ء میں ایک اور شو "نینسی" کے نام سے کیا۔ یہ امریکی صدر کی نوجوان بیٹی کی کہانی تھی جس نے ایک معمولی سے شخص سے شادی کر لی تھی۔ یہ ایک خوبصورت رومانٹک کامیڈی تھی جسے ناظرین میں پسند کیا گیا لیکن سترہ قسطوں کے بعد اسے بند کر دیا گیا۔ میں نہیں سمجھتا کہ آیا اسے وائٹ ہاؤس کی ناراضی کی بنا پر بند کیا گیا یا اس کی کوئی سیاسی وجہ تھی لیکن ہم سب کو اس شو کے بند ہونے پر کافی حیرانی ہوئی۔

1979ء میں "ہارٹ ٹو ہارٹ" کے نام سے ایک شو شروع کیا جو پانچ سال تک کامیابی سے چلتا رہا۔ اس سے پہلے ہی میرے دل میں ناول لکھنے کا خیال آچکا تھا اور میں نے اپنے سیکریٹری کو یہ ناول ڈکٹیٹ کرانا بھی شروع کر دیا تھا اور جب مکمل ہو گیا تو اپنے ایک دوست کو اسے پڑھنے کے لیے دے دیا، وہ خود بھی ناول نگار تھا۔ اسے میرا ناول پسند آیا لیکن پانچ پبلشرز نے یہ ناول واپس کر دیا جب کہ چھٹے پبلشرز نے اسے چھاپنے پر آمادگی ظاہر کر دی۔ یہ ناول 1970ء میں شائع ہوا، یہ رواج ہمیشہ سے رہا ہے کہ کسی بھی کتاب کے شائع ہونے پر اس کا مصنف پورے ملک کا دورہ کرتا ہے، ٹیلی وژن شوز میں شرکت کرتا ہے اور اس کے اعزاز میں تقریبات منعقد ہوتی ہیں لیکن میرے معاملے میں ایسا کچھ نہیں ہوا۔ جب میں نے اپنے پبلشر کی توجہ اس جانب دلائی تو وہ بولا تمہیں ہالی ووڈ سے باہر کوئی نہیں جانتا اس لیے اس کا کوئی فائدہ نہ ہوگا۔ میں نے اپنے طور پر ایک ایجنٹ سے رابطہ کیا اور اس نے میرے لیے کچھ ٹیلی وژن شوز کا انتظام کر دیا۔ میں نے ایک کتابوں کی نمائش میں شرکت کی جہاں دوسرے مصنفین کی کتابیں خریدنے کے لیے لوگ قطار بنائے کھڑے تھے لیکن میرے ناول کا خریدار کوئی نہ تھا پھر ایک خاتون کو مجھ پر ترس آ گیا اور اس نے ایک کاپی خریدی۔ چند ہفتوں بعد میں نیویارک آیا تو پبلشر نے بتایا کہ میرے ناول دی نیکیڈ فیس کی سترہ ہزار کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں اور وہ اس کا دوسرا ایڈیشن چھاپ رہے ہیں۔ میرے لیے یہ کوئی بڑی خبر نہ تھی۔ ٹیلی وژن پر میرا شو ہر ہفتے بیس ملین لوگ دیکھتے تھے اس کے سامنے سترہ ہزار کاپیاں کیا حقیقت رکھتی تھیں اس کے باوجود میں نے دوسرا ناول لکھنا شروع کر دیا۔ کیونکہ اس میں مجھے تخلیقی آزادی میسر تھی اور میں کسی پروڈیوسر یا ڈائریکٹر کا پابند نہ تھا۔ میں نے The other side of midnight کے نام سے دوسرا ناول لکھا جو ایک سال بعد شائع ہوا۔ اس ناول نے میری زندگی بدل دی۔ یہ ناول باون ہفتوں تک بیسٹ سیلر کی فہرست میں رہا اور بی فیئٹر کی پیشن گوئی صحیح ثابت ہوئی کہ ایک دن میں عالمی شہرت یافتہ کہلاؤں گا۔

کئی سال تک فلمیں، تھیٹر اور ٹیلی وژن کے لیے لکھنے کے بعد میں نے ناول کو ترجیح دی۔ یہ ایک بالکل مختلف دنیا ہے جس میں آپ کا دل اور دماغ ساتھ ساتھ چلتے ہیں۔ ناول نگار کے طور پر میرا اپنے پڑھنے والوں سے قریبی رابطہ ہو گیا اور مجھے کئی ایسے خطوط ملنے لگے جن میں وہ اپنی ذاتی باتیں مجھ سے شیئر کرتے تھے۔ میرے ناول 180 ملکوں میں فروخت ہوئے اور ان کا اکیاون زبانوں میں ترجمہ ہوا۔ 1977ء میں میرا نام گنیز بک آف ورلڈ ریکارڈ میں شامل کیا گیا۔ میرے ناولوں کی تین سو ملین کاپیاں فروخت ہو چکی ہیں۔ ان ناولوں کی کامیابی کی ایک ہی وجہ ہے کہ میرے کیریکٹرز مجھ سے اور میرے پڑھنے والوں سے بے حد قریب ہیں۔ میں ریسرچ کرنے کے لیے دنیا بھر میں گھومتا اور اپنے تجربات و مشاہدات کو لفظوں میں ڈھالتا۔

1985ء میں میری پیاری بیوی جورجا چل بسی۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان تھا جس نے میری زندگی میں ایسا خلا پیدا کر دیا جو کبھی پُر نہ ہو سکے گا۔ تین سال بعد میری ملاقات الیگزینڈرا کوسٹوف سے ہوئی اور ہم دونوں کو پہلی نظر میں ہی ایک دوسرے سے محبت ہو گئی جس کا نتیجہ شادی کی صورت میں برآمد ہوا۔ اس شادی کو سولہ برس ہو چکے ہیں اور ہم خوشگوار ازدواجی زندگی گزار رہے ہیں۔ سب سے زیادہ خوشی کی بات یہ ہے کہ میری بیٹی بھی رائٹر بن گئی ہے اور اب تک اس کے دس ناول شائع ہو چکے ہیں جب کہ سولہ سالہ نواسی ریبکا کا بھی ایک ناول منظرِ عام پر آچکا ہے۔

میں اپنے والد اوٹو کا ہمیشہ مشکور رہوں گا جنہوں نے مجھے کتابِ زندگی کے اوراق پلٹنے کا مشورہ دیا اور والدہ نتالی جنہوں نے ہمیشہ میری صلاحیتوں پر اعتماد کیا اور ہر مشکل وقت میں میری ہمت بندھائی۔ میرے کیریئر میں عظیم الشان کامیابیوں کے ساتھ ساتھ بڑی بڑی ناکامیاں بھی شامل ہیں۔ میں اپنے پڑھنے والوں کے ساتھ انہیں شیئر کرنا چاہتا تھا کیونکہ انہی لوگوں کی وجہ سے اس مقام پر ہوں۔ انہوں نے ہمیشہ میرا ساتھ دیا جس کے لیے میں ان سب کا تہِ دل سے شکر گزار ہوں۔





بابائے پشتو

شوکت رحمن خٹک

وہ لسانی اکائی برتر مانی جاتی ہے جس کا ادبی ذخیرہ قابلِ فخر ہو۔ سندھی کی طرح پشتو بھی ادبی خزانے سے مالا مال ہے۔ پشتو ادب کی ترویج و ترقی میں رحمن بابا کے بعد ماضی قریب میں جس شخصیت نے اہم کردار ادا کیا یہ سرگزشت اسی کی ہے۔ اس نے کس طرح پشتو ادب کی بنجر زمین کو چمن بنایا ہے ہر ایک کے لیے سبق ہے۔

نامناسب صورت حال میں بھی اس نے ادب کی خدمت کی

رات کا وقت تھا۔ ہر سو اندھیرے کا راج تھا۔ سوائے جھینگروں کی جھائیں جھائیں کے اور کوئی آواز سنائی نہیں دے رہی تھی۔ ہاں کبھی کبھی کتوں کے بھونکنے کی آوازیں سنائی دے جاتیں۔ ایسے وقت میں ضلع نوشہرہ کے معروف عالم دین عبدالحق کے گھر میں رت جگا کا سماں تھا۔ ہر کمرے میں لالٹین جل رہی تھی۔ لوگ جاگ رہے تھے۔ اندرخانہ تو کچھ زیادہ ہی ہلچل تھی۔ گھر کی تمام عورتیں بڑے کمرے میں جمع تھیں اور چارپائی پر عبدالحق کی زوجہ

درد کی شدت کو کم کرنے کے لیے بار بار اٹھ کر بیٹھنے کی کوشش کررہی تھیں اور وہاں پر موجود دایہ زبردستی ان کا سر تکیہ پر رکھ دیتی تھی۔ باہر والے کمرے میں لالٹین کی یرقان زدہ روشنی پھیلی ہوئی تھی اور اس مٹمیلی روشنی میں بیٹھے عبدالحق کے چہرے پر بھی بے چینی تھی۔ ہاتھ میں پکڑی تسبیح کے دانے گردش میں تھے۔

ضلع نوشہرہ کے قصبہ مانکی شریف میں عبدالحق کے گھرانے کو تعظیم و تکریم کا حامل قرار دیا جاتا تھا کہ یہ گھرانا دین داروں کا تھا۔ لوگ دور دور سے عبدالحق کے پاس آتے تھے تاکہ دینی علم میں اضافہ ہو جائے لیکن آج انہوں نے وقت سے قبل طلاب کو مہمان خانے میں بھیج دیا تھا اور خود بیٹھے ورد کررہے تھے، اسی وقت زنان خانے سے ایک ملازمہ نے ان کے پاس آکر کہا۔ ”مبارک ہو، شہزادہ ہوا ہے۔“

عبدالحق نے جیب سے کچھ سکے نکالے اور اس کی طرف بڑھادیے پھر سجدہ شکر میں گر گئے۔

1895ء کی اس رات عبدالحق کے گھر میں جنم لینے والے بچے کا نام انہوں نے عبدالخالق تجویز کیا۔ یہ بچہ انہیں کافی انتظار کے بعد ملا تھا اس لیے وہ اسے ہتھیلی کا چھالا بنائے رکھتے۔ اسی لاڈ و پیار کے سائے میں بچہ بڑا ہونے لگا۔

عبدالخالق 5 سال کا ہوا تو اسے قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرنے کے لیے ایک معلم کے پاس بٹھادیا گیا۔ بچے کی ذہانت کا یہ عالم تھا کہ وہ ناظرہ میں سب سے آگے آگیا تھا۔ وہ بڑی تیزی سے ختم قرآن کی منزل طے کررہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اسے دیگر علوم بھی ہلکے پھلکے انداز میں پڑھائے جارہے تھے۔

وقت کا پنچھی محو پرواز رہا۔ آہستہ آہستہ وہ تعلیمی میدان میں آگے بڑھتا رہا، اب وہ مڈل کا امتحان بھی پاس کرچکا تھا اور میٹرک کی تیاری میں تھا۔ اس دوران خود اس نے بھی محسوس کرلیا کہ عربی، فارسی سے زیادہ اسے پشتو ادب میں دلچسپی محسوس ہوتی ہے۔

وہ خالی وقت میں پشتو ادب پڑھنے لگا۔ گزرتے وقت کے ساتھ اس کا مطالعہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ 16 سال کی عمر میں اس نے پشتو ادب پر پہلی تحریر لکھی۔ اس تحریر کو سب نے سراہا تو اس کا قلم رواں ہوگیا۔ اس کی تحریر میں تحریک ہوتی، ترغیب ہوتی۔

والدین نے نام رکھا تھا عبدالخالق لیکن خلیق اس کا اپنا

وہ دیکھ رہا تھا کہ اس کے علاقے میں تعلیم کی طرف رجحان بالکل نہیں ہے اس لیے وہ تعلیم عام کرنے پر زور دے رہا تھا لیکن اس کی تحریر اس معاملے میں بہت اچھا اثر ڈالنے میں ناکام ثابت ہورہی تھی اس لیے وہ عملی طور پر میدان میں آگیا۔ 1918ء کی ابتداء میں اس نے جگہ جگہ جاکر 40 طلبہ کو جمع کیا اور انہیں پرائیویٹ ٹیوشن دینے لگا۔

اس کی جدوجہد دیکھ کر لوگ حیران تھے کہ اتنی سی عمر میں اتنا کچھ وہ کیسے کررہا ہے۔ والدین اس کے ان کاموں سے ناخوش تو نہ تھے مگر بہت زیادہ خوش بھی نہیں تھے۔ ان کا کہنا تھا کہ ابھی وقت ہے اپنی ترقی کے بارے میں سوچو کیسے آگے بڑھا جاسکتا ہے یہ دیکھو، آگے بھی تعلیم حاصل کرو والدین کے اس حکم پر بھی اس نے توجہ نہ دی۔ علاقے میں رہنے کے لیے اس نے حکمت شروع کردی۔ مطب کھول لیا اور علاج معالجے کی جانب مڑ گیا۔

مطب میں مریض کم آتے پھر بھی مطب ہمہ وقت بھرا رہتا۔ لوگ اس سے تعلیمی سلسلے میں مشاورت کرتے، ادب پر بحثیں ہوتیں، گویا وہ مطب ادبی مرکز بن گیا تھا۔ اس کے اس کام سے بھی گھر والے خوش نہ تھے۔ اسے کس طرح مستقبل بہتر بنانے کے لیے آمادہ کیا جائے وہ سب اسی پر غور کرتے۔ بالآخر والدین نے ایک دوسرا فیصلہ کیا۔ اسی سال ہری چند لنڈی شاہ کے قریبی گاؤں نزوبو کے ایک معزز خاندان کی لڑکی کو پسند کیا اور حکم صادر کردیا کہ تیاری کرلو ہم تمہاری شادی کررہے ہیں۔

والدین کا حکم تھا وہ دولہا بن گیا۔ بیاہ کر لڑکی کو گھر لے آیا، سب کا خیال تھا کہ گھر میں بیوی آگئی ہے اس لیے وہ گھر میں زیادہ وقت گزارے گا مگر الٹا ہوا۔ وہ اپنے مشن سے ایک قدم بھی پیچھے نہ ہٹا ترویج علم میں زیادہ سے زیادہ وقت دینے لگا۔ پشتو ادب پر بھی کام کی رفتار بڑھادی۔

وقت گزرتا رہا گزرتے وقت کے ساتھ خاندان پھیل رہا تھا، اخراجات بڑھ رہے تھے۔ گھرانا معاشی طور پر مضبوط تھا اس لیے روپے پیسے کی کمی محسوس نہیں ہورہی تھی۔ حکمت بھی چل رہی تھی۔ دور دور سے مریض آرہے تھے۔ وہ مریضوں کے علاج کے ساتھ کم علمی کے مرض کا علاج بھی ڈھونڈ رہے تھے۔ وہ علاقے بھر میں حکیم عبدالخالق خلیق کے نام سے مشہور تھے۔

تجویز کردہ تھا، یوں سمجھ لیں تخلص تھا پھر وہ مزاجاً بھی خلیق تھا۔ نرم مزاج، ہر ایک کے کام آنے والا وہ دیکھ رہا تھا اس کا علاقہ تعلیم میں ذرا بھی آگے نہیں بڑھ رہا ہے۔ اب اس نے چھوٹے بچوں پر توجہ مرکوز کردی، بچوں میں تعلیم کا شعور بیدار کرنے لگا پھر وہ ارباب اختیار سے ملنے، انہیں بچوں کی تعلیمی مسائل کی جانب توجہ دینے میں کوشاں ہوگیا اس سلسلے میں اس نے پشاور جاکر بڑے افسران سے کئی بار میٹنگ کی۔ اس کی یہ کوشش کامیاب ٹھہری اور انگریز حکومت نے اس کی تجویز مان لی، اعانت کا وعدہ کرلیا۔

یہ خبر علاقے میں پھیلی تو لوگ مخالفت کرنے لگے۔ ان لوگوں کو یہ بات پسند نہیں آرہی تھی کہ انگریز حکومت ان کے علاقے میں مدرسہ کھولے۔ برصغیر کے دیگر علاقوں سے سرحد کا معاشرہ یکسر الگ تھا۔ انگریزوں سے نفرت اور اپنی آزادی سے انہیں زیادہ پیار تھا۔ وہ اپنے علاقے میں حکومت کی مداخلت برداشت نہیں کرتے تھے لیکن خلیق کو روک نہیں سکتے تھے کہ اس کی تعلیم پورا علاقہ کررہا تھا۔ اسے بہت زیادہ عزت دی جانے لگی تھی۔ پھر یہ بھی جانتے تھے کہ خلیق بھی ہٹ کے پکے ہیں، وہ ان کی بات کسی طور نہیں مانیں گے اس لیے منہ پر کچھ نہیں کہتے مگر غائبانہ میں بہت کچھ کہتے۔

خلیق یک و تنہا مخالفین سے مقابلہ کرتے رہے۔ بالآخر کامیاب ٹھہرے۔ مدرسے کی بنیاد رکھ دی۔ یہ وہی مدرسہ ہے جو اب گورنمنٹ ہائی اسکول مانکی شریف کے نام سے قائم ہے۔

مدرسہ (پرائمری اسکول) قائم کرنے کے بعد انہوں نے ایک اور کمی کو دور کرنے کی کوشش تیز کردی، مانکی شریف کے بہت سے لوگ دیار غیر میں کام کرتے تھے۔ بمبئی، کلکتہ، لاہور، امرتسر میں رہ رہے تھے۔ ان سب کو ایک بہت بڑی پریشانی کا سامنا تھا۔ باہر جانے والے گھر سے کٹ کر رہ جاتے تھے۔ نہ ان کو گھر والوں کی خبر ملتی تھی اور نہ گھر والوں کو ان کی، اس مسئلے کا سستا حل خطوط کا تبادلہ تھا اور خطوط کے تبادلے کے لیے ڈاک خانے کا قیام ضروری تھا۔ اس مسئلے کے حل کی خاطر انہوں نے اپنی کوشش تیز کردی۔ حکومتی اہلکاروں سے رابطے شروع کردیے۔ بالآخر محکمہ ڈاک نے پوسٹ آفس کے قیام کی اجازت دے دی۔

اب ایک نیا مسئلہ کھڑا ہوگیا۔ ڈاک خانہ چلانے کے لیے ملازم نہیں مل رہے تھے۔ شہر سے اتنی دور آکر کوئی بھی ڈاک خانے کا چارج لینے پر تیار نہ تھا، مجبوراً وہ خود اس کام کو کرنے لگے۔ خطوط لے کر کے پشاور جاتے اور باہر سے کوئی خط آیا ہو تو وہ اسے لے کر آتے اور وصول کنندہ تک پہنچاتے۔ آہستہ آہستہ ڈاک خانے کا کام بڑھنے لگا اور حکومت نے ایک مددگار دے دیا۔

ڈاک خانے کے قیام نے اس علاقے کو دیگر شہروں سے جوڑ دیا تھا، ڈاک سے اب اخبارات بھی منگوانے لگے تھے۔ مدرسہ اور ڈاک خانے کے قیام کے بعد اب انہوں نے کچھ بڑا کام کرنے کا سوچا۔ اخبار آنے کی وجہ سے وہ ملکی سیاست کی خبروں سے آگاہ ہونے لگے تھے۔ اس علاقے کی سیاست باچا خان کے ہاتھ میں تھی۔ وہ ان سے ملنے کے لیے ان کے گاؤں اتمان زئی جا پہنچے۔ ان سے بہت سے مسائل پر تبادلۂ خیال کیا۔

ان کی گفتگو سے باچا خان بہت متاثر ہوئے اور اپنی پارٹی خدائی خدمت گار میں ایک بڑا عہدہ دے دیا۔ انہوں نے باچا خان کو مشورہ دیا کہ پارٹی کا نظریہ عوام تک پہنچانے کے لیے ایک ذاتی میگزین نکالا جائے تاکہ عوام پارٹی کے نظریے، افکار، خبروں سے باخبر رہیں۔

خدائی خدمت گار کے نام سے ان کا لکھا ہوا ڈراما 1931ء میں کاکا صاحب میں اسٹیج ہوا، پہلے ہی دن کئی ہزار روپے کے ٹکٹ فروخت ہوئے۔ اس ڈرامے میں ان کے چھوٹے بھائی عبدالمالک خٹک ہیرو تھے۔ بعد میں اس ڈرامے کو کتابی شکل دی گئی مگر برٹش گورنمنٹ نے کتاب کو ضبط کرلیا جو اب بھی لندن کے عجائب گھر میں محفوظ ہے۔

پشتو ادب پر گورنمنٹ کی طرف سے پابندی عائد تھی۔ خلیق صاحب کی رہنمائی میں ایک جلوس کو گورنر کے پاس جانا تھا، جلوس کی قیادت خلیق صاحب نے کی تھی۔ انہیں جلوس سے آگے کار میں بیٹھ کر چلنا تھا۔ فارغ بخاری نے خلیق صاحب کو کار میں بیٹھنے کو کہا تو خلیق صاحب نے بہت برا منایا کہ یہ کیسے ہوسکتا ہے کہ میں کار میں بیٹھوں اور لوگ پیدل چلیں۔ بہت اصرار پر بھی نہ مانے اور پیرانہ سالی میں جلوس کی قیادت نوجوانوں کی طرح کی اور گورنر کو خاطر میں نہ لاکر اس سے تمام مطالبات منظور کرائے۔

باچا خان کو یہ بات پسند آئی اور ہفت روزہ پختون کا اجراء عمل میں آ گیا۔ پہلا شمارہ 1931ء میں آیا، اس کے ابتدائی چار سال بہت کٹھن گزرے۔ ایک اکیلے خلیق اور ڈھیروں کام۔ زیادہ تر مضامین وغیرہ خود ہی لکھتے۔ کچھ ترجمہ کراتے۔ دفتر سردریاب تھا۔ کام کا دباؤ اس قدر تھا کہ اکثر راتیں وہیں گزرتیں۔ لکھنے والے جو کچھ لکھتے اس پر وہ بھرپور محنت کر کے سنوارتے۔ قلم کاروں کو مشورے دیتے، ان کی خامیوں کی نشاندہی کرتے۔ یہی وجہ تھی کہ ''پختون'' میں چھپنے والے بعد میں ناموری حاصل کرتے گئے۔

خلیق کے قلم میں وہ کاٹ تھی کہ ایوان برطانیہ میں گونج سنائی دینے لگی اور وہ انگریز حکومت کی نظروں میں کھٹکنے لگے۔ 1932ء کی بات ہے، وہ اپنے ساتھیوں کے ہمراہ حجرے میں محوخواب تھے کہ حکومتی اہلکاروں نے حجرے کو گھیر لیا۔

انہوں نے کوتوال سے پوچھا کہ مجھ پر الزام کیا ہے تو وہ بولا۔ ''ہمیں کچھ پتا نہیں۔ ایوان بالا سے خصوصی حکم جاری ہوا ہے، اس لیے ہم گرفتار کرنے آئے ہیں۔''

پولیس انہیں گرفتار کر کے لے جانے لگی تو پورا علاقہ سینہ سپر ہو گیا۔ کہیں بات نہ بگڑ جائے اس ڈر سے انہوں نے تمام ساتھیوں کو دلاسا دیا۔ ہر قسم کی سورش برپا کرنے سے منع کر دیا۔

عرصے تک پابند سلاسل رہے۔ رہا ہوئے تو پھر سے اپنے کام میں منہمک ہو گئے۔ عوام کی عملی خدمت اور پشتو ادب کی ترویج یہی دو کام تھے جو انہیں گھیرے ہوئے تھے۔ وہ تن من دھن سے مصروف تھے۔ وہ علاقے کی ترقی کا خواب دیکھتے رہے تھے۔ ان کی خواہش تھی کہ اس علاقے میں وہ تمام سہولت عوام کو ملے جو بڑے شہروں میں ہے۔

جن دنوں وہ حکمت کر رہے تھے تو انہوں نے محسوس کیا تھا کہ یہاں معمولی معمولی بیماری بھی وقت پر علاج نہ ہونے کی وجہ سے موت کا باعث بن جاتی ہے۔ مانکی شریف ہی کیا دور دور تک علاج معالجے کی سہولت نہیں ہے۔ بس انہوں نے گاؤں میں اسپتال بنانے کی کوشش تیز کر دی۔ پشاور جا کر حکومتی اہلکاروں سے بھی ملے۔ یہ ایک ایسا کام تھا جس کی بہت زیادہ ضرورت تھی اس وجہ سے ان کے شانے سے شانہ ملا کر علاقے کے معززین بھی کھڑے ہو گئے جن میں پیر صاحب مانکی شریف امین الحسنات بھی شامل تھے۔ 1945ء میں انہوں نے اسپتال کا سنگ بنیاد رکھ ہی دیا۔

برصغیر کی سیاست میں بھرپور ابال آ چکا تھا۔ یہاں وہاں سے فسادات کی خبریں بھی آنی شروع ہو گئی تھیں۔ بنگال بہار، اڑیسہ اور آسام ان چاروں صوبوں میں موت کا کھیل شباب پر پہنچ گیا تھا۔ ہر روز مسلمانوں کے محلے کے محلے گاؤں کے گاؤں تباہ کیے جا رہے تھے۔ ان اطلاعات نے انہیں بھی بوکھلا دیا تھا۔ گو کہ وہ مسلم لیگ میں شامل نہیں تھے لیکن مسلمان تو تھے پھر وہ باچا خان کے ساتھی تھے، عدم تشدد پر یقین رکھتے تھے اس لیے وہ خون کی اس آندھی پر پریشان ہو اٹھے تھے۔ اس قتل و غارت گری کو کیسے روکا جائے۔ وہ دن رات اسی پر غور کر رہے تھے لیکن یہ طوفان بڑھتا ہی جا رہا تھا کہ اعلانِ آزادی ہو گیا۔ مسلمانوں کو ایک آزاد وطن مل گیا۔

اس آزادی سے وہ اتنا خوش نہ تھے ان کا کہنا تھا کہ مسلم لیگ نے جلد بازی سے کام لیا ہے۔ یہ تقسیم سراسر غلط ہے۔ انگریزوں نے دغابازی کی ہے۔ کشمیر ہمارا ہے، پورا پنجاب ہمارا ہے۔ آدھا راجستھان ہمارا ہے۔ اسی طرح مشرق میں بھی دھاندلی ہوئی ہے، پورا بنگال اور آدھا بہار مسلم اکثریتی صوبے تھے، وہ بھی پاکستان میں شامل کرتے۔ آسام میں بھی اکثر علاقے مسلم اکثریتی ہیں انہیں بھی پاکستان میں شامل ہونا چاہیے تھا لیکن اب کچھ ہو نہیں سکتا تھا اس لیے تعمیر وطن میں لگ گئے۔

1948ء میں انہوں نے قصہ خوانی بازار میں ادارہ ''اشاعت سرحد'' کے نام سے درسی کتابوں اور اسٹیشنری کی ایک بڑی سی دکان کھول لی۔ افتتاح کے موقع پر میاں جعفر شاہ، خان عبدالولی خان، اسلم خٹک، سمندر خان سمندر، قاضی سعید احمد، عبدالرؤف، ماسٹر عبدالکریم اور پشتو ادب کے ممتاز شعراء و ادیب شامل تھے۔

1946ء کے آخر میں ہی وہ اپنے گاؤں مانکی شریف سے پشاور صدر منتقل ہو گئے تھے اور ایک کرائے کے مکان میں اپنے اہل خانہ کے ہمراہ مقیم تھے (اس گھر میں وہ 1952ء تک مقیم رہے) پھر کوہاٹی دروازہ میں اپنا ذاتی مکان خریدا تو وہاں منتقل ہو گئے۔

اب وہ سیاست سے زیادہ... پشتو ادب کو وقت دینے لگے تھے۔ ادارہ اشاعت سرحد کے ذریعے نئے ادیب و شعراء متعارف کرا رہے تھے۔ پہلے ادیبوں کو منشی کا نام دیا

جاتا تھا۔ انہوں نے منشی کا لفظ ہٹا کر انہیں معاشرے میں مقام دلایا۔ نئے لکھنے والوں کی حوصلہ افزائی کی۔ باقاعدگی سے انہیں معاوضہ دیتے۔

اس ادارے نے پشتو، فارسی اور اردو میں بہت ساری کتابوں کی اشاعت کی، بہت سی فارسی، اردو کتابوں کے ترجمے شائع کیے۔ اسکولوں کی تعلیم کے لیے حکومت سے درسی کتابوں کی اشاعت منظور کرائی۔ دوست محمد خان، امیر حمزہ خان شینواری، اجمل خٹک، فارغ بخاری، رضا ہمدانی، خاطر غزنوی کے علاوہ بھی دیگر نامور ادیبوں کی کتابوں کی اشاعت کی۔ کتابوں کی اشاعت کی آسانی کے لیے خلیق سنز پرنٹنگ پریس کا آغاز کیا۔

خلیق صاحب کی سب سے بڑی کمزوری ان کے دوست تھے۔ وہ اپنے دوستوں کو دعوتِ شیراز دینے میں مشہور تھے۔ ادارہ اشاعت سرحد میں بھی ان کے دوست کثرت سے آتے تھے۔ ان کی مہمان نوازی میں وہ کسر نہ اٹھاتے۔ ان کے دوستوں کی تعداد بہت زیادہ تھی مگر عبدالغفار خان، حضرت امین الحسنات پیر صاحب مانکی شریف، ارباب سکندر خان، فارغ بخاری، قاضی عبدالعلیم اثر، عبدالحکیم، دوست محمد خان کامل، ہمیش خلیل، ولی محمد طوفان، سید رسول رسا جیسے دوستوں کو زیادہ قربت حاصل تھی۔

پٹھانوں کے روایتی لباس سفید قمیص شلوار، سر پر پشاوری لنگا باندھے کاندھے پر خاکی چادر اور ہاتھ میں چھڑی لیے وہ گھر سے نکلتے تھے۔

ریڈیو پاکستان کے ڈائریکٹر جنرل قاضی احمد سعید کی وقت کی پابندی مشہور تھی۔ 1955ء میں خلیق صاحب کی اہلیہ کا انتقال ہوا تو جنازہ کے لیے جو وقت مقرر تھا اسی وقت کے مطابق جنازہ اٹھایا گیا۔ قاضی احمد سعید لیٹ آئے اور جنازے میں شامل نہ ہو سکے۔ اس واقعے کا ذکر قاضی احمد سعید ہر جگہ کرتے کہ خلیق صاحب نے پابندی وقت کے سلسلے میں میرا ریکارڈ توڑ دیا ہے۔

مرتے دم تک تعلق ریڈیو پاکستان پشاور سے ان کا رہا۔ وہ شاعر، تذکرہ نگار، مؤرخ، ادیب، ڈراما نگار، صحافی اور حقیقی معنوں میں سیاست دان تھے۔ کابل میں شہنشاہ ظاہر شاہ کی دعوت پر پشتو ادیبوں اور شاعروں کے ہمراہ کابل گئے۔ انہیں ساتھیوں کے ہمراہ محل میں ٹھہرایا گیا۔ دوسرے دن جب محفل سجی تو خلیق صاحب نے اپنا مقالہ پڑھا۔ ظاہر شاہ کو یہ مقالہ اتنا پسند آیا کہ اپنی کرسی سے اٹھ کر خلیق صاحب کو گلے لگایا، سونے کا تمغہ دیا اور کہا کہ واقعی خلیق پشتو ادب کے بہت بڑے ادیب ہیں۔

15 سال کی عمر میں انہوں نے لکھنا شروع کیا تھا۔ پون صدی تک قلم چلاتے رہے۔ پون صدی کہنے کو آسان ہے مگر یہ دو انسانوں کی اوسط عمر بنتی ہے۔ خلیق صاحب نے انگریزوں کے خلاف مسلمانوں میں بیداری پیدا کی۔ ایک انٹرویو میں کہتے ہیں۔ ''رحمٰن بابا اور خوش حال خان کی مادری زبان پشتو کی غم خواری میں ساری عمر گزری۔ مجھے اپنی زبان میں مذہب کی پہچان ملی۔ اپنی زندگی کے اختتام کے موقع پر اس نتیجے پر پہنچا ہوں کہ مجھے پشتو زبان کی خدمت پر مامور کیا گیا ہے۔ نئی نسل کو چاہیے کہ وہ پشتو میں لکھنا پڑھنا سیکھے اپنی مادری زبان میں خط و کتابت کرے تب میں سمجھوں گا کہ میری محنت رائیگاں نہیں گئی۔

خلیق صاحب نے پشتو زبان کی ترقی و ترویج کے لیے جو خواب دیکھے تھے وہ اب حقیقت کا روپ اختیار کر رہے ہیں۔ ان گنت پشتو اخبارات ہفت روزے، ماہوار میگزین کی اشاعت اس بات کی علامت ہے کہ پشتو ادب اب تیزی سے آگے بڑھ رہا ہے۔ پشتو نصاب کی منظوری کے لیے کالجوں، یونیورسٹیوں کا قیام خوش آیند فیصلہ ہے۔ آئے روز پشتو ادبی سیمینار، لائبریریوں کا قیام، ٹی وی پر پشتو چینلوں کی منظوری بھی پشتو ادب کی ترقی میں اہم زینہ ہے۔

خلیق صاحب نے جس ادبی گلشن کی آبیاری کی اب اس گلشن ادب سے کونپلوں میں نت نئے ادبی پھول اپنی خوشبو پھیلائے پشتو ادب میں ترقی کا باعث ہیں۔ ان میں بہت سے ممتاز ادیب، شاعر اور قومی شاعر جنہوں نے پشتو ادب کی اتنی خدمت کی جن کا تذکرہ چند لفظوں میں کرنا مشکل ہے۔ ان کی ایک کتاب زہ زمانہ پشتو بی اے کے لیے حکومت کی طرف سے منظور شدہ کتاب ہے۔

26 جنوری 1976ء کو ان کی زندگی کا سفر ختم ہوا۔ وہ 81 سال کی عمر میں ہم سے بچھڑ گئے۔ خلیق صاحب کے جنازے کا یہ عالم تھا کہ جیسے سارا شہر امڈ آیا ہو۔ ان کی وفات کا سوگ اب تک جاری ہے۔ جب تک اس دنیا میں پشتو زبان کا قیام ہوگا خلیق صاحب کا نام زندہ رہے گا۔

▲▲

زخم نہاں

زویا اعجاز

مسلمانوں کی دنیا جن افکار اور قدروں پر استوار ہے، وہ دیگر مذاہب کے پیروکاروں سے یکسر مختلف ہے۔ اسلامی دنیا میں ساری چیزیں خدا کے گرد گھومتی ہیں۔ مسلمانوں کی فکر و افکار اسی شرابِ عشق کے گرد گھومتی ہے۔ یہ شرابِ عشق ہی حب الوطنی کا درس دیتی ہے۔ وطن پر مرمٹنے کی للك تیز کرتی ہے۔ شہید ہو جانے کا جذبہ جگاتی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہماری فوج کا ہر سپاہی شہادت کی تمنا میں کچھ ایسے کام بھی کر جاتا ہے جس کی نظیر شاید ہی کہیں اور نظر آئے۔ پاك فوج کے اس جانباز نے بھی کچھ ایسا کر دکھایا تھا کہ بھارتی فوج کے کمانڈر انچیف نے اس مردِ میداں کو ایك نظر دیکھنے کی خواہش کا اظہار کیا کیونکہ اس نے پوری زندگی میں ایسا بہادر نہیں دیکھا تھا۔

پاک فوج کے ایک کیپٹن کی شجاعت کا ناقابلِ فراموش قصہ



وہ مضبوط اور متوازن قدموں سے چلتا اپنی منزل کی جانب رواں دواں تھا۔ اس کی شخصیت بظاہر بہت عام سی تھی لیکن مخصوص فوجی یونیفارم، بااعتماد انداز اور پُرشکوہ چال مقابل کو ایک بار تو سحر زدہ ضرور کر دیا کرتی تھی۔ اس کی یہ طلبی بلاشبہ اچانک تھی لیکن حالاتِ حاضرہ پر مکمل نظر کے باعث اسے یقین تھا کہ جلد ہی وہ کسی نہ کسی اہم ذمہ داری تفویض کرنے کے لیے طلب کر لیا جائے گا۔

دفتر میں پہنچ کر اس نے اپنے سینئر افسر کو بھرپور گرمجوش سلیوٹ کیا۔

''کیا حال ہے جوان؟'' افسر نے متانت سے دریافت کیا۔

''الحمدللہ سر!'' اس نے بھی باوقار انداز میں جواب دیا۔

''مورال کیسا ہے؟''

''اپ ٹو دی اسکائی سر!!''

''گڈ!'' افسر مسکرایا۔ ''کیپٹن احسان!! میں نے تمہیں نہایت حساس اور اہم ذمہ داری سونپنے کے لیے آج یہاں بلایا ہے۔''

''اس عزت افزائی کے لیے میں بہت ممنون ہوں سر!''

”دشمن ایک بار پھر اپنے بل سے نکل کر ہمارے وطن میں انتشار پھیلانے کے درپے ہوگیا ہے۔“

”آپ حکم کیجیے سر! ہم انہیں بل میں واپس بھیجنے کی بجائے اس سرزمین کو ان کے لیے قبرستان بنادیں گے۔“ کیپٹن کی آنکھوں میں ایک برق کوندی۔

”ویل دی اسپرٹ مائی بوائے!! دشمن کو بتادینا ہے کہ پاک سرزمین کے رکھوالے اسے مذموم ارادوں میں کبھی کامیاب نہیں ہونے دیں گے۔“

”ایسا ہی ہوگا سر!! انشاء اللہ ایسا ہی ہوگا۔“ کیپٹن احسان نے عزم سے کہا اور پھر اپنے افسر سے اس مشن کی دیگر تفصیلات ذہن نشین کرانے لگا۔

مملکت خداداد پاکستان پر بہت کٹھن وقت آن پڑا تھا۔ تقسیم ہند کو ابھی دو دہائیاں ہی تو گزری تھیں۔ صرف چوبیس سال گویا ریاست عہد شباب میں تھی۔ پانچ سال قبل ہونے والی جنگ کے بعد اہلیان وطن نے سکون کا سانس لیتے ہوئے یہ تصور کرلیا تھا کہ ازلی دشمن اب انہیں میلی نظر سے دیکھنے کی جسارت نہیں کرے گا۔ اس خیال سے وہ سب اس قدر مطمئن ہوئے کہ اپنے قرب وجوار ہی سے بے نیاز ہوگئے۔ دشمن نے بھی اس بے نیازی کا خوب فائدہ اٹھایا اور اس بار سابقہ غلطیوں سے اجتناب کرتے ہوئے پاکستان کے اندرونی مسائل میں دخل اندازی شروع کردی۔ گوکہ ریشہ دوانی قیام پاکستان کے فوراً بعد شروع ہو گئی تھی۔ قومی زبان بنگلہ کو بنا تحریک۔ وہ مسلسل ایدھن مہیا کررہا تھا۔ ہر سال 21 فروری کو یوم زبان منانے کے لیے اسکول کالج کے طلبہ کو استعمال کرنا۔ اس کی یہ حکمت عملی کافی حد تک کامیاب ہوتی بھی نظر آرہی تھی۔ مشرقی پاکستان میں اساتذہ کے روپ میں اپنے ایجنٹ تعینات کرکے ایک مکمل نسل کی زہریلی ذہنی آبیاری کرنے لگا تھا۔ اسی درمیان شیخ مجیب نے اگرتلہ جاکر بھارتی حکام سے میٹنگ بھی کرلی تھی جس کا راز فاش ہوتے ہی اسے اگرتلہ سازش کیس میں گرفتار کرلیا۔ اس گرفتاری کو بھارتی ایجنٹوں نے اپنے مقصد میں استعمال کرلیا۔ جس کے نتیجہ میں بنگالیوں کے احساس محرومی اور باغیانہ خیالات کو مزید جلا ملی۔ علیحدگی کی تحریک زور پکڑنے لگی۔ ان اندرونی مسائل سے بھرپور فائدہ اٹھاتے ہوئے بھارت نے سرحدی علاقوں میں اپنی فوج بھیجنے کا آغاز کردیا اور آج کی یہ کڑی بھی ایسے ہی ایک علاقہ میں کیپٹن احسان ملک کو ان سے نمٹنے کے لیے بھیجنے کی بابت تھی تاکہ دشمن کی سازش کو ناکام بنایا جاسکے۔

☆......☆

یکم مارچ 1971ء کو عوامی لیگ نے عدم تعاون تحریک شروع کردی۔ 9 مارچ کو ڈھاکا کے ریس کورس میدان میں شیخ مجیب نے اپنی تقریر میں کہا کہ ہم آزادی حاصل کرنے کے لیے ہر سطح پر لڑیں گے۔ گویا وطن سے غداری کا پہلا سبق عوام کو دے دیا گیا۔

مشرقی پاکستان کے ہر شہر ہر قصبے میں ہڑتالیں شروع ہوگئیں۔ مجیب کی مقبولیت دیکھ کر مولانا بھاشانی بھی غداری پر آمادہ ہوگیا۔ اس نے 23 مارچ کے روز یوم پاکستان کی تقریب رکھی۔ نیشنل عوامی پارٹی بھاشانی گروپ کے ارکان صبح سویرے بیت المکرم کے سامنے جمع ہوگئے۔ ایک کا خیال تھا کہ قومی پرچم کو سلامی دی جائے گی مگر اس نے سرخ و سبز رنگ والا بنگلہ دیشی پرچم لہرا کر سلامی دی اور کہا۔ ”عوامی لیگ چھ نکات، میرا ایک نکات، ہمارا ملک آزاد کرو۔“

پرچم لہرا کر وہ انڈیا فرار ہوگیا۔ عوام میں چھپے بھارتی ایجنٹوں نے اس مطالبے کو جائز قرار دے کر شور مچانا شروع کردیا۔ مجبوراً پاک فوج کو 24 جنوری کے روز حالات سنبھالنے کے لیے میدان میں آنا پڑا۔

سرحدی علاقوں میں شورشیں بڑھتی ہی چلی جارہی تھیں۔ ’جمالپور‘ بھی ایسا ہی ایک علاقہ تھا جس کے سب سیکٹر ’کمالپور‘ کی حفاظت 31 بلوچ رجمنٹ کو سونپی گئی تھی۔ اس رجمنٹ کی کمان لیفٹیننٹ کرنل سلطان کے سپرد تھی۔ ان کی بہادری اور پیشہ ورانہ اہمیت مسلمہ تھی۔

کمالپور ایک سرحدی علاقہ تھا جسے ڈھاکا کا ’گیٹ وے‘ بھی کہا جاتا تھا۔ دشمن کی دراندازی بڑھتے ہی پاکستانی فوج کو یہاں ایک فوجی کیمپ قائم کرنا پڑا۔ یہ کیمپ بے حد اہمیت کا حامل تھا کیونکہ ناکامی کی صورت میں پاکستانی فوج جمالپور اور پھر ڈھاکا سے اپنا قبضہ مکمل طور پر کھو بیٹھتی۔

ابتدائی طور پر وہاں کنکریٹ کے ’بنکر‘ بنائے گئے جن کی چھتیں ’شیل پروف‘ تھیں۔ ان بنکرز سے باہمی رابطہ کے لیے خصوصی مواصلاتی خندقیں کھودنے کا اہتمام کیا گیا۔ دفاعی نقطہ نظر سے بارودی سرنگیں بھی بچھائی گئیں۔

یہ اہم ترین علاقہ تین چھوٹی چھوٹی پوسٹس پر مشتمل تھا اور اس کا دفاع کیپٹن احسان ملک کے لیے بہت نازک ذمہ داری تھی۔ اس کے پاس نفری میں 31 بلوچ رجمنٹ کے ’ستر‘ جوانوں کے علاوہ کم و بیش اتنی ہی تعداد میں مجاہد فورس

پاکستان کے پیرا ملٹری بوائے اسکاؤٹس تھے۔ دفاع کی یہ ذمہ داری ہرگز آسان نہ تھی۔ سرحدی پوسٹس لگ بھگ ’دو میل‘ تک طویل تھیں۔ کسی بھی فوج کے لیے اتنے طویل فرنٹ کی حفاظت کرنا ناممکن امر ہوتا ہے لیکن حالات ایسے تھے کہ یہ پُرمشقت فرائض بہرصورت ادا کرنے تھے۔

اپنے جوانوں کے ساتھ کیپٹن احسان ملک نے کمالپور میں محاذ سنبھالا تو خود اسے بھی علم نہ تھا کہ جوش جنوں اور شہادت کی آرزو سے قطع نظر قدرت نے اسے ایک ایسے کام کے لیے منتخب کرلیا ہے جو تاریخ میں اسے شہید سے بھی بڑھ کر رتبہ عطا کرکے امر کردے گا۔

☆......☆

اب ذرا دوسری طرف بھارت کا حال بھی ملاحظہ ہو۔

حکمرانوں کا جنگی جنون سر چڑھ کر بول رہا تھا۔ متحدہ ہندوستان کے بٹوارے، پاکستان کا قیام ان کے لیے گناہ کے مترادف تھا۔ ناقابل معافی تھا۔ بھارت کا 95 بریگیڈ گروپ حملے کے لیے مکمل طور پر تیار تھا۔ اس بریگیڈ کی کمان ’بریگیڈیئر ہردت سنگھ کلیر‘ کے پاس تھی۔

عمومی طور پر ایک مکمل بریگیڈ تین انفنٹری اور دو بٹالین پر مشتمل ہوتا ہے لیکن مذکورہ بریگیڈ گروپ میں چار انفنٹری بٹالین کے علاوہ ٹینک اور توپ خانہ کی مکمل رجمنٹس کے ساتھ ساتھ تقریباً دو بٹالین تربیت یافتہ ’سفاک مکتی باہنی‘ بھی موجود تھیں۔

(فوجی اصطلاح میں بٹالین ایسا ملٹری یونٹ ہوتا ہے جو عموماً 300 تا 800 فوجیوں پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسے مختلف کمپنیز میں بھی منقسم کیا جاسکتا ہے۔ کمپنی میں 80 تا 150 کی تعداد میں فوجی ہوتے ہیں جو کسی کیپٹن یا میجر کے ماتحت ہوتے ہیں)

بریگیڈیئر کلیر ذاتی حیثیت میں بھی بری طرح جنگی جنون میں مبتلا تھا۔ پاکستان کی کمزوریوں سے آگاہی کے بعد اسے اپنے تئیں نفسیاتی برتری حاصل تھی۔ اس کے ایک اعلیٰ افسر ’جنرل گوربخش سنگھ‘ کے مکمل تعاون نے کلیر کے حوصلے کئی گنا بڑھا دیے تھے۔ اپنی بہادری ’برتری اور جنگجوانہ صلاحیتیں ثابت کرنے کے لیے وہ پیشہ ورانہ اخلاقیات کی دھجیاں اڑانے سے بھی چوکنے والا نہیں تھا۔ پاکستان جیسے روایتی دشمن کے خلاف اپنی دلیری، فہم و فراست اور انتظامی خوبیوں کا سکہ جماکر اعلیٰ قیادت کا اعتماد جیتنے کا نادر موقع وہ کیونکر ضائع کرسکتا تھا۔ اس کے شاطر دماغ نے ساری صورتِ حال کا جائزہ لے کر جولائی میں گوریلا جنگ کا آغاز کردیا۔ اس نے مکتی باہنی کے نام پر اپنی فوج میں چند گروپس تشکیل دیے تاکہ پاکستانی علاقوں میں گوریلا کارروائیوں کے ذریعے زیادہ سے زیادہ انتشار پھیلایا جاسکے۔ بریگیڈیئر کلیر کو اپنی کامیابی کا صد فیصد یقین تھا لیکن پھر اس کا سامنا کیپٹن احسان ملک سے ہوگیا۔

☆......☆

سرما کا آغاز ہوچکا تھا۔

کمالپور میں تعینات وہ فوجی موسم کی سختیوں ’تہواروں کی آمد‘ ذاتی غم یا خوشی سے مکمل بے نیاز تھے۔ ذاتی زندگی کا تصور اب صرف مملکت کی حفاظت کے مقدس فرض میں ڈھل چکا تھا۔ اپنی سرزمین کے ہر ایک چپے کی حفاظت کا یہ فرض انہیں ہر خارجی عمل سے بیگانہ کیے ہوئے تھا۔ شہادت کی آرزو نے یہ سفر بہت سہل کردیا تھا۔

بھارتی فوج کی جانب سے اب تک 22 اکتوبر اور 14 نومبر کو بٹالین سطح کے دو شدید حملے ہوچکے تھے لیکن احسان ملک کی پُرجوش قیادت اور معاملہ فہمی انہیں بھارتی نقصان سے محفوظ رکھے ہوئے تھی۔ پاکستانی فوج اپنی جگہ سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کے لیے تیار نہیں تھی۔

نومبر کے تیسرے ہفتے کا آغاز ہوچکا تھا۔ دھند آلود ’صبحیں‘ کہرے سے ٹھٹھری شامیں ’قرب وجوار میں بارودی بارش رگوں میں خون گرمائے رکھتی تھی۔ اس روز کیپٹن کی نظریں افق کو اپنی لپیٹ میں لیے دھند پر تھیں۔ کشادہ پیشانی پر کبھی کوئی شکن بھی ابھر آتی۔

”کیا سوچ رہے ہیں جناب؟“ ایک قریبی ساتھی نے نہایت اپنائیت سے دریافت کیا۔ ”آپ کی نظریں شاید کوئی خاص نکتہ تلاش کررہی ہیں۔“

”ہاں! شاید تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو۔ دھند میں لپٹے اس آسمان کو دیکھ کر یونہی ایک خیال سا دل میں ابھرا تھا۔“ کیپٹن نے ایک گہری سانس لی۔

”وہ کیا بھلا؟“

”ہم اور ہمارے یہ بھائی بھی تو اسی صورت حال کا شکار ہیں۔ ہمارے مابین ایسا ہی ایک پردہ تن چکا ہے جس سے دشمن بھرپور فائدہ اٹھا رہا ہے۔“

”پچھلے دو حملوں میں ناکامی سے اسے کافی افاقہ ہوا ہوگا۔ ہم ان کے لیے تر نوالہ تو ہرگز ثابت نہیں ہوں

گے۔‘‘

’’درست کہا لیکن اب وہ ایک حملہ اور کریں گے۔ اس بار یہ حملہ پہلے سے بھی شدید ہوگا۔ سابقہ ناکامیوں نے انہیں زخمی ناگ بنا دیا ہے اور یہ ناگ اپنا زہر ضرور اگلے گا۔‘‘

’’ہم سب تیار ہیں جناب! فرض کی اس راہ میں دشمن کو جہنم واصل کرنے یا خود شہادت کے مرتبے پر فائز ہونے کے لیے تو ہم نہ جانے کب سے منتظر ہیں۔‘‘

’’گڈ!! دشمن کو کبھی آسان نہیں سمجھنا۔‘‘ کیپٹن نے مسکراتے ہوئے کہا تو ساتھی نے بھی اثبات میں سر ہلا دیا۔

کیپٹن احسان ملک کی معاملہ فہمی درست سمت ہی اشارہ کررہی تھی۔ بریگیڈیئر کلیر کی تلملاہٹ اور طیش تمام حدود پار کرچکے تھے۔ دو حملوں میں ناکامی کے اثرات اب اس کی سپاہ پر بھی جھلکنے لگے تھے۔ دبی دبی مایوس سرگوشیاں بھی اس کی سماعت سے پوشیدہ نہیں تھیں۔ اس صورتِ حال نے اس کے لیے دہرے مسائل پیدا کردیے۔ کسی بھی فوجی کا سب سے بڑا ہتھیار اس کا جذبہ اور جنون ہوتا ہے اور اس کے فوجیوں کے یہ ہتھیار کند ہونے لگے تھے۔ بہت سوچ بچار کے بعد کلیر نے ایک پرانے لیکن آزمودہ نسخے پر عمل کرنے کا فیصلہ کیا۔

’’ہم سب یہاں دھرم کی رکھشا کے لیے آئے ہیں۔ اس جنگ کو معمولی مت سمجھو۔ اکھنڈ بھارت ہمارا حق ہے۔ ہزاروں سال پہلے یہ مُسلے ہمارے دیش میں آئے اپنے جادو منتروں سے بھولے بھالے لوگوں کو ورغلا کر اپنے دھرم میں آنے پر مجبور کیا۔ ان کے پاپ اتنے زیادہ ہیں کہ پرائشچت کی بھی کوئی گنجائش نہیں ہے۔ انہوں نے ہمارے گوردواروں اور مندروں کو ڈھا کر قیمتی مورتیاں پگھلادیں۔ ان پر موجود سونا چاندی پگھلا کر اپنی مسجدوں کی سیڑھیاں بنالیں۔ کیا یہ اپرادھ شما کیا جاسکتا ہے؟‘‘ وہ دھاڑ کر بولا۔

’’نہیں! بالکل بھی نہیں۔‘‘ سپاہیوں کی آنکھیں دہکنے لگیں۔

’’ہمارا دیش ماں سمان ہے۔ ان مُسلوں ہی کے کارن دیش کا بٹوارا ہوا۔ کیا یہ پاپ شما کیا جاسکتا ہے؟ ہندوستان اکھنڈ تھا اور اکھنڈ ہی رہے گا۔ واہگرو کی کرپا سے آج یہ موقع ملا ہے تو اسے ضائع نہیں کرنا۔ ان مُسلوں کو بتا دینا ہے کہ بھارت ماتا کے بیٹے اس کے اپمان کا بدلہ لینا بھی جانتے ہیں اور اپنا حق چھیننا بھی۔‘‘ جوشِ جذبات سے اس کا چہرا سرخ ہوتا چلا گیا۔ اسے بخوبی علم تھا کہ اپنی فوج کے جذبات اسی ایک طریقے سے بڑھائے جاسکتے ہیں ورنہ پاکستانی فوج کی دلیری اور جنگی حکمت عملی انہیں ہمہ وقت ایک نفسیاتی دباؤ میں مبتلا رکھتی تھی۔ ہاں! وہ بات الگ تھی کہ بریگیڈیئر کلیر یا کوئی بھی اور بھارتی افسر اس خوف نما دباؤ کو اپنے احساس برتری، ہتھیاروں کی فراوانی اور شاطرانہ چالوں سے خوابیدہ رکھنے کی کوشش کیا کرتے۔ یہ کوششیں کبھی تو کامیاب ہو جاتیں لیکن اکثر انہیں ناکامی ہی کا سامنا کرنا پڑتا تھا اور وہ وقت ان کے لیے بہت کڑا ثابت ہوا کرتا۔

’’ان کی کمر ٹوٹ چکی ہے۔ وہ زیادہ دیر ہمارے سامنے ٹک نہ سکیں گے۔ اس گرتی ہوئی دیوار کو کیول ایک اور دھکے کی ضرورت رہ گئی ہے۔ اپنے پرکھوں اور بھارت ماتا کے اپمان کا بدلہ لینے کی یہ خوش قسمتی ضائع نہیں کرنی تو کیا تم سب تیار ہو؟‘‘

’’بھارت ماتا کی جے بھارت ماتا کی جے......‘‘ سپاہی حسبِ توقع جوش میں آچکے تھے۔ بریگیڈیئر کلیر اور دیگر اعلیٰ افسران کے لیے یہ بہت بڑی کامیابی تھی۔ مٹھی بھر پاکستانی سپاہ کے سامنے اپنی بھاری بھرکم فوج کے حوصلے پست دیکھنا ان کے لیے نہایت اہانت آمیز اور باعث شرم تھا۔ ان جوانوں کو تر و تازہ اور توانا رکھنا بہت ضروری ہوچکا تھا۔

کلیر کے شیطانی دماغ میں کیپٹن احسان پر دباؤ بڑھانے کے بہت سے طریقے تھے۔ اس نے اگلے حملے سے دو روز قبل کیپٹن کی کمپنی پر بھاری توپ خانہ سے گولوں کی بارش کا حکم جاری کردیا۔

’’اس گولہ باری کی گھن گرج ان مسلوں سے بالکل سہی نہ جائے گی۔ ان کا انجام نشچت ہے۔‘‘ وہ اپنی مونچھیں سہلاتا طمانیت سے بڑبڑاتا تاروں بھرے آسمان کی طرف دیکھنے لگا۔

کہنہ سال فلک کے دربار میں نجم و قمر کی محفل سجی تھی۔ قمر نے تاسف سے اسے دیکھا۔ اس فلک اور ان درباریوں نے کائنات کے روزِ پیدائش ہی سے ایسے جانے کتنے خوش فہم اور خود اعتماد لوگوں کی حیران کن داستانیں دیکھی تھیں۔ صدیوں قبل ایسے ہی خوش فہم ابرہہ نے اپنے ہاتھیوں کی فوج کے ساتھ خانہ کعبہ پر حملہ کیا تھا تو بحکم الٰہی ابابیلوں کی چونچ سے گرنے والی کنکریوں کے نتیجہ میں بھس بن گئے ان ہاتھیوں کا نظارہ عبرتناک تھا۔ کربلا کے میدان میں یزیدیت کی شکست کے بعد تو یہ طے شدہ امر تھا کہ حسینیت کے پیروکار آئندہ اسی میراث پر عمل پیرا رہیں گے۔

سرزمین بنگال پر برپا خیر و شر کے اس معرکہ کی داستان تو اب یہاں روز ہی دہرائی جاتی تھی۔ چند برس قبل اسی قوم کے چند نوجوانوں نے اپنے سینوں سے بم باندھ کر ٹینکوں تلے لیٹ کر ایک نئی مثال قائم کی تھی۔ کیپٹن احسان ملک بھی اسی قوم کا نمائندہ اور انہیں روایات کا وارث تھا۔

’’آنے والا وقت بہت سی نئی داستانیں رقم کرے گا۔‘‘ قمر نے کلیر کی مغرور خود اعتمادی اور احسان ملک کے عاجزانہ خلوص کو دیکھتے ہوئے اپنے ٹمٹماتے ہوئے درباریوں سے پیش گوئی کی۔

☆......☆

بریگیڈیئر کلیر کے حکم پر بھارتی توپ خانہ نے پاکستانی کیمپ پر اندھا دھند گولہ باری کی۔ کیپٹن احسان اور اس کے جوانوں کے حوصلے تاحال جواں تھے۔ دو روز کی اس تابڑ توڑ گولہ باری کے بعد کلیر کے اگلے حکم کے مطابق جب 13 گارڈز بٹالین نے پاکستانی فوج پر طے شدہ حکمت عملی کے مطابق حملہ کیا تو کیپٹن احسان ملک کی کمپنی نے بھرپور مزاحمت کی۔ زندگی کا اختتام جب موت ہی کو مقسوم ٹھہرایا گیا تھا تو اس کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر بغلگیر ہونے کا لطف بھی کچھ اور ہے۔

گولیوں کی تڑتڑاہٹ سے قرب و جوار دہل اٹھے تھے۔ ایک جانب عسکری طاقت کا غرور تھا تو دوسری سمت شوقِ شہادت اور تحفظ مملکت کا جنون۔ اس ٹکراؤ کے نتیجہ میں بھارتی فوج نے کمپنی کے عقبی علاقہ پر قبضہ کرکے بلاکنگ پوزیشنز قائم کرلیں۔ کیپٹن ملک کے پاس توپ خانہ کی کوئی مدد نہ تھی جس کے باعث بلوچ رجمنٹ اس علاقہ کے دفاع میں کامیاب نہ ہوسکی۔ اس قبضہ کے بعد احسان ملک کی پوسٹ اپنے یونٹ سے کٹ گئی۔ سپلائی کا بھی کوئی رستہ باقی نہ رہا۔ بظاہر یہ بھارتی فوج کے لیے بہت بڑی کامیابی تھی۔ کسی بھی پوسٹ کا یونٹ سے رابطہ منقطع ہونے کا مطلب یہی ہوتا ہے کہ انہیں ہتھیار، راشن اور کسی بھی قسم کی عسکری مدد کا اب کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

’’گرتی ہوئی دیوار کو ایک اور دھکے کی جرورت رہ گئی ہے۔‘‘

’’رسی جل گئی ہے۔ بل بھی نکل جائیں گے۔‘‘

’’بھارت ماتا کی جے آج پاکستانی سینا جرور ہتھیار

ڈالنے پر مشورے کرے گی۔"

"ہاں بھئی!! کیوں نہ کریں؟ اپنی جان تو سب ہی کو پیاری ہوتی ہے۔" تکبر اور خود اعتمادی کے نشے میں چور بھارتی سپاہ اور افسران کے تبصرے جاری تھے لیکن وہ یہ بات نہیں جانتے تھے کہ پاکستانی کیمپ میں آیندہ حکمت عملی پر غور و فکر تو ہو رہا تھا لیکن ولولہ اور جنون آج بھی آسمان سے باتیں کرتے دکھائی دیتے تھے۔

"کمپنی کا یونٹ سے رابطہ منقطع ہونا اچھا ثابت نہیں ہوگا۔" ایک فوجی اہلکار نے گھمبیر لہجے میں کہا۔

"جس وقت ہم سر پر کفن باندھے اس مہم پر روانہ ہوئے تھے نفع و نقصان کے تصور سے تو اسی وقت مبرا ہو گئے تھے۔" کیپٹن احسان نے جواب دیا۔ وہ گاہے بگاہے بھی جوانوں کے ساتھ کسی نہ کسی طرح وقت ضرور گزارتا تھا۔ اس کے کندھوں پر سپہ سالاری جیسی اہم ترین ذمہ داری اس بات کی متقاضی تھی کہ اپنے سپاہیوں کے حوصلے اور ہمت توانا رکھے۔ "خیر و شر کا یہ معرکہ پہلی دفعہ تو وقوع پذیر نہیں ہوا۔ کائنات کے روز پیدائش سے ہی یہ تسلسل جاری ہے۔ ہم بے حد خوش قسمت ہیں کہ ایسی درخشندہ روایات کے وارث قرار پائے ہیں۔ ہم سے قبل وفا، جرأت، ہمت اور قربانیوں کی انمول مثالیں قائم ہوئی ہیں۔ ہماری ماؤں نے لوری کی بجائے جن بہادروں کے کارنامے سنائے ہیں وہ آج بھی لہو میں حدت بن کر سمائے ہیں۔ آج ہمارے پاس بھی یہ موقع موجود ہے کہ شہادت کا درجہ پا کر اپنا نام تاریخ میں امر کرلیں۔ ہمارے وطن کی مائیں، بہنیں اپنی آیندہ نسلوں کو ہمارے نام سے آگاہ کریں۔ اگر آج اس نازک موقع پر ہم میں سے کسی نے بھی کمزوری دکھائی یا اپنے فرض سے کوتاہی کی تو روزِ آخرت اپنے نبی ﷺ کے روبرو کیسے ہو پائیں گے؟ اگر وہ ہم سے پوچھیں کہ میرے نواسے نے بے سروسامانی کے باوجود باطل کے سامنے سر نہ جھکایا تو تم نے ایسا کیونکر کر ڈالا؟ کیا اس کے بعد ہم ان کی شفاعت کے اہل ہو پائیں گے؟" کیپٹن احسان نے لمحاتی توقف کیا اور چٹانی لہجے میں گویا ہوا۔

"میں اپنی آخری گولی اور خون کی آخری بوند تک ہار نہیں مانوں گا۔"

"ہم...... ہم سب خون کے آخری قطرے اور اپنے آخری ہتھیار تک لڑیں گے۔ جھکنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ ہم بھی اپنی درخشندہ روایات کے وارث بنیں گے۔ شہید کی جو موت ہے وہ قوم کی حیات ہے۔" ان تھکن آلود زخمی لیکن پُرعزم نوجوانوں نے یک زبان ہو کر جواب دیا۔

"دشمن ہمیں بھوک سے مارنے کے درپے ہوگا، پیاس سے بھی آزمائے گا۔" کیپٹن نے مسکراتے ہوئے مستقبل قریب کی ایک جھلک دکھانی بھی ضروری سمجھا۔

"ہمارے نبی ﷺ اور ان کے اہلِ خانہ پر کفار نے تین سال تک ایسی آزمائشیں قائم رکھی تھیں۔ ان کے پائے استقامت میں لغزش نہ آئی تو ہم کیونکر سرِ تسلیم خم کر سکتے ہیں؟"

"شاباش میرے جوانو!! اپنا حوصلہ اور جذبہ یونہی سلامت رکھنا۔ تم اپنا عہد نبھانا۔ اللہ اپنا عہد نبھائے گا اور یاد رکھنا!!! اللہ ہرگز اپنے وعدے کے خلاف نہیں کرتا۔" کیپٹن کے چہرے پر ایک الوہی مسکراہٹ تھی۔

"خدا بخش!! ذرا اپنی آواز میں آج پھر سے وہ جادو تو جگانا۔" ایک سپاہی نے کھوئے کھوئے لیکن پُرجوش انداز میں کہا۔

خدا بخش اس کا مطمع نظر بھانپ گیا۔ اس نے بھی مسکراتے ہوئے کیپٹن کی طرف دیکھا اور اس کی چمکدار آنکھوں میں مثبت عندیہ پا کر ایک جذبے سے گویا ہوا:

"ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے...... کی لبھنی ایں وچ بازار کڑیے

ایہہ سودا نقد وی نئیں ملدا...... تو لبھدی پھریں ادھار کڑیے

ایہہ پتر وکاؤ چیز نئیں... مُل دے کے جھولی پا لیئے

ایہہ ایڈا استا مال نئیں ... جہیڑا جا کے لبھ لیا لئے لی

ایہہ دیس اپنے دی عزت توں جان اپنی دیندے وار کڑیے

ایہہ پتر ہٹاں تے نئیں وکدے... کی لبھنی ایں وچ بازار کڑیے

ایہہ سودا نقد وی نئیں ملدا... تو لبھدی پھریں ادھار کڑیے"

(وطن کے یہ سجیلے جوان بہت انمول ہیں۔ یہ ایسی جنس ہرگز نہیں جو کوئی بھی انہیں بازار سے خرید سکے۔ یہ اپنے دیس کی عزت کے لیے جان قربان کر دینے کا چٹانی حوصلہ رکھتے ہیں)

رات قطرہ قطرہ پگھل رہی تھی۔ خدا بخش کی خوبصورت آواز میں لہو گرما دینے والے گیت کے وہ بول، ہتھیاروں کا سرد لمس اور فضا میں رچی خنکی رگ و جاں میں زندگی کی ایک نئی جوت جگا رہی تھی۔ وہ زندگی جس کے بعد کوئی موت نہیں، وہ زندگی جس میں ربِ کائنات نے ہر قسم کی نعمتوں سے سرفرازی کا وعدہ فرمایا ہے، وہ زندگی جس کا خواب ہر سپاہی کی آنکھوں میں بستا ہے۔

☆......☆

اگلی صبح بریگیڈیئر کلیر اور اس کے ساتھیوں کے لیے بھی بہت پُرجوش تھی۔

انہیں علم تھا کہ یونٹ سے کٹنے کے بعد پاکستانی عسکری اعلیٰ انتظامیہ اپنے جوانوں کو کسی صورت بے یار و مددگار نہیں چھوڑے گی اور انہیں کسی نہ کسی طور مدد ضرور فراہم کی جائے گی۔ اس متوقع پارٹی پر حملہ اور ان کے مبینہ مشن میں ناکام کرنے کا خیال انہیں ہواؤں میں اڑا رہا تھا۔

ان کی توقعات کے عین مطابق 3 دسمبر کو 31 بلوچ رجمنٹ کے میجر محمد ایوب نے اپنے چند سپاہیوں کے ہمراہ 13 گارڈز بٹالین کی بلاکنگ پوزیشن پر حملہ کر دیا۔ سپلائی اور راشن پہنچانے کی کوشش بہرحال ناکام ثابت ہوئی۔ میجر ایوب نے اگلے ہی روز ایک بار پھر کیپٹن احسان تک رسائی کی بھرپور سعی کی لیکن کامیابی اس بار بھی مقدر نہ بن سکی۔ میجر نے بھارتی فوج کو بے شمار جانی نقصان پہنچانے کے بعد جامِ شہادت نوش کیا۔ بریگیڈیئر کلیر کو اس جانب سے بھی ایسی مزاحمت کی توقع نہیں تھی۔ حقیقت تو یہ ہے کہ باطل و شر کے دل و دماغ میں خیر کی جانب سے ایک ذرا سی پیش قدمی بھی اصل ماخذ سے کئی گنا مایوسی و افسردگی برپا کر دیا کرتی ہے۔ مسلم قوم کی جرأت و بہادری کے اوصاف مسلمہ ہیں اور ان سے ٹکراؤ کی صورت میں ماضی قریب و بعید کی ہزیمت ناقابلِ فراموش۔ اس بظاہر معمولی سی امدادی پارٹی کے ہاتھوں ہونے والے جانی نقصان اور کیپٹن احسان ملک کی کمپنی کی جان توڑ مزاحمت نے انہیں عجیب نفسیاتی دباؤ میں مبتلا کر رکھا تھا۔

کیپٹن ملک کے ڈیڑھ سو سے بھی کم جوانوں پر کلیر کی مکمل بریگیڈ کے حملوں کی وہ ناکامی کوئی معمولی واقعہ ہرگز نہ تھی۔ نچلی سطح پر اس کی انتظامی اور عسکری صلاحیتوں پر دبے لفظوں میں سوال اٹھنے لگے جن سے کلیر بے خبر بھی نہ تھا۔ یہ جنگ اس کی ذاتی انا اور وقار کا مسئلہ بنتی جا رہی تھی۔

"یہ انسان ہیں یا دشت آتمائیں...... ایسی ڈھٹائی دکھا رہے ہیں یہ؟" وہ بے اختیار اپنی پیشہ وارانہ آن اور کر و فر بھول کر بے بسی اور جھنجلاہٹ کی انتہائی حدیں چھونے لگتا۔

"آپ ٹھیک کہہ رہے ہیں سر!! ان کی ڈھٹائی کبھی کبھی حیران کر دیتی ہے۔" قریبی اور سر چڑھے ساتھی بھی اس کی تائید کرتے۔

"لیکن اس بار ان کا پالا مجھ سے پڑا ہے...... بریگیڈیئر کلیر سے...... میں ان کا وہ حشر کروں گا کہ آیندہ کوئی پاکستانی ماں اپنی سنتان کو سینا میں بھیجنے سے پہلے خود ہی مار دیا کرے گی۔ میں ان کا وہ حال کروں گا کہ ان کی کئی نسلیں بھارت ماتا اور کلیر کے نام سے کانپا کریں گی۔" وہ طیش میں اپنے ہوش و حواس کھونے لگا تھا۔

"ایسا ہی ہوگا سر!! اوشیے ایسا ہی ہوگا۔" ساتھی اس کی خوشنودی کے لیے زور و شور سے کہتے۔

کلیر نے کیپٹن احسان ملک کی پوسٹ کے گرد اپنی تین بٹالین تعینات کرنے کے احکام صادر کر دیے۔

"انہیں بھوک پیاس سے مارنا ہے۔ یہ پاکستانی مُسلے کسی بھی صورت زندہ نہیں بچنے چاہئیں۔"

"سر!! حیرانی کی بات تو یہ ہے کہ ان کے پاس توپخانہ ہے اور نہ ہی کوئی راشن۔ پھر بھی یہ ہتھیار ڈال کر باہر کیوں نہیں آ رہے؟" ماتحت بھی زچ ہو کر استفسار کرتے۔

"ان کی موت ایسے ہی لکھی ہے۔ انہیں بھوکا پیاسا مرنے دو۔ ان کے ڈھانچے اسی طرح واپس پاکستان بھیجوں گا تاکہ آیندہ کوئی فوجی بننے کا سپنا بھی نہ دیکھے۔" وہ غصے میں اپنی مونچھوں کو بل دیتے ہوئے کہتا لیکن اصل حقیقت تو یہی تھی کہ وہ پورا بریگیڈ ایک کمپنی سے خوفزدہ ہو چکا تھا۔ بلند و بالا دعوے اور الفاظ کے زہریلے نشتر سے اپنی زخمی انا کو تسلیاں دیتے وہ شدید ذہنی دباؤ میں مبتلا ہو چکے تھے۔

☆......☆

کیپٹن احسان ملک کی کمپنی کو محصور ہوئے کئی دن بیت گئے تھے۔

اناج، پانی اور دیگر ضروریاتِ زندگی کی اشیاء سے محروم ان سپاہیوں کو کوئی بھی خارجی عمل دباؤ میں لانے سے ناکام تھا۔ وہ یقین اور ایمان کی دولت سے سرشار تھے۔ کامیابی کی صورت میں دشمن کو شکست ہوتی یا بصورت دیگر شہادت سے

بغلگیر ہوتے۔ ان کے لیے تو کوئی بھی سودا مہنگا نہ تھا۔

اس حصار کے بعد کلیر کا طیش اور نفرت مزید بے قابو ہوتی چلی گئی۔ اس نے ایک اور بٹالین کو حملہ کرنے کے احکامات صادر کردیے۔ شومئی قسمت اس بٹالین کو زیادہ جانی نقصان کا سامنا نہ کرنا پڑا اور وہ کمپنی پوزیشن کے قریب تر پہنچتی چلی گئی۔

وہ ایک بے مثال لمحہ تھا۔ کماپور کے اس میدان کارزار میں ایک جانب کئی روز سے بھوک' پیاس اور نیند جیسی جبلی ضروریات پر غالب پاکستانی فوجی دو مارٹر گنز اور رائفلوں کے ساتھ جبکہ دوسری سمت سیر شکم' طاقت کے نشے میں چور بھارتی سپاہی اپنے ہتھیاروں اور تمام تر پیشہ وارانہ اہلیت بروئے کار لاتے ہوئے ایک دوسرے کو پچھاڑنے کی کوششوں میں مصروف تھے۔

ہندوستانی فوج نے بڑی حکمت عملی سے مورچہ بندی کررکھی تھی۔ حملہ آور کمانڈنگ آفیسر کے ساتھ مورچے میں چار جوان تھے۔ فضا میں مارٹر گولوں اور رائفلز کے قہقہے ہرسو گونج رہے تھے۔

''ہم دشمن کے کافی قریب آچکے ہیں۔ بس ذرا سی ہمت اور کرو جوانو!! آج جشن کا سمے بہت پاس ہے۔'' کمانڈنگ آفیسر کے یہ الفاظ ابھی منہ میں ہی تھے کہ اس کے ساتھ والے مورچہ میں ایک مارٹر گولہ گرا۔ اگلے چند لمحے اس کے لیے بہت قیامت خیز تھے۔ مورچہ بند جوان ایک ہی پل میں چیتھڑوں کی صورت میں تبدیل ہوچکے تھے۔

کمانڈنگ آفیسر اور اس کے ہمراہ دیگر سپاہیوں کی بصارت یہ مناظر دیکھ کر پتھرا گئی۔ ان کے ساتھیوں کے جسمانی اعضاء کسی ہلکے پھلکے کپڑے یا کھلونوں کی مانند فضا میں اڑ رہے تھے۔ یہ مارٹر گولہ کیپٹن احسان ہی کی گن سے آیا تھا۔

''نعرہ تکبیر......'' احسان نے مسرور لہجہ میں باآواز بلند کہا۔

''اللہ اکبر۔'' جوانوں کی جوابی دھاڑ نے ان بھارتی سپاہیوں کی رہی سہی ہمت بھی ختم کردی۔ ٹھنڈے لوہے کا وہ لمس ان کی ہڈیوں میں گودا جمانے لگا تھا۔

''نعرہ تکبیر، اللہ اکبر۔'' کیپٹن احسان ملک کی وہ صدا ان کی سماعت میں گویا صور اسرافیل پھونک رہی تھی۔ کمانڈنگ آفیسر کے جسم پر لرزہ طاری ہونے لگا۔ اپنے اعضاء اور ذہن سے اس کا اختیار ختم ہوگیا۔ وہ تھر تھر کانپ رہا تھا۔ اپنے اردگرد بکھرے سپاہیوں کے کٹے پھٹے اعضاء کی دید اور سماعت میں گونجتے نعروں نے اسے مکمل مفلوج کردیا۔

''یہ انسان نہیں ہیں، بھگوان قسم!! یہ لوگ انسان نہیں ہیں، یہ کسی اور ہی سنسار کے باسی ہیں۔'' وہ ہذیانی انداز میں بولتے ہوئے اپنے مورچے سے واپس مڑ گیا۔ ''ہے بھگوان!! مجھے موت دے یا یہاں سے نکلنے کا کوئی اُپائے بتادے، یہ لوگ انسان ہی نہیں ہیں۔'' وہ اپنی آنکھوں کو زور سے میچتا تو کبھی کانوں پر ہاتھ رکھ لیتا لیکن امان کہیں بھی نہ تھی۔

خوف' دہشت اور اعصابی شکستگی دھیرے دھیرے پورے بریگیڈ میں پھیلنے لگی تھی۔ نوبت یہاں تک آن پہنچی کہ فوج کا کوئی بھی فرد اب مزید پیش قدمی کے لیے تیار ہی نہ تھا۔

''یہاں چلے آنا میرے جیون کی سب سے بڑی غلطی تھی۔'' اکثر کوئی نہ کوئی اہلکار اپنے ساتھی سے یہ کہتا پایا جاتا۔

''خاموش رہ مورکھ!! کسی اپھسر نے سن لیا تو کورٹ مارشل کردے گا۔'' دبے دبے لیکن خوفزدہ لہجہ میں مقابل کی آواز آتی۔

''تو کردیں کورٹ مارشل، اس بیگار سے تو جان چھوٹے گی۔ اگر یہ کورٹ مارشل نہ بھی کریں تو میں خود استعفیٰ دے دوں گا۔''

''کہتے تو ٹھیک ہی ہو۔ ہمیں انسانوں سے لڑنے کی ٹریننگ دی گئی تھی۔ کسی نے یہ کیوں نہ بتایا کہ یہاں ہمارا واسطہ انسانوں سے نہیں بلکہ کسی اور ہی مخلوق سے پڑتا ہے۔'' بددلی اور مایوسی ان میں مکمل طور پر سرایت کرچکی تھی۔

یہ صورت حال جب بہتری کی بجائے مزید ابتری کی طرف مائل ہوئی تو کلیر کو یہ یونٹ واپس بلاتے ہی بنی۔ زخمی انا ہر پل بلبلاتی رہتی تھی۔ تسکین نفس کی خاطر اس نے کچھ سوچ بچار کی اور پھر ایک حتمی فیصلہ پر پہنچ کر کاغذ قلم تھام لیا۔ وہ جمالپور کے سیکٹر کمانڈر 'لیفٹیننٹ کرنل سلطان' کو خط لکھ رہا تھا۔ چند لمحوں بعد اس کی پیشانی پر شکنوں کا جال غائب ہوگیا اور تنے ہوئے عضلات نرم ہونے لگے۔ اب اگلا مرحلہ یہ خط کرنل سلطان تک پہنچانے کا تھا۔ کلیر کے

شاطر دماغ نے اس مسئلہ کا حل بھی تلاش کرلیا تھا۔

☆......☆

وہ بوڑھا پاریش بنگالی اپنے خشک پڑتے ہونٹوں پر زبان پھیرتا کسی کشمکش میں مبتلا تھا۔

اسے جمالپور سیکٹر کے کمانڈر کرنل سلطان کو ایک خط پہنچانے کی ذمہ داری سونپی گئی تھی۔ ان لمحات میں وہ بیک وقت بہت دکھی اور تناؤ زدہ دکھائی دے رہا تھا۔ خط پڑھ کر کرنل کے چہرے پر نظر آنے والی ہلکی سی مسکراہٹ بھی اس کی ان کیفیات میں کوئی کمی نہیں کرپائی تھی۔

''بزرگوار کو عزت و احترام سے بٹھاؤ اور انہیں چائے پلائے۔'' کشادہ پیشانی اور روشن چہرے والے کرنل نے کہا۔

اس کے بعد انہوں نے اپنے اہم ساتھیوں کو طلب کیا۔

''کماپور میں ہمارے کیپٹن احسان ملک کی پوسٹ کا یونٹ سے رابطہ منقطع ہوچکا ہے۔ آج بھارتی بریگیڈیئر کلیر نے ہمیں ایک نامۂ محبت ارسال کیا ہے، ذرا ملاحظہ کیجیے۔'' انہوں نے متانت وقار سے کہا اور خط کا متن پڑھ کر سنانے لگے۔

''محترم کرنل!

آپ تمام اطراف سے گھیرے جاچکے ہیں۔ آپ کے لیے بچاؤ کا اب کوئی راستہ نہیں ہے۔ میرے پاس توپ خانہ اور ہوائی بمباری کے لامحدود وسائل موجود ہیں۔ اگر آپ کو اپنے جوانوں کی زندگی درکار ہے تو میرا مشورہ مان کر ہتھیار ڈال دیں۔ میں آپ کی معلومات میں اضافہ کے لیے یہ بھی بتاتا چلوں کہ اگر آپ کسی بنگالی' سویلین یا مکتی باہنی والوں کے ہتھے چڑھ گئے تو آپ کے ساتھ ناقابل بیان سلوک ہوسکتا ہے۔ آپ اپنی اعلیٰ قیادت کی جانب سے دھوکے میں مبتلا ہیں اور اصل حقائق آپ کی سوچ سے بھی زیادہ مایوس کن وخطرناک ہیں۔ ہمارے اسلحہ و ہمت کا مقابلہ اب آپ کے بس کی بات نہیں۔ آخری فیصلہ کن حملہ کے لیے مجھے چالیس بمبار طیارے مہیا کردیے گئے ہیں۔ میں آپ کو شام ساڑھے چھ بجے تک کی مہلت دیتا ہوں اور اُمید کرتا ہوں کہ میرے پیام بر سے ضابطہ اخلاق کے مطابق سلوک کیا جائے گا۔

فوری اور دانشمندانہ جواب کا منتظر ہوں۔''

کرنل سلطان سے خط کا متن سن کر وہاں موجود بھی اہلکاروں کے چہرے خوشی' فخر اور طیش کے ملے جلے جذبات سے دہکنے لگے۔

''کیا کہنے!! دشمن دباؤ میں آچکا ہے سر!''

''ہاں بالکل!! یہ خط اس کے منتشر اعصاب ہی کی نشانی ہے اور اس انتشار کے تابوت میں آخری کیل میرا جوابی خط ٹھونکے گا۔'' کرنل نے فوری طور پر جوابی متن تحریر کیا۔

''میرا صرف ایک مشورہ ہے سر!'' ایک لیفٹیننٹ نے مؤدبانہ کہا۔ ''اس خط کے ساتھ ایک بلٹ بھی رکھ دیجیے۔ دشمن کو اندازہ تو ہو کہ اس کا سامنا کس سے ہوتا ہے۔''

''گڈ شو!! ایسا ہی کریں گے۔ اس قاصد کو اندر بلاؤ اب۔'' کرنل کے حکم پر اس پاریش بنگالی کو طلب کرلیا گیا۔ اس کی عمر رسیدہ آنکھوں میں عجیب سا رنگ تھا۔

''کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی بزرگوار!!'' کرنل نے استفسار کیا۔

''نہیں بیٹا! میری تو دیرینہ خواہش پوری ہوگئی۔ بیٹا! برا نہ مناؤ تو ایک گستاخی کی اجازت ہے مجھے؟''

''کیسی خواہش؟ اور گستاخی؟'' کرنل الجھے۔

بوڑھے نے آگے بڑھ کر ان کے ہاتھ تھامے اور فرط محبت سے چوم کر اپنی نم آنکھوں سے لگالیے۔ اس کے آنسو کسی اندرونی کرب اور تپش کا حال سنا رہے تھے۔

''کیا ہوگیا بزرگوار؟ سنبھالیں خود کو۔'' انہوں نے محبت سے کہا۔

''ایک بات پوچھوں بابا جی؟'' ایک اور فوجی اہلکار نے اسے مخاطب کیا۔ ''کیا آپ جانتے ہیں کہ اس کاغذ میں کیا لکھا تھا؟''

''نہیں بیٹا!! مجھ کم علم کو کہاں علم ہوسکتا ہے؟ یہ کاغذ تو مجھے میرے بیٹے نے دیا تھا۔ بھارتی فوجی اکثر اس سے ملاقات کیا کرتے ہیں۔'' بوڑھے نے نظریں چرائیں۔ ''اتنا تو میں جان گیا ہوں کہ وہ بہت خوفزدہ تھے۔ وہ سمجھتے ہیں کہ اگر کوئی جوان یا اہلکار آئے گا تو زندہ واپس نہ لوٹے گا۔''

''آپ کو خوف محسوس نہیں ہوا ہم سے؟'' کرنل نے مسکراتے ہوئے پوچھا۔

''نہیں بیٹا!! تم تو محافظ ہو۔ رکھوالے ہو۔ تم سے کیسا خوف؟''

''ایک بات تو بتائیں بابا جی!! کیا واقعی مقامی لوگ ہم

سے اتنی نفرت کرتے ہیں کہ ہمیں دیکھتے ہی چیر پھاڑ دینے کے درپے ہو جائیں۔'' فوجی اہلکار کی یہ بات سن کر وہ اس طرح بدکا جیسے برقی رو اس کے بدن میں سرایت کر گئی ہو۔

''ہم ایک ہی کنبے کے افراد ہیں بیٹا! تقدیر کے وار نے ہم لوگوں کو دو گھرانوں میں تقسیم کر دیا تھا۔ یونہی جیسے کوئی بڑا اور چھوٹا بھائی، اب جہاں دو برتن ہوں وہ الجھ تو پڑتے ہی ہیں ناں!! یہ بھائی بھی یونہی الجھ گئے۔ اب بات جب تک گھر کی چار دیواری میں رہے بھرم بنی رہتی ہے۔ اگر گھر کی بات میں کوئی تیسرا کود پڑے تو غلط فہمیوں کی آندھی محبتوں کے شجر زمین بوس کر دیتی ہے۔ ہمارے ساتھ بھی تو یہی ہو رہا ہے۔ بڑے بھائی نے غلط فہمیاں دور کرنے کی کوشش ہی نہ کی۔ چھوٹا بھائی اپنے دل میں گلے شکوے دبائے گھٹن کی زندگی جیتا رہا اور یہی گھٹن اس کی اولاد میں منتقل ہو گئی۔'' وہ ایک ثانیے کے لیے خاموش ہوا اور پھر اذیت سے اپنے لب کچلتے ہوئے بولا:

''میں نے بٹوارے کے وقت اپنی قوم کا جذبہ جوان دیکھا۔ انہوں نے ہر ممکن قوت سے اپنا حق چھینا۔ لیکن آج اس جذبے پر وقت نے بدگمانیوں اور نفرت کی گرد بٹھا دی ہے۔ تم بس یہ سمجھ لو کہ یہ جذبہ محض گرد آلود ہوا ہے۔ ختم نہیں ہوا۔ بھلا جذبے بھی کبھی مرتے ہیں۔ ہم سب ایک ہی کلمہ کی لڑی میں پروئے ہیں۔ ہماری اساس سانجھی ہے۔ پانی بھی بھلا لاٹھی مارنے سے الگ ہوا ہے؟ میں تو بس اتنا کہوں گا کہ ہمارے جوانوں کو بھڑکایا گیا ہے اور وہ اپنے انجام سے بے نیاز ہو کر اس آگ میں کود پڑے ہیں۔''

''کیا آپ کے بیٹے بھی؟''

''ہاں بیٹا!! یہاں صرف وہی زندہ ہے جو جئے بنگلہ کا نعرہ لگائے۔ ہم نے ان گناہگار آنکھوں سے ہزاروں گھروں میں جوان اولاد کے لاشے اور بچیوں کو اپنی عصمت بچانے کے لیے تڑپتے دیکھا ہے۔ میں بہت کمزور انسان ہوں بیٹا!! اولاد کا جذبہ سلامت رکھ پایا اور نہ ہی کوئی انتہائی قدم اٹھا پایا۔ میرا گناہ صرف خاموشی ہے۔''

''ہم جانتے ہیں بابا!! ہمیں بھی آپ سب سے اتنی ہی محبت ہے۔''

''لیکن تم یہ نہیں جانتے کہ ہمارے بڑے مولانا صاحب کے خواب میں محمد علی جناح آئے تھے۔ بڑے ہی غمزدہ دکھائی دے رہے تھے۔ کہنے لگے: عبدالباری!! یہ میرے بچے کن راہوں کے مسافر بن گئے ہیں؟ انہیں سمجھاؤ کہ قوموں کے مستقبل کے لیے ذاتی رنجشیں زہر ثابت ہوا کرتی ہیں۔ عبدالباری صاحب اس روز سے بہت رنجیدہ ہیں۔ اکثر کہتے ہیں کہ کاش محمد علی جناح کچھ وقت اور جی لیتے تو اپنے ان نادان بچوں کی تربیت کر دیتے۔'' بوڑھا شخص پھوٹ پھوٹ کر رونے لگا۔

''آپ کی یہی محبتیں ہمارا سرمایہ اور زاد راہ ہیں۔ آپ پُرسکون ہو جائیں اور یہ جوابی خط انہیں پہنچا دیں۔'' کرنل نے شفقت سے کہا۔

''ٹھیک ہے بیٹا!! رب تمہارا حامی و ناصر ہو۔'' وہ خود کو سنبھالتا وہاں سے روانہ ہو گیا۔

کرنل سلطان اپنے ساتھیوں سے دیگر امور کے متعلق تبادلۂ خیال کرنے لگے۔ اس تمام تر مصروفیت میں بھی بریگیڈیئر کلیر کے کچھ الفاظ ان کے دل و دماغ میں کسی زہریلے کانٹے کی طرح چبھ رہے تھے۔

''آپ اپنی اعلیٰ قیادت کی جانب سے دھوکے میں مبتلا ہیں اور اصل حقائق آپ کے اندازوں سے بڑھ کر مایوس کن و خطرناک ہیں۔''

''نہیں!! ایسا ہرگز نہیں ہو سکتا۔ یہ محض دشمن کا ایک نفسیاتی جال ہے۔ وہ ہمیں دباؤ میں لینا چاہتا ہے۔'' انہوں نے پیشہ ورانہ تربیت اور قوت ارادی کی بدولت اپنی اس کیفیت پر قابو پا لیا۔

اس روز وہ گاہے بگاہے بہت اضطراب محسوس کرتے رہے۔ پردہ بصارت پر کیپٹن احسان ملک اور اپنے دیگر جوانوں کی شبیہ لہرائی۔ ان کی بے سروسامانی اور اٹوٹ حوصلے یاد آئے تو مضبوط دل میں بھی پدرانہ رقت پیدا ہونے لگی۔

''الٰہی!! اپنا کرم فرمانا!!! احسان اور اس کے جوانوں کو اپنی حفظ و امان میں رکھنا۔ مجھے ان کو کمک فراہم کرنے میں کامیابی عطا فرمانا۔'' انہوں نے تڑپ کر دعا کی۔

☆......☆

بریگیڈیئر کلیر اس وقت شدید مضطرب تھا۔

وہ جلے پاؤں کی بلی کی مانند ٹہلتا جوابی خط کا منتظر تھا۔ دشمن کو نفسیاتی دباؤ میں لانے کی خواہش اپنی جگہ مسلم لیکن اس کے بیان کردہ حقائق میں غلط باتیں بھری تھیں۔ اس کا انتظار زیادہ طویل ثابت نہ ہوا اور جوابی خط ہاتھ میں آتے ہی اس کی نظریں بے تابانہ انداز میں سطور پر پھسلنے لگیں۔

''محترم بریگیڈیئر صاحب!!

آپ کے خط لکھنے پر بندہ خاکسار بے حد ممنون اور آپ کی جانب سے خیریت کا طالب ہے۔

ہتھیار ڈالنا بعید از قیاس ہے۔ ہمیں اپنا سر کٹوانا منظور ہے لیکن جھکانا نہیں۔ یہ جان کر ہماری خوشی کا کوئی ٹھکانا نہیں کہ بالآخر دو بدو جنگ کا وہ وقت آن پہنچا ہے جس کے لیے ہم جانے کب سے منتظر تھے۔ باقی رہا سوال آپ کے چالیس بمبار طیاروں کا!! تو پیارے بریگیڈیئر!! یہ تعداد بہت کم ہے۔ آپ کے پاس اس سے کئی گنا طاقت ہونی چاہیے۔ مکتی باہنی والوں کو بھی ہماری جانب سے بہت پیار بھرا اسلام۔ قاصدین سے برتاؤ کی بابت آپ ہماری تاریخ اور ماضی سے لاعلم معلوم ہوتے ہیں۔ فوج میں ایک نہایت اہم عہدے پر تعینات ایک شخص کے لیے ایسی بے خبری اچھی نہیں۔ مجھے یقین ہے کہ اگلی بار میں آپ سے ایسے کسی خط کے توسط نصف ملاقات کی بجائے بالمشافہ ملاقات کا اعزاز حاصل کروں گا۔ اس وقت آپ کے ہاتھ میں قلم نہیں بلکہ اسٹین گن ہو گی۔ اُمید ہے کہ آپ کی قلمی صلاحیتوں کی طرح عسکری اہلیت میں بھی کوئی دم ہوگا۔

اس ملاقات تک کے لیے خدا حافظ۔

کمانڈر رجماپور سیکٹر۔''

خط میں جھلکتے تیور اور اس کے ساتھ موجود گولی دیکھ کر بریگیڈیئر کلیر کی مٹھیاں بھنچ گئیں۔ اسے مقابل کی جانب سے ایسے 'غیر دانشمندانہ' جواب اور عمل کی توقع نہیں تھی۔ اس خط نے اس کی انا پر ایک اور کاری ضرب لگائی تھی جس کی کسک اب اسے غیر معمولی فیصلے کرنے پر اکسا رہی تھی۔

اسی مخدوش ذہنی کیفیت میں کلیر نے بھارتی فضائیہ کی مدد طلب کرنے کا فیصلہ کر لیا۔ اکیس بھارتی طیاروں نے پاکستانی علاقہ میں صبح سے شام تک بمباری کی جس کے نتیجہ میں اس علاقے کے قرب و جوار کے نقوش ہی بدل کر رہ گئے۔ کلیر کو یقین ہو چلا تھا کہ اس بمباری کے بعد وہاں موجود فوجی جوان بھی لقمۂ اجل بن گئے ہوں گے۔ اس نے اپنے اہلکاروں کو پیش قدمی کا حکم دیا لیکن وہ سب ہنوز خوف اور مایوسی کے آسیب میں جکڑے تھے۔ یہ صورتِ حال انتہائی اہانت آمیز اور مایوس کن تھی۔ بریگیڈیئر کلیر غصہ سے پاگل پن کی انتہا چھونے لگا۔ اس کی یہ بے بسی اور ناکامی دیکھ کر ڈویژن کمانڈر جنرل گوربخش سنگھ نے علاقے کی کمان سنبھال لی۔ اس کے ذہن میں پاکستانی پوسٹ اور اہلکاروں سے نمٹنے کے کچھ مختلف لائحہ عمل تھے۔

افلاطون 428 اور 423 قبل مسیح کے دوران ایتھنز یا ایجینا میں پیدا ہوا۔ اس کے والد کا نام ارسٹون تھا۔ ڈائیجن یرٹس کے مطابق افلاطون کا خاندان ایتھنز کے شاہی خاندان کی باقیات میں سے تھا۔ افلاطون کی والدہ کا نام پرکشی ٹون تھا۔ اس کا تعلق ایتھنز کے معروف قانون دان اور شاعر سولون کے خاندان سے تھا۔ مورخ لیرٹس کے مطابق اور اپا لوئیس کی تحقیق کے مطابق، افلاطون بچپن میں ہی بہت ذہین تھا اس لیے اس نے لڑکپن اور نوجوانی میں بہت زیادہ مطالعہ کیا۔ اس نے اس وقت کی معروف کتابوں کو ازبر کر لیا تھا۔ وہ پڑھنے لکھنے میں بہت زیادہ محنت کیا کرتا تھا۔ افلاطون نے اپنے زمانے کے معروف اساتذہ سے گرامر، موسیقی، منطق، فلسفہ اور جمناسٹک میں مہارت حاصل کی۔ اس کے علاوہ وہ نوجوانی میں بہترین پہلوان بھی تھا۔ افلاطون جب سقراط سے ملا تو وہ فلسفے کے حوالے سے پہلا استاد کریٹیلس تھا اور افلاطون نے اپنی تعلیم مکمل کرنے کے بعد کئی سال تک اٹلی، سسلی، مصر اور سائیرن کی سیاحت کی۔ افلاطون کی تصنیف میں ''ریاست'' اور ''مکالماتِ افلاطون'' کلاسیک کا درجہ رکھتی ہیں۔

مرسلہ: آمنہ فیض الدین۔ منڈی بہاؤالدین

جنرل نے مکتی باہنی ہی کے ایک اور رکن کو طلب کیا اور اسے پیامبر بنا کر کیپٹن احسان ملک کے پاس روانہ کر دیا۔ پاکستانی علاقے میں قاعدے کے مطابق داخل ہوتے ہی بمباری سے پاؤڈر بن چکے قرب و جوار، گولیوں کے خول اور لہو رنگ زمین کے مناظر نے اس کا استقبال کیا۔ اس کا مضبوط پتہ ایک پل کے لیے پانی ہو گیا لیکن سر جھٹکتے اور حوصلہ مجتمع کرتے وہ پاکستانی سپہ سالار کے پاس جا پہنچا۔

''کہو! کیسے آنا ہوا؟'' کیپٹن نے پُرسکون اور مضبوط انداز میں دریافت کیا۔

''جنرل صاحب نے آپ کے لیے ایک پیغام بھیجا ہے۔'' اس نے اپنے اعصاب پر قابو پاتے ہوئے کہا۔ کیپٹن احسان ملک اور اس کے دبنگ تیور دیکھ کر اسے شدید حیرانی ہوئی تھی۔ اس کے لاشعور میں شاید یہ احساس

اشوکِ اعظم

بندوسار کی وفات کے بعد اس کا بیٹا اور چندر گپت کا پوتا اشوک 269 ق م میں تخت نشین ہوا۔ اس کے بارے میں مشہور انگریزی مؤرخ اور ادیب ایچ جی ویلز لکھتا ہے ''ہزاروں بادشاہوں میں جن کو جہاں پناہ، ان داتا، اعلیٰ حضرت اور خدا جانے کن کن القاب سے یاد کیا جاتا ہے اور جن کے ناموں سے تاریخ کے صفحات بھرے پڑے ہیں، اشوک کا نام اس طرح چمکتا ہے جیسے آسمان پر تنہا ایک ستارہ چمکتا ہو۔ والگا ندی سے لے کر جاپان تک اس کا نام اب بھی بڑے احترام سے لیا جاتا ہے۔ چین، تبت اور ہندوستان میں بھی جو اگرچہ اس کے مذہب کو ترک کر چکا ہے۔ اس عظمت کی روایات اب تک محفوظ ہیں۔ قسطنطین اور شارلیمان کے نام تو بہت کم لوگوں نے سنے ہوں گے لیکن اشوک کی یاد آج بھی ان سے کہیں زیادہ لوگوں میں باقی ہے۔ جب وہ تخت نشین ہوا تو اس کی سلطنت تمام شمالی اور وسطی ہند اور وسط ایشیا تک پھیلی ہوئی تھی۔ اس نے اپنے راج کے نویں سال میں کالنگا پر حملہ کیا تاکہ ہندوستان کے جنوبی اور جنوب مشرقی حصے بھی اپنی سلطنت میں شامل کرلے۔ کالنگا ہندوستان کے مشرقی ساحل پر مہاندی گوداوری اور کرشنا ندی کے درمیان واقع تھا جسے آج اڑیسہ کہا جاتا ہے۔ کالنگا والوں نے بڑی بہادری سے مقابلہ کیا لیکن آخرکار زبردست کشت و خون کے بعد انہیں زیر کرلیا۔ اشوک اس جنگ اور کشت و خون سے بہت متاثر ہوا۔ وہ جنگ اور اس کے لوازمات سے بے انتہا متنفر ہوگیا اور اس کے بعد اس نے کوئی جنگ نہیں کی۔ جنوب کے ایک چھوٹے سے علاقے کے علاوہ سارا ہندوستان اس کے زیر نگیں تھا اور اس کے لیے نہایت آسان تھا کہ وہ اسے بھی فتح کرلیتا لیکن اس نے ایسا نہیں کیا۔ ایچ جی ویلیز لکھتا ہے: ''دنیا کی تاریخ میں فوج کشی کرنے والے بادشاہوں میں یہ پہلی مثال ہے جس نے فتح حاصل کرنے کے بعد جنگ سے توبہ کرلی۔''

مرسلہ: مظہر حسن۔ مظفر گڑھ

کلبلا رہا تھا کہ یہاں اس کا سامنا مفلوک الحال، تھکے ماندہ وجود اور چراغِ آخر شب سی کیفیت لیے مایوس افراد سے ہوگا لیکن یہاں تو گنگا ہی الٹی بہہ رہی تھی۔ وہ چوکس اور بااعتماد جوانوں کو ترچھی نظروں سے دیکھنے لگا۔

دوسری جانب اس کی سوچوں اور تحفظات سے بے نیاز کیپٹن احسان نے متبسم انداز میں دشمن کا محبت نامہ کھول لیا جہاں اس کی اعصابی شکستگی الفاظ کی صورت میں بکھری نظر آرہی تھی۔

''تمہاری یہ سبھی کوششیں لاحاصل اور بہادری احمقانہ ہے۔ تم جو بھی کرو ہماری سینا ہر قیمت پر یہ پوسٹ ختم کردے گی۔ انسانیت کے ناتے تمہیں آخری بار سمجھا رہے ہیں کہ خود پر اور اپنے ساتھیوں پر ترس کھاؤ اور مزید اموات سے بچنے کے لیے مقابلہ ختم کرکے ہتھیار ڈال دو۔''

''تو تمہارا جنرل انسانیت کے ناتے ہمیں جان بخشی اور میدان خالی کرنے کا مشورہ دے رہا ہے۔ خوب!! بہت خوب!'' اس کی مضبوط آواز اور چٹانی لہجے نے پیام لانے والے کے جسم میں پھریری دوڑادی۔

کیپٹن کے یہ الفاظ سن کر آس پاس موجود جوانوں کے چہروں پر بھی چٹانی سختی در آئی تھی۔

''میرا جوابی پیغام بھی لے جاؤ اپنے جنرل کے پاس۔'' کیپٹن احسان نے اس کی آنکھوں میں جھانک کر کہا۔

''ہاں ضرور! کیوں نہیں؟'' اس نے اپنے خشک ہونٹوں پر زبان پھیری۔ جانے کیوں اسے کسی انہونی کا احساس ہونے لگا تھا۔ مسلم فوج کے بارے میں معلومات ہونے کی بدولت اسے اتنا تو یقین تھا کہ وہ اسے کسی بھی قسم کا جانی نقصان نہیں پہنچا سکتے۔

''کیا کرنا چاہتا ہے آخر یہ؟'' اس نے کیپٹن کو بندوق بلند کرتے دیکھ کر سوچا۔

کیپٹن احسان نے نہایت وقار اور اعتماد سے زوردار ہوائی فائرنگ کی اور سنسناتے لہجے میں گویا ہوا؛

''میرا یہ جواب اپنے 'بڑوں' تک پہنچا دینا۔ ہم یہاں سر پر کفن باندھ کر آئے ہیں۔ فتح یا شہادت۔ اس کے سوا تیسرا کوئی راستہ نہیں۔''

مکتی باہنی کے اس اہلکار نے یہ پیغام من وعن جنرل گوربخش سنگھ کو پہنچادیا۔ دشمن کے یہ تیور اس کے لیے بھی ناقابلِ برداشت تھے۔ جنرل نے اگلے روز ایک بار

پھر شدید بمباری کا حکم دے دیا۔

یہ بمباری بھی سارا دن جاری رہی۔ اس شدید حملے کے بعد انہیں یقین ہوچلا تھا کہ پاکستانی کیمپ مزاحمت کا ارادہ ترک کردے گا لیکن یہ بھی خام خیالی ثابت ہوئی۔ اس روز کیپٹن احسان ملک کو ایک اور خط بھیجا گیا جس میں سابقہ مطالبہ دہرایا گیا تھا۔ کیپٹن کا جواب اس بار بھی شدید تر فائرنگ تھی۔

بھارتی کیمپ کے حوصلے اب پست ہوچکے تھے۔ انہوں نے ذہنی طور پر مقابل کی برتری تسلیم کرلی تھی۔ جنرل گوربخش سنگھ نے اس تمام ترصورتِ حال کی بابت اپنے 'بڑوں' کو آگاہ کردیا۔ عسکری انتظامیہ نے نہایت اعتماد سے انہیں یقین دہانی کروائی کہ بظاہر لاینحل یہ مسئلہ بہت جلد ایک منطقی انجام تک پہنچ جائے گا۔

☆......☆

کیپٹن احسان ملک کے چہرے پر اس وقت موت کی سی زردی کھنڈی تھی۔

اس کا وجود ایک ہولناک زلزلے کی زد میں محسوس ہوتا تھا۔ آنکھوں میں بے یقینی، دکھ، اذیت اور شدید کرب کے رنگ جھلک رہے تھے۔

''یہ کیا ہوگیا سر؟ ایسا ہو بھی کیسے سکتا ہے؟'' رنج سے چٹختی ایک آواز اس کی سماعت میں پڑی۔

''مجھے بھی اب تک یقین نہیں آرہا کہ میں نے جو سنا وہ کوئی بھیانک خواب نہیں تھا۔'' ایک اور صدا ابھری۔

تلخی و کرب میں ڈوبے یہ الفاظ احسان ملک کی اذیت دوچند کررہے تھے۔ کچھ لمحے قبل اسے ریڈیو پر اعلیٰ انتظامیہ کی جانب سے ہتھیار ڈالنے کی واضح ہدایت ملی تھی۔ اکیس روز سے کسی سیسہ پلائی دیوار کی طرح دشمن کی راہ روکے ترغیبات اور دھمکیوں کے جال نظرانداز کیے وہ اپنے جوانوں کے ساتھ بھارتی فوج کے لیے لوہے کا چنا ثابت ہوئے تھے۔ کسی مشکل گھڑی نے ان کا حوصلہ متزلزل نہیں کیا تھا تاہم اس نئی صورتِ حال نے انہیں کرب و شرمساری کے کانٹوں پر گھسیٹ کر لہولہان کردیا۔

''سر!! آپ حکم تو کریں۔ ہم اب بھی لڑنا چاہتے ہیں۔''

''میں تم سب کے جذبات کی قدر کرتا ہوں، خود میرا دل بھی اس فیصلہ کی بابت خون کے آنسو رو رہا ہے لیکن ہم سب ہی ایک عہد کی زنجیر سے بندھے ہیں۔ اطاعت امیر کا

1960ء کی دہائی کو پاکستانی موسیقی کے سنہرے دور کی حیثیت سے جانا جاتا ہے۔ اس دور میں ملکہ موسیقی روشن آراء بیگم، استاد امانت علی خاں، استاد فتح علی خاں، استاد نزاکت علی خاں، استاد سلامت علی خاں، استاد شریف خاں پونچھ والے۔ ستار نواز، کلارنٹ نواز، سوہنی خاں۔ پیانو بجانے والے ماسٹر صادق علی۔ استاد نبی بخش خاں سارنگی نواز، استاد شوکت علی اور استاد طالب حسین خان طبلہ نواز کلاسیکی موسیقی کے تابندہ ستارے تھے۔

☆☆☆

عام طور پر یہ خیال کیا جاتا ہے کہ برِاعظم میں کلاسیکی موسیقی ہندوؤں کی وجہ سے پھلی پھولی جب کہ حقیقت یہ نہیں ہے۔ جب مسلمان ہندوستان میں وارد ہوئے تو ہندوؤں میں دھروپد، چھند، کبت اور دوہا گانے کا رواج تھا۔ راجا خاں سنگھ کے درباری بخشو اور مچھو نے دھرو اور پد کو ملا کر گانا شروع کیا جس سے دھروپد کی گائیکی شروع ہوئی ''دھر'' کے معنی ٹھہرا ہوا اور ''پد'' کے معنی لفظ یا مرتبہ......دھروپد کے مزاج میں ٹھہراؤ اور دبدبہ ہے۔ اس کے چار حصے ہیں۔

1۔استھائی 2۔انترا۔ 3۔سنچاری۔ 4۔ابھوک۔

☆☆☆

پندرہویں صدی میں جون پور کے شاہانِ شرقیہ میں سے سلطان حسین شرقی نے ایک نئے ڈھنگ کا گانا ایجاد کیا اور اس کا نام خیال رکھا۔ ایک روایت یہ ہے کہ حضرت امیر خسروؒ نے دوسری ایجادات کے ساتھ ''خیال'' بھی ایجاد کیا۔ شاہد احمد دہلوی کا کہنا ہے کہ ''ممکن ہے یہ طریقہ امیر خسروی نے وضع کیا ہو مگر خیال کی ترویج کا سہرا سلطان حسین شرقی کے سر ہی ہے۔''

☆☆☆

مسلمان گویوں نے خیال (گائیکی) کو چار حصوں میں تقسیم کیا ہے۔ یعنی 1۔الاپ۔ 2۔استھائی۔ 3۔انترا۔ 4۔ترانہ۔ الاپ کو ایرانی موسیقی میں اہم سمجھا جاتا تھا۔ اسے ''ادا'' یا ''پیش'' بھی کہتے تھے۔ خیال گائیکی کی لطافت اور ریاض نے اسے اس بامِ عروج تک پہنچا دیا ہے جہاں اسے مسلمان گھرانوں کی میراث ہونے کا درجہ حاصل ہے۔ کلاسیکی موسیقی سولہویں صدی سے لے کر انیسویں صدی کے اواخر تک استادوں کی موسیقی بن چکی تھی یعنی ان صدیوں میں اکابر موسیقار، گت کار، ضلعی اور پکھاوجی استاد مسلمان تھے جنہوں نے ہندوستانی موسیقی کو وہ ہیئت اور اسالیب عطا کیے جو فی زمانہ بھارت اور پاکستان کی موسیقی میں رائج ہیں۔

مرسلہ: آفاق احمد خاں۔ کراچی

عہد، بغاوت کی بنیاد کیسے ڈال دیں؟'' کیپٹن نے اپنی اندرونی تپش پر بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔ وہ جانتا تھا کہ یہاں موجود بھی جوانوں کے دلوں میں بھی آتش فشاں دہک رہا ہے اور وہ ذاتی حیثیت میں دشمن کو تہس نہس کرنے کی خواہش میں مبتلا ہونے لگے ہیں لیکن عملی طور پر یہ بالکل ممکن نہ رہا تھا۔ پیشہ وارانہ تربیت اور اصول انہیں 'حکم عدولی' کی اجازت نہ دیتے تھے۔

وہ شام بہت بوجھل تھی۔ آسمان کے سرمئی کناروں سے جھلکتی سرخی انہیں اپنے حالِ دل سے مشابہ معلوم ہو رہی تھی۔ اکیس دن محصور رہنے کے دوران ایک پورے بریگیڈ کو فضائی طاقت 'توپخانہ یا ٹینک کی کسی بھی مدد کے بغیر روکے رکھنا کوئی آسان کام تو نہ تھا۔ بھوک' پیاس' نیند کے کاری وار اپنے وجود پر جھیلتے 'ڈبڈبائی آنکھوں اور زخم زخم دل لیے انہوں نے سفید جھنڈا لہرایا اور اس شام سات بجے بحکم انتظامیہ خود کو بھارتی فوج کے حوالے کر دیا۔

☆......☆

جنگ کے شعلے سرد ہو چکے تھے۔

قائداعظم جناح کا پاکستان دولخت ہو چکا تھا۔ متحدہ ہندوستان سے بٹوارے کے بعد حاصل کیا گیا وہ وطن اب عالمی نقشے پر دو الگ ناموں سے موجود تھا۔ معمولاتِ زندگی بظاہر اپنے معمول پر آ چکے تھے لیکن دلوں میں موجود اذیتوں کے وہ گھاؤ آج بھی تر و تازہ تھے۔

بھارتی فوج کا سالارِ اعظم فیلڈ مارشل مانک شا ان دنوں بحث کا موضوع تھا۔ فوجی اہلکاروں میں بھی گرما گرم تبصرے جاری رہتے۔

''سنا ہے کہ بابائے قوم نے اسے پاکستانی فوج میں شمولیت کی دعوت دی تھی کیونکہ اس کا تعلق فرنٹیئر فورس رجمنٹ سے تھا۔'' ایک ساتھی نے کہا۔

''ہاں! سنا تو میں نے بھی ہے لیکن اس نے بہرحال انکار کر دیا تھا۔'' دوسرے ساتھی نے رائے دی۔

''اپنے کیپٹن احسان کا تو وہ آج بھی بہت مداح ہے۔'' ایک اور اہلکار نے فخر و محبت سے کہا تو احسان خاموشی سے اس محفل سے اٹھ کر کھلے آسمان تلے بڑھ گیا۔

جنگ اور کمالپور میں ہتھیار ڈالنے کی وہ گھڑیاں اس کا کشادہ سینہ ہمیشہ ہی غم سے بوجھل کر دیا کرتی تھیں۔ اسے علم تھا کہ اپنی پوسٹ میں گذرے لمحات اور بہادری نے بھارتی فوجی افسران پر بہت گہرے اثرات مرتب کیے تھے۔ جنگ ختم ہونے کے بعد جنرل گوربخش سنگھ اور بریگیڈیئر کلیر تمام تر ذاتی اختلافات بالائے طاق رکھے ایک فوجی جیپ میں ہیڈ کوارٹر سے ملنے کے لیے بھی روانہ ہوئے تھے لیکن ایک بارودی سرنگ سے ٹکراؤ اور زخمی ہونے کے باعث یہ ملاقات نہ ہو پائی۔ فیلڈ مارشل مانک شا نے پاکستانی اعلیٰ عسکری قیادت کو کیپٹن احسان ملک کے لیے ایک خصوصی خط بھی ارسال کیا تھا جس میں اس کی یادگار مزاحمت اور بہادری پر کھلے دل سے خراجِ تحسین پیش کیا گیا تھا۔

مانک شا بانگ دہل اس بات کو تسلیم کرتا تھا کہ اس پوسٹ پر تعینات بھارتی فوجیوں کے ذہن میں آج بھی کیپٹن احسان کے ساتھ خونی ٹکراؤ کے نقوش موجود ہیں۔

''کیا ہوا بھئی؟ یہاں کیوں چلے آئے؟'' ایک قریبی ساتھی نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے پوچھا۔

''بس یونہی ذرا ہوا خوری کے لیے دل چاہ رہا تھا۔'' وہ باوقار انداز میں بولا۔

''تمہیں علم ہے کہ فیلڈ مارشل اب بھی تم سے ملاقات کا خواہشمند ہے۔ اس نے سالارِ اعظم سے بطور خاص تمہارا ذکر کیا کہ کیپٹن احسان ملک کے سب سے بڑے فوجی اعزاز کا مستحق ہے۔'' ساتھی کی بات پر اس کے ہونٹوں پر ایک پھیکی سی مسکراہٹ دوڑ گئی۔ ''ایک فوجی ہونے کے ناتے تم نے اپنا مقصد کسی نہ کسی حد تک تو پا ہی لیا ناں!! تم آج بھی دشمن کے دل و دماغ میں آسیب کی طرح موجود ہو۔''

''تم ٹھیک ہی کہہ رہے ہو گے لیکن میں نے جو پایا ہے وہ کمالپور کے اس لہو رنگ میدان جنگ میں ہونے والے احساسِ زیاں کے بدلے کچھ بھی نہیں۔ میرے وجود پر تعریف و ستائش کے ان گنت میڈلز بھی لگا دیے جائیں تو قلب و روح میں موجود زخم نہاں کبھی سچی خوشی محسوس ہی نہ ہونے دیں گے۔ ایک کسک ہمیشہ زہریلے کانٹے کی طرح اس زخم پر چبھتی رہے گی۔'' اس کے حلق میں تلخ نمی سی در آئی اور پردہ تصور پر ایک سرمئی آنچل کی جھلک چھب دکھانے لگی جس کے سرخ کناروں میں خدابخش اور جانے کتنے شہداء کا لہو شامل تھا۔

یہ تلخی' نمی' اذیت کا سلگتا دھواں اور ضبط تاحیات اس کے یونہی ہمراہی رہنے تھے۔

(اردو ورسائل اور انٹرنیٹ سے حاصل کردہ معلومات پر مبنی تحریر) ▲

اللہ رحیم و کریم کے صدقے وہ کب کس طرح اپنے بندوں کو انجانی خوشیوں سے نوازتا ہے یہ کسی کو علم نہیں ہوتا۔ کئی روز پہلے کی بات ہے، میرے بیٹے نے مجھ سے کہا۔

''ابو! نوید ماموں کا فون آیا تھا۔ ان کی بیٹی کی منگنی ہے۔ انہوں نے کہا ہے کہ میری خواہش ہے کہ دولہا بھائی اس تقریب میں ضرور شرکت کریں کیونکہ اب وہی ہمارے خاندان میں ایک بزرگ ہیں۔''

''تم نے نوید سے کہا نہیں کہ ابو اب کہیں آنے جانے کے قابل نہیں، نصف معذوری کی حالت میں ہیں۔''

''کہا تھا مگر وہ نہ مانے، ضد کرنے لگے کہ انہیں کسی طرح بھی لاؤ یہ تمہارا مجھ پر بڑا احسان ہوگا۔''

میں سوچ میں پڑ گیا۔ مجھے سوچتا ہوا دیکھ کر وہ بولا۔

''ابو! تھوڑی ہمت کیجیے ناں، ان کی خواہش بھی پوری ہو جائے گی اور بہت دنوں کے بچھڑے ہوئے بہت سے لوگوں سے آپ کی ملاقات بھی ہو جائے گی۔''

''ہاں...... مگر......''

''زیادہ سوچیے نہیں۔ آپ گھر سے گاڑی میں بیٹھیں گے تو تقریب کی جگہ پر جا کر اتریں گے۔ بس آپ کو تھوڑی

فلم نگری

بے مثال

انور فرہاد

اس فنکار کی روداد جس نے انتھک محنت سے ایک مقام حاصل کیا

قیامِ پاکستان کے بعد بے وسائل فلمی دنیا کو ازسرِ نو تعمیر کرنے کے لیے جب ہنر مندوں نے قدم بڑھائے تو لاتعداد مسائل منہ پھاڑے کھڑے تھے لیکن لٹ پٹ کر بمبئی کلکتہ سے آنے والے اور پہلے سے موجود ہنرمندوں نے دن رات ایک کر کے فلمی دنیا کو اوج پر پہنچا دیا۔ اس کارواں میں شامل ہونے والے نئے ہنرمندوں نے بھی بڑھ چڑھ کر اپنا حصہ ڈالا۔ انہی میں سے ایک زیرِ نظر روداد کا مرکزی کردار بھی ہے جس نے اس کارواں میں عرصہ بعد شمولیت اختیار کی مگر بے مثال ...ٹھہرا۔ اس نے کس طرح خود کو ایک کامیاب فنکار ثابت کیا اس کی تعریف نہ کرنا زیادتی ہے۔ اپنی لازوال اداکاری سے اس نے ایک دنیا کو متاثر کیا۔



دیر تک بیٹھنے کی ہمت کرنا پڑے گی۔"

اور یہ ہمت اور حوصلہ مجھے کرنا ہی پڑا یہ سوچ کر کہ دوسروں کی خوشی کے لیے تھوڑی جان ماری بھی کرنی چاہیے۔

تقریب ایک شادی ہال میں تھی۔ نوید مجھے دیکھ کر اور مجھ سے بغلگیر ہو کر اتنا خوش ہوا کہ سفر کی تمام تکلیف دور ہو گئی۔ اس نے کہا۔ "آیئے! سب سے پہلے آپ کو اپنی بہنوں، بھائیوں اور ان کے اہلِ خانہ سے ملاتا ہوں۔"

یہ تمام لوگ فرداً فرداً مجھ سے مل کر خوش ہوئے۔

"دولہا بھائی! آپ سے ملے مدت ہو گئی تھی۔ آج آپ کو دیکھ کر مل کر کتنی خوشی ہو رہی ہے، بتا نہیں سکتے۔"

"مجھے بھی خوشی ہو رہی ہے اور حیرت بھی۔ تمہارے بچے جنہیں اتنا سا دیکھا تھا ماشاءاللہ اتنے بڑے ہو گئے ہیں۔"

اسی دوران ایک خاتون اسٹک کے سہارے چلتے ہوئے ہمارے قریب آئیں، ناک پر سنہری فریم کا نظروں کا چشمہ، ہاتھ میں تسبیح، کمر جھکی ہوئی۔

"بھئی! یہ کون صاحب ہیں؟" انہوں نے قریب کر کے نوید سے پوچھا۔

"خالہ اماں! یہ ہمارے بہت بہت پیارے دولہا بھائی ہیں جو ایک مدت کے بعد میرے اصرار پر آئے ہیں۔" پھر نوید نے ان کا تعارف کرایا۔ "دولہا بھائی! یہ میری بہن نسرین کی خالہ ساس ہیں۔"

میں نے اپنی چندھیائی ہوئی نظروں سے انہیں ذرا غور سے دیکھتے ہوئے کہا۔ "آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔" پھر نوید سے کہا۔ "عجیب اتفاق ہے ان سے پہلے کبھی ملاقات نہیں ہوئی۔"

"کیسے ہوتی، یہ مستقل طور پر برطانیہ میں رہتی ہیں۔ شادی کے بعد ان کے میاں انہیں لندن لے گئے تھے۔ کبھی کبھار ہی پاکستان آنا ہوتا ہے۔"

"کیا نام ہے ان کا؟" انہوں نے نوید سے پوچھا۔

نوید نے جواب دیا۔ "انور فرہاد۔"

"فرہاد بے چارہ اگر اپنے سر پر ہتھوڑا نہ مارتا تو اس عمر کو پہنچ کر شاید ان ہی کی طرح ہوتا۔" پھر سوچتے ہوئے بولیں۔ "اس نام کے ایک شخص کو میں بھی جانتی ہوں مگر پہچانتی نہیں۔"

"وہ کون صاحب تھے؟"

"وہ ایک صحافی تھے۔ میں یہاں جب کالج میں تھی تو ان کے مضامین اور کالم اخباروں میں پڑھتی تھی، میں ان سے کبھی ملی نہیں مگر ان کی تحریر شوق سے پڑھتی تھی۔"

"یہ وہی ہیں۔" صحافی انور فرہاد! اس عمر میں بھی لکھتے ہیں۔"

"آپ سے مل کر صحیح معنوں میں خوشی ہوئی کہ اتنے دنوں کے بعد اپنے فیورٹ لکھاری سے ملاقات ہوئی۔ شادی کے بعد بال بچوں کے جھمیلوں میں ایسی پھنسی کہ پھر پڑھنے لکھنے کا شوق پس پشت چلا گیا۔"

نوید نے ہم دونوں کو ایک دوسرے کے روبرو کرسیوں پر بٹھا دیا اور کہا۔ "آپ لوگ اطمینان سے باتیں کیجیے۔"

"آپ کی وہاں لندن میں کیا مصروفیات ہیں؟" میں نے یونہی باتوں کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔

"ابتداء میں تو تھوڑا گھوم پھر بھی لیتے تھے، کبھی مووی بھی دیکھ لیتے تھے اور ٹی وی بڑی پابندی سے دیکھتے تھے پھر جیسے جیسے گھریلو ذمہ داریاں بڑھتی گئیں ان میں کمی آتی گئی۔"

اس کے بعد میں سوچنے لگا کہ اب میں کیا کہوں۔ ذرا توقف کے بعد وہی بولیں۔ "انور صاحب! جن دنوں ہم پابندی سے ٹی وی دیکھتے تھے۔" اتنا کہہ کر وہ ذرا رکیں پھر بولیں۔ "آپ کو انور کہوں یا فرہاد؟"

"جس نام سے پکاریں۔ مجھے کوئی اعتراض نہیں ہوگا۔"

"شکریہ!" کہہ کر انہوں نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ "جن دنوں ہم پابندی سے ٹی وی دیکھتے تھے۔ بی بی سی چینل سے کچھ ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں اپنے پاکستان کے ایک آرٹسٹ کو دیکھ کر بڑی خوشی ہوتی تھی۔"

"وہ کون سا آرٹسٹ تھا؟"

پیشانی پر ہاتھ رکھ کر سوچتے ہوئے بولیں۔ "شاید..... طلعت حسین۔ وہ بڑا ٹیلنٹڈ اداکار تھا۔ شادی سے پہلے جب میں یہاں پاکستان میں تھی ان دنوں بھی وہ یہاں کے کچھ ڈراموں میں اور دیگر پروگراموں میں نظر آتا تھا۔ وہ کب لندن آیا اور یہاں کے ٹی وی ڈراموں میں کام کرنے لگا۔ مجھے معلوم نہیں۔"

"وہ آپ کے پیچھے پیچھے ہی غالباً پہنچ گئے ہوں گے کہ ہماری ایک چاہنے والی اب پاکستان میں نہیں رہی تو مجھے بھی وہیں چلا جانا چاہیے جہاں وہ گئی ہیں۔"

"نہیں۔" وہ مسکرائیں۔ "ایسی بات نہیں کسی اور وجہ سے وہ ترک وطن کر کے پردیس گئے ہوں گے۔" پھر ذرا رک کر بولیں۔ "میرا خیال ہے اب وہ لندن میں قیام پذیر نہیں۔"

"جی ہاں۔ وہ 1977ء میں لندن سے واپس

پاکستان آ گئے تھے۔ وہ 1972ء میں لندن گئے تھے۔"

"دیکھیے آپ صحافی ہیں اس لیے ان کے بارے میں آپ کو علم ہے کہ کب لندن گئے اور کب واپس آئے۔"

میں نے انہیں پھر چھیڑنے کے لیے کہا۔ "غالباً جب انہیں یہ معلوم ہوا ہو کہ میری پرستار نے ٹی وی دیکھنا ہی ترک کر دیا ہے تو پھر بی بی سی چینل پر کس کے لیے کام کروں؟"

"ارے نہیں صاحب! وہ آپ کی طرح فرہاد نہیں کہ....." مسکراتے ہوئے انہوں نے کہا۔ پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے بولیں۔ "ایک دو بار ہم نے انہیں ٹی وی اسکرین سے باہر بھی دیکھا مگر انہیں دیکھ کر خوشی نہیں ہوئی، ہم بہت دکھی ہوئے۔" ان کے چہرے پر اس وقت بھی ملال کی گرد نظر آ رہی تھی۔ میرا اشتیاق بڑھا۔ میں یہ پوچھے بغیر نہ رہ سکا۔

"اپنے فیورٹ فنکاروں کو اپنے سامنے دیکھ کر تو چاہنے والوں کو خوشی ہوتی ہے۔ آپ کو دکھ کیوں ہوا؟"

"وہ...... بات دراصل یہ ہے انور صاحب کہ ہم نے انہیں ایک ہوٹل میں دیکھا مگر اپنی طرح گاہکوں کی حیثیت سے نہیں، گاہکوں کو صرف کرتے ویٹر کی صورت میں۔" یہ کہتے کہتے ان کی آواز لڑکھڑانے لگی۔ "ایک اتنا اچھا آرٹسٹ اور اس کی یہ حالت۔"

"ہاں۔" کہہ کر میں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی اور کہا۔ "میں نے بہت پہلے اسرار الحق مجاز کے بارے میں ایک نظم لکھی تھی۔ جس کے چند مصرعے ہیں۔

اپنے دیس کی بات نیاری
یہاں جاہل کی جیبیں بھاری
ننگے بھوکے فن کے پجاری

"مگر یہ تو لندن تھا۔" خاتون بولیں۔ "وہاں تو فن اور فنکاروں کی بہت قدر ہوتی ہے۔"

طلعت حسین کا وہ دور بہت آزمائشی تھا۔ وہ لندن پڑھنے گئے تھے۔ پرفارمنگ آرٹ کی تدریس حاصل کرنے گئے تھے۔ اس دوران انہیں ٹی وی پر کام کرنے کا موقع تو ملا مگر کبھی کبھار ہی موقع ملتا تھا اس لیے انہیں زندہ رہنے کے لیے ایسا کرنا پڑا۔ محنت مزدوری کرنا کوئی جرم نہیں۔ وہ ایک حساس طبیعت کے آرٹسٹ تھے اور اب بھی ہیں۔ انہوں نے بھیک مانگنے سے بہتر یہ سمجھا کہ......"

"مگر......" خاتون نے قطع کلامی کرتے ہوئے کہا۔

زندگی نامہ

نام: خاندانی نام طلعت حسین

پیدائش: 1945ء دلی۔ انڈیا

والد کا نام: الطاف حسین وارثی

والدہ کا نام: شائستہ بیگم

والد کی ملازمت: سول سروس کے اعلیٰ عہدے دار ڈیفنس ڈیپارٹمنٹ میں تعینات رہے۔

ہجرت: 1949ء (ہجرت کے وقت طلعت حسین کی عمر 4 سال تھی)

پاکستان آنے کے بعد: کراچی آنے کے بعد طلعت کے والد الطاف حسین نے دل برداشتہ ہو کر سرکاری ملازمت سے کنارہ کشی اختیار کر لی۔ کچھ دنوں نجی کمپنی میں ملازمت کی۔ کچھ دنوں تک پی آئی اے سے بھی منسلک رہے۔

تعلیم: اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن۔ (اداکاری کی تربیت لندن اکیڈمی سے)

طلعت حسین کی ثقافتی سرگرمیاں: ریڈیو میں صداکاری، پھر ٹی وی میں اداکاری۔ 1972ء سے 1977ء تک لندن میں "لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامیٹک آرٹ" میں تعلیم و تربیت حاصل کرنے کے دوران بی بی سی ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ڈراموں اور دیگر پروگراموں میں حصہ لیا۔ پاکستان واپسی کے بعد اسٹیج ڈراموں میں کام کیا پھر ٹی وی اور فلموں میں بھی اداکاری کی۔

"بھیک مانگنے کی بات آپ کہاں سے لے آئے۔ انہیں چاہیے تھا۔ وہ بی بی سی کے ذمہ داروں سے کہتے کہ میرے پروگرام کچھ بڑھا دیں۔"

"ان کے لیے یہ بھیک مانگنے کے برابر تھا۔"

"مگر انور صاحب! ہمارے لیے یہ بات بڑی تکلیف دہ تھی کہ اپنے وطن عزیز کے ایک ابھرتے ہوئے آرٹسٹ کو دیارِ غیر میں اس حال میں دیکھیں۔ یقین جانیے ہمیں آرڈر دینے کے لیے انہیں آواز دے کر بلانے کی ہمت نہیں ہوتی تھی۔ ہمیں شرم آتی تھی۔ ہم ہچکچاتے تھے۔"

"اس بات کا احساس طلعت حسین کو بھی تھا وہ کہتے ہیں پاکستانی مجھے آرڈر دیتے ہوئے جھجکتے تھے۔"

"مگر انہیں ہوٹل میں کام کرنے کا خیال کیسے آیا۔ کوئی ایسا کام کر لیتے جس میں وہ پبلک کی نگاہوں میں نہیں آتے۔"

اس بارے میں ان کا کہنا ہے۔ "لندن میں جن دنوں مجھے کچھ معاشی مسائل کا سامنا ہوا، انہی دنوں کی بات ہے ایک دن مجھے ایک لڑکا مل گیا جو مجھے پہچانتا تھا۔ اس نے مجھے ریجنٹ اسٹریٹ پر واقع ہوٹل میں ایک شخص سے ملوایا جو اتفاق سے میری بیوی کا کزن تھا اور پڑھنے کے لیے لندن آیا ہوا تھا۔ اس ہوٹل میں ویٹر اور برتن دھونے والے کی ضرورت تھی۔ چنانچہ میں نے اپنی بیوی کے کزن کے مشورہ پر اس ہوٹل میں ویٹر کی ملازمت کر لی۔ وہ بھی اس ہوٹل میں ویٹر کی ملازمت کرتا تھا۔ میں جمعہ اور ہفتے کی رات برتن دھوتا اور اتوار کا سارا دن ویٹری کرتا تھا۔"

"کتنے افسوس کی بات ہے کہ ایک شخص جو بنیادی طور پر فنکار ہے اور اپنے فن کی تکمیل کے لیے تعلیم حاصل کرنے آیا ہو، اسے ایسی گھٹیا ملازمت کرنی پڑی۔"

"لیکن......" میں نے کہا۔ "اس بڑے فنکار کی عظمت اور بڑائی تو دیکھیے اس نے اس وقت جب وہ ایک بڑے اور باوقار فنکار کی حیثیت سے اپنا لوہا منوا چکا تھا اس وقت جس دلیری کے ساتھ اپنے برے دنوں کا یہ واقعہ سنایا۔ اس پر پردہ نہیں ڈالا، اسے چھپایا نہیں۔ اسے اپنے لیے باعث شرم نہیں سمجھا۔"

"ہاں یہ بڑے ظرف کی بات ہے۔" خاتون بولیں۔ "مجھے آج بھی یہ سوچ کر دکھ ہوتا ہے کہ انہیں ایسے برے وقت کا سامنا کرنا پڑا۔ میں تو اس واقعے کا ذکر کر کے بھی دل ہی دل میں کہہ رہی تھی کہ مجھے یہ بات بتا کر ان کی تذلیل نہیں کرنی چاہیے تھی مگر شاباش ہے اس بڑے فنکار پر اس نے خود اپنی زبانی اپنے برے دنوں کی کہانی کس دیدہ دلیری سے سنادی۔"

اسی دوران نوید نے کولڈ ڈرنک کی دو بوتلیں لا کر ہمارے سامنے رکھ دیں۔

"باتوں کے دوران اس کے سپ بھی لیتے جائیں۔" یہ کہہ کر وہ چلا گیا۔

بوتل دیکھ کر مجھے کچھ پیاس سی محسوس ہونے لگی۔ میں نے بوتل اٹھا کر ایک دو گھونٹ لیے پھر مسکراتے ہوئے ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "اس کی دیدہ دلیری کا یہ عالم ہے کہ اس نے اپنے چاہنے والوں سے یہ بات بھی نہیں چھپائی کہ اس نے یہاں اپنے وطن عزیز میں اپنے فنکارانہ دور کے ابتدائی دنوں میں ریڈیو اور ٹی وی پر زیادہ کام نہ ملنے کی وجہ سے اپنے معاشی حالات کو درست رکھنے کے لیے کچھ عرصہ تک لیرک سینما میں گیٹ کیپنگ بھی کی۔"

"نہیں!" انہوں نے غیر یقینی انداز میں کہا۔

"یہ حقیقت ہے۔ اس کا اظہار بھی انہوں نے خود ہی کیا ہے۔"

"آپ بھی ان سے ملے؟"

"جب میں 1966ء میں پہلی بار کراچی آیا تھا اور ہفتے تک رہا تھا۔ اس دوران کہانی اور ڈراما نویس حمید کاشمیری کی کتابوں کی دکان پر اکثر طلعت حسین سے ملاقات ہو جاتی تھی۔ حمید کاشمیری کی یہ چھوٹی سی دکان زیب النساء اسٹریٹ پر تھی اور یہاں ادیبوں، شاعروں، صحافیوں اور فنکاروں سے اکثر ملاقات ہو جاتی تھی پھر جب میں 1969ء میں مستقل طور پر کراچی آگیا اور ہفت روزہ نگار میں بطور سب ایڈیٹر ملازمت کر لی تو اس دوران بھی حمید کاشمیری کی دکان پر اکثر چھٹی کے بعد پہنچ جاتا تھا۔ حمید کاشمیری نگار میں ایک کالم بھی لکھتے تھے۔ اس سلسلے میں بھی اکثر ان سے ملتا رہتا تھا مگر 1971ء اور 1972ء کے کچھ مہینوں کے بعد وہاں طلعت سے ملاقات نہیں ہوئی بعد میں معلوم ہوا وہ لندن چلے گئے ہیں۔ وہاں وہ لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامیٹک آرٹ میں تین سال کا کورس کرنے گئے ہیں۔"

"میں نے کہیں پڑھا تھا کہ طلعت حسین کی والدہ ریڈیو پاکستان کی مشہور اناؤنسر تھیں۔" خاتون نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔ "مگر یہ بہت پرانی بات ہے۔ ان کا نام یاد نہیں رہا۔"

"ان کا نام شائستہ بیگم تھا۔"

"ہاں! یاد آیا۔ یہی نام تھا ان کا۔ شاید طلعت انہی کی مدد اور تعاون سے ریڈیو تک رسائی حاصل کر سکے ہوں گے۔"

"نہیں خاتون! ایسا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کا بالکل الٹ ہوا تھا۔ جب طلعت حسین ریڈیو پر آڈیشن دینے گئے تو ان کی والدہ نے انہیں فیل کرانے کی بڑی کوشش کی تھی۔"

اس سے پہلے کہ میں کچھ اور کہتا۔ وہ جھٹ پوچھ بیٹھیں۔ "بھلا کیوں؟ لوگ تو اپنوں کی سفارش کرتے ہیں انہوں نے بیٹے کی مخالفت کیوں کی؟"

"بات دراصل یہ تھی کہ وہ اپنے بیٹے کو ریڈیو کا صداکار بنانا نہیں چاہتی تھیں۔ ان کی خواہش تھی کہ ان کا نور نظر لخت جگر سی ایس ایس کا امتحان پاس کر کے ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر بن جائے۔"

"اوہ! یہ بات تھی۔ یہ تو ان کی بڑی فطری خواہش تھی۔ ہر ماں چاہتی ہے کہ اس کا بیٹا زیادہ سے زیادہ لکھ پڑھ کر بڑا آدمی بنے۔ عیش و آرام کی زندگی بسر کرے۔ ان کو تو بخوبی علم ہوگا کہ ریڈیو کے صداکار کیا کماتے ہیں۔" وہ ذرا رکیں، پھر بولیں۔ "اچھا یہ تو بتایئے۔ طلعت آڈیشن میں کامیاب ہوئے یا ان کی والدہ کی خواہش پر انہیں فیل کر دیا گیا؟"

"دراصل!" میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ "قدرت کو یہ منظور نہیں تھا کہ وہ ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر بنیں اس لیے آڈیشن لینے والے پروڈیوسر حمید ارمان نے شائستہ بیگم سے صاف کہہ دیا۔ "اس کی آواز بہت اچھی ہے لہٰذا میں اسے فیل نہیں کر سکتا۔"

خاتون مسکرائیں۔ "قدرت کو تو انہیں آنے والے دنوں میں ایک بڑا فنکار بنانا تھا۔ وقت کرتا ہے پرورش برسوں، حادثہ ایک دم نہیں ہوتا۔" "اگر طلعت حسین، ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر بن جاتے تو میں یا آپ ان کے بارے میں اس طرح آج بات کر رہے ہوتے؟"

"نہیں، ہرگز نہیں۔ سرکاری افسروں کو کون کہاں یاد رکھتا ہے۔"

اور وہ جو آپ نے ریڈیو کی کمائی کے بارے میں پوچھا تھا۔" میں نے ایک دو گھونٹ پینے کے بعد کہا۔ "تو طلعت حسین کو ابتداء میں ریڈیو کی صداکاری کا معاوضہ ماہانہ 100 روپے بھی نہیں ملتا تھا پھر وقفے وقفے سے رقم بڑھتی گئی پہلے سو ہوئے پھر 150 روپے ہوئے۔ اسلم اظہر صاحب نے انہیں بطور نیوز کاسٹر متعارف کرایا۔ خبرنامہ پڑھنے کے الگ سے 200 روپے ماہانہ ملنے لگے۔ ان دنوں اشتہاری فلمیں بھی بننا شروع ہوگئی تھیں۔ ان میں صداکاری کے 300 روپے ملتے تھے۔ اس طرح تقریباً ڈیڑھ ہزار روپے مہینا ہو جایا کرتے تھے۔ ان دنوں اتنی رقم بہت بڑی ہوا کرتی تھی۔"

"آپ نے کہا تھا کہ انہوں نے لیرک سینما میں گیٹ کیپری بھی کی۔"

"جی ہاں کی تھی مگر یہ بالکل ابتدائی دور کی بات تھی جب سو روپے بھی ماہانہ نہیں ملتے تھے انہیں۔"

ذرا دیر تک خاتون بھی کولڈ ڈرنک سے دل بہلاتی رہیں۔ پھر بوتل رکھتے ہوئے بولیں۔ "طلعت کی والدہ، کیا نام بتایا تھا آپ نے ان کا؟"

"شائستہ بیگم۔"

"شائستہ بیگم اگر اپنے بیٹے کو ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر بنانا چاہتی تھیں تو اس کا مطلب یہ ہے کہ وہ خود بھی پڑھی لکھی

اولاد

دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔ دونوں بیٹیوں اور بیٹے کی شادیاں ہو چکی ہیں۔ سب اعلیٰ تعلیم یافتہ ہیں۔

ایوارڈ اعزازات

فلم گمنام میں ڈاکٹر کے کردار پر بیسٹ ایکٹر، فلم لاج میں بیسٹ سپورٹنگ ایکٹر کا ایوارڈ۔ حکومتِ پاکستان کی طرف سے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا گیا۔ نارویجن فلم امپورٹ ایکسپورٹ پر بیسٹ سپورٹنگ ایکٹر کا غیر ملکی ایوارڈ۔

☆☆☆

پہلا ٹی وی ڈراما: ارجمند
پہلی فلم: اشارہ
غیر ملکی فلمیں: سوکن کی بیٹی (بھارتی) ایکسپورٹ امپورٹ (نارویجن فلم)

فلمیں

چراغ جلتا رہا، گمنام، انسان اور آدمی، جناح، لاج، قربانی، کامیابی، آشنا، بندگی، محبت مر نہیں سکتی، ایکٹران لا، چھپن چھپائی پروجیکٹ قاضی۔

یادداشت

طلعت حسین ابتداء ہی سے بہت ذہین تھے۔ انہوں نے گورنمنٹ بوائز سیکنڈری اسکول جیل روڈ کراچی سے امتیازی نمبروں سے میٹرک پاس کیا۔ اسلامیہ کالج کراچی سے گریجویشن بھی بہت اچھے نمبر لے کر پاس کیا اور پھر لندن اکیڈمی کا تین سال کا کورس دو سال میں مکمل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ بچپن سے ان کی یادداشت اتنی اچھی تھی کہ دو سال کی عمر کی باتیں بھی انہیں یاد تھیں۔

خاتون ہوں گی۔"

"جی ہاں، شائستہ بیگم بمبئی کی طیبہ کالج کی گریجویٹ تھیں۔"

"اوہ، گڈ! جبھی تو وہ بیٹے کو کچھ بنانا چاہتی تھیں۔" پھر ذرا توقف کے بعد بولیں۔ "پھر تو ان کی شادی بھی کسی پڑھے لکھے شخص سے ہوئی ہوگی؟"

"جی ہاں! ان کے شوہر الطاف حسین وارثی انڈین سول سروس (ڈیفنس) کے ایک اعلیٰ عہدے پر فائز تھے۔"

"یعنی طلعت حسین بڑے ماں باپ کے چشم و چراغ ہیں۔"

"ہیں نہیں، تھے۔ جب تک ان کے والدین دہلی میں تھے۔ بڑی ٹھاٹ باٹ اور عیش و عشرت کی زندگی بسر کرتے تھے۔ دہلی سے جب ان کے والدین نے ہجرت کی۔ طلعت حسین کی عمر چار سال تھی۔"

"ٹھہریے۔" خاتون نے مجھے روکتے ہوئے کہا۔ "میں بھی تھوڑی پڑھی لکھی ہوں اور اسی شہر کی باسی تھی۔ میں نے اپنے بزرگوں سے سنا تھا کہ انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والے پڑھے لکھے اور اعلیٰ عہدوں پر فائز حضرات کو یہاں متبادل نوکریاں مل جاتی تھیں۔"

"جی ہاں آپ کی اطلاع درست ہے۔ آپ نے غلط نہیں سنا ہے۔"

"پھر طلعت حسین کے والد۔ کیا نام بتایا تھا آپ نے ان کا؟"

"الطاف حسین وارثی۔"

"الطاف حسین وارثی صاحب کو تو کسی بڑے عہدے پر فائز ہونا چاہیے تھا۔ ان کی بیوی اور ان کا بیٹا در در کی ٹھوکریں کیوں کھاتے رہے؟"

"یہ ایک الگ داستان ہے خاتون۔" میں نے سنجیدگی سے کہا۔ "کبھی کبھی حالات انسان کا ساتھ نہیں دیتے۔ انڈیا سے ہجرت کر کے آنے والوں میں بہت سے لوگ غربت میں آ کے چھپے جو وطن میں گمنام تھے اور کئی اچھے خاصے کھاتے پیتے اور خوش حال لوگ در در کی ٹھوکریں کھانے پر مجبور ہو گئے۔"

"آخر ایسا کیا ہو گیا تھا الطاف حسین وارثی صاحب کے ساتھ کہ وہ عرش سے فرش پر آ گئے؟"

میں نے پروفیسر نظیر صدیقی کا مصرعہ پڑھا۔ "بہت طویل کہانی ہے پھر بھی اسے دوست۔"

"نہیں پھر کبھی نہیں۔" خاتون نے ضد کرنے والے انداز میں کہا۔ "ابھی نہیں تو پھر کبھی نہیں۔ آپ سے دوبارہ ملاقات کی کوئی اُمید نہیں۔"

"ہاں یہ بات بھی درست ہے۔" مگر یہ بات میں نے دل ہی دل میں کہی۔ "آپ چند دنوں کے بعد لندن آشیانی ہو جائیں گی اور میں اپنے گھر کا قیدی بن کر رہ جاؤں گا۔"

"کیا سوچنے لگے؟" مجھے خاموش دیکھ کر خاتون نے ٹوکا۔

"میں سوچ رہا ہوں ان کی بربادی کی داستان کہاں سے شروع کروں؟"

"بس جہاں سے یاد آئے شروع کر دیجیے۔ زیادہ سوچ بچار کا وقت نہیں۔"

"ٹھیک ہے۔" میں نے کہا۔ "مجھے طلعت حسین کے ایک انٹرویو کے درمیان کہی ہوئی باتیں یاد آ رہی ہیں۔ ان کے بقول "ہجرت کے وقت میں چار سال کا تھا۔ اس وقت کے واقعات ذرا ذرا سے یاد ہیں۔ یہ سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو رہا ہے۔ بعد میں والد اور والدہ کی زبانی ساری باتیں معلوم ہوئیں۔ چونکہ میرے والد سول سروس میں اعلیٰ عہدے پر فائز تھے لہٰذا دیگر افسروں کی طرح انہیں بھی پیشکش ہوئی کہ وہ انگلستان یا پاکستان چلے جائیں یا پھر بھارت ہی میں رہیں۔ انہوں نے پاکستان جانے کو ترجیح دی۔ افسروں اور ان کے قریبی رشتہ داروں کو سہولت فراہم کی گئی کہ وہ ہوائی جہاز کے ذریعے پاکستان جا سکتے ہیں۔ میری دو خالائیں اور نانی نے پاکستان جانے سے انکار کر دیا۔ میری والدہ میری نانی کو چھوڑنا نہیں چاہتی تھیں۔ لہٰذا والد نے جہاز کے ٹکٹ واپس کر دیے مگر جب دہلی میں فسادات شروع ہوئے تو سب لوگ ہجرت کے لیے تیار ہو گئے۔ چونکہ جہاز کے ٹکٹ واپس کر دیے گئے تھے لہٰذا ہمیں پانی کے جہاز سے ہجرت کرنا پڑی۔ نارتھ سرکل کا علاقہ قدرے پُرسکون تھا۔ ہجرت کے وقت والد نے صلیب پہن کر اپنے آپ کو عیسائی ظاہر کیا اور ہمارے لیے فوجی ٹرک لینے چلے گئے۔ ہم فوجی ٹرک میں لال قلعہ پہنچے۔ وہاں سے ریل کے ذریعے بمبئی آئے اور پھر پانی کے جہاز میں سوار ہو کر کراچی پہنچ گئے۔ کھوکھراپار (کراچی) میں ہم نے پہلا پڑاؤ کیا پھر ہمیں ڈیفنس میں کوارٹر الاٹ کیا گیا۔ چونکہ اس کوارٹر میں ایک انگریز رہائش پذیر تھا اس لیے کچھ عرصے کے

لیے ہمیں ایک بیرک میں ٹھہرایا گیا۔

میرے والد جب بھارت میں تھے تو ان کی پوسٹنگ راولپنڈی کر دی گئی تھی بعد میں ان کا تبادلہ کراچی کر دیا گیا۔ چنانچہ ہمارا سامان پنڈی میں اور ہم کراچی میں اترے۔ ایک ہفتہ بعد جب والد سامان لینے پنڈی گئے تو پتا چلا کہ ہمارا سامان غائب ہے۔ یوں ہم انڈیا میں تو نہیں لٹے البتہ پاکستان پہنچ کر لٹ گئے۔ ہمارے پاس کچھ بھی باقی نہیں بچا تھا۔ اس زمانے میں 50 سگریٹوں کا ڈبہ آتا تھا۔ ہم شیشے اور پیتل کے گلاسوں میں پانی پینے والے سگریٹ کے خالی ڈبے میں پانی پینے پر مجبور کر دیے گئے۔ والد نے دل برداشتہ ہو کر سرکاری ملازمت سے استعفیٰ دے دیا اور ایک نجی کمپنی میں ملازمت کر لی۔ بعد ازاں وہ پی آئی اے سے منسلک ہو گئے۔ کچھ عرصے بعد وہ بیمار رہنے لگے اور انہوں نے بستر پکڑ لیا۔ گھر کے حالات دیکھتے ہوئے والدہ نے ریڈیو پاکستان کی ملازمت اختیار کر لی۔" یہاں تک کہہ کر میں ذرا رکا پھر ان کی طرف دیکھ کر کہا۔ "میں نے اپنی یادداشت پر زور دے کر کوشش کی ہے طلعت حسین کی کہی ہوئی باتوں کو انہی کے انداز میں بیان کروں۔ پتا نہیں اس کوشش میں، میں کہاں تک کامیاب ہوا؟"

"آپ چونکہ صحافی ہیں اور اس دشت کے پرانے راہی ہیں، اس لیے میرے خیال میں بڑی اچھی طرح......"

بس اسی دوران شور ہوا۔ "دولہا والے آ گئے۔ دولہا والے آ گئے۔"

اس افراتفری کے عالم میں نسرین نے آ کر کہا۔ "خالہ اماں! دولہا بھائی سے باقی باتیں آپ بعد میں کیجیے گا۔ چلیے دلہن کے پاس آپ کی موجودگی زیادہ ضروری ہے۔"

اور خاتون کو کچھ کہنے کا موقع دیے بغیر انہیں اپنے ساتھ لے کر دلہن کی طرف چل دی۔ میں بھی اس موقع کو مناسب سمجھ کر اس ٹیبل پر منتقل ہو گیا جس پر گئی جانے والے بیٹھے تھے۔ وہاں موجود حضرات سے صاحب سلامت کے بعد بیٹھ گیا۔

لوگوں سے باتیں کرتے ہوئے میں سوچ رہا تھا کہ میں اپنی نیم معذوری کی وجہ سے گھر کا قیدی بن کر رہ گیا اور دنیا کہاں سے کہاں پہنچ گئی۔ جن سے میں جوانی کے عالم میں ملا تھا وہ اب بڑھاپے کی طرف مائل پرواز ہیں اور اس دور کے بچے اب میرے قد سے بھی آگے نکل گئے ہیں۔

تھیٹر سے وابستگی

طلعت حسین نے لندن سے واپس آ کر کوئی دس بارہ اسٹیج ڈراموں میں اداکاری، اس دوران کئی ڈراموں کی ہدایت کاری کے فرائض بھی انجام دیے۔ جنرل ضیاء الحق کا مارشل لاء لگنے کے بعد تھیٹر سخت سنسر شپ میں آ کر اپنی اصل حیثیت سے محروم ہو گیا تو طلعت نے تھیٹر سے کنارہ کشی کر لی اور تھیٹر سے متعلق ان کی سرگرمیاں ختم ہو گئیں۔

کیا کچھ نہ سہا تیرے لیے

طلعت حسین کو بچپن ہی سے اداکاری کا شوق تھا۔ اس شوق کی تکمیل کے لیے انہیں بہت پاپڑ بیلنے پڑے، والدہ انہیں ڈپٹی کمشنر یا ڈپٹی کلکٹر بنانا چاہتی تھیں مگر وہ ایکٹر ہی بنے اور اس مقصد کی تکمیل کے لیے بڑی کٹھنائیاں برداشت کرنی پڑیں۔ کراچی میں انہوں نے ایک سینما گھر میں کچھ دنوں گیٹ کیپری بھی کی اور لندن میں اکیڈمی کی تربیت کے دوران ہوٹل میں بیرا گیری بھی کی اور برتن بھی دھوئے اور یہ ساری باتیں انہوں نے خود اس وقت بتائیں جب وہ عالمگیر شہرت کے فنکار بن چکے تھے۔

ہر گھڑی منقلب زمانہ ہے
یہی دنیا کا کارخانہ ہے

واپسی کا لمحہ آیا تو نوید نے کہا۔ "اُدھر خواتین سے بھی الوداعی ملاقات کریں گے؟"

"نہیں بہت دیر ہو جائے گی۔"

کئی دنوں کے بعد میں گھر میں بیٹھا لکھ رہا تھا کہ دیکھا بچوں نے کسی کو لا کر میرے قریب کھڑا کر دیا ہے۔

"یہ ہیں ہمارے ابو دادا۔ جناب انور فرہاد۔" میں نے نظر اٹھا کر دیکھا تو سماعت سے ایک آواز ٹکرائی۔ "تم نہ آئے تو ہم چلے آئے۔"

یہ نسرین کی خالہ ساس تھیں۔ اسی ہج دھج میں جس میں منگنی کی تقریب میں نظر آئی تھیں۔ میں نے اٹھ کر ان کا استقبال کیا اور اپنے قریب کرسی پر بٹھایا۔ وہ بولیں۔ "طلعت حسین کی کچھ اور باتیں آپ سے معلوم کر لوں اس لیے آپ کی نہیں، ان کی محبت میں آ گئی۔"

میں نے مسکرانے پر اکتفا کیا۔

''بات دراصل یہ ہے فرہاد صاحب۔'' خاتون نے اپنی بات آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''آج کی نئی نسل اپنے دور کے ہی سلیبرٹیز سے دلچسپی رکھتے ہیں۔ ان فنکاروں کو جو لیجنڈ ہیں، ان کے بارے میں زیادہ جانتے نہیں۔ میں نے نسرین کے ان بچوں سے جن کو ادب یا آرٹ سے لگاؤ ہے، طلعت حسین کے بارے میں بات کرنے کی کوشش کی تھی، انہوں نے بس اتنا بتایا۔ ''وہ تو اب اکیڈمی کی حیثیت کے حامل ہیں۔ ان کے بارے میں ہم کیا بتائیں آپ کو......''

''ان سے مایوس ہو کر میں نے سوچا۔ فرہاد کی ہی خدمت حاصل کرنی چاہیے۔ وہی میری معلومات کی نئی نہر نکال سکیں گے۔''

''نسرین کے بچوں کا کہنا غلط نہیں ہے۔ اب طلعت حسین ایک طرح سے گمنامی کی زندگی بسر کر رہے ہیں۔ ان کی فنکارانہ سرگرمیاں بہت محدود ہو گئی ہیں۔''

''میں یہ نہیں چاہتی کہ ان کی موجودہ سرگرمیوں کی کوئی نہر کھود دوں۔ ارے بھائی! میں تو ان کی پرانی پرستار ہوں۔ ان کے ماضی کے بارے ہی میں جو آپ کو معلوم ہے، بتائیں۔''

میں نے فوری طور پر کوئی جواب نہیں دیا۔ کچھ دیر تک ذہن پر زور دینے کے بعد کہا۔ طلعت حسین کی خوبیوں میں ایک خوبی ان کی بلا کی یادداشت ہے، وہ بچپن سے ہی بڑے ذہین تھے۔ انہوں نے ایک بار اپنے ایک انٹرویو میں بتایا تھا۔

''مجھے اپنی یادداشت کا انکشاف اس وقت ہوا جب میری عمر 26 سال تھی۔ ایک روز میں نے باتوں باتوں میں والدہ سے کہنا شروع کیا۔ ''ہمارا ایک گھر ہوا کرتا تھا جہاں بہت سارے نوکر چاکر تھے۔ باہر ایک بیٹھک تھی جہاں مہمان بیٹھتے تھے، آپ اور ابا مجھے لے کر ایک دو بار فلم دیکھنے گئے تھے۔ ہمارے ساتھ نوکر بھی تھا اس وقت سنیما میں عورتیں اوپر اور مرد نیچے بیٹھا کرتے تھے۔ نوکر کبھی مجھے اٹھا کر آپ کے پاس لے جاتا اور کبھی نیچے ابا کی گود میں دے دیتا تھا۔ یہ باتیں سن کر والدہ حیران رہ گئیں اور انہوں نے کہا۔ ''خبردار! یہ باتیں اگر تم نے کسی کو بتائیں۔ تمہیں پتا ہے اس وقت تمہاری عمر کیا تھی؟ تم صرف دو سال کے تھے۔''

''وہ جو کہتے ہیں نا، پوت کے پاؤں پالنے میں نظر آجاتے ہیں۔'' خاتون بولیں۔ ''بڑے لوگ جنہیں کوئی کارنامہ انجام دینا ہوتا ہے۔ قدرت انہیں بچپن اور لڑکپن سے غیر معمولی صلاحیتوں کا بناتی ہے۔''

میں سوچنے لگا کہ یہ محترمہ ڈومور کے مصداق کچھ اور سنانے کی فرمائش کریں گی اور وہی ہوا۔ میری بہو نے ابھی گرما گرم چائے لا کر رکھی ہی تھی کہ اس سے اٹھتے ہوئے بھاپ کو دیکھ کر بول پڑیں۔ ''چائے جب تک ذرا ٹھنڈی ہو کچھ اور بات یاد کیجیے۔''

طلعت حسین کا کہنا ہے۔ ''جن دنوں ہمارے حالات بہتر تھے ابا مجھے فلم دکھانے لے جاتے تھے اور اکثر والدہ سے چھپ کر مجھے فلم دیکھنے کے لیے ڈیڑھ روپے دیتے تھے کہ تم خود دیکھ آؤ۔''

یہ پاکستان آنے کے بعد کی بات ہے جب طلعت حسین ٹین ایجر تھے اور ابھی ان کے والد ملازمت کیا کرتے تھے۔

ذرا توقف کے بعد میں نے کہا۔ ''طلعت حسین کے بقول ان کے خاندان کو دو بڑے حادثات پیش آئے۔ تقسیم سے پہلے دہلی کا مسلم بینک جب بند ہو گیا تو ان کے والدین کے ڈیڑھ لاکھ روپے ڈوب گئے۔ اس وقت ڈیڑھ لاکھ روپے بہت بڑی رقم تھی۔ یہ پہلا حادثہ تھا جس سے انہیں بڑی مشکل سے سنبھلنے کا موقع ملا۔ دوسرا حادثہ اس سے بھی زیادہ جان کاہ تھا، یہ طلعت کے والد کی بیماری تھا۔ وہ ایسے بیمار پڑے کہ بیماری اور بے کاری نے اس خاندان کو ہلا کر رکھ دیا۔''

''ہاں۔'' خاتون ٹھنڈی سانس لے کر بولیں۔ ''کوئی نہیں جانتا، کب اور کس وقت قدرت کس آزمائش میں مبتلا کر دے گی۔''

''شاید انہی دنوں طلعت حسین کو سنیما کی گیٹ کیپنگ بھی کرنی پڑی ہو گی۔ عظیم ہیں وہ لوگ جو جوانمردی سے برے سے برے حالات کا مقابلہ کرتے ہیں اور دوسروں کے آگے دستِ سوال پھیلانے کی بجائے ہر آزمائش کا مقابلہ کرتے ہیں۔ طلعت حسین بھی انہی عظیم لوگوں میں ہیں جنہوں نے خارزارِ زندگی سے گزر کر عزت، شہرت اور مقبولیت حاصل کی۔''

''آپ کی ان باتوں سے اندازہ ہوتا ہے کہ طلعت کی نوجوانی یا عنفوانِ شباب کے دور میں ماں باپ کی جانب سے نگرانی یا رہنمائی کا کم موقع ملا انہیں کیونکہ باپ بیمار اور

والدہ روزگار کے شکنجے میں گرفتار۔''

''جی ہاں! آپ کا اندازہ درست ہے پھر بھی ان کی والدہ ان پر نظر رکھتی تھیں۔ اس کا پتا اس بات سے چلتا ہے کہ ان کی گلی کے نکڑ میں مصدق نام کے ایک ہوٹل میں ان دنوں جب وہ (طلعت) میٹرک میں تھے، یار دوستوں کے ساتھ بیٹھا کرتے تھے جب ان کی والدہ کے آنے کا وقت ہوتا تو وہ دوستوں کی اوٹ میں چھپ جایا کرتے تھے۔ جب ان کی والدہ ادھر سے گزر جاتیں تو وہ سامنے آتے۔ مگر ایک دن ان کی نظر طلعت حسین پر پڑ ہی گئی۔ انہیں ہوٹل میں بیٹھا دیکھا تو صدمے سے رو پڑیں۔ انہیں یہ بات بالکل پسند نہیں تھی کہ طالب علمی کے دور میں ان کا بیٹا ہوٹل میں بیٹھ کر اپنا وقت ضائع کرے۔ انہوں نے بڑے دکھ کے ساتھ اپنے شوہر سے ان کے بیٹے کی ''آوارگی'' کی شکایت کی۔ ان کے والد نے اس بات پر ناراض ہونے کی بجائے اپنی بیگم کو بہلانے کی کوشش کی۔ ''ارے بھئی! اتنی سی بات پر اتنی ٹینشن لینا درست نہیں۔''

''آپ اسے اتنی سی بات کہتے ہیں!!''

''ہاں! میرے خیال میں یہ کوئی مسئلہ نہیں۔ بچوں کو صرف نصابی کتابوں کا کیڑا بنا کر ان کے حق میں ہم کوئی بہتری نہیں لا سکتے۔ وہ جو علامہ اقبال نے کہا ہے

کھول آنکھ زمیں دیکھ فلک دیکھ فضا دیکھ

تو ہمیں بچوں کو بھی اس بات کا موقع دینا چاہیے کہ وہ اپنی کھلی آنکھوں سے اپنے اردگرد کا جائزہ لیتے رہیں۔ طلعت اب ایسا نا سمجھ بچہ بھی نہیں۔ عام بچوں کے مقابلے میں بہت باشعور اور سنجیدہ ہے۔ وہ اگر دوستوں کے درمیان کچھ دیر تک بیٹھ کر ہنس بول لیتا ہے تو اس سے اسے فائدہ ہی ہو گا۔ کوئی منفی اثرات اس پر اثر انداز نہیں ہوں گے۔''

اس طرح شائستہ بیگم کی سمجھ میں بھی یہ بات آ گئی کہ چائے خانے میں کچھ دیر تک دوستوں کے ساتھ ہنس بول لینا ان کے بیٹے کے لیے نقصان دہ نہیں ہو گا یوں کمسن طلعت حسین کو دوستوں کے ساتھ ہوٹل میں بیٹھنے کی اجازت مل گئی۔

خاتون مسکرائیں۔ ''اس واقعے سے اس بات کی اندازہ ہوتی ہے کہ پہلے یعنی ماضی قریب میں بھی اپنے بچوں کی تعلیم و تربیت پر کتنی گہری نظر رکھی جاتی تھی۔ جب کہ آج کے والدین اپنے بچوں کو اسکول اور کالج بھیج کر سمجھتے ہیں کہ بس یہی ان کی ذمہ داری تھی۔''

چائے اب قدرے ٹھنڈی ہو گئی تھی۔ ہم دونوں کپ اٹھا کر سپ لینے لگے۔ ایک دو گھونٹ پی کر بولیں۔ ''طلعت حسین نے تو ٹی وی میں بھی کام کیا۔ وہ ٹی وی تک کیسے پہنچے؟''

میں نے اپنے ذہن پر زور دیا اور ان دنوں کے بارے میں سوچتے ہوئے کہا۔ ''محترمہ! ہم ٹھہرے صحافی، اس لیے کسی فنکار کے بارے میں وہی باتیں کہتے ہیں جو اس کی زبانی سنی ہے یا لکھی ہوئی پڑھی ہے۔'' ٹیلی ویژن کے ابتدائی دور سے ہی طلعت حسین اس سے وابستہ ہو گئے تھے۔ اس بارے میں ان کی کہی ہوئی بات سنیے۔

''ان دنوں فضل کمال، آغا ناصر، اسلم اظہر وغیرہ ٹیلی ویژن پر کام کر رہے تھے۔ پی ٹی وی کراچی کا دفتر سب سے پہلے المرکز نامی عمارت میں قائم کیا گیا تھا۔ البتہ اس کا پائلٹ اسٹیشن لاہور میں تھا۔ فضل کمال اور اذکار دارثی نے مجھے ٹی وی پر ملازمت کرنے کے لیے 750 روپے ماہوار کی پیش کش کی۔ ان دنوں یہ ایک بڑی رقم ہوا کرتی تھی لیکن میرے لیے لاہور جانا ایک مسئلہ تھا۔ والد کی طبیعت ناساز رہتی تھی۔ غلط انجکشن لگنے کی وجہ سے ان کی ایک ٹانگ نے کام کرنا چھوڑ دیا تھا اور وہ بستر کے ہو کر رہ گئے تھے۔ میں نے انہیں جواب دیا۔ چونکہ مجھے لاہور میں رہائش اختیار کرنا پڑے گی، اس لیے آپ مجھے ایک ہزار روپے تنخواہ دیں۔ اس پر ہماری بات نہ بن سکی اور میری جگہ طارق عزیز کو رکھ لیا گیا۔'' ٹی وی پر میں نے پہلا پروگرام 1967ء میں ''ارجمند'' کیا تھا۔ پندرہ منٹ کی اس سیریل میں ایک گھرانے کی کہانی بیان کی گئی تھی جس میں ارجمند نامی لڑکے کا کردار میں نے ادا کیا تھا۔'' اتنا کہہ کر میں ذرا رکا اور پھر اپنی بات آگے بڑھائی۔ ''آپ کے اس فیورٹ فنکار نے پی ٹی وی پر بطور نیوز کاسٹر اور اناؤنسر کے بھی کام کیا۔ آپ کو بتا چکا ہوں کہ طلعت حسین نے 1972ء سے 1977ء تک لندن میں گزارا۔ اس دوران انہوں نے لندن اکیڈمی آف میوزک اینڈ ڈرامٹک آرٹ سے تربیت حاصل کی اور تین سال کا کورس امتیازی نمبر سے دو سال میں تکمیل کر کے گولڈ میڈل حاصل کیا۔ لندن میں قیام کے دوران بی بی سی سے بھی وابستہ رہے اور بی بی سی چینل کے متعدد پروگراموں میں حصہ لیا۔''

''جی ہاں یاد ہے۔'' خاتون بولیں۔ ''اور یہ بھی یاد ہے کہ لندن میں اور لندن سے واپس وطن آنے کے بعد

انہوں نے بیرہ گیری بھی کی۔ برتن بھی دھوئے اور سینما گھر کی گیٹ کیپری بھی کی۔'' اتنا کہہ کر انہوں نے ایک لمبی ٹھنڈی سانس لی۔ پھر بولیں۔ ''وہ اتنے بڑے فنکار یونہی نہیں بنے۔ انہوں نے کیا کیا صعوبتیں نہیں جھیلیں۔ آزمائشی دور سے گزرے۔''

''جی ہاں، آگ میں جل کر ہی سونا کندن بنتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''آج کل ایک ہی چھلانگ لگا کر کچھ لوگ آسمان کو چھو لینے کی تمنا کرتے ہیں مگر ایسا نہیں ہوتا اگر ہوتا بھی ہے تو کبھی کبھار ہی ہوتا ہے۔''

''لندن میں ہم نے انہیں ٹی وی پر پروگرام کرتے ہوئے تو دیکھا مگر ہمیں یہ دیکھ کر حیرانی ہوئی تھی کہ یہ پاکستانی آرٹسٹ برطانوی میڈیا میں کب اور کیسے آیا؟''

''اس بات کا جواب بھی ان کی اپنی زبان سے سنیے۔ ان کے ایک انٹرویو کے مطابق۔ ''پاکستان سے ضمیر الدین احمد بی بی سی چلے گئے تھے۔ انہوں نے مجھے کہا تھا۔ جب تم پڑھنے کے لیے لندن آؤ تو مجھ سے ضرور ملنا۔ تمہیں بی بی سی میں کام کرنے کی صورت میں کچھ پیسے مل جایا کریں گے۔ چنانچہ لندن کے قیام کے دوران میں اکیڈمی میں پڑھتا بھی تھا اور بی بی سی ریڈیو کے پروگرام بھی باقاعدگی سے کرتا تھا۔ چونکہ میں ایک پروفیشنل آرٹسٹ تھا اس لیے انہوں نے مجھے یہ رعایت دی تھی کہ میں آزادانہ طور پر کام کرسکوں۔ اس کے بعد میں نے بی بی سی ٹی وی چینل پر بھی کام کیا۔''

''بی بی سی ٹی وی چینل کے ڈراموں میں کام کرنے کے سلسلے میں طلعت حسین نے ایک بار کہا تھا۔

بی بی سی کی ٹی وی سیریل ''کراؤن کورٹ'' میں میرے دو رول بہت زیادہ مشہور ہوئے تھے۔ ان کی شہرت کا یہ عالم تھا کہ جب میں ریل میں سفر کرتا تو انگریز عورتیں مجھے اپروچ کرتی تھیں۔ اگر میں لندن چھوڑ کر پاکستان نہ آتا تو شاید زیادہ نام کماتا۔ 1978ء میں جب مشتاق گزدر لندن سے آئے تو انہوں نے مجھ سے کہا۔ ''لندن میں تمہارا بڑا شہرہ ہے۔ لوگ تمہارے بارے میں پوچھتے ہیں کہ وہ پاکستانی آرٹسٹ جو یہاں آیا تھا کہاں گیا؟''

''مشتاق گزدر صاحب نے غلط نہیں کہا تھا۔'' خاتون بولیں۔ ''ہمیں بھی کچھ دنوں کے بعد احساس ہوا کہ طلعت اب ٹی وی پر نظر کیوں نہیں آرہے ہیں؟''

''وہ جو کہتے ہیں کہ عزت اسے ملی جو وطن سے نکل گیا۔ تو طلعت حسین کو بھی دیار غیر میں ان کے قیام کے دور میں خاصی عزت اور شہرت ملی۔'' میں نے کہا۔

''مگر...... اس کے باوجود۔'' خاتون بولیں۔ ''وہ وہاں کی عزت اور شہرت چھوڑ کر وطن واپس آگئے۔ ایسا انہوں نے کیوں کیا؟ وہیں رہ جاتے۔''

''اس کا صحیح جواب تو وہی دے سکیں گے۔ البتہ ہم قیاس کر سکتے ہیں کہ یہاں ان کے والدین اور عزیز و اقارب تھے۔ دوست احباب تھے۔ اس کے علاوہ وطن کی مٹی، یہاں کی فضا، ہوا اور ماحول کے بھی وہ عادی تھے اس لیے محض اپنے مفاد کے لیے عزت اور شہرت کے لیے لندن میں رہنا گوارا نہیں کیا اور یہاں لوٹ آئے۔''

''ہاں۔'' خاتون نے آہ بھر کر کہا۔ ''اور یہاں آکر پھر مصائب اور آلام کے شکار ہوگئے۔''

میں نے مسکرا کر کہا۔ ''عشق اسی کا نام ہے۔ لوگ محبت میں مبتلا ہو کر اپنا سکھ چین گنوا بیٹھتے ہیں۔ عشق کسی سے ہو کسی شخصیت سے یا وطن کی مٹی سے۔ طلعت حسین جیسا حساس آرٹسٹ بھلا اس عشق سے کیسے محفوظ رہ سکتا تھا؟''

''یہاں آنے کے بعد......'' خاتون نے خالی کپ کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''طلعت حسین کو ایک دم تو ریڈیو اور ٹی وی پر کام نہیں مل گیا ہوگا؟''

''نہیں، جہاں یہ عالم ہو کہ بڑے بڑے آرٹسٹ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھے ہوں، وہاں ایک نوآموز آرٹسٹ کو کون بلا کر کام کرنے کی پیشکش کرتا؟ جب کہ دوسری طرف ایک خوددار شخصیت زندہ رہنے کے لیے انسان کو روزی روٹی کی تو ضرورت پڑتی ہے۔ طلعت حسین نے اپنی روزی روٹی کے لیے انتظار نہیں کیا کہ ریڈیو، ٹی وی یا اسٹیج سے انہیں بلاوا آئے۔ روٹی کی فوری ضرورت پوری کرنے کے لیے روزی کا نیا راستہ اختیار کرلیا۔ انہوں نے بطور صحافی ملازمت کرلی۔''

''کیا کیا؟'' خاتون ایک دم چونکیں۔ ''لندن سے آرٹ اور فن کی تعلیم و تربیت حاصل کرکے آنے والے فنکار نے اخبار میں کام کرنا شروع کردیا؟''

''جی ہاں وہ پڑھے لکھے تو تھے ہی انہوں نے فخر ماتری کے اردو اخبار ''حریت'' میں بطور سب ایڈیٹر کام کرنا شروع کردیا اور کوئی ڈیڑھ سال تک قلم کی روزی کماتے رہے۔''

''ارے بھئی اٹھہریں رکیں۔'' خاتون نے مجھے ٹوکتے ہوئے کہا۔ ''یہ ایک دم وہ صحافت کے میدان میں کیسے کود پڑے؟''

''قیاس اغلب ہے کہ اے آر ممتاز ہی نے انہیں صحافت کی دشت نوردی پر آمادہ کیا ہوگا۔ اے آر ممتاز سے لندن ہی میں ان کی صاحب سلامت ہوئی تھی۔ وہ بھی بی بی سی سے وابستہ تھے۔ وطن واپس آکر وہ حریت سے وابستہ ہو گئے ہوں گے۔ یہاں جب طلعت واپس آئے اور ان سے ملاقات ہوئی ہوگی تو انہوں نے پوچھا ہوگا۔ ''کیا کررہے ہو؟''

انہوں نے کہا ہوگا۔ ''کچھ نہیں۔''

غالباً اس طرح اے آر ممتاز کے کہنے پر وہ صحافی بن گئے۔

''روٹی تو کما کھائے کسی طور مچھندر۔'' خاتون خوشگوار موڈ میں بولیں۔

''شکر ہے کہ اس موقع پر انہوں نے کوئی کمتر کام نہیں کیا۔''

''کوئی کام گھٹیا یا کمتر نہیں ہوتا۔'' میں نے کہا۔ ''چوری کرنا، کسی کی حق تلفی کرنا، بھیک مانگنا، یہ گھٹیا کام ہیں۔ ان کے بجائے کسی طرح کی بھی مزدوری کرنا اور حلال رزق کمانا باعث فخر ہے۔ ہاں، یہ بات اچھی ہے کہ انہوں نے اس موقع پر بطور صحافی کام کیا۔ اردو اخبار ہی میں صحافتی ذمہ داری نہیں نبھائی۔ کچھ عرصہ تک کراچی سے شائع ہونے والے انگریزی روزنامہ مارننگ نیوز میں بھی سب ایڈیٹری کی۔''

''گڈ!'' خاتون بولیں۔ ''اعلیٰ تعلیم یافتہ ہونے کی وجہ سے ان کے لیے اردو اور انگریزی ایک ہی جیسی تھی۔ یوں بھی وہ بڑے باصلاحیت انسان ہیں۔ انہوں نے بی بی سی ٹیلی ویژن پر بھی اردو کے علاوہ انگریزی پروگراموں میں کامیابی سے پرفارم کیا تھا۔''

''آپ کو طلعت حسین کی کون سی بات یا خوبی اچھی لگتی ہے یا لگتی تھی؟'' میں نے پوچھا۔

''میں کیا اور میری بساط کیا۔'' خاتون نے کسر نفسی سے کام لیتے ہوئے کہا۔ ''میں تو ان کی ایک عام سی پرستار ہوں۔''

''پرستاروں کی بھی کوئی پسند ہوتی ہے۔ آپ کی پسند کیا ہے؟''

ذرا سوچ کر بولیں۔ ''ان کی یہ بات مجھے پسند ہے کہ وہ جس کردار میں بھی سامنے آتے ہیں۔ اس میں دیکھنے والوں کو ضرور متاثر کرتے ہیں۔ بہ الفاظ دیگر وہ ہر رول میں انگوٹھی کے نگینے کی طرح فٹ نظر آتے ہیں، جب کہ ان کی آواز بہت خوب صورت ہے اور میرا خیال ہے کہ ان کی آواز کا بھی بہت بڑا اور نمایاں حصہ ہے ان کی اداکاری کو کامیاب بنانے کا۔''

''جی ہاں! طلعت کی آواز ان کی بہت بڑی خوبی ہے۔ مجھ سمیت بہت سے لوگ ان کی آواز کو پسند کرتے ہیں۔ ایک بار ایک صحافی نے بھی ان سے ان کی آواز کے بارے میں سوال کیا تھا۔ ''آپ پر کب انکشاف ہوا کہ آپ غیر معمولی آواز کے مالک ہیں؟''

اس پر انہوں نے جواب دیا۔ ''اگر آپ مجھ سے ایماندارانہ جواب مانگتے ہیں تو میں آپ کو بتاؤں کہ مجھے آج تک پتا نہیں چلا کہ میری آواز بہت اچھی ہے۔ میں اچھا آرٹسٹ ہوں۔ لوگ کہتے ہیں کہ آپ کی آواز اچھی ہے۔ یقیناً ہوگی مگر مجھے اپنی آواز اتنی اچھی نہیں لگتی۔''

خاتون مسکرائیں۔ ''یہ ان کی کسر نفسی ہے۔ حقیقت یہ ہے کہ ان کی آواز واقعی غیر معمولی ہے۔'' وہ ذرا رکیں۔ پھر بولیں۔ ''ان کی کوئی اور خوبی؟''

میں نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''پتا نہیں آپ کو معلوم ہے یا نہیں کہ انہوں نے کچھ ڈرامے بھی لکھے ہیں۔''

''نہیں مجھے بالکل معلوم نہیں۔ میں نے آپ کو بتایا ہے نا کہ گھریلو ذمہ داریوں میں پھنس کر میری تفریحی سرگرمیاں بہت محدود ہو کر رہ گئی تھیں۔''

''طلعت حسین نے چار ڈرامے ٹی وی کے لیے لکھے تھے۔ طارق بن زیاد، ایک رات ایک کھیل، ٹائپسٹ اور قصہ چہار درویش تھے۔''

''اس سلسلے کو آگے کیوں نہیں بڑھایا؟'' خاتون نے حیرت کا اظہار کرتے ہوئے پوچھا۔

اس کا جواب انہوں نے یہ دیا تھا کہ طارق بن زیاد کے بعد میں نے ڈرامانویسی سے توبہ کرلی۔ آپ پوچھیں گے کہ طارق بن زیاد میں ایسی کیا بات تھی کہ آپ کو ڈرامانویسی سے تائب ہونا پڑا؟ تو اس کا جواب یہ ہے کہ میں حقیقت پسند ہوں۔ میں اپنے ڈراموں میں وہی لکھتا ہوں جو سچ ہو۔ سنی سنائی اور مفروضوں پر مبنی باتوں پر اپنی تحریر کی عمارت کھڑی نہیں کرتا۔ طارق بن زیاد کی تاریخی حیثیت یہ ہے کہ وہ ایک اچھا جنگجو تھا۔ ہمارے ہاں یہ بڑا مسئلہ ہے کہ ہمارے جتنے بھی جنگجو ہیرو ہیں ہم انہیں آسمان سے اتری ہوئی مخلوق سمجھ بیٹھتے ہیں کہ ان سے کوئی غلطی نہیں ہوسکتی۔

طارق بن زیاد کا معاملہ یہ تھا کہ اسے موسیٰ بن نصیر نے حملہ کرنے کے لیے بھیجا تھا کیہ اسپین کے فرمانروا راڈک نے دختر وزیر کی عزت لوٹ لی تھی اور اس وزیر نے اس واقعے کی شکایت موسیٰ بن نصیر سے کردی تھی۔ اس زمانے میں یہ قاعدہ تھا کہ وزراء اور فوجیوں کی بیٹیوں کو تربیت کے بہانے شاہی محلوں میں رکھا جاتا تھا۔ ایک طرح سے وہ یرغمال ہوتی تھیں کہ مبادا با اثر لوگ بادشاہ کے خلاف بغاوت نہ کریں۔ حملے سے قبل طارق بن زیاد کی طرف سے کی گئی تقریر تاریخ کے صفحات میں محفوظ ہے۔ اس تقریر میں طارق اپنے سپاہیوں سے یہ کہتا ہے کہ امراء کی بیٹیاں شوہر کے انتظار میں بیٹھی ہیں۔ آخر میں صرف اتنا ذکر ہے کہ اگر تم کامیاب ہو گئے تو تمہیں جنت ملے گی۔ جب میں نے یہ ڈراما لکھا تو ایک شور اٹھ کھڑا ہوا کہ طارق بن زیاد اتنا بڑا آدمی تھا طلعت نے اس کے بارے میں کیا لکھ دیا جس کے سیٹ بنانے میں اتنی رقم ضائع کردی۔ میرے پاس صحافیوں کا باقاعدہ ایک گروپ آیا اور انہوں نے یہ سوال اٹھایا تو مجھے ہنسی آگئی اور میں نے ان سے کہا کہ اس ڈرامے میں کوئی سیٹ بنایا ہی نہیں گیا تھا۔ صرف روشنی سے تاثر دینے کی کوشش کی گئی تھی۔''

خاتون ذرا دیر خاموش رہیں پھر یوں لب کشائی کی۔

''میرے خیال میں تو طلعت حسین کی دلیل درست ہے۔''

اس کے بعد ذرا دیر تک ہم دونوں خاموش رہے پھر خاتون کچھ یاد کرتے ہوئے بولیں۔ ''طلعت حسین کے بقول انہوں نے طارق بن زیاد کے بعد ڈراما لکھنا ترک کردیا مگر یہ جو بعد کے ڈرامے ہیں۔ ایک رات ایک کھیل، ٹائپسٹ اور قصہ چہار درویش کیوں لکھا؟''

انہوں نے یہ ڈرامے پہلے لکھے تھے جو ٹیلی کاسٹ ہو کر مقبول ہوئے۔ طارق بن زیادہ اس سلسلے کا آخری ڈراما تھا۔ دراصل میرے بتانے کی یہ غلطی تھی۔ میں نے طارق بن زیاد کا نام پہلے لے لیا تھا۔''

اتنے میں میری بہو نے آکر کہا۔ ''خالہ اماں! آپ کھانا کھا کر جایئے گا۔''

''ارے بھئی! تم نے اتنی محبت سے اتنی اچھی چائے پلا دی کیا وہی کافی نہیں؟''

''اب کھانے کا وقت ہونے والا ہے۔ اس لیے کھائے بغیر آپ کیسے جاسکتی ہیں؟''

''اس شرط پر کھالوں گی کہ تم کوئی اہتمام نہ کرو۔ جو کچھ تم عام حالت میں پکاتی ہو بس وہی ہو۔''

''جو کچھ دال دلیا موجود ہے وہی پیش کروں گی۔''

''ہمارے لندن میں تو تھیٹر بہت مقبول ہے۔'' خاتون ذرا توقف کے بعد بولیں۔

''مجھے پتا نہیں، طلعت نے لندن میں کسی تھیٹر میں کام کیا یا نہیں۔ یہاں کا حال آپ کو معلوم ہوگا۔''

''تھیٹر اداکاری کا ایسا اسکول ہے جو آرٹسٹوں کو اس فن کا بنیادی سبق پڑھاتا ہے۔'' میں نے کہا۔ ''لندن میں کئی تھیٹر سال بھر تک ڈرامے اسٹیج کرتے رہتے ہیں۔ جن میں بڑے اور چھوٹے، نامور اور غیر معروف آرٹسٹ اپنے فن کا مظاہرہ کرتے رہتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی کبھی اچھے اور معیاری اسٹیج ڈرامے پیش کیے جاتے تھے جو آہستہ آہستہ معدوم ہوگئے۔ طلعت حسین نے لندن سے واپس آکر کچھ تھیٹر ڈراموں میں کام کیا تھا۔ وہ اس بارے میں کہتے ہیں۔ ''میں بڑے شوق سے تھیٹر کرنے لندن سے پاکستان آیا تھا مگر جنرل ضیاء الحق پیچھے پڑ گئے۔ مجھے جتنا موقع مل سکا میں نے اسٹیج کیا۔ تقریباً دس بارہ ڈرامے کیے۔ اس کے بعد پاکستان میں تھیٹر رہا ہی نہیں۔ اب تو لوگ صرف عمر شریف اور امان اللہ وغیرہ ہی کا تھیٹر دیکھ رہے ہیں مگر یہ وہ ہے ہی نہیں جو تھیٹر کی تعریف پر پورا اترتا ہو۔ یہ صرف ہمارے ہاں ہی نہیں ہوا، اس سے پہلے یہ اٹلی میں ہو چکا ہے۔ تھیٹر میں جگت بازی اور پھکڑ پن کی شروعات پندرہویں صدی میں اٹلی سے ہوئی۔ اسی زمانے میں COMMEDI A DELL ARTE سامنے آئے جو بھانڈ قسم کے لوگ تھے اور گاؤں گاؤں جا کر تماشا دکھاتے تھے۔ یہ انتہائی ولگر ہوا کرتے تھے۔ یہی چیز آج تک چل رہی ہے۔ بہرحال عمر شریف اور امان اللہ وغیرہ جو کچھ کر رہے ہیں اسے میں کم نہیں سمجھتا۔ عمر شریف کے پاس مکالمات کا ذخیرہ ہے وہ جس طرح معاشرے پر جملے کستے ہیں یہ انہی کا خاصا ہے مگر عمر شریف، امان اللہ اور ان کی پیروی کرنے والے جگت بازوں کو کچھ بھی نام دے دیا جائے میں اسے ڈراما یا تھیٹر تسلیم نہیں کرسکتا۔''

ہمارے ہاں سنجیدہ ڈراما کامیاب نہ ہوسکا جس کی وجہ طلعت حسین یہ بتاتے ہیں۔ ''پاکستان میں ستر تک سب کچھ ٹھیک چل رہا تھا۔ فرقان حیدر صاحب آدم جی ہال میں ڈرامے کیا کرتے تھے۔ اس کے بعد تھیٹر کو زوال آیا جس کی وجہ انتہائی سیاسی تھی۔ ستر میں یہاں جو تبدیلی آئی اس تبدیلی

کو سازشی سے زیادہ سازشی کہا جاسکتا ہے۔''

''ہمارے ہاں کچھ لوگوں کا خیال ہے کہ......'' میں نے خاتون کی دلچسپی کو دیکھتے ہوئے بات آگے بڑھائی۔ ''ڈرامے گلیمرائز ہو کر اپنی کہانی کھو چکے ہیں جب کہ طلعت حسین کا خیال ہے کہ گلیمرائز ہو نہیں گئے بلکہ کیے گئے ہیں۔ تعلیمی نظام کے کمزور ہونے سے ایک خلا پیدا ہوا۔ اس خلا کو انگریزی نظام اور پرائیویٹ اسکولوں نے پُر کردیا۔ پہلے اردو میں نصاب ہوتا تھا اور انگریزی اختیاری مضمون تھا یہ ایک بڑا موضوع ہے۔ انسانی ترقی، ارتقاء تصورات کی بنیاد پر ہوتا ہے۔ تصورات کی طاقت اور صلاحیت مادری زبان میں ہوتی ہے۔''

میں ذرا دم لینے کے لیے رکا تھا کہ خاتون بول پڑیں۔

''ماشاء اللہ! یہ اس شخص کی سوچ اور وژن ہے جو انگریزوں کے دیس میں خاصا وقت گزار آیا ہے۔ اپنی زبان کے علاوہ انگریزی زبان میں بھی اپنی صلاحیتوں کا اظہار کر چکا ہے۔''

''بات دراصل یہ ہے محترمہ!'' میں نے ان سے کہا۔ ''طلعت حسین ہمارے ان فنکاروں میں ہیں جو صرف پرفارمنگ آرٹ کے تربیت یافتہ نہیں اور معاشرتی معاملات کو بھی بخوبی سمجھتے ہیں ان پر غور وفکر کرتے ہیں ان کی اس سلسلے میں مزید باتیں سنیے۔

''تصورات کی طاقت اور صلاحیت اس زبان میں ہوتی ہے جو ایک خطے کی زبان سمجھی جاتی ہے اس سے ملتی جلتی ہماری زبانیں ہوتی ہیں۔ ان زبانوں کے درمیان جب انگریزی زبان کو رائج کیا جائے گا تو اس کا اثر مقامی زبانوں پر بھی پڑے گا۔ بچپن سے ہم ماں یا اماں سنتے آئے ہیں۔ اس کی جگہ مدر یا ماما نے لے لی ہے، کیا مدر یا ماما کے الفاظ آپ کے اندر ایسے ہی جذبات پیدا کرتے ہیں جیسے لفظ ماں پیدا کرتا ہے؟ یہ ایک پیچیدہ مسئلہ ہے۔ ہم نے اپنی زبان کو ختم کردیا ہے۔''

وہ غالباً کوئی نیا سوال کرنے والی تھیں کہ میری بہو نے آکر کہا۔ ''کھانا لگ گیا ہے۔ پہلے کھا لیجیے۔ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔''

ہم اٹھ کر کھانے کی میز پر چلے گئے۔ کھانا بہت عام سا تھا۔ وہ خوش ہو کر بولیں۔ ''جیتی رہو۔ یہ سادہ کھانا دیکھ کر دل خوش ہوگیا جب سے لندن سے آئی ہوں جہاں جاؤ بریانی، قورمہ اور روایتی ڈش۔''

میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔ ''آپ یہاں یوں بچ گئیں کہ آپ کے آنے کی کوئی اطلاع نہیں تھی اگر پہلے سے معلوم ہوتا تو یہاں بھی بریانی آپ کو زہر مار کرنی پڑتی۔''

اس پر وہ ذرا سے ہنسیں۔

کھانے سے فارغ ہو کر ہم دونوں نے دوبارہ گفتگو شروع کی تو طلعت حسین کی اداکاری کے بارے میں پوچھ بیٹھیں۔ ''طلعت نے ڈراموں کے علاوہ فلموں میں بھی تو کام کیا ہے؟''

''جی ہاں۔'' میں نے کہا۔ ''انہوں نے بہت پہلے ایک انڈین فلم سوتن کی بیٹی میں ایک وکیل کا کردار ادا کیا تھا جو بہت سراہا گیا۔ پھر جب 1998ء میں قائداعظم محمد علی جناح پر فلم ''جناح'' بنی تو اس میں طلعت حسین نے مہاجر کا کردار بڑی خوب صورتی سے ادا کیا۔ فلم میں جب اس مفلوک الحال مہاجر کا قائداعظم سے سامنا ہوتا ہے تو اس کے چہرے پر بیک وقت غم اور خوشی کے جذبات اور تاثرات قابل دید اور آنکھیں نم کردینے والا نظارہ تھا۔''

''ہاں! میں نے یہ فلم لندن میں دیکھی ہے۔ اس میں طلعت کا کردار بہت متاثر کن ہے۔'' خاتون نے اظہار خیال کیا۔ پھر بولیں۔ ''پاکستانی ڈراموں کا مجھے زیادہ علم نہیں جن میں انہوں نے اداکاری کے جوہر دکھائے ہیں۔''

''انہوں نے بہت سے ٹی وی ڈراموں میں کام کیا ہے۔'' میں نے بات کا سلسلہ آگے بڑھاتے ہوئے کہا۔ ''ان کے مشہور ڈراموں میں پناہ، انسان اور آدمی، ہوائیں، کشکول، تھوڑی خوشی تھوڑے غم، کھیت کھیت ہریالی، گھوڑا گھاس کھاتا ہے، دیس پردیس، آنسو، اک نئے موڑ پر، طارق بن زیاد، ٹائپسٹ اور پرچھائیاں یادگار حیثیت کے حامل ہیں۔''

سوویت فوج کی افغانستان آمد اور افغان جنگ کے پس منظر میں بنائے گئے پی ٹی وی کے ڈرامے ''پناہ'' میں طلعت حسین کا کردار لوگ اب تک نہیں بھولے۔ پناہ میں طلعت حسین اور عظمیٰ گیلانی کی فنکارانہ صلاحیتیں عروج پر نظر آئیں۔ طلعت حسین کی فنکارانہ صلاحیتوں کا اعتراف کرتے ہوئے انہیں متعدد ایوارڈز سے نوازا جاچکا ہے۔ ان اعزازات میں ''گمنام'' میں ڈاکٹر کے کردار پر بینٹ ایکٹر اور لاج کے رول پر بیسٹ سپورٹنگ ایکٹر کے ایوارڈ بھی شامل ہیں۔ 1982ء میں انہیں حکومت پاکستان نے تمغۂ حسن کارکردگی سے نوازا۔ 2006ء میں فلم ''امپورٹ ایکسپورٹ'' پر انہیں ناروے کی جانب سے بیسٹ سپورٹنگ

ایکٹر کا ''اینڈ اایوارڈ'' ملا۔

''پچھلے، آپ کی زبانی مجھے یہ معلوم ہوا کہ میرے پسندیدہ فنکار کو نجی اور سرکاری طور پر اعزازات اور ایوارڈز سے بھی نوازا گیا۔ یہ بڑی خوش آیند بات ہے۔''

وہ خاموش ہوئیں تو میں کچھ سوچ کر مسکرانے لگا۔ مجھے ہنستے ہوئے دیکھ کر فوراً متوجہ ہوئیں۔ ''خیریت تو ہے کس بات پر ہنسی آرہی ہے؟''

''ایک بات یاد آگئی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''اور وہ بات یہ تھی۔ طلعت حسین سے کبھی کسی صحافی نے پوچھا تھا۔ بعض لوگوں کا خیال ہے کہ فنکاروں کو ایوارڈز اور عہدے ذاتی تعلقات اور سیاسی وابستگیوں کی بناء پر دیے جاتے ہیں۔ اس الزام میں کتنی صداقت ہے؟''

''پھر اس ایوارڈز ونر فنکار نے کیا جواب دیا؟''

''اس کا جواب اس کی طرح عجیب تھا۔ وہ بولا۔ ''اس بارے میں مجھے کچھ پتا نہیں جب مجھے ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' ملا تب بھی مجھے اس بارے میں کچھ پتا نہیں تھا۔ نیشنل فلم ایوارڈ ملے تب بھی اس بارے میں کچھ نہیں جانتا تھا۔ ناروے سے انٹرنیشنل ایوارڈ بھی لے آیا۔ اس وقت بھی مجھے یہ معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ ایوارڈ مجھے کس نے دلوایا۔ میری سفارش کس نے کی؟ کون ایسا میرا چہیتا تھا جس کے کہنے پر مجھے ان اعزازات سے نوازا گیا؟''

''ہاں۔'' خاتون مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''اس سوال کا سیدھا سا جواب تھا۔ مجھے معلوم نہیں کہ ایوارڈز اور اعزازات کس طرح دیے جاتے ہیں مگر انہوں نے اپنے اعزازات اور ایوارڈز کے حوالے سے جواب دیا اور کہا میں نے تو کسی سے سفارش کرنے کو نہیں کہا تھا۔ میرے تو کسی سے ایسے تعلقات نہیں تھے جس سے میں کہتا مجھے ایوارڈ دلوا دو۔''

''مگر ان کا جواب سن کر سوال کرنے والے صحافی کو مزہ آگیا ہوگا اور جب اس نے ان کا جواب شائع کیا ہوگا تو پڑھنے والوں کو بھی مزہ آیا ہوگا۔''

''جی ہاں ان کا جواب بہرحال دلچسپ تھا۔'' پھر ذرا توقف کے بعد بولیں۔ ''یہ بات سمجھ میں نہیں آئی کہ فلم ''جناح'' میں ان سے صرف ایک سین میں اداکاری کروائی گئی۔ ڈائریکٹر نے ان سے مزید کام کیوں نہیں کرایا؟''

''بات دراصل یہ ہے جس کا جتنا کام ہوتا ہے ہدایت کار اس سے اتنا ہی کام لیتا ہے۔ کسی بھی فلم یا ڈرامے میں بہت سے کردار ہوتے ہیں۔ جس سے جتنا کام لیا جانا ضروری ہوتا ہے اس سے اتنا ہی کام لیا جاتا ہے۔ یہ سوال جو آپ نے کیا ہے کچھ اور لوگوں نے بھی کیا تھا جس کا جواب طلعت حسین نے کچھ اس طرح دیا تھا۔ ''اگر آپ ''جناح'' کا موازنہ فلم ''گاندھی'' سے کریں گے تو گاندھی کے بنائے جانے کا منصوبہ بالکل مختلف تھا۔ گاندھی داستان گوئی کے انداز میں بنائی گئی تھی اور داستان لمبی ہوتی ہے جب کہ ''جناح'' افسانے کے انداز میں بنائی گئی جو چھوٹا ہوتا ہے اور اس میں بہت سی چیزیں آپ کو خود سمجھنی ہوتی ہیں، اگر اصطلاحی معنوں میں اسے سمجھنا چاہیں تو عرض کروں گا کہ ''گاندھی'' کلاسیکل یا داستان گوئی کے انداز میں بنی تھی اور ''جناح'' ماڈرن انداز میں بنائی گئی۔ اس میں زیادہ تفصیل نہیں دی گئی ہے۔'' اس جواب کے اختتام پر انہوں نے کہا۔ ''مجموعی طور پر ''جناح'' بہت اچھی فلم تھی۔''

''فلموں کے بارے میں طلعت کی سوچ بہت وسیع ہے۔'' خاتون نے ذرا سوچ کر کہا۔ ''انہوں نے کبھی خود فلم سازی کے بارے میں نہیں سوچا؟''

طلعت حسین اس بارے میں کہتے ہیں۔ ''اگر میرے پاس پیسے ہوتے تو اس جانب کب کا قدم اٹھا چکا ہوتا۔'' طلعت کا کہنا ہے۔ ''اگر ہم اچھی فلمیں بنائیں تو لوگ سینما ہال کا رخ کریں گے۔ ہمارے ہاں زیادہ تر گرمی رہتی ہے لوگ سینما کے ٹھنڈے ماحول میں بیٹھنا چاہتے ہیں۔ بہت سے لوگ ہوٹلنگ کرتے ہیں جس میں چار پانچ سو روپے خرچ ہو جاتے ہیں۔ یہی لوگ فلم دیکھنے بھی آسکتے ہیں۔ زبان کے چٹخارے سے زیادہ قلب ونگاہ اور ذہن کی تفریح زیادہ سود مند ہے۔''

''مجھے پتا نہیں، آپ کے ہاں فلم سازی میں کیا پیش رفت ہوئی ہے۔''

''آپ نے پوچھا ہے ہمارے ہاں بننے والی فلموں کے بارے میں تو اب ماشاءاللہ کچھ اچھی فلمیں بننے لگی ہیں جو اچھا بزنس بھی کررہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہونا چاہیے کہ اب ہمارے ہاں بھارتی فلمیں بھی باضابطگی کے ساتھ ریلیز ہونے لگی ہیں۔ ہماری اچھی فلمیں بھارتی فلموں کی موجودگی میں بھی اچھا بزنس کرلیتی ہیں جب کہ بیرونی مارکیٹ میں بھی اب انہیں شوق سے دیکھا جاتا ہے۔''

''میرا خیال ہے لندن واپس جانے سے پہلے میں یہاں کراچی میں ایک دو پاکستانی فلمیں دیکھ لوں۔''

''کراچی ہی میں نہیں، آپ لندن میں بھی فلمیں دیکھیں۔ اخبار پڑھیں۔ ٹیلی ویژن دیکھیں۔ ہوسکتا ہے آنے والے دنوں میں طلعت حسین کو کوئی پروڈیوسر مل جائے اور وہ فلم بنانے کا شوق بھی پورا کرلیں۔ اگر آپ اخبار نہیں پڑھیں گی، ٹیلی ویژن نہیں دیکھیں گی تو آپ اپنے محبوب فنکار کی فلم دیکھنے سے بھی محروم ہو جائیں گی۔ آج سے بہت پہلے طلعت حسین نے کہا تھا۔ ''ہماری فلم انڈسٹری اگر دوبارہ اٹھے گی تو کراچی سے اٹھے گی اور جب تک یہاں رہے گی ٹھیک رہے گی۔ کراچی سے نکلی تو خراب ہو جائے گی۔'' اور اب ہمارے ہاں دوبارہ فلموں کا ریوائیول ہوا تو کراچی ہی سے ہوا۔ یعنی طلعت حسین کی پیش گوئی درست ثابت ہوئی۔''

''طلعت نے، یہ بات کیوں کہی؟'' خاتون بولیں۔ ''لاہور تو شروع سے ہی پاکستان کا فلمی مرکز رہا ہے۔''

''آپ چونکہ پاکستان سے لندن جانے کے بعد، یہاں جو کچھ ہوا، اس سے واقف نہیں، اس لیے آپ کو یہ جاننا ضروری ہے کہ جب تک لاہور میں اچھی معیاری اور خوب صورت تفریحی فلمیں بنتی رہیں، لاہور مرکز کی اہمیت اور افادیت قائم رہی مگر وہاں ایک وقت ایسا آیا کہ نان ٹیکنیکل اور نان پروفیشنل لوگوں کے ہاتھوں پوری فلم انڈسٹری یرغمال بن گئی۔ یہ دیکھ کر جو جینوئن اور پروفیشنل فلم میکر تھے وہ انڈسٹری سے کنارہ کش ہو گئے۔ نااہل اور ناتجربہ کار لوگ اپنے سرمایہ کے زور پر آئے تھے۔ انہوں نے جو فلمیں بنانا شروع کیں، ان میں مار دھاڑ، عریانی فحاشی اور بے مقصدیت کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتا تھا۔ یہ فلمیں بھی ہنرمندوں سے بنواتے تھے جو زیادہ تجربہ کار نہ تھے۔ ایسی فلموں کا جو حشر ہونا تھا وہ ہوا۔ لوگوں نے سینما گھر آنا ترک کردیا۔ فلم انڈسٹری تباہی کے دہانے پر چلی گئی۔ ایسے میں سینما انڈسٹری بھی بری طرح متاثر ہوئی۔ سینما انڈسٹری کو زندہ رکھنے کے لیے ہی بھارتی فلموں کی نمائش سے پابندی ختم کرائی گئی۔ بھارتی فلموں کی وجہ سے ہی نئے اور جدید سینما گھروں میں اضافہ ہوا۔''

''دیکھیے! آپ کی زبانی اتنی بڑی تبدیلی کی اطلاع ملی۔ مجھے تو بالکل بھی معلوم نہیں تھا کہ لاہور کا فلمی مرکز کن حالات سے دوچار ہوا۔ غالباً اس لیے طلعت نے یہ پیش گوئی کی تھی کہ اچھی فلمیں کراچی ہی سے بننا شروع ہوں گی۔''

''جی ہاں وجہ تو یہی تھی مگر لاہور میں بھی اب اچھے فلم میکر اچھی فلمیں بنانے لگے ہیں۔ بات دراصل یہ تھی کہ اچھے لوگ برے حالات میں انڈسٹری سے فیڈ آؤٹ ہو گئے تھے۔ فلم انڈسٹری کی تباہی کے بعد اس کے ذمے دار لوگ جب اپنی دنیا میں واپس چلے گئے اور کراچی میں بننے والی معیاری اور خوب صورت فلموں نے جب شائقین کو متاثر کرنا شروع کردیا اور ان فلموں نے اپنے بنانے والوں کو کما کردینا شروع کردیا۔ لاکھوں میں نہیں کروڑوں میں فلموں کی آمدنی ہونے لگی تو فلموں میں سرمایہ کاری کرنے والے بھی سامنے آنے لگے اور جدید سینما گھر جو پاکستانی فلموں میں دلچسپی نہیں لیتے تھے وہ بھی پاکستانی فلمیں دکھانے لگے۔ کراچی سے فلم سازی کے نئے سفر کا آغاز ہونے کے بعد لاہور میں بھی نئے رجحان کی فلمیں بنائی جانے لگی ہیں۔''

''یہ تو اچھی اور خوش آیند بات ہے۔'' خاتون نے اظہار خیال کیا۔ ''کراچی میں بنیں یا لاہور میں۔ ہیں تو پاکستانی فلمیں ہی، اب فلموں کا تو جو دستور ابتداء سے رہا ہے۔ جو اچھی ہوگی وہی پسند کی جائے گی اور اچھا بزنس کر کے دے گی۔''

''آپ درست کہہ رہی ہیں۔ سب فلمیں ایک جیسی نہیں ہوتیں۔ جن کی کہانی اچھی اور معیاری ہونے کے ساتھ ساتھ منفرد ہوتی ہیں، عام فلمی کہانیوں سے الگ اور مختلف ہوتی اور انہیں جدید تقاضوں کے تحت بنایا جاتا ہے، وہی فلمیں شائقین کی توجہ اور پسندیدگی حاصل کرتی ہیں۔ کراچی اور لاہور میں اس نئے دور میں جو فلمیں بنائی گئی ہیں۔ سب نے قابل ذکر کامیابی حاصل نہیں کی۔ کچھ فلمیں باکس آفس پر ناکام بھی ہوتی ہیں۔ کچھ نے درمیانی درجے کی کامیابی حاصل کی جب کہ چند فلموں نے سپرہٹ ہوکر دھوم مچائی۔''

''کیا آپ ایسی چند فلموں کے نام بتائیں گے؟''

''ایسی فلموں میں جوانی پھر نہیں آنی، نامعلوم افراد، نامعلوم افراد 2، وار، ایکٹر ان لا قابل ذکر ہیں۔''

''طلعت حسین جنہوں نے بقول آپ کے اچھی فلمیں دوبارہ بننے کی پیش گوئی کی تھی۔ کیا وہ بھی اس نئے دور میں شریک سفر ہے یا ان کو نظر انداز کردیا گیا؟''

''بطور اداکار ان کا سفر جاری رہا۔ وہ اچھے ہی نہیں بہت اچھے پرفارمر ہیں، اس بات سے کون انکار کرسکتا ہے۔ لہٰذا نئے دور کی فلموں میں بھی جہاں ان کی ضرورت محسوس کی

گئی، ان کو کاسٹ کیا گیا۔ ان سے اداکاری کروائی گئی۔''

ابھی میں دم لینے کے لیے ذرا رکا ہی تھا کہ خاتون جھٹ بول پڑیں۔ ''اب ان فلموں کے نام بھی بتا دیجیے اگر آپ کو یاد ہوں۔''

میں نے شرارتاً ذرا سوچنے کی اداکاری کی۔ مقصد صرف یہ تھا کہ ان کی بے قراری کا تماشا دیکھوں پھر میں نے گویا ذہن پر زور دیتے ہوئے کہا۔

''ایسی فلمیں ہیں ایکٹر ان لا، چھپن چھپائی اور پروجیکٹ قاضی۔''

خاتون نے اطمینان بھری لمبی سانس لی۔ ''اگر انہیں۔'' انہوں نے کہنا شروع کیا۔ ''بھارتی فلم ''سوکن کی بیٹی'' اور ناروییجن فلم ''ایکسپورٹ امپورٹ میں کاسٹ کیا جاسکتا ہے تو اپنے پاکستانی فلم ساز انہیں کیسے نظرانداز کرسکتے ہیں۔''

''بات صرف کاسٹ کیے جانے کی نہیں۔'' میں نے انہیں سمجھایا۔ ''ہر فلم بنانے والا، انہیں کاسٹ کرنا چاہتا ہے مگر وہ ہر فلم میں آنکھ بند کرکے کام نہیں کرتے، یہ دیکھتے ہیں کہ فلم کون بنا رہا ہے۔ کیسی کہانی پر فلم بنا رہا ہے، اس میں ان کا کیسا کردار ہے؟ وہ ایک سین کا بھی کردار ہو۔ جیسا ''جناح'' کا تھا۔ اگر اس میں ان کو پرفارم کرنے کا امکان نظر آتا ہے تو قبول کرلیتے ہیں۔ نہ ہو تو بڑی سے بڑی فلم کا بڑے سے بڑا کردار بھی قبول نہیں کرتے۔''

''ہر بڑا فنکار ان باتوں کو پیش نظر رکھتا ہے۔ اسی طرح اس کی عظمت برقرار رہتی ہے۔ طلعت حسین نے نئے دور سے پہلے بھی تو کچھ فلموں کا انتخاب کیا ہوگا؟ ایسی فلمیں کون سی تھیں؟''

''ایسی فلمیں جو مجھے یاد آرہی ہیں۔ چراغ جلتا رہا، گمنام، انسان اور آدمی، جناح، لاج، قربانی، کامیابی، آشنا، بندگی اور محبت مر نہیں سکتی، ہیں مگر یہ یاد نہیں کہ کس فلم میں ان کا کیا کردار تھا۔''

''یہ نہیں پوچھوں گی جو کچھ آپ نے بتایا ہے میرے لیے وہی کافی ہے۔''

میں نے ان سے کہا۔ ''طلعت حسین کے بارے میں ڈاکٹر ہما میر نے ایک مکمل کتاب تحریر کی ہے۔'' یہ ہیں طلعت حسین'' اگر آپ کو یہ کتاب مل سکے تو اسے ضرور پڑھیے۔''

''آپ کے پاس ہے یہ کتاب؟''

''نہیں۔''

''پھر کہاں سے اور کیسے دستیاب ہوسکے گی یہ کتاب؟''

''یہ کتاب آرٹس کونسل آف پاکستان، کراچی نے یہ کتاب چھاپی تھی جواب ان کے پاس بھی موجود نہیں۔ میں نے آرٹس کونسل سے رجوع کیا تھا تو انہوں نے کہا۔ اب تو اس کی ایک کاپی بھی ہمارے پاس نہیں۔''

''تو انہوں نے اسے دوبارہ کیوں نہیں پرنٹ کروایا؟''

''کونسل کے اور بھی بہت سے کام ہیں لہٰذا ان پر انہیں زیادہ توجہ دینا پڑتی ہے۔''

خاتون نے ذرا رک کر کہا۔ ''یہ ڈاکٹر ہما میر کون ہیں؟ انہیں اپنے طور ہی یہ کتاب ری پرنٹ کروانا چاہیے تھا۔''

''ڈاکٹر ہما میر آرٹس کونسل کی ایک بہت فعال ممبر ہیں اور انہیں اتنی فرصت نہیں ہوتی کہ وہ اپنے سابقہ کاموں کی ترویج میں وقت لگائیں۔ آرٹس کونسل کی بڑی ذمہ داریاں انہیں نبھانی پڑتی ہیں۔''

''طلعت حسین کی موجودہ مصروفیات کیا ہیں۔ وہ کچھ نہ کچھ تو کرتے ہوں گے؟''

''وہ ناپا (نیشنل اکیڈمی آف پرفارمنگ آرٹ) کے سرگرم رکن ہیں اور نوآموز فنکاروں کو اداکاری کی تربیت دیتے ہیں جب کہ ہیرا اور نیشنل بک فاؤنڈیشن کے ایمبیسڈر کے طور پر بھی اہم ذمہ داری نبھاتے ہیں۔''

''اللہ آپ کا بھلا کرے۔'' خاتون نے دعائیہ انداز میں کہا۔ پھر مسکراتے ہوئے بولیں۔ ''میری بھی تعریف کیجیے کہ میں نے ایسے بندے کو ڈھونڈ نکالا جس نے میری معلومات کے خزانے میں اتنا اضافہ کیا۔''

''آپ نے اللہ کا نام لیا۔'' میں نے سنجیدگی سے کہا۔ ''تو ایک بہت اہم بات یاد آگئی اور وہ یہ ہے کہ آپ کے اور ہم سب کے طلعت حسین نے اپنی غیر معمولی آواز میں قرآن شریف کا ترجمہ بھی ریکارڈ کرایا ہے۔''

''کیا...... کیا...... کیا! ذرا تفصیل سے بتائیں جناب۔''

''یہ تو آپ کو معلوم ہوگا کہ کلام اللہ کا آڈیو ریکارڈ بہترین قاریوں کی زبان سے ریکارڈ کروایا گیا ہے۔ ایسے ہی ایک آڈیو ریکارڈ میں ہر آیت کا جو ترجمہ پیش کیا گیا ہے، وہ ترجمہ طلعت حسین کی خوب صورت آواز میں ہے۔''

''سبحان اللہ!'' کہتے ہوئے خاتون کی آنکھوں میں نمی آگئی۔

نشان

سید احتشام

پولیس کا کام ہے کہ وہ جرم کو روکے، اگر کوئی جرم ہوا ہے تو وہ مجرم تک پہنچے۔ اس پولیس افسر نے بھی تحقیقات کا دائرہ اتنا بڑھا دیا کہ مجرم خود بخود سامنے آگیا۔ جب کہ مجرم اتنا چالاک تھا کہ اس نے جرم کے تمام نشانات مٹا دیئے تھے۔

ایک قتل کی تفتیش کا احوال جو خود میں انوکھا ہے

باربرا موگر کو مٹھائی کی اس دکان میں استقبالیہ پر کام کرتے ہوئے ایک ہفتہ ہوا تھا کہ ایک دن ایک شخص دکان میں داخل ہوا اور اس سے باتیں کرنے لگا۔ وہ کشیدہ قامت اور خوش شکل تھا۔ اس کی باتیں لچھے دار تھیں۔ باربرا اسے دل دے بیٹھی۔ وہ سترہ سال کی ایک حسین و جمیل اور پُرشباب دوشیزہ تھی۔ اس کی راہ میں آنکھیں بچھانے والے یقیناً کم نہ ہوں گے لیکن وہ پہلے کبھی کسی کی محبت میں گرفتار نہیں ہوئی تھی۔ یہ اس کی پہلی محبت تھی، لہٰذا وہ اپنی اس محبت میں بہت سنجیدہ



تھی۔ اس نے اس شخص کو اپنی فیملی سے ملانے کے لیے اگلی شب اپنے یہاں مدعو کیا۔ وہ شخص حسبِ وعدہ اس کے یہاں پہنچ گیا۔ باربرا کی فیملی اس شخص سے حد درجہ متاثر ہوئی۔ اس کا نام رسل تھا۔ اس کے جسم پر بیش قیمت لباس تھا۔ باربرا کی فیملی کے علم میں یہ بات آئی کہ اس کی عمر ستائیس سال تھی۔ گویا وہ باربرا سے دس سال بڑا تھا۔ انہیں یہ بھی معلوم ہوا کہ وہ فلاڈیلفیا کے ایک محکمہ جاتی اسٹور میں کریڈٹ منیجر کی حیثیت سے ملازم تھا۔ کان سے کم سنتا تھا لیکن اس کی یہ خامی باربرا کے لیے کوئی اہمیت نہیں رکھتی تھی کیونکہ وہ نہ صرف امیر بلکہ تعلیم یافتہ بھی تھا اور کئی زبانیں جانتا تھا۔ اس کی شخصیت خاصی متاثر کن تھی۔ وہ اپنے محلے کے بچوں کو سوئمنگ پول میں تیراکی بھی سکھاتا تھا۔

اس ملاقات کے ایک ہفتے کے بعد باربرا نے اس کے کہنے پر اپنی ملازمت چھوڑ دی اور اس کے بلاؤنزز ڈیپارٹمنٹل اسٹور میں اسٹینوگرافر کی حیثیت سے ملازم ہو گئی۔ پھر رسل اتنی آزادی سے اس کے یہاں آنے جانے لگا گویا وہ موگر فیملی کا داماد بن چکا ہو۔ مسٹر اور مسز موگر یہ محسوس کیے بغیر نہ رہ سکے کہ اگر وہ خود باربرا کے لیے کوئی بر ڈھونڈتے تو انہیں اس سے اچھا داماد نہیں مل سکتا تھا۔ وہ دھوم دھام سے ان کی شادی کا پروگرام بنانے لگے لیکن تین ہی مہینے بعد انہیں ایک دن ایسی خبر ملی جس نے سب کو دہلا دیا۔ انہیں یہ خبر ایک خط کے ذریعہ ملی تھی جو شکاگو سے پوسٹ کیا گیا تھا۔ اس خط میں باربرا نے اپنی بچکانہ تحریر میں لکھا تھا کہ وہ اور رسل وسطی امریکا جا رہے ہیں اور یہ کہ وہ راستے ہی میں شادی کرلیں گے۔ ان کی روانگی اتنی عجلت میں ہوئی تھی کہ انہیں ان لوگوں کو مطلع کرنے کا موقع ہی نہیں مل سکا تھا۔ وہ جلد ہی دوبارہ خط لکھے گی اور کچھ دنوں کے بعد رسل کے ہمراہ فلاڈیلفیا لوٹے گی اور ان کی دعائیں لے گی۔

مسٹر اور مسز لوگو کی سمجھ میں کچھ بھی نہیں آیا لیکن انہیں یہ اطمینان ضرور ہو گیا کہ وہ دونوں خوش تھے۔ یہ خط پہنچا ہی تھا کہ ایک اسکینڈل رونما ہو گیا۔ سب سے پہلے ڈیپارٹمنٹل اسٹور کے تفتیش کار وارد ہوئے اور پوچھنے لگے کہ وہ گمشدہ جوڑا کہاں ہے۔ ان کا کہنا تھا کہ رسل فرم کی ایک چھوٹی سی رقم سات سو ڈالر لے کر بھاگا تھا۔ پھر پولیس اس خبر کے ساتھ آدھمکی کہ وہ شخص جوان کی بیٹی کو بھگا لے گیا ہے، پہلے سے شادی شدہ تھا۔ دو بچوں کا باپ تھا اور یہ کہ بہت ہی دل پھینک واقع ہوا تھا۔

پولیس تو چلی گئی لیکن مسٹر اور مسز موگر کا سکون بھی اپنے ساتھ لے گئی۔ اب وہ اپنی بیٹی کے اگلے خط کا انتظار ہی کر سکتے تھے۔ اسی دوران پورے ملک میں ان دونوں کی تلاش شروع ہو گئی جس کا سلسلہ آخر کار وسطی اور جنوبی امریکا اور پھر یورپ تک پھیل گیا لیکن کہیں بھی ان کا پتا نہ چل سکا۔ دن اور رات ایک دوسرے کا تعاقب کرتے رہے۔ مسٹر اور مسز مورگن اپنی بیٹی کے منتظر رہے لیکن کوئی خط نہیں آیا۔ اسی طرح چھ ماہ گزر گئے۔ پھر 2 اگست کو وہاں سے تین ہزار میل دور کیلی فورنیا کے مضافات اسٹون کیسین سے گزرنے والے دو لڑکوں کو ایک جھاڑی میں سے جھانکتا ہوا ایک عورت کا سر نظر آیا۔ دونوں لڑکے دیر تک اس سر کو گھورتے رہے۔ پھر وہ مڑ کر بھاگتے ہوئے وہاں سے نصف میل دور واقع ایک گاؤں تک پہنچے اور وہاں موجود ایک شخص کو بتایا کہ انہوں نے کیا دیکھا تھا۔ اس شخص نے پولیس کو فون کر دیا۔

☆......☆

اطلاع ملتے ہی لاس اینجلس ہوموسائیڈ بیورو کے دو سراغ رساں لیفٹیننٹ فرینک اور رائے کو تفتیش کے لیے وہاں بھیج دیا گیا جہاں ایک ڈپٹی کورونر، ایک پولیس کیسٹ اور ایک پولیس فوٹو گرافر پہلے سے موجود تھے لیکن وہاں سنہرے بالوں والی کوئی لڑکی جھاڑیوں میں سے نہیں جھانک رہی تھی، جیسا کہ ان لڑکوں نے بیان کیا تھا۔ انہوں نے جو کچھ دیکھا، وہ انسانی کھوپڑی کی کھال تھی جس سے سنہرے بال اب بھی چپکے ہوئے تھے۔ اس مقام سے تقریباً دو سو فٹ کے فاصلے پر انہیں ایک لاش کی باقیات ملیں۔ لاش پشت کے بل پڑی ہوئی تھی، بالکل برہنہ تھی اور اس کی دائیں ٹانگ غائب تھی۔ ان لوگوں نے لاش کا معائنہ کیا۔ اس کا پیٹ چاک تھا اور اندرونی اعضا غائب تھے۔ یہ بظاہر کسی جنگلی جانور کی کارستانی لگتی تھی۔ ان لوگوں نے دیکھا کہ اس کی پیشانی کے بائیں طرف فریکچر بھی تھا۔ وہ بلاشبہ کسی نوخیز دوشیزہ کی لاش تھی۔ عمر بیس سال سے زیادہ نہیں رہی ہوگی۔ اس کے خدوخال بتاتے تھے کہ وہ بہت حسین اور بہت خوش اندام رہی ہوگی۔ ناخن خوبصورتی سے ترشے ہوئے تھے اور جسم سکڑا ہوا لگ رہا تھا۔ سورج کی تپش نے کھال کو جھلسا دیا تھا۔ یہ ایک انتہائی دلخراش اور روح فرسا منظر تھا۔ لڑکی کی ستواں ناک کے بانسے پر گولی کا ایک سوراخ تھا۔ مزید دو سوراخ بائیں سینے کے اندر نظر آرہے تھے لیکن ان سوراخوں میں گولی داخل نہیں ہوئی تھی بلکہ ان میں سے نکلی تھی۔ کورونر کے آدمیوں نے دستانے پہن کر لاش کو اوندھا کر دیا۔ لڑکی پر تین گولیاں چلائی گئی تھیں۔ ایک سر کی

پشت پر جو ناک سے نکل گئی تھی اور باقی دو گولیاں شانے پر جو سینے کے نیچے پائے جانے والے زخم کا نتیجہ تھیں۔ ان دو میں سے ایک گولی اب بھی جسم میں موجود تھی۔ کورونر نے اندازہ لگایا کہ لاش چار سے چھ ہفتے پرانی تھی۔

سراغ رساں فرینک اور رائے لڑکی کی گمشدہ ٹانگ کا سراغ لگانے کے لیے علاقے کو چھاننے لگے۔ ان کا خیال تھا کہ اتنے گھنے جنگل میں اس کی ٹانگ کا کہیں سراغ نہ مل سکا۔ ہاں لاش سے چند ہی منٹ کے فاصلے پر انہیں گھنی جھاڑیوں میں کسی شیر خوار کی کھوپڑی اور اس کی ننھی ننھی ٹانگوں کی دو ہڈیاں ملیں۔ ان سراغ رسانوں کی نظریں غیر ارادی طور پر لڑکی کی لاش پر چلی گئیں۔ انہوں نے بہت احتیاط سے اس کا معائنہ کیا اور اب ان کی سمجھ میں آیا کہ وہ لڑکی حاملہ تھی۔

وہ جنگل اور جھاڑیوں کو کھنگالتے ہوئے، تیس فٹ کی بلندی طے کر کے ''مل ہالینڈ ڈرائیو'' پر پہنچے۔ یہاں اس ہائی وے پر سڑک کے کنارے گرد و غبار میں انہیں چار چمکتی ہوئی چیزیں ملیں۔ یہ ہڈیوں کے بنے ہوئے چار منکے تھے جن پر ہاتھی دانت کی پالش تھی۔ یہ منکے ایک ٹوٹے ہوئے دھاگے میں پروئے ہوئے تھے۔ اس دریافت سے یہ ظاہر ہوتا تھا کہ قتل غالباً اسی مقام پر ہوا تھا۔ اس لڑکی نے بھاگنے کی کوشش کی تھی کہ پیچھے سے اس پر فائر کیے گئے تھے اور پھر اس کے کپڑے اتار کر اس کی لاش نیچے پھینک دی گئی تھی۔ ان سراغ رسانوں نے مزید ایک گھنٹا وہاں گزارا اور پھر لاس اینجلس واپس آگئے جہاں کورونر نے انہیں بتایا۔

''ہم نے لاش کی صفائی کر کے اسے برف میں رکھ دیا ہے۔ یہ رہی اس کی انگوٹھی اور یہ رہی وہ گولی جو اس کی ریڑھ کی ہڈی میں پھنسی ہوئی تھی۔ یہ اعشاریہ تین آٹھ کی گولی لگتی ہے۔''

''ڈاکٹر، آپ کو کوئی اندازہ ہے کہ جب وہ حیات تھی تو دیکھنے میں کیسی لگتی تھی؟''

''ہاں۔'' ڈاکٹر نے جواب دیا۔ ''یہ رہی ٹائپ شدہ رپورٹ۔ قد پانچ فٹ چار انچ، وزن چار اسٹون، زلفیں سنہری، خوش جمال اور خوش اندام۔ عمر اٹھارہ اور پچیس کے درمیان۔ مجھے ایسا کوئی ثبوت نہیں ملا کہ اس کی داہنی ٹانگ مصنوعی تھی۔''

''ڈاکٹر۔'' رائے بولا۔ ''میں اور فرینک سوچ رہے تھے کہ ممکن ہے اس کی ٹانگ میں کسی قسم کا نقص ہو جس سے ہمیں اس کی شناخت میں مدد مل سکے۔''

''اور تم لوگ یہ سوچ رہے ہو کہ قاتل نے وہ ٹانگ کاٹ دی؟'' ڈاکٹر حیرانی سے بولا۔ پھر اس نے سر ہلایا۔ ''ہاں، یہ ممکن ہے جب لاش سڑنے لگی ہوگی تو یہ کام مشکل نہیں ہوا ہوگا۔''

فرینک اور رائے نے کیپٹن جیمز اور اپنے چیف ہرمین کو اس کی رپورٹ دی اور اپنے دفتر پہنچ کر محدب عدسے کی مدد سے اس انگوٹھی کا معائنہ کرنے لگے۔ انگوٹھی کے اندر کی طرف ایک نمبر کندہ تھا۔ 1047 لاس اینجلس۔ گروی کے دکانداروں کا یہ طریقہ تھا کہ وہ اس طرح چیزوں کا ریکارڈ رکھتے تھے۔ سراغ رسانوں نے ان کی ایسوسی ایشن سے رابطہ کیا تو پتا چلا کہ وہ ففتھ مین اسٹریٹ کی ایک دکان کا تھا۔ اس دکان کے ریکارڈ سے یہ ظاہر ہوا کہ وہ نمبر مسز باربرا، 841 گولڈن ایونیو، لاس اینجلس کو چار جون کو جاری کیا گیا تھا۔ مسز باربرا نے 50 سینٹ کے عوض وہ انگوٹھی گروی رکھوائی تھی اور چار دن کے بعد قرض ادا کر کے انگوٹھی چھڑائی تھی۔

''مجھے وہ لڑکی اچھی طرح یاد ہے۔'' دکاندار نے کہا۔ ''وہ اٹھارہ سال سے زیادہ عمر کی نہیں تھی اور حاملہ تھی۔ وہ انگوٹھی نہایت معمولی تھی لیکن مجھے اس پر ترس آگیا تھا۔''

سراغ رساں گولڈن ایونیو کے پتے پر پہنچے اور 841 نمبر اپارٹمنٹ کے دروازے پر دستک دی لیکن اندر سے کوئی جواب نہیں ملا۔ انہوں نے اپارٹمنٹ بلڈنگ کے منیجر کو ڈھونڈ نکالا۔ وہ مسز لیسٹرڈ نامی ایک خاتون تھی۔

''میں کسی مسز باربرا کو نہیں جانتی۔'' وہ بولی۔ لیکن جب رائے نے اس کا حلیہ بیان کیا اور عمر بتائی تو اسے ایک دم یاد آگیا۔ ''ہاں، اب میں سمجھ گئی۔'' اس نے کہا۔ ''کہیں اسے کچھ ہو تو نہیں گیا؟ اگر اسے کچھ ہوا ہے تو اس میں اس کے شوہر رسل کا ہاتھ ہوگا۔''

''تم ایسا کیوں کہہ رہی ہو مسز لیسٹرڈ؟''

''کیونکہ وہ پکنک پر گئی تھی اور اب تک واپس نہیں آئی، بے چاری۔'' مسز لیسٹرڈ نے جواب دیا۔ ''آپ جا کر مسز برنس سے ملیں۔ وہ آپ کو بہت کچھ بتا سکے گی۔ وہ شہر کے بلٹ مور ہوٹل میں کام کرتی ہے۔ شام میں لوٹے گی۔ وہ اور باربرا اچھی دوست تھیں۔''

''اس دوران آپ جو کچھ ہمیں بتا سکتی ہیں، بتائیں۔'' رائے نے کہا۔

''دونوں میاں بیوی پچھلے اپریل میں یہاں آئے تھے۔'' مسز لیسٹرڈ بتانے لگی۔ ''باربرا اُمید سے تھی اور اس کے یہاں جولائی یا اگست میں ولادت متوقع تھی۔ دونوں بہت اچھے تھے۔ وقت پر کرایہ ادا کرتے تھے اور پریشان نہیں کرتے

تھے۔ رسل ہر صبح کام پر چلا جاتا تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ وہ کیا کرتا تھا لیکن ظاہر ہے کہ وہ کوئی اچھی ملازمت کرتا ہوگا اور اسے اچھی تنخواہ ملتی ہوگی۔ تاہم باربرا خوش نہیں نظر آتی تھی۔ وہ اکثر رات میں اپنے شوہر کی منتیں کرتی ہوئی سنائی دیتی تھی۔ یہ کوئی نہیں جانتا کہ وہ کیا منتیں کرتی تھی پھر 24 جون کو اتوار کی صبح اس نے ایک کار کرائے پر حاصل کی اور اپنی بیوی کو پکنک پر لے گیا۔ اس نے ایسا ہی کچھ کہا تھا لیکن شام میں جب وہ لوٹا تو تنہا تھا۔ اس نے ایک مضحکہ خیز کہانی سنائی۔ اس نے کہا کہ واپسی میں لانگ بیچ پر باربرا کی خالہ مل گئی جو ریلوے اسٹیشن پر ایک ٹیکسی سے اتر رہی تھی۔ اسے اپنے گھر جانا تھا۔ باربرا ان کے ساتھ چلی گئی تاکہ ولادت کے موقع پر وہ اپنے ماں باپ کے پاس رہے۔'' وہ سانس لینے کو رکی اور پھر گویا ہوئی۔ ''اگلے روز رسل کو پچھلے احاطے میں باربرا کے بہت سے کپڑے جلاتے ہوئے دیکھا گیا۔ اس نے کئی پارسل بھی حوالہ ڈاک کیے اور باربرا کی پالتو بلی کو بھی آزاد کردیا۔ اس کے چند ہی دنوں کے بعد وہ کچھ بتائے بغیر کہیں چلا گیا اور اس کے بعد سے اب تک ہمیں اس کی کوئی خبر نہیں۔ باربرا کا بھی کوئی پتا نہیں چلا۔''

سراغ رسانوں نے دوسرے پڑوسیوں سے بھی پوچھ گچھ کی اور پھر اپنے ہیڈ کوارٹرز لوٹ گئے۔ جب وہ وہاں پہنچے تو ایک شخص ان کے پاس آیا اور ان سے مخاطب ہوا۔ ''میرا نام ٹیڈ ہے اور میں ایک ٹیکسی ڈرائیور ہوں۔'' اس نے اپنی آواز دھیمی کردی۔ ''4 جولائی کی رات کو ایک شخص نے مجھے روکا اور ''مل ہالینڈ ڈرائیو'' چلنے کو کہا۔ پھر اسٹون کیسین کے مغرب میں تقریباً سو گز پر پہنچ کر اس نے ٹیکسی رکوائی۔ اس کے پاس کاغذ میں لپٹی ہوئی کوئی چیز تھی، جس کی بوتل کے سائز اور شکل کی اور یہ بھی کہا کہ وہاں کہیں چوری چھپے شراب بکتی ہے۔ میں اس کا انتظار کرنے لگا۔ تقریباً چالیس منٹ کے بعد وہ بھاگتا ہوا آیا اور اچھل کر ٹیکسی میں بیٹھ گیا، ساتھ ہی چیخا۔ ''جلدی سے یہاں سے نکل چلو۔ میں نہیں چاہتا کہ پولیس میرے پیچھے لگ جائے۔'' لہٰذا میں اسے واپس لاس اینجلس لے آیا۔ آپ کو پتا ہے مجھے اس کی بات پر ذرا بھی یقین نہیں آیا تھا کیونکہ جب وہ واپس آیا تو اس کے ہاتھ میں وہ پیکٹ نہیں تھا اور اس کے جسم سے ایسی بو آرہی تھی جیسے وہ جراثیم کش دوا سے نہا کر آیا ہو۔''

اس کی بات سن کر فرینک اور رائے دونوں ہی قائل ہوگئے کہ رسل نہ صرف لاش کا تعفن چھپانے بلکہ باربرا کی ٹانگ کاٹنے وہاں گیا تھا اور یہ رسل ہی تھا جس نے اسٹون کیسین کی بھیانک تیرگی میں باربرا کی لاش اٹھا کر تیس فٹ نیچے پھینکی تھی لیکن اس نے وہ ٹانگ کہیں چھپادی تھی۔

''ہم کل وہاں جائیں گے اور جائزہ لیں گے۔'' فرینک نے کہا۔ ''غالباً اسے یقین ہوگیا تھا کہ ٹانگ کے بغیر ہم اس کی بیوی کی لاش شناخت نہیں کرسکیں گے اور وہ صاف بچ نکلے گا۔''

☆......☆

وہ ایک بار پھر مسز برنس سے ملنے گولڈن ایونیو پہنچ گئے جس کے بارے میں مسز لیزڈ نے کہا تھا کہ وہ باربرا کی اچھی سہیلی تھی۔ مسز برنس چالیس سال کی گداز جسم کی مالک عورت تھی۔ فرینک اور رائے نے اسے منکے کی ٹوٹی ہوئی مالا دکھائی تو وہ فوراً پہچان گئی۔ ''یہ مالا باربرا اس دن پہنے ہوئے تھی جس دن وہ لاپتا ہوئی تھی۔ میرا اندازہ ہے کہ وہ زندہ نہیں ہے۔'' وہ بولی۔ پھر وہ اس پکنک کا ذکر کرنے لگی جس کا ذکر مسز لیزڈ پہلے کرچکی تھی اور پھر گویا ہوئی۔ ''میں نے ان کے پکنک پر جانے سے ایک دن پہلے یعنی 23 جون کو رسل کے پاس اعشاریہ تین آٹھ کا ایک ریوالور بھی دیکھا تھا۔ میں نے نہ صرف دیکھا تھا بلکہ ہاتھ میں بھی لیا تھا، اور باربرا کے کہنے پر رسل کو اس ریوالور کی گولیاں بھی فراہم کی تھیں۔''

''کیا مطلب؟'' دونوں سراغ رساں چونک کر بولے۔

''مطلب یہ کہ اس صبح رسل نے اسلحہ کی ایک دکان سے مجھے فون کیا تھا جہاں سے وہ ٹارگٹ پریکٹس کرنے کے لیے گولیوں کا ایک ڈبہ خریدنا چاہتا تھا۔ اس کے پاس جو ریوالور تھا وہ اس نے کسی سے عاریتاً لیا تھا اور اسے اس ریوالور کے کیلبر کا علم نہیں تھا۔ اس نے اپنی بیوی باربرا سے فون پر کہا کہ وہ ریوالور دیکھ کر بتائے کہ وہ کس کیلبر کا ہے۔ باربرا نے پوچھا کہ اس نے ریوالور کہاں رکھا ہے جس پر وہ بولا کہ ریوالور ڈریسر کی دراز میں ہے۔ باربرا نے اسے ہولڈ کرنے کو کہا اور پھر مجھ سے درخواست کی کہ میں اس کے ساتھ نیچے اس کے اپارٹمنٹ میں چلوں کیونکہ اگر اس نے ریوالور کو ہاتھ میں بھی لیا تو مارے خوف کے اس کا دم نکل جائے گا۔ چنانچہ میں اس کے ساتھ چلی گئی اور ریوالور دیکھ کر بتادیا کہ وہ کس کیلبر کا ہے۔ پھر باربرا نے فون پر رسل کو اس کے کیلبر سے آگاہ کردیا۔''

''کیا وہ ریوالور تمہیں اب بھی یاد ہے؟'' سراغ رسانوں نے پوچھا۔

''ہاں، مجھے یاد ہے۔ وہ لمبی نال کا ایک وزنی ریوالور تھا۔ اس پر ولسن اعشاریہ تین آٹھ کندہ تھا۔'' اس نے ایک لمحہ توقف کیا، پھر بولی۔ ''باربرا نے مجھے بتایا تھا کہ وہ پنسلوانیا سے آئی تھی اور یہ اپارٹمنٹ کرائے پر لینے سے پہلے کہیں اور دو ہفتے سے زیادہ نہیں ٹھہری تھی۔ وہ مختلف ناموں سے ٹھہرتے تھے لیکن اس کے شوہر نے اس کی وجہ نہیں بتائی تھی۔''

''کیا باربرا نے یہ بتایا تھا کہ وہ پنسلوانیا کے کس شہر سے آئے تھے؟''

''نہیں جناب، اس نے یہ نہیں بتایا تھا۔''

''کیا اس نے کبھی یہ بتایا تھا کہ اس کی داہنی ٹانگ میں کوئی نقص تھا؟''

''نہیں۔''

''کیا تمہیں معلوم ہے کہ رسل کام کیا کرتا تھا؟''

''نہیں۔'' اس نے نفی میں سر ہلایا۔

☆......☆

اس ڈر سے کہ کہیں رسل غائب نہ ہوجائے، اخبارات کو مقتولہ کا حلیہ جاری نہیں کیا گیا۔ پولیس ہیڈ کوارٹرز سے پنسلوانیا اسٹیٹ پولیس کو مطلع کیا گیا اور اس جوڑے کا حلیہ بتا کر ان سے گمشدہ افراد کی فائل چیک کرنے کی درخواست کی گئی پھر علی الصباح فرینک اور رائے اس کوہستانی علاقے کو چھاننے پہنچ گئے لیکن گمشدہ ٹانگ ایک معما بنی رہی۔ تاہم اسٹون کیسین کے مشرقی حصے میں انہیں اعشاریہ تین آٹھ کی گولیوں کا ایک ڈبہ مل گیا۔ اس ڈبے میں بیالیس گولیاں تھیں اور اس پر لاس اینجلس کی ایک دکان کا لیبل چسپاں تھا۔ وہاں سے نکل کر وہ دونوں اس دکان پر پہنچے جہاں ریکارڈ سے یہ ثابت ہوا کہ وہ 23 جون کو اس دن فروخت کیا گیا تھا جس دن رسل نے اپنی بیوی باربرا کو ریوالور کا کیلبر معلوم کرنے کے لیے فون کیا تھا۔ ان سراغ رسانوں کے پوچھنے پر دکان دار نے خریدار کا جو حلیہ بتایا وہ رسل سے ملتا جلتا تھا۔

اب مسز برنس نے پولیس کو فون کرکے بتایا کہ اسے یاد آتا ہے کہ اس نے رسل کے اپارٹمنٹ میں کسی سینما کے روشن دان کی تعمیر کے نقشے دیکھے تھے۔ غالباً وہ اسی قسم کا کام کرتا تھا۔'' وہ بولی۔

تب فلاڈیلفیا کی پولیس نے رسل کے بارے میں مکمل حقائق اور باربرا کے بارے میں تھوڑے بہت حقائق اکٹھے کرلیے جن میں سے ایک حقیقت یہ تھی کہ باربرا کی داہنی ٹانگ کا ایک مرتبہ آپریشن ہوا تھا اور اس آپریشن کا ایک بڑا سا نشان تھا۔ ویسے اس کی ٹانگ میں کوئی نقص وغیرہ نہیں تھا۔

فرینک اور رائے دونوں کو اب یقین ہو چلا تھا کہ غیر شادی شدہ باربرا چونکہ حاملہ ہوگئی تھی لہٰذا وہ شادی کرنے کے لیے رسل سے اصرار کرتی رہتی تھی۔ وہ اس حقیقت سے واقف نہیں تھی کہ رسل پہلے سے شادی شدہ تھا لیکن وہ یہ ضرور سمجھ گئی تھی کہ رسل اسے کسی دوسری حسینہ کی خاطر چھوڑنے کا ارادہ رکھتا تھا۔ یہی وہ ذہنی کشمکش تھی جس سے چھٹکارا پانے کے لیے رسل نے باربرا کو ہلاک کرنے کا فیصلہ کرلیا تھا۔ اگر وہ محض اسے چھوڑ دیتا تو نہ صرف یہ کہ اس کا سارا کچا چٹھا سامنے آجاتا بلکہ اسے سنگین نوعیت کے الزامات کا بھی سامنا کرنا پڑتا۔ چنانچہ اس کے سامنے صرف ایک ہی راستہ رہ گیا تھا اور اس نے وہی راستہ اختیار کیا۔ باربرا سے ہمیشہ کے لیے نجات پانے کا راستہ۔

☆......☆

سراغ رسانوں نے مسز برنس کی اطلاع کی روشنی میں اس سینما ہاؤس کا پتا چلالیا۔ اس کا نام میٹروپولیٹن تھیٹر تھا۔ اس کے منیجر نے بتایا کہ مئی کے مہینے میں اس سینما ہاؤس میں ایئر کنڈیشنڈ نصب کیا گیا تھا اور اس کا ٹھیکا لاس اینجلس کی ایک بہت بڑی فرم کو دیا گیا تھا۔ فرینک اور رائے کے لیے یہ اطلاع حد درجہ اہمیت رکھتی تھی۔ یہ پہلا موقع تھا کہ رسل کا سراغ مل گیا تھا۔ وہ دونوں وہاں سے اٹھ کر سیدھے اس فرم میں پہنچ گئے۔ وہاں رسل ایک ڈیسک پر کسی بلو پرنٹ پر کام کرتا ہوا انہیں مل گیا۔ وہ بغیر آستینوں والی شرٹ پہنے ہوئے تھا اور ایک ڈھیلی ڈھالی سی سیاہ ٹائی اس کے گلے میں لٹک رہی تھی۔ اس کے بال نفاست سے سنورے ہوئے تھے اور بیچ سے مانگ نکلی ہوئی تھی۔

''تم پولیس مین ہو اور مجھ سے میری بیوی کے بارے میں پوچھنا چاہتے ہو؟'' ان کے قریب پہنچنے پر وہ مخاطب ہوا۔ ''میں سب کچھ بتاتا ہوں۔''

دونوں سراغ رساں ایک لمحے کے لیے بوکھلا گئے اور پھر اس کے کچھ بتانے کا انتظار کرنے لگے لیکن اس نے جو کچھ بتایا انہیں اس کی توقع نہیں تھی۔

''میں اسے مل ہالینڈ ڈرائیو لے گیا تھا۔'' وہ بولا۔ ''وہاں ہمارا جھگڑا ہوگیا۔ وہ کسی اور مرد سے پینگیں بڑھا رہی تھی۔ وہ ناراض ہوکر کار سے اتر گئی اور پھر میں نے اسے آج تک نہیں دیکھا۔''

''اس حالت میں۔'' فرینک نے کہا۔ ''کہ وہ حاملہ تھی اور ایک مہینے کے بعد اس کے یہاں ولادت ہونے والی تھی، وہ

کسی اور مرد سے پینگیں بڑھا رہی تھی؟''
''یہ سچ ہے۔''
''وہ اس وقت کیا پہنے ہوئے تھی؟''
''وہی جو عام طور سے حاملہ عورتیں پہنتی ہیں۔ ہلکا پھلکا لباس.....''
''کیا ایک ایسے لباس میں، جسم پر کوئی کوٹ نہیں، جیب میں پیسے نہیں، وہ ایک سنسان سڑک پر اتر گئی اور تمہاری زندگی سے نکل گئی؟ تم نے اسے ڈھونڈا کیوں نہیں؟''
''کہیں تم کچھ نظر انداز تو نہیں کر رہے؟'' فرینک نے پوچھا۔ ''تم نے اپنی پڑوسن کو ایک مختلف کہانی سنائی تھی۔ تم نے کہا تھا کہ تمہاری بیوی اپنی خالہ کے ہمراہ اس کے گھر چلی گئی ہے۔''
''وہ سچ نہیں تھا۔''
''تمہارے خیال میں، ہم تمہاری بیوی کے بارے میں پوچھنے کیوں آئے ہیں؟''
''وہ مجھے چھوڑ کر چلی گئی اور میں سمجھتا ہوں کہ کسی نے یقیناً اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرائی ہوگی۔''
''تم اخبارات پڑھتے ہو۔ ایک عورت کی ناقابلِ شناخت لاش اس مقام پر پائی گئی تھی جہاں بقول تمہارے تمہاری بیوی تمہیں چھوڑ کر چلی گئی تھی۔ کیا تمہیں یہ خیال نہیں گزرا کہ وہ تمہاری بیوی کی لاش ہو سکتی ہے؟''
''مجھے یہ خیال کیوں گزرتا؟'' رسل نے الٹا سوال داغ دیا۔ ''وہ غالباً اس شخص کے ساتھ ہوگی جس سے وہ ملتی رہتی تھی۔''

وہ دونوں اسے اسٹون کیمین میں اس مقام پر لے گئے جہاں منکے کی ٹوٹی ہوئی مالا ملی تھی پھر ان جھاڑیوں میں، جہاں لاش پائی گئی تھی۔ رسل نے تردید کی کہ اس نے اپنی بیوی کو ہلاک کیا تھا اور یہ کہ وہ پہلے بھی اس پہاڑی علاقے میں آیا تھا اور پھر 4 جولائی کی شب ایک ٹیکسی کے ذریعہ پھر دوبارہ آیا تھا۔
وہاں سے وہ لوگ اسے لے کر ہیڈ کوارٹرز آئے جہاں انہوں نے اسے بتایا کہ اس کا پورا نام رسل بیزل ہے اور یہ کہ اس نے جس لڑکی کو قتل کیا تھا وہ باربرا موگر تھی۔ جواب میں وہ ایک لمحہ کے لیے ہچکچایا اور پھر اس نے ان کی باتوں کو درست تسلیم کر لیا۔ اس کے بعد سراغ رسانوں نے اس ٹیکسی ڈرائیور کو طلب کیا جس نے پہلی ہی نگاہ میں اسے پہچان لیا۔
''ہاں، یہی وہ شخص ہے جسے میں وہاں لے گیا تھا۔'' وہ بولا۔
رسل نے اسے جھٹلایا۔ تب وہ اسے مردہ خانے لے گئے جہاں باربرا کی لاش پڑی تھی۔ انہوں نے لاش کی طرف اشارہ کیا۔ ''کیا تم یہ جھٹلا سکتے ہو کہ یہ وہی لڑکی ہے جو بقول تمہارے کسی اور شخص کے ساتھ فرار ہو گئی تھی؟''
رسل انہیں خونخوار نظروں سے گھورنے لگا۔ منہ سے کچھ نہ بولا۔
''تم نے اس کی ٹانگ کہاں چھپائی ہے؟'' فرینک نے پوچھا۔
''سراغ رساں تم ہو۔'' رسل چیخ کر بولا۔ ''تم مجھے بتاؤ۔''
انہوں نے اسے قتل کے الزام میں گرفتار کر کے جیل بھیج دیا اور پھر اس فرم میں پہنچ گئے جہاں وہ ملازم تھا۔ انہوں نے وہاں پوچھ گچھ کی تو ایک شخص نے بتایا کہ اس نے 22 جون کو رسل کو اپنا ریوالور نشانے کی مشق کرنے کے لیے دیا تھا لیکن رسل نے وہ ریوالور آج تک اسے واپس نہیں کیا۔
''وہ کس کیلیبر کا تھا؟'' رائے نے پوچھا۔
''ولسن، اعشاریہ تین آٹھ کا۔'' اس شخص نے جواب دیا۔
انہوں نے رسل کی میز کھنگالی تو ریوالور ایک دراز میں مل گیا۔ ریوالور کی نالی ساڑھے پانچ انچ لمبی تھی جسے کاٹ کر چار انچ کر دیا گیا تھا۔ ''جب میں نے یہ ریوالور اسے دیا تھا تو اس وقت تو یہ ایسا نہیں تھا۔'' وہ شخص بولا۔ ''پھر اس نے اس کی نال کاٹ کو چھوٹی کیوں کر دی؟''
''تاکہ اس میں سائلنسر فٹ کر سکے۔'' رائے نے جواب دیا۔

☆......☆

وہ ریوالور پولیس سائنٹیفک بیورو کے ہیڈ لیفٹیننٹ ریکس کے حوالے کر دیا گیا جس نے اس سے ایک گولی داغنے کے بعد اس گولی کا موازنہ باربرا کے جسم سے نکالی جانے والی گولی سے کیا۔ دونوں گولیوں پر ایک ہی طرح کے نشان پائے گئے۔ 24 ستمبر کو رسل لاس اینجلس کی عدالت میں پیش ہوا جہاں اس کے وکیل نے اس امر پر شبہ ظاہر کیا کہ واقعی وہ لاش باربرا موگر ہی کی تھی یا کسی اور عورت کی تھی؟ استغاثہ کو پہلے ہی اس شک کا اندازہ تھا چنانچہ اس نے سارے ثبوت و شواہد عدالت کے روبرو پیش کر دیے جن کے مطابق مقتولہ باربرا موگر ہی تھی۔
جیوری کو جو سات خواتین اور پانچ مردوں پر مشتمل تھی، کسی فیصلے پر پہنچنے میں صرف چالیس منٹ لگے۔ انہوں نے رسل کو فرسٹ ڈگری مرڈر کا مجرم قرار دے دیا اور جج نے اس فیصلے کی روشنی میں اسے پھانسی کی سزا سنا دی۔ رسل نے سزا کے خلاف اپیل کی جو رد کر دی گئی۔ چنانچہ باربرا کی لاش دریافت ہونے کے ٹھیک ایک سال بعد 2 اگست کو رسل کو سان کوئنٹن جیل میں پھانسی پر لٹکا دیا گیا۔



فتح و شکست

اعتزاز زریاب وصلی

کرکٹ ایک ایسا کھیل ہے جس کی پسندیدگی کا یہ عالم ہے کہ لوگ گراؤنڈ سے دور بیٹھ کر بھی ہر ہر زاویہ پر نظر رکھتے ہیں، شائقین کو پوری پوری تاریخ ازبر ہوتی ہے، اسی نکتے کو مدنظر رکھ کر اس تحریر کو مرتب کیا ہے۔

شائقین کرکٹ کے لیے ایک چھوٹی سی مگر بھرپور تحریر

آصف نے آج مجھے، نذر گل اور عمیر کو اپنے گھر بلایا تھا۔ میں ان کے گھر کی بیٹھک میں داخل ہوا تو دیکھا عمیر اور نذر گل غائب تھے۔ ''وہ دونوں کہاں ہیں۔'' میں نے آصف سے پوچھا۔
''ابھی ابھی باہر نکلے ہیں پاکستان کی جیت کی خوشی میں چاچا غفور نے مٹھائی بانٹی ہے اور ڈھول پر سب بھنگڑا ڈال رہے ہیں۔'' اس نے جواب دیا۔
''اچھی بات ہے۔ ویسے ہم اپنی ٹیم کی جیت پر جتنا

خوش ہوتے ہیں، ہمیں چاہیے ان کی ہار بھی اتنے ہی حوصلے سے برداشت کریں۔" میں نے کہا۔ اسی دوران عمیر اور نذر گل بیٹھک میں داخل ہوئے۔

"تو اب تم چاہتے ہو جب پاکستان ہارے تو ہم اسی طرح ڈھول پر بھنگڑا ڈال کر مٹھائیاں تقسیم کریں۔" عمیر نے میری بات سن لی تھی، وہ طنزیہ انداز میں گویا ہوا۔

"نہیں میرے بھائی میں یہ نہیں چاہتا پر ٹیم کے ہارنے پر کھلاڑیوں کی حوصلہ شکنی کرنا، ان کی پرفارمنس کا مذاق اڑانا، واپسی پر گندے انڈوں اور ٹماٹروں سے استقبال کرنا غلط ہے۔ ہار جیت تو کھیل کا حصہ ہے۔ جس طرح پاکستان 2017ء کی چیمپینز ٹرافی میں شاندار پرفارمنس دکھا کر جیتا ہے اسی طرح بھی خراب پرفارمنس دکھائے تو ہمیں چاہیے مثبت تنقید کریں ......" میں نے اسے نرم الفاظ میں سمجھایا۔

"ٹھہرو میں ذرا چائے کا کہہ لوں پھر اس افلاطون کی بات سنتے ہیں۔" آصف اٹھ کر اندر گیا اور کچھ دیر بعد واپس آ کر بولا۔ "ہاں جی اب بتائیں آپ کہنا کیا چاہتے ہیں۔" اس نے میری طرف دیکھا اور میں نے بات شروع کر دی 1996ء سے جب پاکستان دفاعی چیمپئن تھا اور میزبان سری لنکا، پاکستان اور انڈیا تھا۔

1992 کا ورلڈکپ کرکٹ کی دنیا کا مشہور ورلڈکپ تھا۔ تاریخ میں پہلی بار ہر ٹیم نے اپنے ملک کی نمائندگی کے لیے مخصوص وردی پہنی۔ آسٹریلیا کرکٹ بورڈ نے اس ورلڈکپ میں اس سے پہلے ہونے والے ورلڈکپ کی نسبت کہیں زیادہ بہتر انتظامات کیے۔ یہ ورلڈکپ جیت کر پاکستان کرکٹ ٹیم نے اپنے ملک کا نام روشن کیا۔ عوام نے اپنی ٹیم کا اتنا شاندار استقبال کیا کہ دنیا حیران رہ گئی۔

1996ء کے ورلڈکپ کی میزبانی ایشیا کے تین ممالک کو ملی۔ دفاعی چیمپئن پاکستان اس ٹورنامنٹ کو جیتنے کے لیے فیورٹ تھی۔ پاکستان ٹیم کی مضبوط بیٹنگ اور باؤلنگ لائن اپ نے پہلا میچ نو وکٹس سے جیت کر مخالف ٹیموں کے لیے خطرے کی گھنٹی بجادی۔ دوسرے میچ میں آٹھ وکٹس سے فتح یاب ہو کر وسیم اکرم کی کپتانی میں کھیلنے والی پاکستانی ٹیم کے حوصلے بلند ہوگئے۔ ساؤتھ افریقا سے متنازعہ ہار کے بعد انگلینڈ اور نیوزی لینڈ کو باآسانی شکست دے کر پاکستانی ٹیم نے کوارٹر فائنل میں جگہ بنائی، جہاں مقابلہ تھا روایتی حریف بھارت سے۔ یہ میچ انڈیا کے ہوم گراؤنڈ چنا سوامی اسٹیڈیم بنگلور میں ہونا تھا۔ ہائی وولٹیج کی اس گیم میں پاکستانی ٹیم کو پہلا جھٹکا اس وقت لگا جب میچ کے دن کی صبح کو پاکستان کے کیپٹن اور دنیا کے بہترین گیند باز وسیم اکرم نے خود کو ان فٹ قرار دے کر میچ کھیلنے سے انکار کردیا۔ انڈین ٹیم فل فارم میں تھی۔ انہوں نے پہلے کھیلتے ہوئے مقررہ پچاس اوور میں 287 رنز کا ٹارگٹ دیا۔ مضبوط اوپننگ پارٹنرشپ کے باوجود پاکستان یہ میچ انتالیس رنز سے ہار گیا۔ اس میچ میں پاکستانی اوپنر عامر سہیل اور انڈین باؤلر پرساد کی لڑائی نے بہت شہرت حاصل کی۔ ہار جیت کھیل کا حصہ ہے مگر اس میچ کے بعد پاکستانی عوام اور اخبارات کا رویہ بہت مایوس کن رہا۔ وسیم اکرم پر میچ فکسنگ کا الزام لگایا گیا۔ پاکستان کے لیجنڈ بیٹسمین جاوید میانداد کے کرکٹ کیریئر کا یہ آخری میچ تھا۔ انہوں نے اس میچ کو اپنے کیریئر کی بدترین یاد قرار دیا۔ بقول ان کے "پاکستان پلیئرز کی باڈی لینگویج اور کھیلنے کے انداز سے یہ لگ ہی نہیں رہا تھا کہ یہ وہی پاکستانی ٹیم ہے جس نے اس سے پہلے ہونے والی میچز میں شاندار کارکردگی دکھائی ہے۔ کئی کرکٹ دیوانوں نے ٹی وی توڑ دیے۔ ایک جنونی نے خودکشی کرلی۔ پاکستانی ٹیم کو شدید تنقید کا نشانہ بنایا گیا۔ وسیم اکرم جیسے عظیم کرکٹر کی عزت اچھالنے کی کوشش کی گئی۔ 1996 کا یہ ورلڈکپ پاکستانی ٹیم کے لیے بہت برے انداز میں اختتام پذیر ہوا۔"

یہ کہہ کر میں نے لمبا سانس لیا اور پانی کا ایک گلاس پی کر سب کے چہرے کی طرف دیکھا۔ وہ چپ چاپ میری طرف متوجہ تھے۔ اب میں نے بات شروع کردی انگلینڈ میں ہونے والی کرکٹ، دنیا کے بہترین ورلڈکپ 1999 کی۔ جس کے میزبان انگلینڈ اینڈ ویلز تھے۔

1996ء کے ٹھیک تین سال بعد 1999ء کے عالمی کپ کا میلہ انگلینڈ میں سج گیا۔ اس ورلڈکپ کو کرکٹ کی دنیا میں بہت اہمیت حاصل تھی کیونکہ اس ورلڈکپ نے آنے والے وقت کا فیصلہ کرنا تھا۔ بیسویں صدی میں کون ہوگا چیمپئن اور کون رہے گا "چوکر" کون بنے گا رنراپ اور کون سی ٹیم ہاتھ ملتی رہ جائے گی اس کا فیصلہ 1999ء کے ورلڈکپ نے کیا تھا۔ کرکٹ کے گھر انگلینڈ میں ہونے والے اس عالمی کپ کے لیے پاکستانی ٹیم کو دنیا کی مضبوط ترین ٹیم کہنا کچھ غلط نہ ہوگا۔ اس بات کا اندازہ اس بات سے لگایا جاسکتا ہے کہ انضمام الحق نے اپنے ایک بیان میں کہا تھا "پاکستان کا اسکواڈ جو 1999ء کا ورلڈکپ کھیلا تھا وہ 1992 کی ونر ٹیم

سے بھی زیادہ مضبوط تھا۔" ایک بار پھر وسیم اکرم کی کپتانی میں جیتنے کا عزم لے کر پاکستانی ٹیم میدان میں اتری۔ پہلے میچ میں ہی پاکستانی ٹیم نے کالی آندھی کو ناکوں چنے چبوا دیے۔ 27 رنز سے جیت کے بعد پاکستان کرکٹ ٹیم کے اعتماد میں بے پناہ اضافہ ہوا۔ اس اعتماد کا اگلا نشانہ اسکاٹ لینڈ کی ٹیم بنی۔ پاکستانی شاہینوں نے اگلے میچ میں 1996ء کی فائنلسٹ آسٹریلین کرکٹ ٹیم کو بھی نہ بخشا۔ وسیم اکرم کی سائیڈ نے دلچسپ مقابلے کے بعد کینگروز کو دس رنز سے پچھاڑ دیا۔ سپر سکس میں جگہ پکی کرنے کے بعد شاہینوں نے نیوزی لینڈ کا شکار بھی باآسانی کرلیا مگر بنگلہ دیش سے ایک غیر اہم مقابلے میں ہارنے والی پاکستانی کرکٹ ٹیم ایک بار پھر تنقید کا نشانہ بنی۔ الزامات اور مذاق اڑانے کا سلسلہ ایک بار پھر شروع ہوگیا۔ سپر سکس کے پہلے دو میچ ہارنے کے باوجود پاکستانی ٹیم نے زمبابوے اور نیوزی لینڈ کو ہرا کر سیمی فائنل میں رسائی حاصل کی۔ سیمی فائنل میں ایک بار پھر نیوزی لینڈ کی ٹیم شاہینوں کا آسان نشانہ بن گئی۔ نو وکٹس سے سیمی فائنل جیتنے والی ٹیم کا مقابلہ۔ فائنل میں سیمی فائنل برابر کرکے رن ریٹ کے سہارے پہنچنے والی ٹیم آسٹریلیا تھی ..... اس میچ میں پاکستان فیورٹ تھا کیونکہ گرین شرٹس پہلے آسٹریلیا کو گروپ اسٹیج میں ہرا چکے تھے مگر لارڈز کے مشہور زمانہ اسٹیڈیم میں ہونے والے فائنل میں پاکستانی ٹیم کی قسمت میں کچھ اور لکھا تھا۔ صرف 132 پر ڈھیر ہو کر پاکستان کی مضبوط بیٹنگ لائن اپ نے سب کو مایوس کیا۔ آسٹریلیا نے یہ ٹارگٹ صرف دو وکٹس کے نقصان پر پورا کرلیا۔ میچ کے بعد ملنے والے عوامی ری ایکشن نے ایک بار پھر مایوس کیا۔ ٹیم پر میچ فکس کرنے کا الزام لگایا گیا۔ تحقیق بھی ہوئی اور میڈیا نے قومی ٹیم کو خوب نشانہ بنایا۔ کپتان وسیم اکرم کو ان کے عہدے سے ہٹا دیا گیا۔ اس کے برعکس ساؤتھ افریقن کرکٹ ٹیم جو کہ سیمی فائنل ہار گئی تھی، کا شاندار استقبال ہوا۔ شاید یہی فرق ہے۔ گورے کھیل کو کھیل کہتے ہیں جبکہ ہم نے اسے ضد اور انا بنایا ہوا ہے۔"

آخری جملہ کہہ کر میں رکا۔ ٹیبل پر چائے سرو کی جاچکی تھی۔ سب نے اپنے اپنے کپ اٹھائے اور پھر میری طرف متوجہ ہوئے۔ میں نے بات شروع کی 2003ء کے ورلڈکپ کی جس کی میزبانی ساؤتھ افریقا نے کی تھی۔ جس کے میزبان جنوبی افریقا، زمبابوے اور کینیا ٹھہرے۔

1999 کے ورلڈکپ کے بعد کرکٹ کی دنیا آہستہ آہستہ بدلنے لگی۔ کھیل کے قوانین میں تبدیلی کی گئی۔ کرکٹ تیز ہوگئی۔ 2003ء کے ورلڈکپ کی میزبانی براعظم افریقا کو ملی۔ افریقا کی تیز اور باؤنسی پچز پر ایشیا کی ٹیمیں ہمیشہ مشکل کا شکار نظر آتی ہیں۔ 2003ء تک پاکستان نے جنوبی افریقا میں بہت کم کرکٹ کھیلی تھی اس لیے پاکستان کی ٹیم سے کچھ خاص توقعات نہیں لگائی گئیں۔ آسٹریلیا، انڈیا اور جنوبی افریقا کی ٹیمیں مضبوط اور فائنل کی دوڑ میں سب سے آگے دکھائی دے رہی تھیں۔ اس عالمی کپ میں ٹوٹل چودہ ممالک کی ٹیموں نے حصہ لیا جو کہ اس وقت تک کھیلے گئے ورلڈکپ میں سب سے زیادہ تھی۔ پاکستان نے وقار یونس کی کپتانی میں اپنا پہلا میچ دفاعی چیمپئن آسٹریلیا کے خلاف کھیلا۔ اس میچ میں قومی ٹیم نے آسٹریلیا کو پہلے پندرہ اوور میں مشکل میں ڈالے رکھا مگر اس کے بعد اینڈریو سائمنڈز کا بلا چل پڑا۔ آسٹریلیا نے مقررہ پچاس اوور میں 310 کا پہاڑ کھڑا کیا۔ شین وارن اس ورلڈکپ سے پہلے پابندی کا شکار ہو چکے تھے۔ اس کے باوجود آسٹریلین باؤلرز نے پاکستان کی ٹیم کو ہدف سے بیاسی رنز پہلے شکار کرلیا۔ اس میچ کے بعد وقار یونس کی کپتانی پر کافی تنقید ہوئی۔ اگلے میچ میں نمیبیا کے خلاف فتح سمیٹ کر شاہینوں نے اڑان بھری مگر انگلش ٹیم نے شاہینوں کے پر کاٹ دیے۔ نیدرلینڈ کے خلاف ملنے والی جیت سے قومی ٹیم کو جو آس لگی وہ روایتی حریف بھارت نے جلد ختم کردی۔ اس طرح پاکستان پہلے راؤنڈ سے ہی باہر ہوگیا۔ اس ورلڈکپ کے بعد سب سے زیادہ وقار یونس تنقید کا نشانہ بنے۔ اتنے مضبوط اسکواڈ کے باوجود وہ ٹیم میں جذبہ اور جیت کی لگن نہ پیدا کرسکے۔ خاص طور پر روایتی حریف بھارت کے خلاف میچ میں پاکستانی باؤلرز کی پرفارمنس پر سوال اٹھے۔ یہ 1975ء کے بعد پہلا عالمی کپ تھا جس میں قومی ٹیم دوسرے راؤنڈ میں نہ پہنچ سکی۔ ساؤتھ افریقا سے واپس آتے ہوئے قومی ٹیم نے قوم کے نام ایک پیغام بھیجا۔ "ہم شرمندہ ہیں ہم لاکھوں فینز کی امیدوں پر پورا نہیں اتر سکے۔" اس ورلڈکپ کے بعد ٹیم میں کچھ بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ وقار یونس کو فوراً کپتانی سے ہٹا دیا گیا۔ رچرڈ پائبس کی جگہ جاوید میانداد کو کوچ بنا دیا گیا۔ نیشنل سلیکشن کمیٹی کو بھی فارغ کردیا گیا۔ راشد لطیف کو نیا کپتان جبکہ ہارون رشید کو ٹیم کا منیجر بنا دیا گیا۔ عامر سہیل نے چیف سلیکٹر کی جگہ سنبھالی۔ نئی سلیکشن کمیٹی نے نیا ٹیلنٹ ڈھونڈنے کی کوششیں تیز کردیں مگر آنے والے وقت نے بتایا

کہ ہار کے بعد سنبھلنا آسان نہیں ہوتا۔"

چائے کا گھونٹ بھرتے ہوئے میں ایک بار پھر سب کی طرف متوجہ ہوا۔ "اب جس ٹورنامنٹ کی میں بات کرنے جارہا ہوں یہ پاکستان کی کرکٹ کی تاریخ کا بدترین ٹورنامنٹ کہلاتا ہے۔" میں نے بات شروع کی ورلڈکپ 2007ء کی جب قومی ٹیم نے ویسٹ انڈیز کا رخ کیا تھا جس کے میزبان ویسٹ انڈیز تھے۔

نویں عالمی کپ کا میلہ ویسٹ انڈیز میں سجا۔ کیریبین جزائر پر یہ پہلا عالمی کپ تھا۔ ٹوٹل سولہ ٹیموں نے اس ٹورنامنٹ میں حصہ لیا۔ ان ٹیموں کو چار گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستان گروپ ڈی میں ویسٹ انڈیز، آئرلینڈ اور زمبابوے کے ساتھ براجمان تھا۔ انضمام الحق کی کپتانی میں کھیلنے والی ٹیم کو ٹورنامنٹ سے پہلے ایک بڑا جھٹکا تب لگا جب شاہد آفریدی پہلے دو میچوں سے پابندی کی وجہ سے باہر ہوگئے۔ پہلے میچ میں میزبان ویسٹ انڈیز نے شاہینوں کو چون رنز سے ہرا دیا۔ 241 رنز کے تعاقب میں قومی ٹیم صرف 187 رنز بنا سکی۔ اگلے میچ میں کمزور ٹیم آئرلینڈ کے خلاف بیٹنگ لائن اپ نے ایک بار پھر دھوکا دیا۔ ساری ٹیم 132 رنز بنا سکی اور آئرلینڈ نے تین وکٹس سے یہ میچ جیت لیا۔ یوں پاکستان پہلے راؤنڈ سے ہی باہر ہوگیا۔ آخری میچ زمبابوے کے خلاف تھا جسے جیت کر ٹیم وطن واپس آئی جس دن پاکستان ٹیم ورلڈکپ سے باہر ہوئی، قومی ٹیم کے کوچ باب وولمر کی موت نے کرکٹ دنیا کو ہلا کر رکھ دیا۔ میچ کے بعد ہونے والی پریس کانفرنس میں باب وولمر کا کہنا تھا۔ "میں پاکستانی ٹیم کی مستقبل میں بھی کوچنگ کرنا پسند کروں گا۔" مگر وہ بے خبر تھا کہ یہی رات اس کی آخری رات ہے۔ ان کی موت کی پہلی وجہ ہارٹ اٹیک بیان کی گئی۔ کچھ لوگوں نے اسے خودکشی کا رنگ دیا جبکہ کچھ تنقید نگاروں نے قومی ٹیم کی پرفارمنس کو کوچ کی موت کی ایک بڑی وجہ قرار دیا۔ کوچ کی موت کے کچھ گھنٹوں بعد ہی کپتان انضمام الحق نے کپتانی سے استعفیٰ دے دیا اور اپنی ریٹائرمنٹ کا اعلان کردیا۔ یہ ایک عظیم پاکستانی بلے باز کے کیریئر کا بدترین اختتام تھا۔ کچھ دنوں بعد کوچ باب وولمر کی موت کو قتل قرار دیا گیا۔ پاکستانی ٹیم کے اسسٹنٹ کوچ مشتاق احمد اور مینیجر طلعت علی کے ساتھ کپتان انضمام الحق کو فلائٹ سے صرف چند گھنٹے پہلے روک کر سوال پوچھے گئے۔ دنیا بھر کے اسپورٹس جرنلسٹ اور میڈیا نے باب وولمر کی موت پر سوال اٹھائے مگر اس معمے کا آج تک حل نہیں مل سکا۔ پاکستانی ٹیم کی گھر واپسی کے دو دن بعد کوچ کی موت کو طبعی موت قرار دیا گیا۔ 2007ء کے ورلڈکپ کی ہار ہضم کرنا پاکستانی عوام کے لیے آسان نہ تھا۔ قومی ٹیم ایک بار پھر تنقید کا نشانہ بنی۔ میڈیا نے جی بھر کے کھلاڑیوں کو لتاڑا۔ ان حالات میں قومی ٹیم دنیا کا پہلا ورلڈ... ٹی ٹوئنٹی کپ کھیلنے جنوبی افریقا جا پہنچی۔ 2003ء کی بری یادوں اور 2007ء کے عالمی کپ کے بعد ناقدین کا منہ بند کرنے کا قومی ٹیم کے پاس سنہری موقع تھا۔ مضبوط اسکواڈ نے پاکستانی فینز کے دل میں امید جگا رکھی تھی۔ پاکستان ٹیم نے کئی بڑی ٹیموں کو پچھاڑ کر فائنل تک رسائی حاصل کی مگر روایتی حریف بھارت کے سامنے بے بس ہوگئی۔ سنسنی خیز فائنل میں قومی ٹیم کو صرف پانچ رنز سے ہار ملی۔ اس ٹورنامنٹ کو ہارنے کے باوجود 2007 کے عالمی کپ میں بدترین پرفارمنس کے بعد اگلے ٹورنامنٹ میں فائنل تک رسائی حاصل کرنا بہت بڑی بات تھی مگر کرکٹ کے ان جنونیوں کو کون سمجھائے کہ ہر بار جیت نہیں ملتی۔ دوسری ٹیم بھی کھیلنے آتی ہے۔ کھلاڑی بھی انسان ہوتے ہیں ان سے بھی غلطی ہوجاتی ہے۔ اگر ہم اپنے ان قومی کھلاڑیوں کی ہار برداشت نہیں کرسکتے اور واپسی پر ٹماٹروں اور گندے انڈوں سے ان کا استقبال کریں تو ہمیں کوئی حق نہیں کہ ان کی جیت میں آتش بازی کریں یا مٹھائی تقسیم کریں۔"

میری آخری بات سن کر تینوں کے چہرے پر مسکراہٹ آگئی۔ "چل بھائی کرکٹ کے افلاطون، نیکسٹ ٹورنامنٹ پر چھلانگ لگا۔" عمیر کی بات سن کر میں مسکرایا۔

اب ہم چلتے ہیں انڈیا میں جہاں دسویں عالمی کپ کے لیے قومی ٹیم 2009 کے ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کپ کے ہیرو شاہد آفریدی کی قیادت میں میدان میں اتری۔

ورلڈکپ 2011 جس کے میزبان انڈیا، بنگلہ دیش، سری لنکا تھے۔

دنیائے کرکٹ میں ٹی ٹوئنٹی فارمیٹ نے بہت زیادہ تبدیلی کردی۔ بیس اوور کی اس گیم نے ایک روزہ کرکٹ پر کتنا اثر ڈالا اس کا صحیح اندازہ ورلڈکپ 2011 میں ہوا۔ یہ ورلڈکپ انڈیا، سری لنکا اور پہلی دفعہ بنگلہ دیش میں منعقد ہوا۔ انیس فروری سے شروع ہونے والے اس ٹورنامنٹ میں ٹوٹل چودہ ممالک کی کرکٹ ٹیم نے حصہ لیا۔ ٹوٹل انچاس میچ کھیلے گئے۔ پاکستان کو بھی اس ٹورنامنٹ کی میزبانی کے لئے کچھ میچ ملے تھے مگر 2009ء میں سری لنکا کی ٹیم پر ہونے

والے اٹیک کی وجہ سے ان میچز کو باقی تینوں ممالک پر تقسیم کردیا گیا۔ اس بار عالمی کپ کی چودہ ٹیموں کو سات سات کے دو گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ قومی ٹیم نے ٹورنامنٹ کا آغاز کینیا کے خلاف 205 رنز کی فتح کے ساتھ کیا۔ اگلے میچ میں سنسنی خیز مقابلے کے بعد سری لنکا کو گیارہ رنز سے پچھاڑ کر شاہینوں کا حوصلہ آسمان تک جا پہنچا۔ کمزور کینیڈا کے خلاف بیٹنگ لائن اپ فلاپ ہوئی مگر باؤلرز نے قومی ٹیم کی چھیالیس رنز سے جیت دلوا کر مومینٹم رکنے نہ دیا۔ پاکستان کی سب سے کمزور پرفارمنس نیوزی لینڈ کے خلاف رہی جب کامران اکمل نے روس ٹیلر کے دو کیچز ڈراپ کیے اور نیوزی لینڈ نے 302 رنز کا پہاڑ کھڑا کیا جس کے جواب میں قومی ٹیم صرف 192 رنز پر ڈھیر ہوگئی۔ اس میچ کے بعد سوشل میڈیا پر قومی ٹیم کے وکٹ کیپر کامران اکمل کا مذاق اڑایا گیا۔ ان کی کارکردگی پر کڑی تنقید کی گئی اور میچ فکسنگ کا الزام لگایا گیا۔ بارش سے متاثرہ اگلے میچ میں زمبابوے کو سات وکٹ سے ہرا کر پاکستان کے سامنے آسٹریلین چیلنج کھڑا ہوگیا۔ آسٹریلیا جسے عالمی کپ 1999ء میں پاکستان کے بعد کوئی ٹیم 2003ء اور 2007ء کے ورلڈکپ میں نہیں ہرا سکی تھی ایک بار پھر شاہینوں کے سامنے تھی۔ آسٹریلیا کی مضبوط بیٹنگ لائن اپ کو 176 رنز تک محدود کرکے شاہینوں نے یہ ٹارگٹ چھ وکٹس کے نقصان کے ساتھ پورا کرلیا۔ آسٹریلین ٹیم جسے دنیائے کرکٹ ناقابلِ شکست کا خطاب دے چکی تھی، گرین شرٹس کے سامنے بے بس نظر آئی۔ کوارٹر فائنل میں کالی آندھی کو دس وکٹوں سے ہرا کر سیمی فائنل میں پہنچنے والی قومی ٹیم کے سامنے دشمن ملک بھارت کی ٹیم آن کھڑی ہوئی۔ کرکٹ کے پنڈت اس مقابلے کو کرکٹ کی تاریخ کا سب سے بڑا مقابلہ قرار دے چکے تھے۔ موہالی میں ہونے والے اس سیمی فائنل میں انڈیا نے 260 رنز کا ٹارگٹ دیا جس کے جواب میں قومی ٹیم 231 رنز بنا سکی۔ یہ شکست پاکستانی عوام کے لیے ایک بہت بڑا صدمہ تھی۔ اس میچ میں پاکستانی فیلڈرز نے سچن ٹنڈولکر کے چار کیچز ڈراپ کیے۔ مصباح الحق کا آخری پانچ اوور میں بہت کم اسٹرائیک ریٹ سے بیٹنگ کرنے پر کرکٹ فینز نے انہیں مسٹر ٹک ٹک کا خطاب دیا۔ آنے والے کئی سالوں میں مصباح نے پاکستان کو کئی فتوحات دلوائیں مگر سیمی فائنل میں اپنی بیٹنگ کا داغ نہ دھو سکے۔ شاہد آفریدی نے اس ہار کو اپنے کیریئر کی بدترین قرار دیا۔ اس ہار کے بعد غصے سے بھری عوام کا ری ایکشن بہت سخت تھا۔ ملک بھر میں احتجاج کیا گیا۔ روڈ بلاک کیے گئے۔ اس دن میچ کے اختتام پر تیس کے قریب لوگ صرف کراچی میں مختلف واقعات میں زخمی ہوئے۔ پاکستانی میڈیا نے قومی ٹیم کے خلاف خوب زہر اگلا۔ میچ فکسنگ کا الزام ایک بار پھر قومی ٹیم کے لیے عذاب بن گیا۔ میڈیا اور عوام شاید یہ بھول چکے تھے کہ 2010ء کے فکسنگ اسکینڈل کے بعد بکھری ہوئی قومی ٹیم کا یوں پرفارم کرکے سیمی فائنل تک رسائی حاصل کرنا ایک بہت بڑی اچیومنٹ تھی۔ ٹی وی توڑنا، احتجاج کرنا، روڈ بلاک کرنا اور ٹریفک روک دینا ایک مہذب قوم کی نشانی نہیں۔ کھیل میں سب سے بڑی بات ہمت اور حوصلے سے ہار برداشت کرنا ہوتا ہے۔ اس طرح کی جنونیت اور جذباتیت نہ صرف ملک کی بدنامی کا باعث بنتی ہے بلکہ کھلاڑیوں کی بھی حوصلہ شکنی ہوتی ہے۔" بات کے اختتام پر میں نے صوفے سے ٹیک لگالی۔ آصف اور عمیر میری طرف دیکھ رہے تھے جبکہ نذر گل کسی خیال میں گم تھا۔ "ہاں بھئی شہزادے اب کہاں سفر کرنا ہے؟" اس بار عمیر نے پوچھا۔ (نوٹ: ٹی ٹوئنٹی کا پہلے ذکر ہوچکا ہے)۔ اب ہم جا پہنچے ورلڈکپ 2015ء میں جب پاکستان مصباح الحق کی قیادت میں 1992ء کی یاد تازہ کرنے آسٹریلیا جا پہنچا۔

ورلڈکپ 2015ء کے میزبان آسٹریلیا، نیوزی لینڈ تھے۔

ورلڈکپ 2015 کا میلہ ایک ساتھ دو بڑی کرکٹ ٹیم یعنی نیوزی لینڈ اور آسٹریلیا کے گھر سجا۔ یہ گیارہواں عالمی کپ تھا۔ آسٹریلیا میں ہونے والا پہلا ورلڈکپ پاکستان نے جیتا تھا اس لیے 1992 کی سنہری یادوں کے سہارے پاک ٹیم مصباح الحق کی قیادت میں کینگروز کی سرزمین پر اتری۔ پہلا میچ ہی روایتی حریف بھارت کے خلاف تھا۔ پاکستان کا اسکواڈ مضبوط مگر شاہینوں میں ٹیم ورک کی کمی تھی۔ اس بار ٹوٹل چودہ ٹیموں کو سات سات کے دو گروپس میں تقسیم کیا گیا۔ پاکستان نے اپنے ورلڈکپ سفر کا آغاز انڈیا کے خلاف 76 رنز سے ملنے والی کراری ہار سے کیا۔ پریشر گیم میں فیلڈرز کی ناقص فیلڈنگ اور باؤلرز کی پرفارمنس ایک بار پھر سوشل میڈیا کا ٹاپ ٹرینڈ بن گئی۔ بھارتی میڈیا نے پاکستانی کھلاڑیوں کا خوب مذاق اڑایا تو پاکستانی عوام بھی پیچھے نہ رہی۔ ایک بار پھر ٹی وی توڑنے کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ اگلے میچ میں کالی آندھی نے کمزور ٹیم ورک کی گرین شرٹس کو آڑے ہاتھوں لیا

اور 150 رنز سے فتح سمیٹی۔ ناقدین کا نشانہ بننے والی پاکستانی ٹیم نے زمبابوے کو ہرا کر حوصلہ پکڑا اور یوا ے ای کو بھی پچھاڑ ڈالا۔ سات مارچ کو ہاٹ فیورٹ جنوبی افریقا قومی ٹیم کا نشانہ بنی اور سنسنی خیز میچ میں پاکستان نے انتیس رنز سے فتح سمیٹی۔ اس بار وہی میڈیا جو شاہینوں کے خلاف زہر اگل رہا تھا ایک بار پھر کھلاڑیوں کی تعریف کے پل باندھنا شروع ہوگیا۔ آئرلینڈ کو سات وکٹس سے ہرا کر گرین شرٹس کوارٹر فائنل میں جا پہنچی جہاں ہوم سائیڈ آسٹریلیا کا چیلنج درپیش تھا۔ آسٹریلیا جس نے اپنے سامنے آنے والی ہر رکاوٹ کو توڑ ڈالا تھا۔ پاکستان کو بھی پچھاڑنے میں کامیاب رہی۔ اس میچ کے بعد مصباح الحق، یونس خان اور شاہد آفریدی جیسے عظیم کھلاڑیوں کا ون ڈے کیریئر ختم ہوگیا۔ قومی ٹیم میں بڑی تبدیلیاں کی گئیں۔ مصباح الحق کی جگہ نیا کپتان اظہر علی کو بنایا گیا مگر اس بکھری ہوئی ٹیم کو ابھی مشکل سے سنبھلنا تھا۔ ہر طرف سے تنقید کرنے والے کرکٹ فینز شاید یہ بھول چکے تھے کہ گرین شرٹس چھ سال سے اپنے ملک میں کرکٹ کو ترس گئی ہے۔

''تو یہ تھا 1992 کے بعد عالمی کپ میں پاکستانی ٹیم کا سفر اور عوام کا ری ایکشن'' میں نے بات۔۔۔ختم کی۔

''یار تم نے 1992 سے پہلے کچھ نہیں بتایا؟'' آصف نے پوچھا۔

''وہ اس لیے کہ تب کرکٹ پاکستان میں کھیل ہی سمجھی جاتی تھی۔ ہار جیت کو کھیل کا حصہ سمجھا جاتا اور میڈیا بھی اس حد تک آوارہ نہیں تھا جو عوام کے جذبات کو بھڑکا دیتا۔'' میری بات سن کر تینوں ہنس پڑے۔

''اچھا چلو اب ہمیں کچھ سیریز اور ٹی ٹوئنٹی کپ کی انفارمیشن دو'' نذر گل بولا اور میں شروع ہوگیا۔

2007 کے ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ میں فائنل تک رسائی اور 2009 کی ونر ٹیم پاکستان نے بیس اوور کے کھیل میں اپنی صلاحیتوں کا لوہا خوب منوایا۔ 2010 کا ورلڈ کپ ویسٹ انڈیز میں ہوا۔ اس سے پہلے ایک روزہ کرکٹ کپ میں ویسٹ انڈیز کی سرزمین پاکستان کے لیے بدترین ثابت ہوئی تھی۔ اس داغ کو دھونے کے لیے یہ ایک سنہری موقع تھا۔ شاہد آفریدی کی کپتانی میں کھیلنے والی ٹیم نے پہلے میچ میں بنگال ٹائیگرز کو دھول چٹادی۔ دوسرے میچ میں کینگروز نے شاہینوں کے پرچونتیس رنز سے جیت کر کاٹ دیے۔ سپر ایٹ میں پہلے میچ میں ہی انگلینڈ سے ہار ملی۔ نیوزی لینڈ نے سے بھی سنسنی خیز مقابلے کے بعد ایک رنز سے ہارنے والی گرین شرٹس کے سیمی فائنل کی امیدیں کمزور پڑتی جارہی تھیں لیکن جنوبی افریقا کو گیارہ رنز سے ہرانے کے بعد نیوزی لینڈ کی انگلینڈ سے ہارنے رن ریٹ کی بنیاد پر پاکستان ٹیم کے لیے سیمی فائنل کی سیٹ پکی کردی۔ سیمی فائنل میں مقابلہ تھا کینگروز سے جنہوں نے پہلے میچ میں پاکستان کو ہرایا تھا۔ پاکستان نے شاندار بیٹنگ کرتے ہوئے 191 رنز کا ٹارگٹ دیا مگر سنسنی خیز مقابلے کے بعد مائیک ہسی نے سعید اجمل سے آخری اوور میں سترہ رنز لوٹ کر جیت پاکستان کے جبڑوں سے چھین لی۔ اس سے قطع نظر کہ گرین شرٹس نے اس میچ میں کتنا مقابلہ کیا عوام کا ری ایکشن ایک بار پھر مایوس کن تھا۔ سعید اجمل اس تنقید کا سب سے زیادہ نشانہ بنے۔ 2009 کی فاتح ٹیم کا حصہ سعید اجمل کے کیریئر پر اس سیمی فائنل کا داغ لگ گیا۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں اسی سعید اجمل نے کئی میچز میں قومی ٹیم کے لیے جیت حاصل کی۔

اسی طرح ورلڈ کپ، 2012 میں جس کا میزبان سری لنکا تھا۔ اس پر بھی کچھ باتیں ہوجائیں۔

سری لنکا میں ہونے والے چوتھے ٹی ٹوئنٹی عالمی کپ میں شاہین محمد حفیظ کی کپتانی میں میدان میں اترے۔ اس سے پہلے ہونے والے بیس اوور کے تینوں ٹورنامنٹس نے مقبولیت کے ریکارڈ توڑ دیے۔ کرکٹ کے شائقین نے اس فارمیٹ میں بے پناہ دلچسپی ظاہر کی۔ انٹرنیشنل طرز پر ہونے والی لیگز نے اس فارمیٹ کو مزید شہرت بخشی۔ پاکستانی ٹیم کی اس فارمیٹ میں اب تک بہترین پرفارمنس تھی۔ ایشیا کی اسپن اور سلو پچز پر شاہین فیورٹ تھے۔ وارم اپ میچ میں بھارت کو ہرا کر گروپ کے پہلے میچ میں گرین شرٹس نے نیوزی لینڈ کو پچھاڑا۔ تیرہ رنز سے ملی اس جیت کے بعد بنگالی ٹائیگرز شاہینوں کے قہر کا نشانہ بنی اور آٹھ وکٹوں سے مات کھا کر ٹورنامنٹ کی دوڑ سے باہر ہوگئی۔ سپر ایٹ اسٹیج میں پاکستان ٹیم انڈیا، آسٹریلیا اور جنوبی افریقا کے ساتھ گروپ بی میں براجمان تھی۔ یہ گروپ اب تک ٹورنامنٹ کا مشکل ترین گروپ تھا۔ پہلے میچ میں جنوبی افریقا کو گرین شرٹس کے خلاف سنسنی خیز مقابلے میں دو وکٹس سے ہار ملی۔ اگلے میچ روایتی حریف بھارت کے خلاف آٹھ وکٹس سے شکست کھانے کے بعد آخری میچ میں کینگروز کو بتیس رنز سے پچھاڑ کر پاکستان نے سیمی فائنل میں جگہ بنائی۔ سیمی فائنل میں ہوم

...سری لنکا نے فیورٹ پاکستان کو اسپن کے جال میں جکڑ ...اور پاکستان سولہ رنز سے شکست کھا کر گھر واپس آگیا۔ اس ...منٹ کے بعد قومی ٹیم کے کچھ کھلاڑیوں اور محمد حفیظ کی ...الی تنقید کا نشانہ بنی۔ روایتی حریف بھارت کے خلاف ...کی طرح ناکام پرفارمنس پر بھی سوال اٹھے۔

2014 میں ورلڈ کپ کا میزبان بنگلہ دیش تھا۔

ورلڈ کپ اور ٹی ٹوئنٹی کی بڑھتی مقبولیت میں 2014 ...الی ٹوئنٹی کپ مختلف ممالک کی ٹیموں کے لیے خود کو ثابت ...رنے کے لیے ایک شاندار موقع تھا۔ بنگلہ دیش کی سرزمین ...ہاراس فارمیٹ کے عالمی کپ کو ہوسٹ کر رہی تھی۔ محمد ...کی کپتانی میں یہ ٹورنامنٹ کھیلنے والی ٹیم کے پاس اپنے ...ام دوسرا ورلڈ کپ کرنے کا یہ سنہری موقع تھا۔ اس ٹیم میں ...فارمیٹ کے بہترین کھلاڑی موجود تھے۔ اس بار ...ورنامنٹ کا فارمیٹ تبدیل کیا گیا تھا۔ پانچ پانچ ٹیموں کے ...دو پول تھے جن میں سے ٹاپ ٹو سیمی فائنل میں پہنچ جاتی۔ ...روایتی حریف بھارت نے پاکستان کو سات وکٹس سے ہرادیا۔ اس کے بعد اگلے میچ میں شاہینوں کا نشانہ کینگروز ...سولہ رنز سے میچ جیت کر ٹیم نے حوصلہ پکڑا اور بنگالی ...ٹائیگرز کو پچاس رنز سے ہرا کر ٹورنامنٹ سے باہر کر دیا مگر ...ال آندمی نے طوفان کا روپ دھار کر پاکستانی ٹیم کے ...خواب چکنا چور کر ڈالے۔ چوراسی رنز سے ملنے والی شکست ...نے ٹیم کو پہلی بار ٹی ٹوئنٹی ورلڈ کپ کے پہلے راؤنڈ سے ...باہر کردیا۔ اس بار میڈیا اور عوام نے ٹیم کے خوب لتے لیے۔ ...پورٹ پر پہنچتے ہی ''شیم شیم'' کے نعروں سے پاکستانی ٹیم ...کا استقبال ہوا۔ محمد حفیظ نے دلبرداشتہ ہو کر کپتانی سے استعفیٰ ...دے دیا۔ یہ تھا ٹی ٹوئنٹی کے ایک بہترین کھلاڑی کی کپتانی کا ...بدترین اختتام۔

اس کے بعد ورلڈ کپ 2016 کا میزبان انڈیا تھا۔

ٹی ٹوئنٹی کی شہرت عروج پر پہنچتے ہی بھارت کی ...سرزمین پر چھٹے بیس اوور کے عالمی کپ کا میلہ سجا۔ پاکستانی ...شاہد آفریدی کی قیادت میں بلند حوصلوں کے ساتھ مگر ...مشکل حالات میں دشمن ملک کی سرزمین پر اتری۔ اس سے ...ایشیا کپ میں ملنے والی ہار نے ٹیم کو مشکل میں ڈالا ہوا ...۔ پاکستان ٹورنامنٹ کے گروپ بی میں آسٹریلیا، انڈیا، ...دیش اور نیوزی لینڈ کے ساتھ موجود تھا۔ اس گروپ ...کو گروپ آف ڈیتھ'' بھی کہا گیا۔ پاکستان نے اپنے ...آغاز بنگلہ دیش کے خلاف ملنے والی جیت سے کیا مگر

پنجاب میں آریہ کی مزاحمت ہوئی اور سال ہا سال لڑائیاں ہوتی رہیں۔ ان میں ''دس بادشاہوں کی لڑائی'' سب سے مشہور ہے۔ بالآخر پنجابیوں کو شکست دے کر انہوں نے یہاں اپنی بستیاں قائم کیں اور کھیتی باڑی شروع کردی۔ آبپاشی کے لیے کنویں کھودے گئے۔ گندم اور جو کی کاشت کی گئی۔ کپڑا بننے میں مہارت حاصل کی گئی۔ صدیوں تک آریائی تہذیب کو پنجاب میں خوب فروغ ہوا۔ اس حد تک کہ وہ وقت بھی آگیا جب انہیں مزید وسعت کی ضرورت محسوس ہوئی۔ پنجاب ان کے عزائم اور ضرورتوں کے لیے چھوٹا پڑ گیا۔ پنجاب میں آبادی بڑھ جانے کی وجہ سے یہ ضروری ہوگیا کہ مشرق کی سمت آگے بڑھ کر نئے مقامات تلاش کیے جائیں۔ چنانچہ وہ وادی گنگا کی طرف نقل مکانی کرنے لگے اور جلد ہی انہوں نے گنگا اور جمنا کے درمیانی علاقے پر قبضہ جما لیا لیکن جب انہوں نے مزید آگے بڑھنے کے لیے بہار کی طرف پیش قدمی کی تو ان علاقوں کے اصل باشندوں نے سخت مزاحمت کی اور ہر ممکن طریقے سے ان کا راستہ روکنے کی کوشش کی۔ وہ لوگ بہت مہذب تھے اور فصیل دار شہروں میں امن و امان سے رہتے تھے لیکن ہند آریائی، شمال کی سرد آب و ہوا سے آئے تھے، اس لیے زیادہ جفاکش اور طاقت ور تھے اس لیے انہوں نے طویل لڑائیوں کے بعد یہاں (یوپی) کے اصلی باشندوں کو شکست دے دی۔ وہ ان لوگوں سے نفرت کرتے تھے۔ ان کو جنگلی، وحشی، سیاہ فام اور چپٹی ناک والے کہتے تھے۔ اس کے باوجود جب آریوں نے یہاں مستقل سکونت اختیار کرلی تو انہوں نے مقامی آبادی سے میل جول شروع کردیا۔ آپس میں شادیاں ہونے لگیں۔ کاروبار اور مذہبی رسوم میں باہم شرکت ہونے لگی اور یوں صدیوں کے باہمی اختلاط سے ایک ایسی نئی قوم کا ظہور ہوا جس میں آریائی اور غیر آریائی تہذیبوں کا امتزاج تھا۔ اس نئی قوم کو ''ہندو'' کہا جاتا ہے۔

مرسلہ: محمد فیضان قادری۔ نامدوال

انڈیا نے شاہینوں کو ایک بار پھر شکست دی۔ چھ وکٹوں سے ہارنے کے بعد قومی ٹیم سنبھل نہ سکی۔ حوصلہ ہاری ہوئی ٹیم کو نیوزی لینڈ نے بائیس رنز سے ہرایا اور آسٹریلیا نے اکیس رنز کے ساتھ شکار بنایا۔ اس طرح لگاتار دوسرے ورلڈ کپ سے گرین ٹیم پہلے راؤنڈ سے باہر ہوگئی۔ اس بار سوشل میڈیا پر ٹیم کا خوب مذاق بنا۔ شاہد آفریدی نے کپتانی چھوڑ دی۔ ان کے کیریئر کا اختتام بھی بہت سے لیجنڈ پاکستانی کرکٹرز کی طرح برے انداز میں ہوا۔ ٹیم کی قیادت سرفراز احمد نے سنبھالی۔ وقار یونس نے تنقید سے تنگ آکر کوچ کی سیٹ چھوڑ دی اور ٹیم ایک بار پھر رینیو ہونے لگی۔ نوجوان کھلاڑیوں کی تلاش میں پی سی بی نے ایک کمیٹی بنائی۔ ڈومیسٹک لیول سے نوجوان کرکٹرز کا چناؤ کیا گیا۔

''تو یہ تھا چند ورلڈ ٹی ٹوئنٹی کپ میں پاکستان کی ہار جیت کا سفر'' میں نے بات ختم کی اور پانی کا گلاس منہ سے لگایا۔ پانی پینے کے بعد میں نے سب کے چہرے کی طرف دیکھا اور کہا۔ ''اب میں دو ایسی سیریز کی بات کرنے جا رہا ہوں جن کو پاکستان کرکٹ کی تاریخ میں بری سیریز کہا جائے تو کچھ غلط نہ ہوگا۔''

''جی جی شروع کریں'' عمیر نے کہا اور میں شروع ہوگیا۔

2014 کا پاکستان ٹور آف سری لنکا۔

2014 میں پاکستانی کرکٹ ٹیم نے دو ٹیسٹ اور تین ایک روزہ میچ کھیلنے کے لیے سری لنکا کی طرف اڑان بھری۔ پاکستانی ٹیم کی قیادت مصباح الحق کے سپرد تھی۔ پہلا ٹیسٹ گال کے میدان پر ہوا۔ پاکستان ٹیم نے پہلے بلے بازی کی اور یونس خان کی 177 رنز کی شاندار پرفارمنس کے بدولت 451 رنز کا پہاڑ کھڑا کیا۔ دوسری جانب آئی لینڈ نے آسان پچ پر پاکستانی باؤلرز کو آڑے ہاتھوں لیا اور 533 رنز پر اننگز ڈیکلیئر کی۔ پاکستانی ٹیم سے توقع کی جا رہی تھی کہ وہ آسانی سے یہ میچ ڈرا کرلیں گے مگر شاہینوں کے بلے باز رنگنا ہیراتھ کی گھومتی گیندوں کے سامنے گھوم کے رہ گئے اور آخری دن سری لنکا نے پاکستان کا ننانوے رنز کا ٹارگٹ با آسانی صرف تین وکٹس کے نقصان پر حاصل کرلیا۔ دوسرے ٹیسٹ میں بھی بیٹنگ لائن اپ کی فلاپ پرفارمنس نے 105 رنز سے شکست قومی ٹیم کی قسمت میں لکھ دی۔ ٹیسٹ میں ہاری ہوئی ٹیم کو پہلے ایک روزہ میچ میں صہیب مقصود کی شاندار اننگ کی بدولت جیت ملی مگر دوسرے اور تیسرے ون ڈے میں لنکن ٹیم نے شاہینوں کو بے بس کر ڈالا اس طرح پاکستان صرف ایک جیت کے ساتھ گھر لوٹا۔ اس ٹور کی سب سے بری بات یہ رہی کہ پاکستان کے جادوگر اسپنر سعید اجمل پابندی کا شکار ہوگئے۔ ٹیم میں سفارشی کھلاڑیوں کو جگہ دینے کا الزام لگایا گیا۔ مصباح الحق کو ایک بزدل کپتان ہونے کا طعنہ دیا گیا۔

2017 کا پاکستان ٹور آف آسٹریلیا

2016 کے اختتام پر پاکستانی کرکٹ ٹیم نے آسٹریلیا کا دورہ کیا۔ اس دورے میں پاکستان کو تین ٹیسٹ اور پانچ ایک روزہ میچ کھیلنے تھے۔ ٹیسٹ کی کپتانی مصباح الحق اور ون ڈے کی کپتانی اظہر علی کر رہے تھے۔ پہلے ٹیسٹ میچ میں دلچسپ مقابلے کے بعد پاکستان کو صرف انتالیس رنز سے ہار ملی۔ یہ آسٹریلیا اور پاکستان کا پہلا ڈے نائٹ ٹیسٹ تھا۔ اگلے میچ میں گرین شرٹس کی مایوس کن پرفارمنس کے بعد آسٹریلیا نے ایک اننگز اور اٹھارہ رنز سے جیت سمیٹی۔ تیسرے میچ میں 220 رنز سے ہار کر پاکستان ٹیم نے رینکنگ میں نمبرون پوزیشن گنوا دی مگر ٹیم کو نمبرون بنانے والے مصباح ایک بار پھر تنقید اور مذاق کا نشانہ بنے۔ ٹیسٹ میں ہارنے والی ٹیم کو کینگروز نے سنبھلنے نہ دیا۔ پہلے میچ میں بانوے رنز سے ہرا کر شاہینوں کو بے بس کیا۔ دوسرے میچ میں ٹیم نے ٹور کی پہلی کامیابی سمیٹی اور آسٹریلیا کو چھ وکٹس سے بے بس کیا مگر ہوم سائیڈ نے اگلے میچ میں ساٹھ، چوتھے میچ میں چھیاسی اور پانچویں میچ میں ستاون رنز سے فتح سمیٹ کر شاہینوں کو رینکنگ میں آٹھویں نمبر پر پھینک دیا۔ اس سیریز میں اظہر علی کی کپتانی اور بیٹنگ پر کڑی تنقید ہوئی اور اس نے کپتانی سے استعفیٰ دے دیا۔ ایک روزہ ٹیم میں ایک بار پھر تبدیلیاں کی گئیں۔ کئی نئے کھلاڑی آزمائے گئے۔

اس کے ساتھ ہی میں نے بات ختم کردی ''بس دوستو آج کے لیے اتنا ہی۔ حال ہی میں 2015 کے بعد کڑی تنقید کا نشانہ بننے والی ٹیم چیمپئنز ٹرافی میں بڑے بڑے ناموں کو آؤٹ کردیا اور روایتی حریف سے فائنل جیت کر کھلاڑیوں نے ملک کا نام روشن کیا۔ اس لیے ہمیں ان کی جیت کی خوشی منانی چاہیے اور ہار کو کھلے دل سے تسلیم کرکے کھیل کا حصہ سمجھنا چاہیے'' میں نے کہا۔ سب باری باری آصف سے ہاتھ ملا کر رخصت ہونے لگے۔

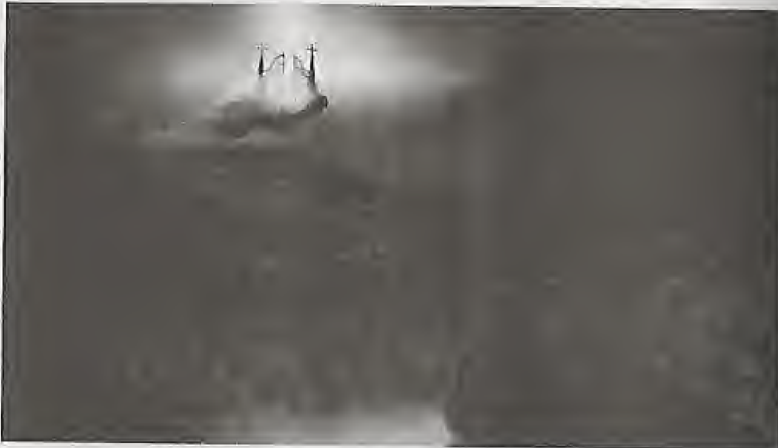


ناقابلِ یقین

کوثر اسلام

ہمارے اردگرد اکثر ایسے واقعات رونما ہوتے ہیں جو عقل سے ماورا ہیں۔ ان کی توجیح مشکل ہے لیکن انہیں جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ ایسے ہی چند واقعات کا تذکرہ۔

ناقابل یقین واقعات مختصر پیرائے میں



یہ دنیا ایک ایسا عجائب خانہ ہے جہاں اسرار کے ہزار ہا پردے ہیں جن کے پار دیکھنا اور ان اسرار کو سمجھنا آسان نہیں، عقل کی کسوٹی پر پرکھنا چاہیں تو عقل میں نہ سمائے۔ کہتے ہیں کہ دنیا کے اس کونے سے اس کونے تک ہر لمحہ ایک نہ ایک حیران کن تماشا ہوتا ہی رہتا ہے۔ اب جاپان کے اس واقعے کو ہی لے لیں اور پڑھنے کے بعد غور کریں کہ ایسا ہونا کیا ممکن ہے۔ عقل کا جواب کچھ بھی ہو مگر ایسا واقعہ رونما ہوا ہے تو آئیے اس واقعے کی طرف چلتے ہیں۔

یہ جولائی 1954ء کا ایک گرم دن تھا۔ ٹوکیو انٹرنیشنل ایئرپورٹ پر معمول کے مطابق جہاز اترا۔ مسافر جہاز سے باہر آنے لگے۔ سیکیورٹی حکام ان کے پاسپورٹ اور دیگر اشیاء چیک کر رہے تھے۔ اچانک ایک شخص جو شکل وصورت سے یورپی لگ رہا تھا مگر روانی سے جاپانی زبان بول رہا تھا۔ اس کے پاسپورٹ کو دیکھ کر حکام حیران رہ گئے۔ پاسپورٹ پر ملک کا نام "ٹورڈ" درج تھا۔ حکام ٹورڈ نامی کسی ملک سے واقف نہیں تھے۔

تفتیش کی غرض سے حکام نے اسے ایک کمرے میں بٹھایا اور پوچھا۔ "کیا تم اپنے بارے میں کچھ بتا سکتے ہو۔"

"میں پہلی بار جاپان نہیں آیا یہ میرا تیسرا سفر ہے۔ میں ایک کمپنی کے لیے کام کرتا ہوں اور اسی طرح کے سفر کرتا رہتا ہوں۔ کمپنی نے قریبی ہوٹل میں میرے قیام کا بندوبست کر رکھا ہے۔" مسافر نے قدرے غصے اور بیزاری سے کہا۔

جس کمپنی اور ہوٹل کا نام اس نے بتایا حکام کے علم کے مطابق اس کا کہیں بھی وجود نہیں تھا۔

انہوں نے اس کے سامنے نقشہ رکھا اور پوچھا۔ "کیا تم اس نقشے میں اپنے ملک کی نشاندہی کر سکتے ہو؟"

مسافر نے نقشے کو غور سے دیکھا کچھ لمحے سوچنے کے بعد اس نے فرانس اور اسپین کے درمیان ایک چھوٹے سے علاقے "اینڈورا" پر انگلی رکھتے ہوئے کہا کہ یہ اس کا ملک "ٹورڈ" ہے۔

سیکیورٹی حکام نے اسے بتایا۔ "یہ ٹورڈ نہیں بلکہ اینڈورا ہے۔ ٹورڈ آج سے تقریباً ایک ہزار سال پہلے موجود تھا جب کہ آج کہیں بھی اس کا وجود نہیں۔"

یہ سن کر مسافر بہت حیران ہوا۔ کچھ دیر سوچنے کے بعد اس نے مطالبہ کیا کہ اسے اعلیٰ حکام سے بات کرنے کا موقع دیا جائے تاکہ اس مسئلے کا کوئی حل نکالا جا سکے۔

سیکیورٹی حکام نے اس کی بات مانتے ہوئے اسے ایک قریبی ہوٹل میں ٹھہرایا اور کہا کہ وہ اس کا رابطہ بہت جلد اعلیٰ حکام کے ساتھ کر دیں گے۔

سیکیورٹی حکام نے دو آفیسرز اس کے کمرے کے باہر بٹھائے اور ان کو ہدایت دی کہ اس پر نظر رکھیں۔

مسافر نے رات کا کھانا کھایا اور سونے کے لیے چلا گیا۔

آفیسرز نے ساری رات اس کے کمرے کے باہر گزاری۔ صبح جب انہوں نے اس کا کمرا دیکھا تو وہ خالی تھا۔ کوئی بھی نہیں جان سکا کہ وہ کیسے آیا تھا اور بند کمرے سے کیسے اور کہاں گیا۔

اسی طرح کا ایک حیران کن واقعہ روم میں رونما ہوا۔ کیسے اور کس طرح یہ آپ بھی ملاحظہ کریں۔

سن 1911ء میں بہار اپنی تمام تر رنگینیوں کے ساتھ رخصت ہو چکا تھا۔ گرمیوں کی آمد آمد تھی۔ زینٹی نامی ٹرین میں 106 مسافر سوار ہوئے۔ ٹرین روم سے ایک قریبی پہاڑی علاقے کو جا رہی تھی۔ دورانِ سفر ٹرین کو ایک کلومیٹر لمبی سرنگ میں سے گزرنا تھا۔ ٹرین جب سرنگ میں داخل ہوئی تو دوبارہ اس سے کبھی نہ نکل سکی۔

ٹرین کی گمشدگی پر خیال ظاہر کیا گیا کہ اسے سرنگ میں کوئی حادثہ پیش آیا ہے۔ جائے حادثہ کو دیکھنے کی خاطر روم کی پولیس اور ریلوے حکام سرنگ میں داخل ہوئے۔ انہوں نے سرنگ کا کونا کونا کئی بار چھان مارا لیکن نہ تو انہیں ٹرین ملی نہ اس کی باقیات۔

پولیس اور ریلوے حکام شدید حیران تھے کہ اس ایک کلومیٹر سرنگ میں ٹرین کہاں غائب ہو گئی۔ انہوں نے بڑے پیمانے پر تحقیقات شروع کیں تو انہیں ٹرین کے دو مسافروں کے بارے میں معلوم ہوا۔

ان مسافروں نے دوران تفتیش بتایا۔ "ٹرین اپنے معمول کے مطابق محوِ سفر تھی۔ جیسے ہی وہ سرنگ میں داخل ہوئی انہیں دائیں جانب دودھیا رنگ کی تیز روشنی دکھائی دی۔ وہ ڈر گئے اور انہوں نے چلتی ٹرین سے چھلانگ لگا دی۔ ٹرین دودھیا رنگ کی روشنی میں غائب ہو گئی۔"

سخت کوششوں کے باوجود بھی تفتیش کاروں کو اس کے سوا کچھ بھی معلوم نہ ہو سکا۔

قریب تھا کہ یہ واقعہ بھی وقت کی گرد کے نیچے دب جاتا لیکن 1926ء میں ایک ریکارڈ منظر عام پر آ گیا۔ ریکارڈ پر تاریخ 1845ء درج تھی۔ ریکارڈ کے مطابق 1845ء میں میکسیکو میں 104 اٹالین آدمی پائے گئے۔ جو دماغی لحاظ سے غیر حاضر تھے۔ ان سب کا کہنا تھا کہ وہ روم سے روانہ ہوئے ہیں اور زینٹی ٹرین کے مسافر ہیں۔ اس وقت کے حکام نے روم کو اس واقعے کی اطلاع دی لیکن روم نے اس سے لاعلمی کا اظہار کیا۔ حکام نے ان تمام 104 افراد کو دماغی مریض قرار دے کر ایک اسپتال میں داخل کر دیا۔

ان افراد میں سے ایک شخص کے پاس سے سگریٹ کا ایک پیکٹ برآمد ہوا جس پر ڈن ہل کمپنی کا مونوگرام اور سال

آریائی مذہب

آریائی حملہ آوروں کے مذہب سے متعلق علم کا بہترین ذریعہ ویدک ادب ہے لیکن یہ ادب اس وقت مرتب ہوا جب آریائی کافی عرصہ ہوا ہندوستان میں آباد ہو چکے تھے اور مقامی لوگوں اور ان کے مذہب کے ساتھ گھل مل چکے تھے۔ ویدوں میں کیا کچھ حقیقتاً آریائی اور قبل از آریائی ہے، اس کا فیصلہ کرنا بہت مشکل ہے۔ بایں ہمہ آریائی مذہب کے بارے میں کچھ بنیادی مفروضے قائم کیے جاسکتے ہیں۔ یہ بات واضح نظر آتی ہے کہ ہندوستان کے آریائی حملہ آور اپنے ساتھ کثرت پرست مذہب لے کر آئے۔ آریائی دیوتاؤں یونانی، رومی معبد کے دیوتاؤں سے ملانے کی خاصی کوششیں ہوتی رہیں۔ آریائی جن دیوتاؤں کی پوجا کرتے تھے وہ مختلف فطری قوتوں مثلاً طوفان، سورج، چاند اور زرخیزی کی شخصی صورتیں لگتی ہیں۔ آریائی دیوتاؤں کی پرستش کا بنیادی طریقہ بدیہی طور پر قربانی تھا اگرچہ ہندوستان پر تسلط کے ابتدائی دنوں میں آریائی بنیادی طور پر خانہ بدوش تھے لہٰذا انہوں نے اپنے دیوتاؤں کے لیے معبد قائم نہ کیے بلکہ کھلی جگہوں پر بنائی گئی قربان گاہوں پر ان کے لیے قربانیاں پیش کرتے رہے۔ یہ زیادہ تر جانوروں کی قربانیاں ہوتی تھیں لیکن اس میں دودھ کی بنی ہوئی اشیاء مثلاً مکھن بھی دیوتاؤں کو پیش کیا جاتا۔

اقتباس: مذاہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا

مرسلہ: شہروز عالم۔ کراچی

1907ء درج تھا۔ 1845ء میں برآمد شدہ یہ پیکٹ ابھی تک میکسیکو حکام کی تحویل میں ہے۔

یہ گتھی آج تک کوئی نہ سلجھا سکا کہ ایک ٹرین روم سے 10000 کلومیٹر دور میکسیکو تک کیسے پہنچ گئی جبکہ درمیان میں کئی سمندر بھی ہیں۔ اس سے مزید حیران کن بات یہ ہے کہ وہ 66 سال پہلے کیسے پائی گئی۔ 1907ء میں قائم شدہ کمپنی کے سگریٹ 1845ء میں کیسے پائے گئے۔ یہ وہ سوالات ہیں جن کا جواب کسی کے پاس نہیں۔

لگے ہاتھوں امریکا کا بھی ایک واقعہ سن لیں۔

جولائی 1955ء میں ایک جہاز DC-4 فلائٹ نمبر 914 نے نیویارک سے میامی کے لیے اڑان بھری۔ جہاز میں عملے کے 4 افراد سمیت 57 مسافر سوار تھے۔

اڑنے کے چند لمحوں بعد جہاز غائب ہوگیا۔ اسے بہت تلاش کیا گیا لیکن اس کا کچھ پتا نہ چل سکا۔

21 مئی 1992ء کو وینزویلا کے ایئرپورٹ کراکس پر ایک اجنبی جہاز نمودار ہوا۔ حیرت انگیز طور پر اسے ریڈار پر نہیں دیکھا گیا۔ کنٹرول ٹاور نے پائلٹ سے رابطہ کیا اور پوچھا۔ ”تم کون ہو اور کہاں سے آئے ہو۔“

”یہ فلائٹ نمبر 914 ہے ہم نیویارک سے میامی کے لیے اڑے ہیں۔ ہمارے ساتھ عملے کے 4 افراد سمیت 57 مسافر ہیں ہمیں 2 جولائی 1955ء کو صبح 9 بج کر 55 منٹ پر میامی ایئرپورٹ پر اترنا تھا۔“ پائلٹ نے الجھے ہوئے لہجے میں کہا۔

”آپ 1800 کلومیٹر دور بغیر اطلاع کے یہاں کیسے آگئے۔“ کنٹرول ٹاور کی جانب سے پوچھا گیا۔

”یہ کون سی جگہ ہے؟“ پائلٹ نے گمبھیر لہجے میں پوچھا۔

”یہ جنوبی امریکا کا علاقہ وینزویلا ہے۔“ کنٹرول ٹاور کی جانب سے جواب دیا گیا۔

”جی، شاید کچھ غلط ہوگیا ہے۔“ پائلٹ نے اپنے کو پائلٹ سے کہا۔

”یہ 21 مئی 1992 ہے۔“ کنٹرول ٹاور کی جانب سے کہا گیا۔

”اوہ مائی گاڈ......“ پائلٹ نے ایک ٹھنڈی آہ بھر کر کہا۔

کچھ دیر بعد اس نے اپنے کاک پٹ ونڈو سے خدا حافظ کہا اور دوبارہ اڑان بھر کر نظروں سے اوجھل ہوگیا۔

خدا حافظ کہتے وقت اس کے ہاتھ سے کیلنڈر گر گیا جو 1955ء کا تھا۔

کیلنڈر اور پائلٹ کے ساتھ ہونے والی ریکارڈ شدہ گفتگو محفوظ ہے۔

37 سال تک ایک جہاز کیسے محو پرواز رہا۔ 37 سال ایک جہاز میں لوگ کیسے زندہ رہے یہ ایک ایسا راز ہے جس سے شاید ہی کوئی پردہ اٹھا سکے۔

شمشال سے ٹورنٹو

ندیم اقبال





یہ اعزاز صرف سرگزشت کو حاصل ہے کہ اس نے سفر ناموں کے انداز کو بالکل بدل دیا۔ اگر یوں کہا جائے تو غلط نہیں ہوگا کہ سفر نامہ نگاری میں ایک نئے عہد کا اضافہ کیا اور ان خرافات کو یکسر نظر انداز کردیا جو خشک تھے۔ سفر نامہ پر کہانی کا گمان ہو اس جانب مکمل توجہ رکھی۔ سفر نامے میں تاریخ و جغرافیہ اور دیگر معلومات بھی ہوں اس کا بھی خیال رکھا۔ ندیم اقبال کے سفر نامے میں بھی ایسا سب کچھ نظر آتا ہے۔

ذوقِ مطالعہ کی خاطر بالکل الگ انداز کا سفرنامہ

اپنا تعارف کروایا کہ ہم پاکستان سے ٹورنٹو دیکھنے آئے ہیں۔ ان سے پوچھا تو معلوم ہوا کہ ایڈنبرا اسکاٹ لینڈ سے کینیڈا کی سیاحت پر آئی ہوئی ہیں۔ شہباز نے انہیں کافی کی دعوت دی تو انہوں نے نہ جانے کس جذبے کے تحت فوری طور پر قبول کرلی اور اٹھ کر ہمارے پاس چلی آئیں۔

ہم سب کھڑے ہوگئے اور ان کے لیے بڑھ چڑھ کر کرسیاں سیدھی کرنے لگے۔ مفتی کی حالت غیر ہورہی تھی

اور ادھر سرجی شرمائے جارہے تھے۔ مطیع اللہ ویلکم ویلکم کہہ رہا تھا۔ خان دونوں ہاتھ بڑھا کر ہاتھ ملا رہا تھا۔ میں نے بھی ہاتھ ملائے اور وہ ہمارے ساتھ بیٹھ گئیں۔

سرجی کی ''محبت'' حسنِ اتفاق سے میرے ساتھ بیٹھی تھی اور سامنے سرجی اپنے آپ میں لپٹے بیٹھے تھے۔ تعارف ہوا تو اس کا نام میگی نکلا۔ میگی کے علاوہ سب دبلی پتلی تھیں۔

ہم سب ایکدم مہذب اور بااخلاق بن گئے تھے۔ شہباز کے علاوہ سب نے ٹانگ پر ٹانگ رکھ کر اپنے ہاتھ گودوں میں رکھ لیے تھے۔ یہ معرکہ شہباز نے سر کیا تھا، اسی لیے وہ ذرا کھل کر بیٹھا تھا۔

شہباز نے میزبان کا رول سنبھال لیا اور پوچھا۔ ''کون سی کافی آپ پئیں گی؟''

سب نے کچھ نہ کچھ بتایا اور میگی اٹھ کر مینو بورڈ کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ اپنی موٹے شیشوں کی عینک کو اتارا۔ مینو کو بغور دیکھا اور واپس آکر شہباز سے بولی۔ ''کوئی بھی منگوالیں۔''

قد اس کا سرجی سے نکلتا ہوا تھا۔ بعد میں شہباز یہ کہتا پایا گیا تھا کہ اس کی ہر چیز سرجی سے نکلتی ہوئی تھی اور سرجی شہباز کے ریمارکس اپنے دل پر لے رہے تھے۔ وزن اس کا سرجی سے دوگنا نہیں تو اس سے ذرا کم ہوگا مگر سرجی کے بقول ''دل آتا ہے تو دیوانہ وار چلا آتا ہے۔''

وہ شرماتے سرجی کو حیرانگی سے دیکھتی جارہی تھی۔ دوسری چار لڑکیوں میں جو زیادہ خوب صورت تھی، اس سے میں نے پوچھا۔ ''آپ لوگ اسکاٹ لینڈ سے آئی ہیں کیا سوچ کر آئی ہیں؟''

وہ لڑکی ٹانگ پر ٹانگ رکھے اپنے پاؤں متواتر ہلائے چلی جارہی تھی۔ سب نے نیکریں پہن رکھی تھیں اور ہمارے اردگرد بے شمار عریاں ٹانگیں ہل رہی تھیں۔ وہ لڑکی میرے سوال پر سلیس انگریزی میں بولی۔ ''ہمیں راکی ماؤنٹین میں جیسپر (Jasper) اور بینف (Banff) دیکھنے کا بہت شوق تھا۔ ہم سے زیادہ میگی کو تھا۔ ایک برٹش پاؤنڈ کے دو کینیڈین ڈالر بنتے تھے۔ ہم نے دو سال جاب کر کے رقم اکٹھی کی اور گروپ بنا کر آگئے۔''

جیسپر اور بینف کا نام میں نے اس کی زبان سے پہلی بار سنا تھا۔ نام اچھا لگا۔ میں نے اس کا بغور جائزہ لیتے ہوئے کہا۔ ''جیسپر؟ کیسا مقام ہے؟''

اپنے دونوں ہاتھ جکڑے اور جھرجھری لیتے ہوئے آنکھیں بند کر کے بولی۔ ''میں کیسے بتاؤں؟ وہ اتنی خوب صورت جگہ ہے۔ ایسا پُرسکون قصبہ ہے کہ دل کرتا ہے وہیں ساری زندگی گزار لوں۔'' اپنی بات جاری رکھی اور نیلی آنکھیں پھیلا کر بولی۔ ''پہاڑوں پر سورج غروب ہوتا ہے تو آسمان سے اتنے رنگ اترتے ہیں کہ دل و دماغ کو جکڑ سا جاتا ہے۔ اس کے جنگلوں میں ریچھ گھومتے پھرتے ہیں۔ جھیلوں میں برفانی پہاڑوں کے عکس دیکھ کر پریوں کی کہانیاں یاد آجاتی ہیں۔ شام کو جیسپر کے چھوٹے سے بازار میں گھومتے ہوئے ایسا لگتا ہے کہ جسم نہیں آپ کی روح وہاں پھر رہی ہے۔''

''اور بینف؟'' میں نے پوچھا۔

وہ اپنے ہاتھ چہرے کے سامنے لہرا کر بولی۔ ''بینف تو جنت ہے۔ اردگرد بلند سرسبز پہاڑ، پُرسکون اور خوب صورت ماحول، آبشاریں، جھیلیں اور دریا دیکھنے سے تعلق رکھتے ہیں۔ جھیل لوئیس جیسی جھیل شاید ہی دنیا میں کہیں ہو گی۔''

وہ خوشی اور مسرت سے کرسی پر ذرا آگے کھسک کر بولی۔ ''بینف سے جیسپر کو جو راستہ جاتا ہے اس کا سفر اور راستے کی خوب صورتی دیکھ کر لگتا ہے کہ آپ کسی اور جہاں میں آگئے ہوں۔''

جیسپر اور بینف دونوں کینیڈا کے صوبے البرٹا میں واقع ہیں۔ البرٹا کا فاصلہ ٹورنٹو سے ہزاروں میل ہے۔ میں نے دور دراز کے سفر جب شروع کیے تو میری ابتداء بینف سے ہوئی تھی۔ اس کے بعد جیسپر گیا۔ ایک بار جانے کے بعد بار بار جاتا رہا ہوں۔ جیسا سنا تھا اس سے بڑھ کر پایا۔ انشاء اللہ میرے ان سفروں کے احوال قارئین تک جلد پہنچیں گے۔ سرجی اسی دوران میگی کو دزدیدہ نظروں سے دیکھ لیتے تھے اور میگی ان کی نگاہوں کے مطلب تلاش کرتی محسوس ہورہی تھی۔

مطیع اللہ نے سرجی سے کہا۔ ''یہ لوگ کیا سوچیں گے، کافی پر ٹرخا دیا۔ کوئی کیک بھی لے آئیں۔''

سرجی میری جانب دیکھنے لگے۔ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور دوبارہ محوِ گفتگو ہوگیا۔ مجھے نئے علاقوں کی باتیں ویسے بھی اچھی لگتی تھیں اور سنانے والیاں بھی اسکاٹش تھیں تو ہم سب اپنی آنکھیں اور کان ان ہی کی جانب لگائے بیٹھے تھے۔

شہباز نے پوچھا۔ ''اسکاٹ لینڈ کیسا ملک ہے؟''

''اسکاٹ لینڈ آپ لوگوں نے نہیں دیکھا؟'' ایک لڑکی حیرت سے بولی۔

''پاکستان میں اتنے مصروف ہوتے ہیں کہ وقت ہی نہیں ملتا۔ اگلے سال جولائی میں ضرور آئیں گے۔'' مطیع اللہ بولا۔ اتنے میں سرجی کیک لائے اور سارے ٹکڑے میگی کے سامنے رکھ دیے۔ میگی اب سرجی کی نظروں کی تاب نہ لا کر پہلو بدل رہی تھی۔ سرجی اس کے ٹرانس میں آگئے اور میکانکی انداز میں حرکتیں کر رہے تھے۔ لگتا تھا کہ میگی نے کسی آسیب کی طرح ان کے دل و دماغ پر قبضہ کرلیا ہے۔ میں اس صورتِ حال کو خوب انجوائے کر رہا تھا۔

ایک لڑکی بولی۔ ''اسکاٹ لینڈ کی زمین کسی طرح بھی سوئٹزرلینڈ سے کم خوب صورت نہیں ہے۔ وہاں کے سیکڑوں سال پرانے محلات کو ہوٹلوں میں تبدیل کردیا گیا ہے۔ کئی ایک جزیرے جو امیر لوگوں کی ملکیت تھے۔ وہاں بنے محلات میں ٹھہرنا آپ کو سینکڑوں سال پرانے ماحول میں لے جاتا ہے۔ جزیروں تک جانے کے لیے آپ کو بوٹس لے جاتی ہیں۔'' پھر مشورہ دیتے ہوئے مطیع اللہ سے بولی۔ ''جب اسکاٹ لینڈ جائیں تو ان محلات میں ضرور ٹھہرنا۔''

مطیع اللہ بڑی سنجیدگی سے سر ہلاتے ہوئے کہنے لگا۔ ''انشاء اللہ اگلے سال جولائی میں جائیں گے۔''

اس لڑکی کی باتیں سولہ آنے ٹھیک تھیں۔ میں نے یہ تجربہ بھی کر کے دیکھا تھا۔ ان محلات کے کمروں میں بیڈ اتنے دبیز تھے کہ لیٹیں تو دھنستے چلے جاتے ہیں اور واپس زمین پر آنا یعنی بستر سے اترنا بھی مشکل ہو جاتا ہے۔ خان نے تو اتنی بے تکلفی پیدا کرلی کہ باتیں کرتے کرتے ہنس کر اس سے ہاتھ بھی ملانے لگا تھا۔

میگی سرجی کی محبت بھری نظروں کی تاب نہ لا سکی اور آخر بول پڑی۔ ''آپ کیا دیکھ رہے ہیں؟ کیا ہم پہلے مل چکے ہیں؟''

سرجی ایکدم بوکھلا گئے۔ رنگ زرد پڑ گیا اور کچھ کہنے لگے جو ہماری سمجھ میں نہیں آرہا تھا۔ ہم سب میگی کے سوال کی طرف متوجہ ہو کر اب سرجی کو دیکھنے لگے۔ ان کی حالت ایسی تھی کہ ابھی گر پڑیں گے۔

میگی کو کوئی نہ کوئی جواب تو دینا ضروری تھا مگر سرجی جواب دینے کے قابل کہاں رہے تھے۔ ایک عجیب سی صورتِ حال پیدا ہو گئی تھی۔ سرجی میری جانب ہمیشہ کی طرح دیکھ رہے تھے اور میں کندھے اچکا کر خاموش بیٹھا تھا۔ مطیع اللہ کی نظروں میں مجھے ایک چمک دکھائی دی اور مجھے شک گزرا کہ وہ کچھ کر گزرنے والا ہے۔

ہم سب خاموش تھے کہ مطیع اللہ کی باریک آواز سنائی دی۔ اس نے میگی کی آنکھوں میں دیکھ کر خلاؤں میں تکتے ہوئے بولا۔ ''آپ کو دیکھنے کے پیچھے ایک نہایت درد انگیز داستان ہے۔ نہ ہی سنیں تو بہتر ہے۔''

اب لڑکیوں کے علاوہ ہم سب بھی چونکنے ہوگئے۔ سرجی کے چہرے پر رنگ چڑھ اور اتر رہے تھے۔

میگی جو اپنی ایک انتہائی صحت مند ٹانگ دوسری پر رکھے بیٹھی تھی وہ بولی۔ ''کیا داستان؟ میں سمجھی نہیں؟''

مطیع نے نظریں اٹھا کر مارکیٹ کی مخروطی چھت پر پھنسے بے شمار پائپوں کو گھورتے ہوئے کہا۔ ''جب سے آپ کو کوئین پارک میں گھاس پر دراز لیٹے دیکھا تو یہ سکتے کی کیفیت میں کھوئے کھوئے پھر رہے ہیں۔ ایک بار تو گاڑیوں کو ٹکر مارتے مارتے بچے ہیں۔ کچھ کھایا پیا بھی نہیں اور بس بھوکے پھر رہے ہیں۔ ابھی یہ کیک لائے مگر اس کو ہاتھ بھی نہیں لگایا۔''

مطیع اللہ نے غم کی کیفیت اپنے پر طاری کرتے ہوئے کیک کا ایک ٹکڑا اٹھایا اور منہ میں ڈال کر سرجی سے بولا۔ ''کیک تو بہت اچھا ہے۔''

میگی نے اپنی ایک ٹانگ اپنی دوسری ٹانگ پر سے اتاری تو مجھے یوں محسوس ہوا کہ بوجھ مجھ پر سے ہٹا ہو۔ وہ حیرت سے مطیع اللہ اور سرجی کو باری باری دیکھتے ہوئے بولی۔ ''میں واقعی پریشان ہورہی ہوں۔ آخر میری وجہ سے ان کو کیا تکلیف پہنچی ہے؟''

سرجی کے علاوہ ہم سب مسکراہٹیں دبائے بیٹھے تھے اور سرجی اپنے بیگ کی آڑ میں مطیع اللہ کو اپنے بندھے ہاتھ دکھلا رہے تھے مگر مطیع اللہ گیئر بدل چکا تھا اور اب وہ بریک لگانے کے موڈ میں قطعاً نہیں تھا۔ مطیع اللہ نے کیک کا ایک اور پیس اٹھایا اور میگی کی جانب بڑھایا پھر اس کا نفی میں سر ہلتے دیکھ کر اسے اپنے منہ میں رکھ لیا اور میگی سے کہنے لگا۔ ''آپ اتنا زور دے رہی ہیں تو بتا دیتا ہوں، ورنہ وہ تو اپنے سب راز صرف مجھ ہی کو بتاتے ہیں۔''

اب سرجی شہباز کی طرح زرد پڑ کے ہلکا سا کپکپا بھی رہے تھے۔ میرے ساتھیوں کے چہروں پر مسکراہٹ کے علاوہ یہ اشتیاق بھی تھا کہ مطیع اللہ کے سازشی ذہن سے برآمد

کیا ہوتا ہے۔ میگی اور اس کی سہیلیاں بھی کچھ سننے کے لیے بے تاب دکھائی دیتی تھیں۔

”اصل نام تو وہ خود بھی بھول گیا ہے اور اب یہ سرجی کہلاتے ہیں۔ بیس سال پہلے یہ مون لائٹ سینما سے ایک انگریزی فلم دیکھ کر سرخ چہرہ لیے باہر نکلے تو اچانک انہیں یاد آیا کہ وہ کسی کی محبت میں شدت سے گرفتار ہو چکے ہیں۔ جس کو وہ دل دے چکے تھے اس کی شکل ہو بہو میگی جیسی تھی۔ یہی قد، یہی ناک نقشہ اور فرق اتنا تھا کہ ان کی میگی گندمی سے سیاہ رنگ کی تھی اور ہماری میگی سفید سے گندمی رنگ کی ہے۔ سرجی کی میگی ان ہی کی طرح سرجی پر جان چھڑکتی تھی اور کئی بار تو اپنی جان دینے کی کوشش بھی کر چکی تھی مگر سرجی کے سمجھانے اور دلاسے دینے کے بعد اس نے اپنا ارادہ تبدیل کر لیا تھا۔“ مطیع انتہائی سنجیدگی سے یہ کہانی سنا رہا تھا اور میں نے اپنی ہنسی دباتے ہوئے چہرے پر دایاں ہاتھ رکھ لیا تھا۔

مطیع نے لمحہ بھر کے لیے کچھ سوچا اور پھر گویا ہوا۔ ”پھر وہی ہوا جس کا خدشہ سرجی کے دل و دماغ میں ہر وقت رہتا تھا۔“

”کیا؟“ میگی نے پوچھا۔

”وہی جو پیار کرنے والوں کے نصیب میں ہوتا ہے۔ یعنی ہمیشہ کی جدائی۔“ مطیع نے جواب دیا۔

مطیع اللہ سرجی کے ان سانحات اور رازوں کی بابت بتا رہا تھا جو کبھی وقوع پذیر بھی نہ ہوئے تھے۔ میرے لیے اب دلچسپی اس بات میں تھی کہ مطیع بتانا کیا چاہتا ہے اور یہ کہانی گھڑ کر حاصل کیا کرنا چاہتا ہے۔

میگی بے چینی سے بولی۔ ”آخر ہوا کیا تھا؟“

”آپ کو تو معلوم ہے کہ مشرق بہت پُراسرار ہے۔ محیرالعقول واقعات سے بھرا پڑا ہے۔“ مطیع بولا۔

”اوہ یس۔“ وہ دلچسپی لیتے ہوئے بولی۔

”سرجی کی میگی پر ایک دن محلے کا بھوت عاشق ہو گیا۔“

”اوہ نو۔“ میگی بولی۔

”اوہ یس۔“ مطیع بولا پھر اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”ایک شام سرجی کی میگی چھت پر چارپائی چڑھا رہی تھی۔“

”سرجی کی میگی۔“ سننے کے بعد وہ بوکھلا کر میگی کی طرف دیکھتے اور میگی کو گھورتے دیکھ کر شرما جاتے۔

ایک لڑکی نے پوچھا۔ ”چھت پر بیڈ بنانے کیوں جا رہی تھی؟“

”آپ کو معلوم تو ہے کہ مشرق بہت پُراسرار جگہ ہے۔“ مطیع نے یاد دلایا۔

”اوہ یس۔“ وہی آواز دوبارہ آئی۔

مطیع اللہ نے اسٹوری جاری رکھی۔ ”وہ چارپائی لیے چھت پر پہنچی تو بھوت بیٹھا اپنے کسی نجی مسئلے پر غور و خوض کر رہا تھا۔ یہ بھوت کو تو نہیں دیکھ سکتی تھی۔ لہٰذا اس نے بھوت کا پاؤں کچل دیا۔“

”اوہ نو۔“

”اوہ یس۔“

”پہلے تو بھوت کو بہت طیش آیا مگر جب اس نے ان کی میگی کو دیکھا تو اپنا دل ہار بیٹھا۔ بھوت نے بعد میں سرجی کی میگی کو بتایا تھا کہ میں سینکڑوں سالوں سے ایسی جی دار، زوردار، بے باک اور جواں ہمت لڑکی کی تلاش میں تھا جو جب بھی میرے ہمراہ چلے تو سب چڑیلیں کہیں کہ کیا جوڑی ہے۔“

کہیں سے پھر آواز آئی۔ ”اوہ نو۔“

”اوہ یس۔“ یہ مطیع تھا۔ مطیع کے ”کیا جوڑی ہے“ کہنے پر میگی اور سرجی دونوں اپنی اپنی تشویش میں مبتلا ہو گئے۔ سرجی نے تو نہیں مگر ہماری میگی نے برا بھی منایا۔

”آہستہ آہستہ سرجی کی میگی اور بھوت کی ملاقاتیں بڑھنے لگیں۔ دونوں میں مکمل Understanding پیدا ہو گئی تھی۔ بھوت اپنی میگی کا اتنا خیال رکھتا کہ وہ جب بھی کھانے کی کسی چیز کی فرمائش کرتی تو وہ حاضر کر دیتا۔“

”یہ کس طرح ممکن ہو سکتا ہے؟“ میگی شک بھرے لہجے میں بولی۔

”آپ کو پہلے بھی بتا چکا ہوں کہ مشرق بڑی پُراسرار جگہ ہے۔“ مطیع، میگی سے مخاطب ہوا۔

”اوہ یس۔“ یہ میگی تھی۔

”اسی دوران سرجی کو شک پڑ گیا تھا کہ ان کی میگی کسی اور کو دل دے چکی ہے۔ وہ سرجی سے کھنچی کھنچی رہنے لگی تھی۔ کئی بار اس نے سرجی کے لائے برگرز اور شوارمے کوؤں کے آگے ڈال دیئے۔ بھوت نے اپنی میگی سے کہہ دیا تھا کہ سرجی اسے بالکل اچھے نہیں لگتے کیونکہ وہ اس کے حریف رو سیاہ ہیں مگر سرجی بھی باز کہاں آنے والے تھے، وہ اپنے محاذ پر ڈٹے رہے۔ سرجی کو بھوت کے بارے میں تو کچھ علم نہ تھا

مگر انہوں نے جلدی جلدی تھوڑا بہت روحانی علم حاصل کیا اور بھوت تک پہنچ گئے۔ اب بھوت اور سرجی کے درمیان سرد جنگ شروع ہو گئی۔ بھوت سرجی کو ستانے لگا تھا۔ کبھی ان کی موٹر بائیک کی ہوا نکال جاتا اور کبھی جب یہ سوچوں میں ڈوبے ہوتے تو ان کو سر پر چپت رسید کر کے بھاگ جاتا۔“

”واقعی؟“ یہ خان تھا۔

”خان تم خاموش بیٹھو ورنہ تمہیں بھی کہانی میں ڈال دوں گی۔“ مطیع اللہ اردو میں بولا۔

”تو بھوت نے سرجی کے لیے ایک سیاپا کھڑا کر رکھا تھا۔“ اب شہباز بولا تھا۔

مطیع اللہ شہباز سے کہنے لگا۔ ”لڑکیوں کو بتاؤ کہ بھوت بالکل تم جیسی تھی مجھے اب ٹوکا تو نانی یاد دلا دوں گی۔“

میں نے شہباز اور خان کو خاموش رہنے کا کہا اور بولا کہ اگر مطیع اللہ سے کہانی بے ربط ہو گئی تو بھانڈا پھوٹ جائے گا۔ وہ دونوں خاموش ہو گئے۔ لڑکیاں ہمیں اپنی زبان میں باتیں کرتے دیکھ کر ہمارے چہروں کو باری باری تک رہی تھیں۔ مطیع نے اپنی بات دوبارہ شروع کی۔

”بھوت کو شادی کی جلدی تھی کیونکہ پہلے ہی اس کی عمر تین سو نوے سال ہو چکی تھی۔ شادی کی عمر ہاتھ سے نکلی جا رہی تھی۔ سرجی کی میگی اب بھوت کی میگی بن چکی تھی۔ بھوت اپنی میگی سے شادی کی بات کرتا تو وہ شرما کر کہتی کہ پہلے میری ماں سے بات کرو۔“

”بھوت کی میگی شرماتی کیوں تھی۔ حالانکہ اسے خوف کھانا چاہیے تھا اور شادی کے لیے اپنی ماں سے بات کیوں کرنا چاہتی تھی۔“ یہ اس لڑکی کا سوال تھا جو ان سب سے قدرے خوب صورت تھی۔

مطیع اللہ بولا۔ ”مشرق اور مغرب واقعی دو مختلف کونے ہیں۔ دونوں ایک دوسرے کو نہیں سمجھ سکتے۔ مشرق واقعی پُراسرار جگہ ہے۔“

وہ لڑکی بولی۔ ”واقعی میں سمجھ سکتی ہوں۔“

میں نے مطیع سے انگریزی میں کہا۔ ”کہانی کو ذرا مختصر کرو۔ ہم نے یہ مارکیٹ بھی دیکھنی ہے۔ لارنس ہال، ٹاؤن سینٹر اور فلپس اسکوائر بھی جانا ہے۔“

اب کہانی دوبارہ شروع ہوئی۔ ”بھوت اب گاہے گاہے اپنی میگی کے جسم میں حلول کر جاتا اور اس سے عجیب و غریب حرکتیں کرواتا تھا۔ ماں باپ نے کوئی خاص نوٹس نہ لیا کیونکہ ان کی میگی پہلے ہی ایسی حرکتیں کرتی رہی تھی، جیسے سارے گھر کا کھانا اکیلے ہی کھا جانا۔ اپنے ابا کے ڈرائی فروٹ رات کو چوری کر کے پورا لفافہ خالی کر دینا اور اپنے چھوٹے بھائی کو دونوں ہاتھوں پر اٹھا کر سر سے بلند کر کے چارپائی پر پٹخ دینا۔ گھر والوں کی نظر میں یہ سب معمول کی حرکتیں تھیں مگر بھوت کو بہت غصہ آیا کہ کوئی بھی گھر والا میری کسی بھی بات کا نوٹس نہیں لے رہا۔ آخر ایک دن میگی کے بدن میں داخل ہوا اور گھر والوں کے سامنے گھمبیر مردانہ آواز میں شکایتیں کرنے لگا کہ گھر کا کوئی فرد بھی مجھے بھوت ہی نہیں سمجھتا اور میں اتنا گیا گزرا بھی نہیں ہوں کہ ہاتھ پر ہاتھ دھرے بیٹھا رہوں۔“

”یہ کس طرح ممکن ہے کہ لڑکی کی آواز ایکدم سے مردانہ بن جائے؟“ ایک لڑکی پہلو بدل کر بولی۔

مطیع اللہ نے ذرا درشت لہجے میں جواب دیا۔ ”آپ کو کیا معلوم نہیں کہ مشرق بہت پراسرار جگہ ہے۔“

”اوہ یس۔“ وہ سمجھ گئی۔

”بھوت کی میگی نے مردانہ آواز میں بھی بول کر دیکھا مگر گھر والوں پر نہ کوئی اثر ہوا اور نہ ہی کسی نے لفٹ کرائی۔ اب بھوت اپنی اس ہتک پر احساس کمتری میں مبتلا ہو گیا۔ ایک دن بھوت نے اپنی میگی کی زبان سے مردانہ آواز میں ماں سے شکایت کی کہ میں جو اتنی بکواس ہر روز کرتا ہوں، آپ لوگ آخر کان کیوں نہیں دھرتے۔“

ماں نے پھر بھی کوئی نوٹس نہ لیا کیونکہ وہ سمجھتی تھی کہ بیٹی سے کچھ بعید نہیں کہ انسان کیا، جانوروں کی آوازوں میں بھی باتیں کر لے۔ بھوت نے غصے میں آ کر کچن کے سارے برتن توڑ ڈالے اور پھونک مار کر گھر کا چولہا بھی بجھا ڈالا۔ اس جرم کی پاداش پر ماں صاحبہ نے جوتے کے ساتھ اپنی میگی اور بھوت دونوں کی خوب پٹائی کی۔“

اب مجھ سے اور میرے سب ساتھیوں سے ہنسی روکنا مشکل ہو رہی تھی مگر لڑکیاں حیرت و سکوت سے سب سن رہی تھیں۔

مطیع نے سرجی سے کہا کہ ایک کپ کافی کا پھٹا پھٹ (فٹافٹ) آرڈر کرو۔ سرجی جھٹکے سے اٹھے اور آرڈر دے کر واپس اپنی جگہ بیٹھ کر اپنی کہانی غور سے سننے لگے۔

مطیع اللہ نے میگی سے پوچھا۔ ”آپ ابھی کیا پوچھ رہی تھیں؟“

”میں نے تو کچھ نہیں پوچھا۔“ وہ حیرت سے بولی۔

''آپ نے نہیں پوچھا کہ کبھی میں اسے سرجی کی میکی کبھی بھوت کی میکی اور کبھی ماں باپ کی میکی کہہ رہا ہوں۔ کیا اس کا اپنا کوئی نام نہ تھا؟'' مطیع نے تفتیشی انداز سے پوچھا۔

یہ سن کر میکی کی آنکھیں پھیل گئیں۔ کچھ خوف اور بہت ساری حیرتیں اس کے چہرے پر نمایاں تھیں۔

بعد میں مطیع نے ہمیں یہ بتایا کہ جب بھی وہ میکی کو مختلف حوالوں سے کہانی میں لے آتا تو بے چاری اصل میکی بے چینی سے پہلو بدلنے لگتی تھی۔ اس پر میرا تکرار کہ فلاں کی میکی، فلاں کی میکی کہنا اسے گراں گزر رہا تھا، اسی لیے میں نے کہانی میں زیادہ تھرل پیدا کرنے کے لیے یہ تیر چلایا تھا۔

اب میکی اپنی دونوں گلگلی سی سفید ہتھیلیاں اپنے سامنے پھیلا کر بے یقینی اور حیرت سے بولی۔ ''میں قسم اٹھا کر کہتی ہوں کہ یہ سوال میرے دل میں تو شروع سے تھا مگر زبان سے ادا نہیں کیا۔''

میرے سمیت سب لڑکیوں نے میکی کی تائید کی۔ ہم سب پر اب حیرت طاری تھی۔

ایک لڑکی معترف ہو کر مطیع اللہ سے بولی۔ ''یہ کس طرح ممکن ہے کہ آپ اس کے ذہن میں سوال کو جان گئے؟''

''یہی تو میں کہتا چلا آ رہا ہوں کہ مشرق بہت ہی پُراسرار جگہ ہے۔'' مطیع اللہ نے لڑکیوں کو تسلی دیتے ہوئے کہا۔

''واقعی پراسرار ہے مشرق، واؤ کتنا زیادہ تھرل ہے وہاں پر۔'' اس لڑکی نے مرعوب بیٹھی اپنی سہیلیوں سے آنکھیں پھیلا کر کہا۔

مطیع نے سب کو اپنی جانب متوجہ کر کے کہانی کو آگے بیان کرنا شروع کیا۔ ''بیٹی کی لگاتار عجیب و غریب اور کچھ نامناسب حرکات دیکھ کر ماں کو شک گزرا کہ یا تو بیٹی کسی بھوت پر ہے یا کوئی بھوت بیٹی پر ہے۔ دونوں صورتیں نازک تھیں کیونکہ بیچ میں بھوت اٹکا ہوا تھا اور پھر سرجی نے ماں صاحبہ کا شک یقین میں یہ کہہ کر بدل دیا کہ جو میرے پاس تھوڑا بہت علم ہے اس کے مطابق بھوت اور آپ کی بیٹی دونوں ایک دوسرے سے چمٹے ہوئے ہیں۔ بھوت اور سرجی کی پہلے بھی رسا کشی چل رہی تھی اور یہ کہنے کے بعد کھنچاؤ دشمنی میں بدل گیا۔ سرجی نے ماں صاحبہ سے کہا کہ میرا روحانی استاد بہت پہنچا ہوا گھوسٹ ماسٹر ہے اور اس جیسے تلنگے بھوت تو اس کا نام سن کر شہر ہی چھوڑ جاتے ہیں۔ پھر فیصلہ ہوا کہ سرجی اسی پیر یعنی گھوسٹ ماسٹر کو لے کر آئیں گے۔''

سب سے خوب صورت لڑکی سے دوسرے نمبر والی بولی۔ ''پاکستان میں بھوت اتارنے والے گھوسٹ ماسٹر بھی ہوتے ہیں؟''

مطیع اللہ بولا۔ ''جہاں بھوت ہوگا وہاں گھوسٹ ماسٹر بھی ہوگا۔ بالکل اسی طرح جیسے جہاں میکی ہوگی وہاں یا تو سرجی ہوگا یا پھر بھوت ہوگا۔''

میں زیرِ لب مسکرانے لگا۔ مجھ کو مطیع اللہ سے ایسی داستان گوئی کی اُمید قطعاً نہ تھی۔

''پھر اگلے روز سرجی اپنے پیر صاحب کو بائیک پر بٹھا کر لے آئے۔ پیر صاحب کچھ پڑھتے ہوئے گھر کی ڈیوڑھی میں داخل ہوئے تو سامنے سب کی میکی کھڑی فرش دھو رہی تھی۔ سرجی نے چھوٹتے ہی پیر صاحب سے کہا کہ یہی ہے اور پیر صاحب نے سنتے ہی لپک کر اس میکی کی گردن جکڑ لی۔ سرجی چلاتے رہے کہ مر جائے گی اور پیر صاحب یہ کہتے تھے کہ بھوت ہو یا میکی، دونوں ہی زمین پر نحوست ہیں۔''

میں اور میرے دوست اپنی ہنسی دبائے چہرے سرخ کیے بیٹھے تھے۔

مطیع اللہ انتہائی سنجیدگی سے کہانی بیان کر رہا تھا۔ ''سرجی نے بڑی مشکل سے اپنی محبت کی گردن چھڑوائی اور پیر صاحب سمیت اپنی میکی کو گھر کے صحن میں چارپائی پر لا بٹھایا۔

اب پیر صاحب میکی سے کہنے لگے کہ بھوت کو بلاؤ اور وہ ضد پر اڑی یہ کہتی رہی کہ پہلے اماں سے رشتے کے لیے ہاں کر۔

پیر صاحب کہتے کہ یہ فیصلہ گھر کے بڑے کرتے ہیں۔

میکی کہتی کہ میرے بھوت کے بڑے مرکھپ گئے ہیں اور میرے گھر والے میری محبت کے دشمن ہیں۔ میں نہیں بلاتی اسے جس سے یہ لوگ نفرت کرتے ہیں۔

پیر صاحب بولے کہ بلائے گا تو تیرا باپ بھی اور یہ کہہ کر میکی کے بالوں کو پیچھے سے پکڑ کر مروڑنے لگا۔ وہ چیخی چلائی تو بھوت سے رہا نہ گیا اور میکی کے جسم میں حلول کر گیا۔ آتے ہی پیر صاحب کو لات ماری اور دونوں گتھم گتھا ہو گئے۔ پیر صاحب کہے جاتے تھے کہ تو بھوت ہے تو میں تم

بڑا بھوت ہوں اور آخر انہوں نے یہ پیچ کر دکھایا اور ...کو ایسے داؤ پیچ لگا کر شکنجے میں جکڑا کہ وہ بے چارہ چل نہیں سکتا تھا۔''

مطیع کی کہانی جاری تھی اور لڑکیوں سمیت ہم بھی بغور ...کا کلائمکس سننے کے منتظر تھے۔

''اب بھوت اور میکی دونوں مل کر چلائے تو گھر لرز ...۔ آخر بھوت نے پیر صاحب کو دوطرفہ پرامن مذاکرات کی دعوت دی اور پیر صاحب نے قبول کر لی۔ پیر صاحب ...کہ میکی کو چھوڑ دو اور بھوت کہتا کہ میں اپنی محبت سرجی کے حوالے نہیں کر سکتا، سرجی کو میکی سے دستبردار ہونا پڑے ...۔ پھر پیر صاحب نے سرجی کے آگے ہاتھ جوڑے اور عرض کی کہ دو بھوت بلکہ بھوت اور سرجی مدمقابل آ گئے ہیں اور سرجی کو اپنی محبت کی قربانی دینا پڑے گی ورنہ میکی جان سے جائے گی۔ بھوت کہتا کہ میں میکی کو چھوڑ دوں گا اگر میرا ...بھی چھوڑ دے۔ آخر سرجی کو بھوت پر ترس آ گیا۔ ...میکی پر ترس آ گیا۔ انہوں نے سب کے سامنے میکی کی قسم کھا کر وعدہ کیا کہ وہ بھوت کو ہمیشہ کے لیے بھولنے کی کوشش کریں گے۔ یعنی میکی کو بھولنے کی۔''

میکی نے پوچھا۔ ''تو سرجی نے میکی کو چھوڑ دیا؟''

''ہاں چھوڑ دیا۔ پھر میکی کی دوسرے بھوت یعنی ایک ...ے سرجی سے شادی ہو گئی اور پندرہ سال بعد ایک دن ...بٹھائے دل برداشت ہوئے اور اسی بھوت کی مدد ...امیگریشن لی اور ہمیشہ کے لیے یہاں کینیڈا آ بسے۔'' ...اللہ نے کہانی کو اینڈ لگایا۔

پھر آواز آئی۔ ''اوہ نو۔''

''اوہ یس، پھر سرجی نے آج میکی کو دیکھا تو ان کے ...م ہرے ہو گئے۔''

''اوہ نو۔'' میکی دھیمے لہجے میں بولی۔ ''آج یقین ...کہ واقعی مشرق بہت پُراسرار ہے۔''

خان قیصر نے مطیع کو پنجابی میں کہا۔ ''ان پر وقت ...علاوہ پیسے بھی خرچ کیے ہیں۔ ان سے کہو کہ شام تک ...ے ہمراہ گھومیں پھریں تاکہ ہماری بھی ٹور بن سکے۔''

مطیع بولا۔ ''بھکر (فکر) مت کرو۔ یہ خود ساتھ چلنے ...۔''

ایک لڑکی جو اپنی آنکھوں میں چھپا جوش نہیں چھپا پا ...ی وہ اشتیاق بھرے لہجے میں مطیع سے بولی۔ ''وہ آپ ...ہے تھے کہ سرجی نے روحانی علم بھی حاصل کیا ہے؟''

شعیب احمد عباسی

محلہ ملانا امروہہ کے علمی و ادبی گھرانے سے تعلق رکھنے والے شعیب حزیں کا اصلی نام شعیب احمد عباسی ہے۔ والد کا نام ڈاکٹر محمد احسن عباسی تھا۔ شعیب حزیں 1916ء میں امروہہ میں پیدا ہوئے۔ ابتدائی تعلیم کا مرحلہ امروہہ میں گزرا۔ عثمانیہ یونیورسٹی سے بی اے کیا۔ علی گڑھ یونیورسٹی سے ایم اے سال اوّل کا امتحان دینے کے بعد دہلی ریڈیو سے منسلک ہو گئے۔ تقسیم ہند کے بعد پاکستان آئے اور پہلے لاہور، کوئٹہ اور پھر کراچی ریڈیو سے منسلک رہے۔ شعیب حزیں کا شمار بحیثیت سینئر براڈ کاسٹر، ڈراما نگار، اسکرپٹ رائٹر اور معروف شاعر کی حیثیت سے بھی ہوتا ہے۔ لاہور کے انجام اور امروز کے علاوہ کوئٹہ کے اخبار زمانہ سے بھی منسلک رہے اور صحافتی ذمہ داریاں پوری کرتے رہے۔ پچاس کی دہائی میں آپ کی تحریر کردہ تاریخ سندھ کو انٹرمیڈیٹ کورس میں شامل کی گئی۔ 1971ء میں آنے والے ماہِ اگست کی کسی تاریخ کو داعی اجل کو لبیک کہا اور خفتگانِ کراچی ہوئے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم
مرسلہ: ظفر عابدی۔ کراچی

''ہاں کیا تھا اور پامسٹری بھی جانتے ہیں مگر اب یہ بہت کم لوگوں سے ملتے جلتے ہیں۔'' مطیع نے بے بسی سے کہا۔

اس دوران سرجی ہر لڑکی کے چہرے کو نظریں پھاڑ پھاڑ کر دیکھتے چلے جا رہے تھے۔

سب لڑکیوں نے بڑھ کر ان سے ہاتھ ملایا۔ تعظیم دی اور ان سے ایسے پیش آ رہی تھیں کہ جیسے وہ کوئی مافوق الفطرت ہستی ہوں۔

میکی کہنے لگی۔ ''ڈاؤن ٹاؤن ہم نے بھی دیکھا ہے اور آپ لوگوں نے بھی، اگر اعتراض نہ ہو تو ہم اکٹھے گھومتے ہیں۔ اب تو ہماری دوستی بھی ہو گئی ہے۔'' یہ کہہ کر وہ مسکرا کر سرجی کو دیکھنے لگی۔

مطیع نے اپنے کندھے اچکاتے ہوئے کہا۔ ''ہمیں تو خوشی ہوگی۔'' یہ کہہ کر خان کو آنکھ ماری اور میں سوچنے لگا کہ مشرق واقعی بہت پراسرار جگہ ہے۔

سرجی نے ادائیگی کی اور پھرتی سے واپس لڑکیوں

کے بیچ آ کھڑے ہوئے جیسے انہیں کوئی ضروری بات کرنی ہو۔ لڑکیاں سرجی کو اپنی نظروں سے تول رہی تھیں۔ بھوت تو ہم میں سے شاید ہی کسی نے دیکھا ہوگا اسی لیے لڑکیاں سرجی کو بغور دیکھ رہی تھیں جو کہ وہ بھوت سے دوبدو ہو چکے تھے۔ وہ سرجی سے سوال پہ سوال کرنے لگیں۔ شہباز میرا بازو پکڑ کر مجھے آگے لے گیا۔ ”ان کا سیاپا تو رات تک لگا رہے گا ہم یہ منڈی تو دیکھ لیں۔“

”چلو۔“ کہہ کر میں نے سب کو اشارہ کیا۔

ہم اِدھر اُدھر اسٹالوں اور ان کی رونق کو دیکھتے آگے بڑھنے لگے۔

لوگوں کا رش تھا۔ ہر رنگ و نسل کی عورت اور مرد موجود تھے کچھ ہم سے ٹکراتے اور کچھ سے ہم ٹکرا رہے تھے جب کہ راستہ اتنا چوڑا تھا کہ تین چار بندے با آسانی پیدل چل سکتے تھے۔ آس پاس تازہ فوڈ، گوشت، سبزیاں، پھل، ملبوسات، بیکری، جیولری، ریسٹورنٹ اور کیفے کے اسٹال تھے جو سامان اور گاہکوں سے بھرے ہوئے تھے۔

گروپ کی ایک لڑکی جو شکل میں مناسب تھی مگر ذہانت اس کی آنکھوں میں نظر آ رہی تھی۔ سرجی سمیت میرے سب دوست لڑکیوں کے ساتھ یا لڑکیاں ان کے ساتھ ایک طرح سے شیر و شکر ہو گئے تھے۔ ان کے قہقہے گونج رہے تھے اور سرجی سرشاری کے عالم میں مگر سنجیدگی سے ان کے سوالات پر جوابات دے رہے تھے۔

میں ایک میٹ شاپ کے سامنے کھڑا تھا۔ وہ بھی ساتھ آ کھڑی ہوئی، نظروں میں ایک دوسرے کو ہیلو کہا تو وہ بولی۔ ”یقین نہیں آتا کہ یہ مارکیٹ دو سو سال پرانی ہے۔“

”دو سو سال پہلے تو کھلے میدان میں یہ مارکیٹ لگتی تھی۔ آس پاس کے علاقوں سے لوگ اپنا سامان یہاں لاکر بیچا کرتے تھے۔ کھانے کی اشیاء کے علاوہ مویشی بھی بکتے تھے۔“ میں نے شوکیس میں نفاست سے رکھے گائے کے گوشت کو دیکھ کر کہا۔

وہ حیران ہو کر بولی۔ ”آپ اس کے بارے میں اتنا جانتے ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”آپ بھی کچھ اسٹڈی کر کے آئی ہیں؟“

وہ بولی۔ ”صرف یہ کہ دو سو سال سے زیادہ پرانی مارکیٹ ہے۔“

میں نے اپنا سر ہلایا اور بولا۔ ”جس جگہ کو ہم پرانی مارکیٹ جان کر پھر رہے ہیں، یہ عمارت تو 1968ء میں بنی تھی۔ شروع میں بیس ضرب تیس میٹر کا لکڑی سے بنا بارن ہاؤس ٹائپ جگہ تھی۔ ایک بار آگ لگی تو وہ جل کر خاکستر ہو گیا۔ پھر انہوں نے اینٹوں سے بنی عمارت بنائی، وہ بھی آتش زدگی کا شکار ہو گئی۔ 1845ء میں یہاں سٹی ہال بنا دیا گیا جس میں سوک آفس، کورٹ، جیل وغیرہ بھی تھی۔ یہیں مارکیٹ بھی لگتی تھی۔“

اس نے میری تعریف کی، میں اندر سے خوش ہوا اور پھر زیادہ بولنے لگا۔ ”انیسویں صدی کے شروع میں اس مقام پر غلام بھی بکا کرتے تھے اور مجرموں کو سرِعام پھانسیاں بھی یہیں دی جاتی تھیں مگر اب وہ لارنس مارکیٹ کی تشہیر میں ان باتوں کا ذکر بالکل نہیں کرتے۔“

وہ حیرت زدہ ہو کر میرا منہ دیکھنے لگی۔ اس کی آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ حیرت سے کہنے لگی۔ ”مجھے یقین نہیں آ رہا۔“

میں نے کہا۔ ”کیوں نہیں آ رہا؟ پھانسیاں اور غلاموں کی بولیاں کیا چھپ چھپا کر ہوتی تھیں؟“

”نہیں!“ وہ ابھی تک حیرت اور صدمے میں تھی۔

میں سوچ رہا تھا کہ غلامی تو یورپ میں بھی تھی اور بہت اونچے درجے پر تھی تو پھر وہ لڑکی جس کا نام جولین تھا، اتنی حیرت میں کیوں کھڑی تھی۔ ان ممالک میں یہی غلام اب کئی نسلوں کا سفر طے کر چکے ہیں اور اب ان کی آبادی میں کئی گنا اضافہ بھی ہو گیا ہے۔ گوروں کے آگے وہ چھپے پھرتے سانپ ہیں۔ ایسے سانپ جن سے وہ نفرت تو کر سکتے ہیں مگر انہیں ختم نہیں کر سکتے۔ کیا بے بسی ہے گوری اقوام کی کہ جنہیں وہ اب بھی ذہنی طور پر غلام سمجھتے ہیں، وہی غلام انہیں اب سامنے کھڑے ہو کر نفرت بھری نظروں سے دیکھتے ہیں۔

سیاہ فام لوگوں نے اپنی آبادی میں بے تحاشا اضافہ کیا ہے۔ جس سیاہ فام سے میں نے پوچھا کہ آپ کے کتنے بچے ہیں تو کوئی کہتا ہے دس، بارہ یا سترہ ہیں۔ میں حیران ہو جاتا کہ یہاں تو کم بچے پیدا کرنے کا رواج ہے تو یہ درجن تک کیسے پہنچ گئے۔ ذرا کریدنے پر بتانے لگے کہ بارہ ہیں مگر پانچ عورتوں سے اور پانچوں میں سے کسی سے بھی شادی نہیں کی۔

سیاہ فام لوگوں میں اٹھ بیٹھ کر ان کی طرزِ زندگی کا مطالعہ کیا تو میرے رونگٹے کھڑے ہو گئے۔ ہر پانچ میں چار

نہ کسی جرم میں ملوث ہیں۔ نشہ، اسلحہ، ڈکیتی، چوری تو عام ہے۔ یہ تربیت وہ محلے اور اسکول سے لیتے ہیں۔ سر پر کوئی نگراں نہیں ہے۔ اس لیے یہ بے لگام گھوڑے کی طرح جدھر منہ آتا ہے دوڑے چلے جاتے ہیں۔ جہاں کہیں لڑکی ملی تو تعلقات قائم ہو گئے، دو تین سال رہے جب بھی دل بھر گیا تو بچوں سمیت چھوڑ دیا۔ پھر یہ بھی ہے کہ وہ لڑکی بعد میں اس کے بیٹے یا باپ سے تعلقات استوار کر کے رہ رہی ہے اور چند بچے اس سے بھی پیدا کر لیے۔

یہ کالے جو کل غلام تھے، ایک کراہیت زدہ ماحول میں رہتے ہیں۔ گورے ذہنی طور پر اب بھی ان کے حکمران ہیں۔ امریکا کی جنوبی ریاستوں میں جہاں غلامی شدت سے تھی وہاں عدالتوں کے فیصلے اٹھا کر دیکھیں تو تعصب واضح ہے۔ کوئی سیاہ فام ان ریاستوں میں جرم کر کے پکڑا جاتا تو گورے کی نسبت پانچ گنا زیادہ سزا پاتا تھا۔ میں نے وہ عدالتوں کے ایسے فیصلے دیکھے ہیں جن میں صاف لکھا ہے کہ اپنی سوسائٹی کو بچانے کے لیے انہیں سخت سزائیں دینا لازمی ہیں۔

یہ ممالک جن کی ہم ویڈیو اور تصویریں دیکھ کر للچاتے ہیں، اگر انہیں اندر سے دیکھ لیں تو دنگ رہ جائیں۔ ایک کھوکھلا اور نفرت زدہ معاشرہ جو ٹیکنالوجی پر چل رہا ہے۔ مسکراتے چہروں کے پیچھے خوف زدہ اور لرزتی روحیں ہیں۔ مشرقی روایات اور معاشرے میں جو مسرت ہے، اس کی تو یہاں تصور بھی نہیں مگر ہم بھی تقلید کے قائل ہوتے جا رہے ہیں۔ ان کے تہواروں کو منا کر اپنا چھوٹا اور کھوکھلا اسٹیٹس ظاہر کرنے کی سعی کرتے ہیں۔ پڑھتے نماز ہیں، سجدہ رب کو کرتے ہیں مگر آستینوں میں خواہشوں کے بت چھپے ہیں۔

میں نے جولین سے پوچھا۔ ”غلاموں اور غلامی کے ذکر پر تم کو اتنا صدمہ کیوں پہنچا؟“

الٹا وہ مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”آپ کی نظر میں غلامی کیا ہے؟“

”بحث کرنا چاہتی ہو؟“ میں نے مسکراتے ہوئے کہا۔

وہ سنجیدگی سے بولی۔ ”نہیں سننا چاہتی ہوں۔“

میں نے کہا۔ ”ابھی تو ہم یہ مارکیٹ دیکھنے آئے ہیں۔ شام تک اگر تم لوگ ہمارے ساتھ رہے تو کچھ تبادلہ خیال کر لیں گے۔“

”آئی ایم سوری، لگتا ہے آپ کو اچھا نہیں لگا۔ میں آپ کا وقت خراب کر رہی ہوں؟“ وہ شرمندگی سے بولی۔

”نہیں ایسی کوئی بات نہیں۔ اگلے چند گھنٹے ہم ساتھ ہیں۔ ہم بھوتوں کی نہیں بلکہ زندہ لوگوں کی باتیں کریں گے۔“ میں نے مسکرا کر کہا۔ پھر اس سے پوچھا۔ ”آپ کے مضامین کیا ہیں؟“

وہ بولی۔ ”فلسفہ اور تاریخ۔“

”اور دوسری لڑکیوں کے؟“ میں نے پوچھا۔

وہ ہنس پڑی اور بولی۔ ”مختلف ہیں مگر کسی کا فلسفہ اور تاریخ نہیں ہے۔“

میں نے کہا۔ ”چلیں سامنے میٹ شاپ پر دیکھتے ہیں۔ یہ لوگ صدیوں سے کیا بیچ رہے ہیں۔“

وہ ایک بڑی شاپ کی طرح کا اسٹال تھا۔ آگے بڑا سا کاؤنٹر تھا۔ میٹ کو کٹ کرنے کے جدید طریقوں نے اسے ایک بڑی صنعت بنایا ہے۔ کاؤنٹر میں بیف اور مٹن کے کئی پارچے مومی کاغذ میں لپٹے رکھے تھے۔ وہ کاؤنٹر یعنی شوکیس دراصل ایک فریج تھا۔ اس موسم میں گوشت تو خراب ہونے سے رہا مگر قانون کے تحت ان کو درجہ حرارت کم رکھنا تھا۔

بیف اور مٹن کے علاوہ پورک (سور) کا گوشت بھی تھا مگر وہ علیحدہ رکھا تھا۔ اس جانب میں اس لیے بھی نہ دیکھتا تھا کہ مجھے متلی ہونے لگتی ہے۔ اونٹ اور کینگرو کا گوشت بھی موجود تھا۔

کہیں بیف کے اسٹیک پڑے ہیں، کہیں گوشت کے بڑے بڑے ٹکڑے، کہیں ڈبل روٹی کی طرح کے ٹکڑے جنہیں سلائس کر کے ایک کے اوپر ایک رکھا گیا ہے۔ کہیں بکرے کی چانپیں ہیں جن میں ہڈی ہے اور کچھ چانپیں ہیں جن میں سے ہڈی نکال دی گئی ہے۔ کہیں گوشت کے کیوب کٹے رکھے ہیں اور کہیں لمبے ٹکڑے جیسے جھالریں پڑی ہوں۔ ایک ہی جانور کو کٹنگ ٹیکنالوجی سے کاٹا جاتا ہے اور پھر کئی ایک کوری پروسس کیا جاتا ہے کہ جی کرتا ہے کہ پاکستانیوں کی طرح سب گھر لے جائیں اگر جیب بھری ہو۔

ہمارے ساتھ گاہک کھڑے تھے۔ انہوں نے اسٹیک لیے۔ دکاندار ہسپانوی تھا۔ اس نے وزن کیا اور پھر اسٹیک کو قرینے سے دوسرے مومی کاغذ میں لپیٹا اور پھر ایک بیگ میں رکھ کر گاہکوں کے حوالے کر دیا۔ گوشت کی چربی پہلے سے لگی ہوئی تھی۔ اس لیے ان کے بیچ کوئی جھگڑا ابھی نہ

ہوا۔ یہ بھی نہ تھا کہ دکاندار کے جی میں جو آئے وہ کرے، جانور کے کسی حصے کا گوشت انہیں دے دے، ہر حصے کا گوشت علیحدہ رکھا تھا اور ہر ایک کی قیمت بھی الگ تھی۔ ہمارے ہاں تو لیگ کا گوشت سب سے مہنگا ہوتا ہے اور یہاں سب سے سستا ہے۔

راؤنڈ گوشت پچھلی ران کا تھا اور اسے قیمہ بنا کر دے رہے تھے۔ یہ سب سے سستا تھا۔ مہنگا گوشت پیٹھ کا تھا اور پیٹھ کے پچھلے حصے کی چانپیں سب سے مہنگی تھیں جس کو یہاں سرلائن (Sirlion) کہتے ہیں۔ آگے کی چانپیں جن کو رب (Rib) کہتے ہیں ان کو بھی مختلف انداز سے کاٹ کر مختلف قیمتوں پر بیچ رہے تھے۔ کچھ روسٹ کرنے کے لیے اور کچھ اسٹیک تھے۔ چک (Chuck) دستی اور کندھے کا گوشت تھا جن کی قیمت درمیانی تھی۔ گردن کا گوشت Fore Shank کہلاتا ہے اور وہ اپنی قیمت پر بک رہا تھا۔ اس کے علاوہ بھی اتنی اقسام تھیں کہ نام یاد رکھنا بھی مشکل ہوتا ہے۔ یہی حال بکرے کے گوشت کا تھا۔

میں نے دکاندار سے پوچھا۔ ”آپ گوشت کی درجہ بندی کیسے کرتے ہیں؟“

وہ بولا۔ ”جانور کی عمر کے مطابق اس کی درجہ بندی ہوتی ہے۔ کم عمر زیادہ مہنگا ہوتا ہے۔“ وہ یہ بھی کہہ رہا تھا کہ Quality grade مہنگا ہوتا ہے اور وہ بڑے بڑے ریسٹورنٹ والے لے جاتے ہیں۔ Yeild Grade سستا ہوتا ہے جو ہم گروسری شاپ کو مہیا کرتے ہیں۔

میرے لیے یہ سب چیزیں نئی اور عجیب تھیں۔ میں دلچسپی سے دکاندار سے تفصیل سن رہا تھا۔

جولین پوچھنے لگی۔ ”آپ اتنی تفصیل سے ہر چیز کیوں دیکھ رہے ہیں؟“

میں نے ہنس کر کہا۔ ”بیف اور مٹن کے اتنے زیادہ اقسام کے کٹ میرے لیے نئی چیز ہیں۔ ہم لوگ تو جانور ذبح کر کے لٹکا دیتے ہیں اور بغیر کسی مشین کے چھروں سے وار کر کے سب برابر کر دیتے ہیں۔ آخر میں کلیجی نکال کر اور اپنی پسند کی بوٹیاں چن کر کچلے اور غریب لوگوں میں بانٹ دیتے ہیں۔ قسائی بانٹتا نہیں ہے، وہ فروخت کر دیتا ہے۔“

وہ حیرت اور بے یقینی کے عالم میں کھڑی مجھے دیکھ رہی تھی کہ جیسے میں کوئی انوکھی بات کر رہا ہوں۔

میں نے مسکرا کر پوچھا۔ ”کیا یقین نہیں آ رہا؟“

اپنے سنہری بال ٹھیک کرتے ہوئے ہنس کر بولی۔

”یقین آ رہا ہے۔ کیونکہ مشرق ایک پُراسرار جگہ ہے۔“ بڑی خوب صورتی سے چوٹ کر گئی تھی۔

میں نے پوچھا۔ ”کیا اسکاٹ لینڈ پُراسرار نہیں ہے؟“

وہ بولی۔ ”صرف اتنا کہ ہم ہارر فلمیں اور ٹی وی شو دیکھ کر ذرا دیر کے لیے خوف زدہ ہو کر خوش ہو لیتے ہیں۔“

مجھے جولین دلچسپ لگ رہی تھی اور ساتھ عقل مند بھی۔ ایسی نہ ہوتی تو اپنی سہیلیوں کی مانند سر جی سے جھوٹ سچ اگلوا رہی ہوتی اور میرے ساتھ گائے کا گوشت اور اقسام نہ دیکھ رہی ہوتی۔ اسے ادراک ہو گیا تھا کہ مطیع کی سنائی کہانی ساری گپ نہیں ہے مگر اس میں بہت زیادہ کامیڈی ہے۔

پیچھے مڑ کر دیکھا تو سب خراماں خراماں ہنستے مسکراتے چلے آ رہے تھے۔ سر جی کبھی شرماتے، کبھی خوش ہوتے، کبھی ہاں اور کبھی ناں کرتے نظر آ رہے تھے۔ کوئی لڑکی سوال پوچھتی تو میرے سب ساتھی ایک ایک کر کے جواب دیتے اور پھر زور لگا کر اسے سمجھاتے اور قائل کرتے تھے۔ اب ہر ایک کے پاس جنوں، پریوں اور بھوتوں کی لاتعداد کہانیاں تھیں اور سننے والی اسکاٹش لڑکیاں تھیں۔ وہ اپنی ڈاؤن ٹاؤن ٹورنٹو کی سیر بھول کر انہیں نت نئے خیالوں کی سیر کرا رہے تھے۔

میں اور جولین میٹ شاپ والے سے معلومات لے کر اب ایک بڑے اسٹال پر کھڑے تھے جہاں مچھلیاں اور دوسری سمندری مخلوق برائے فروخت تھیں۔

جولین بولی۔ ”یہ مت کہنا کہ مشرق میں مچھلی یہاں سے بالکل مختلف ہوتی ہے۔“ وہ بات کر کے ہنس پڑی۔

میں نے بھی مسکرا کر سنجیدگی سے کہا۔ ”ہر دریا اور سمندر کی مچھلی دوسرے دریا اور سمندر سے مختلف ہوتی ہے۔“

”وہ کیسے۔“

”سمندر میں جتنی مچھلیاں حضرت انسان کے ہاتھ لگی ہیں وہ پندرہ ہزار ہیں اور دریاؤں میں دس ہزار اقسام کی مچھلیاں پائی جاتی ہیں۔“ یہ کہہ کر میں نے اس سے پوچھا۔ ”اور آپ کو کتنی اقسام سے واسطہ پڑا ہے؟“

وہ بولی۔ ”یہ تو مجھے معلوم نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”پہلے ان کے شوکیسوں میں دیکھتے ہیں کہ یہاں کتنی اقسام ہیں۔“

وہ سر ہلا کر شوکیس کے شیشوں میں جھانکنے لگی۔

کئی اقسام کی مچھلیاں سلائس بنی رکھی تھیں۔ لوگ اور مچھلی کا نام لے کر دو، تین یا زیادہ سلائس کا آرڈر ... کاؤنٹر کے پیچھے ایپرن باندھے لڑکی سلائس تول کر خوب صورتی سے پیک کر دیتی۔ ہر قسم کی مچھلی کی قیمت پر لکھی تھی۔ مچھلی کے علاوہ کریب (Crab) اور جھینگے تھے۔ شرمپ (Shrmp) بھی ڈھیروں کے حساب رکھے تھے۔ بڑا شرمپ جھینگا پراون کہلاتا ہے۔ اتنے جھینگے تھے کہ دیکھنے میں عجیب لگتے تھے۔ شرمپ جتنا بڑا ہو گا اس کی قیمت زیادہ ہو گی۔ آگے ایک ریسٹورنٹ پر ... لگے شرمپ (Smoked shrimp) بک رہے تھے۔ لوگ خرید کر انہیں کچا چبا رہے تھے۔

سب سے انوکھی بات یہ تھی کہ جس طرح ہمارے ہاں مرغی پسند کر کے آپ وہیں ذبح کروا لیتے ہیں اسی طرح بڑے شیشے کے شوکیس میں مچھلیاں تیر رہی تھیں۔ ... ٹینک میں لابسٹر تھے جو زندہ تھے۔ میں تو اپنی گلی ... اکثر یہ آوازیں سنا کرتا تھا تازہ مچھلی تازہ مچھلی۔ اور ... واقعی تازہ بروک، ٹراؤٹ مچھلی تیر رہی تھی۔ آپ سائز ... کریں تو لڑکی جال سے پکڑ کر چند منٹ میں اسے ایک ... میں رکھتی اور پھر چھری سے اس کے ٹکڑے ٹکڑے کر ... گاہک کے ہاتھ میں بیگ تھما کر مسکرانے لگتی۔

... زندہ کریب بھی رکھے تھے۔ آٹھ ٹانگوں والے ... دیکھ کر مجھے مکڑی یاد آ رہی تھی۔ میں حیران تھا کہ اس ... کو کیسے کھاتے ہوں گے۔ جولین بتاتی تھی کہ اس کی ... کی ہڈیوں میں سے گودا نکال کر بڑے شوق سے کھایا ... ہے۔ بعد میں مجھے تجربہ ہوا کہ ہم کسی ریسٹورنٹ میں ... ہیں اور ساتھ والی میز پر ہڈیوں یعنی کریب کی ٹانگوں ... کا ڈھیر پڑے ہیں۔ جس طرح ہم بکرے کی ہڈی سے گودا کھاتے ہیں اسی طرح وہ کریب کی ٹانگوں سے گودا ... مزے مزے سے چسکا لے کر کھا رہے تھے۔

لابسٹر تو بہت ہی شوق سے کھایا جاتا ہے۔ لابسٹر کی ... موٹی ٹانگیں ہوتی ہیں۔ تھوڑا بہت پکا کر اسے بیچ میں ... کاٹنے کی مدد سے گودے کی طرح کا گوشت نکال کر ... ہیں۔ میں نے اپنی زندگی میں بہت تجربے کیے مگر ... پر کوئی تجربہ نہ کیا اور نہ ہی ارادہ ہے۔ کریب اور ... سے میں ابھی تک دور ہوں۔

جولین پوچھنے لگی۔ ”مچھلی تو آپ کے لیے حرام نہیں ہے؟“

”ہر طرح کی مچھلی کو ہم حلال سمجھتے ہیں اور بڑے شوق سے ہڑپ کر جاتے ہیں۔“ میں نے ہنس کر کہا۔

”ہر قسم سے کیا مطلب؟“

میں نے بات بدلی اور کہا۔ ”سمندر کی ہو یا میٹھے پانی کی۔“

شوکیس میں رکھی مچھلیوں کی اقسام کی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولی۔ ”یہ اقسام پاکستان میں ہوتی ہیں یا اس سے مختلف؟“

میں نے نام پڑھے تو تقریباً ایسے تھے جو میں نے پہلے بھی پڑھے ہوئے تھے مگر دیکھ آج رہا تھا۔

بروک، ٹراؤٹ، رینبو ٹراٹ، پرچ، بیس، کریک، کیٹ، فش، لیک، وائٹ فش، سیلمن، رٹیلا پیا، ہیلی بٹ، سمیلٹ اور اس کے علاوہ بھی تھیں۔

یہاں ٹراؤٹ دونوں اقسام کی وافر مقدار میں ہر جگہ دستیاب ہیں مگر یہ زیادہ تر فشری میں یعنی فش فارم میں بڑی کی جاتی ہیں۔ قدرتی طور پر پلی اور فشری میں بڑی ہوئی مچھلی کے ذائقوں میں وہی فرق ہوتا ہے جو دیسی اور برائلر مرغی میں ہوتا ہے۔ یہاں فشری زیادہ تر چھوٹی مچھلیوں یا سمندر کے کسی حصے میں ہوتی ہیں۔

جولین سے میں نے پوچھا۔ ”سنا ہے اسکاٹ لینڈ میں فشنگ بہت ہوتی ہے۔“

دکان کے کاؤنٹر سے ٹیک لگا کر وہ بولی۔ ”وہاں کمرشل اور شوقیہ فشنگ دونوں بہت مقبول ہیں۔ بحر اوقیانوس شمالی اسکاٹ لینڈ کو لگتا ہے اور سمندر کے گہرے پانیوں میں بہت فشنگ ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ جھیلوں اور دریاؤں میں بھی فشنگ ہوتی ہے۔ میں خود بھی کبھار چھٹی کے دن اپنے والدین کے ہمراہ فشنگ کرنے کسی نہ کسی جھیل پر جاتی ہوں۔ میرا وقت جھیل کے درمیان بوٹ پر مچھلی پکڑتے بہت اچھا گزرتا ہے۔“ پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”آپ نے کبھی فشنگ کی ہے؟“

”کی تو ہے مگر مچھلی شاید دو تین بار ہی پکڑی ہوگی۔ نہ تو ہمارے ہاں بوٹس ہوتی ہیں اور نہ ہی جھیلیں ہیں۔ جہاں جھیلیں ہیں وہاں شکار کرنے نہیں دیتے۔ بس دریا کنارے ڈوریاں ڈال کر بیٹھ گئے۔ مچھلی نہ پکڑی مگر کتاب ختم کر لی۔ ہم اس میں بھی خوش ہو جاتے ہیں۔“ میں نے جواب دیا۔

امریکا اور کینیڈا میں مچھلی کا شکار سب سے محبوب آؤٹ ڈور مشغلہ ہے۔ لوگ سیکڑوں میل دور جا کر مچھلی کا شکار کرتے ہیں۔ ایک دوسرے سے بے نیاز پانیوں میں گھسے مچھلی کے لیے پورا پورا دن انتظار کرتے ہیں۔ میرا ایک امریکی دوست ایک بار تیس کلو کی چار فٹ سے بڑی مچھلی پکڑ لایا تھا۔ اس کے ساتھ فوٹو کھنچوا کر فریم کرائے اور ہر ایک سے مہینوں اس کا ذکر کرتا رہا تھا۔

میں ایک بار میامی میں تھا۔ کیوبا کا ایک دوست جو بھاگ کر امریکا آگیا تھا وہ مجھے اپنے گھر لے گیا۔ میں بحری جہاز سے ویسٹ انڈیز کی فوٹوگرافی کرکے واپس آرہا تھا۔ اس دوست کا گھر بہت بڑا تھا۔ وہ مجھے اپنے بیک یارڈ میں لے آیا جہاں ایک بڑا سوئمنگ پول تھا۔ ساتھ گرل رکھی تھی۔ ایک آؤٹ ڈور کیبنٹ تھی جس میں اس نے ہر قسم کی شراب سجائی تھی۔ مجھ سے بولا کہ تمہارے لیے اسپیشل قسم کی شراب لا رکھی ہے۔ میں نے انکار کردیا اور وجہ بھی بتائی۔ کئی اقسام کے پرندے اس نے رکھے تھے۔ چھوٹے چھوٹے لو برڈ تھے۔ کئی رنگوں کے پرندے بہت بھلے لگتے تھے۔ ہر جانب پھول ہی پھول تھے اور کئی رنگوں میں کھلے تھے۔ جنوری کے مہینے میں جہاں امریکا کے دیگر حصے میں برفانی طوفان تھے تو وہاں ہم باہر سنگل شرٹ میں خوشگوار موسم سے لطف اندوز ہورہے تھے۔ میں یہ سارا ذکر اس لیے کررہا ہوں کہ وہاں اس کی بیس فٹ لمبی نئی نکور بوٹ کھڑی تھی۔ مجھے وہ دعوت دے رہا تھا کہ گرمیوں میں میرے ساتھ خلیج میکسیکو میں سمندر کے گہرے پانیوں میں شکار پر چلو۔ تین چار دن کا پروگرام بنا رہا تھا۔ بوٹ میں کمرا تھا جس میں آرام دہ کاؤچز تھیں۔ باتھ روم اور ٹی وی تھا۔ بتا رہا تھا کہ وہ ہر دو ماہ بعد جاتا رہتا ہے اور کچھ دن بعد منوں کے حساب سے مچھلی لے آتا ہے۔

پوچھا کہ بیچتے ہو تو بولا۔ ”نہیں! دوستوں کی پارٹیاں کرتا ہوں۔ گھر والے بھی کھاتے ہیں۔ اسی گرل پر باربی کیو کرتا ہوں اور ہر طرح کی شراب پیتا ہوں۔“

اس نے بتایا کہ میامی میں تقریباً ہر بندہ اپنی بوٹ رکھتا ہے۔ موسم پورا سال یکساں رہتا ہے تو یہ لوگ جو کام بڑی رغبت سے کرتے ہیں وہ سمندر کنارے نہانا ہوتا ہے اور ”ڈیپ اوشین فشنگ“ ہوتی ہے۔ میں دو دن اس کے پاس ٹھہرا تھا۔ اس نے مجھے ہوٹل نہیں جانے دیا اور دونوں دن میں نے فشنگ اور پرندوں کے علاوہ اس کے منہ سے کچھ نہ سنا۔ اس نے لان میں ایک کولڈ روم بھی بنایا ہوا جس میں مچھلی رکھی گئی تھی۔ اس نے مجھے مچھلی کھلائی اور حلفیہ کہتا ہوں کہ اس سے زیادہ بدذائقہ اور پھیکی مچھلی نے کبھی نہیں کھائی ہوگی۔

”میں ٹیونا فش کو فش ہی نہیں مانتی، ٹیونا کو گرائنڈ (پیس کر) بنا کر) کرکے بند ڈبوں میں بیچا جاتا ہے۔ معلوم نہیں لوگ کیوں کھاتے ہیں۔“ جولین بولی۔

میں نے کہا۔ ”مگر ٹیونا دنیا میں سب سے زیادہ پکڑی جاتی ہے۔ سینٹرل اور ساؤتھ امریکا کے مغربی ساحلوں پر تقریباً 13 ملین اسکوائر کلومیٹر کا علاقہ ٹیونا پکڑنے کے لیے مشہور ہے۔“

وہ بولی۔ ”ہمارے ہاں اٹلانٹک اوشن (بحر اوقیانوس) سے بھی بہت زیادہ مچھلی پکڑی جاتی ہے۔ اسکاٹ لینڈ اسے برآمد بھی کرتا ہے۔“

”جتنی مچھلی پکڑی جاتی ہے اس کا تین چوتھائی سے حاصل ہوتا ہے اور پچاس فیصد سمندری مچھلی بحر الکاہل سے حاصل ہوتی ہے۔ امریکا کے علاقے الاسکا سے نیچے اور وہاں سے انڈونیشیا، جاپان، ویت نام اور تھائی لینڈ یہ سمندر لگا ہوا ہے۔ یہاں سے ٹیونا، سیلمن اور میکریل پائی جاتی ہے، بحر اوقیانوس سے تو صرف پندرہ فیصد مچھلی حاصل ہوتی ہے۔“ میں نے اسے مرعوب کرنے کے لیے اپنی معلومات پیش کیں۔

مگر وہ قطعاً مرعوب نہیں ہوئی فرفر بولی۔ ”بحر اوقیانوس جو نارتھ امریکا کو چھوتا ہے وہاں زیادہ تر مچھلی کینیڈا کے صوبے نیوفاؤنڈ لینڈ سے لے کر امریکا کے علاقے نیو انگلینڈ میں پکڑی جاتی ہے۔“ پھر خود ہی کچھ سوچتے ہوئے بولی۔ ”سمندر بھی عجیب ہیں ایک طرف نارتھ امریکا اور یورپ کو چھوتے ہیں اور دوسری جانب وہی سمندر یورپ، آسٹریلیا اور فار ایسٹ کی زمینوں سے جا لگتا ہے۔ مختلف تہذیبوں اور لوگوں کے درمیان سمندر ہی میں جو پل بنے ہیں کاش ہم انسان بھی سمندر کی طرح ہوتے جو مختلف زمینوں پر بسے۔ لوگوں کے دلوں کو جوڑ سکتے۔“

میں کسی عام لڑکی سے نہیں بلکہ ایک یورپین لڑکی سے بات کررہا تھا جس کے مضامین فلسفہ اور تاریخ تھے۔ خوب صورت بات اس نے کی تھی۔ ان لڑکیوں سے کہیں بہتر اور آگے تھی جو بھوت کے افسانے سن کر اب تک کھڑی بھوت بھوت کررہی تھیں۔

میں نے اپنی بات جاری رکھی۔ ”سمندر میں تو محبت کی مچھلیاں ہوتی ہیں جو شاید اسے جوڑنے کا ہنر سکھاتی ہیں۔ رنگ دار۔ قوس قزح کے جتنے رنگ ہیں ان سب کو ترتیب سے ملائیں تو ہزاروں شیڈ بنتے ہیں اور مچھلیاں بھی ہزاروں رنگوں کی ہیں۔ زمین پہ جتنے اقسام کے جانور ہیں تو اس سے زیادہ اقسام کی مچھلیاں ہیں۔ یہ سب سمندروں میں جلترنگ پیدا کرتی ہیں اور اس جلترنگ کی سے محبت کی لہریں نکلتی ہیں جن کی پہنچ میلوں دور تک ہے۔ کوئی مچھلی سانپ کی طرح کی ہے تو کوئی ننھے سے کیڑے کی طرح، کوئی پنکھ کی طرح ہے تو کوئی غبارے کی طرح۔ سرخ، پیلے، نیلے، کاسنی سب رنگ ملائیں تو مچھلیوں کے رنگ بنتے ہیں۔ کچھ پر دھاریاں ہیں تو کچھ پر دھبے ہیں پر پولکا ڈاٹس۔ کوئی مچھلی سات ملی میٹر کی ہے جو دوسروں سے اپنا پیار جیتی ہے اور پھر چالیس فٹ کی شارک ہے جو ایسی محبتیں لے کر ایک براعظم سے دوسرے براعظم تک چلی آتی ہے۔ اتنی بڑی مچھلی کہ جس کا وزن ہاتھی سے بھی دوگنا ہے مگر یہ انسان کے لیے بے ضرر ہے۔“ میں نے یہ کہہ کر اس سے پوچھا۔ ”کیا انسانی دلوں میں اتنی ساری محبتیں موجود ہیں؟“

اس نے انگریزی کا ایک محاورہ بولا جس کا مطلب تھا انسانی دل سمندر سے زیادہ گہرا ہوتا ہے۔ یہ سن کر مجھے سلطان باہو کا کلام یاد آگیا۔ ”دل دریا سمندروں ڈونگے کون دلاں دیا جانے ہو۔“

محاورہ بول کر اس نے اپنی بات آگے بڑھائی۔ ”یہ نہیں کہ کسی عام انسانی دل میں تھوڑی سی برائی نہ ہو۔ سمندر میں ایک کلومیٹر کی گہری تہ میں وہ مچھلیاں پائی جاتی ہیں جن کے دانت آرے کی طرح تیز ہوتے ہیں۔ وہ خونخوار بھی ہوتی ہیں۔“ پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔ ”معلوم ہے وہ کیوں خونخوار ہوتی ہیں؟“

میں نے کہا۔ ”کیا اس لیے کہ وہاں گھپ اندھیرا ہوتا ہے۔ جہاں تک روشنی نہیں پہنچتی تو وہ خونخوار ہوجاتی ہیں۔“

جوش سے بولی۔ ”بالکل ایسی ہی بات ہے اور کچھ جہاں مدھم سی روشنی پہنچتی ہے مگر وہ بھی خطرناک ہوتی ہیں۔ لائن فش جس کا ڈنک کوبرا سے بھی زیادہ زہریلا ہوتا ہے، اس مچھلی کا زہر انسان کو وہیں ہلاک کردیتا ہے مگر روشنی تو پڑتی ہے۔ اگر سمندر ان ہلاکت خیز مچھلیوں کے باوجود محبت بانٹ سکتا ہے تو انسانی دل میں چھپے پیار کو ہم دیکھیں، تاکہ وہاں بھی ایل اور اسٹون فش تلاش کرتے رہیں۔“

میں نے مسکرا کر اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے پوچھا۔ ”محبت کی اتنی ساری باتیں کہاں سے سیکھی ہیں؟“

”مجھے معلوم ہے کہ مشرق کے لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ مغرب میں بسنے والے محبت سے بالکل عاری ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں دل نہیں ہوتا اور وہ صرف اپنی ذات میں گم رہتے ہیں۔“ یہ کہہ کر ایک توقف لیا اور پوچھنے لگی۔ ”ایک بات کہوں اگر تم خفا نہ ہو۔“

”ضرور کم از کم اتنی اچھی باتیں سننے کے بعد تو میں ہرگز خفا نہیں ہوں گا۔“

وہ بولی۔ ”تم لوگ خود تو ترقی نہ کرسکے لہٰذا ہماری ترقی سے جلتے ہو۔ ہم میں عیب ڈھونڈتے ہو، نت نئی کہانیاں ہمارے بارے میں بناتے ہو۔ کچھ نہیں بن پاتا تو یہ دعویٰ کرتے ہو کہ ہمارے ہاں پیار خالص ہوتا ہے۔ ہم یورپ والوں کی طرح مشینیں نہیں جذبات رکھتے ہیں۔ کبھی پراسرار ہونے کا دعویٰ کرکے اپنے آپ کو اونچے درجے پر رکھنے کی کوشش کرتے ہو۔ پھر بھی یورپ آنے کے جتن کرتے رہتے ہو۔ اسی کے خواب دیکھتے ہو۔ اس لیے میں تو اسے کھلی منافقت کہوں گی۔“

میں خفت میں گھرا کھڑا یہ سوچ رہا تھا کہ یہ لڑکی تو الٹا میرے گلے پڑگئی ہے مگر بہت حد تک اس کی باتیں ٹھیک بھی تھیں۔

میں نے اس سے کہا۔ ”یہ باتیں تو ہوتی رہیں گی۔ ذرا مارکیٹ میں گھوم لیتے۔“

وہ مسکرا کر بولی۔ ”مگر مجھے نارتھ امریکا میں غلامی اور غلاموں کے بارے میں ضرور بتانا ہے۔“

میں نے کہا۔ ”ہمارے ساتھی ہم سے آگے نکل گئے ہیں اور جتنا مجھے معلوم ہے وہ ضرور بتاؤں گا۔“

یہ کہہ کر ہم دونوں آگے بڑھے۔ اس طرح کہ برسوں سے ایک دوسرے کو جانتے ہوں۔

ہم ذرا سا دائیں مڑے تو دیکھا کہ سامنے تھوڑا سا آگے میرے تمام دوست جولین کی سہیلیوں کے ساتھ کرسیوں پر بیٹھے ہیں۔ سر جی جو میگی کے ساتھ بیٹھے تھے وہ کبھی شرماتے اور کبھی میگی کو دیکھ کر خوش ہوتے۔ چہرے سے مسرتیں پھوٹ رہی تھیں۔ خان قیصر اور مفتی ہنستے ہوئے لڑکیوں سے کچھ کہہ رہے تھے۔ مطیع ایک لڑکی کو کچھ سمجھا رہا

تھا اور شہباز اپنی باری کے انتظار میں زرد چہرہ لیے بیٹھا مطیع کو گھورے جا رہا تھا۔

سر جی نے مجھے دیکھا تو سٹپٹا گئے جیسے رنگے ہاتھوں میں نے پکڑ لیا ہو۔

میں نے نزدیک پہنچ کر کہا۔ ’’ابھی تو کافی آپ لوگوں نے پی ہے پھر کیوں دوبارہ بیٹھ گئے۔‘‘

ساتھ بیکری کا ایک بڑا اسٹال تھا۔ مطیع اسی جانب اشارہ کرتے ہوئے بولا۔ ’’میگی کو تیسری بار پھر سے بھوک لگا تھا۔ سر جی نے بولا کہ اسے کیک کھلانا ہے۔‘‘

ہم دونوں بھی وہیں بیٹھ گئے۔ میں نے میگی سے پوچھا۔ ’’لگتا ہے کہ سر جی کو اپنی میگی مل گئی ہے؟‘‘

ایک لڑکی ہنس کر بولی۔ ’’سر جی تو کہہ رہے تھے کہ انہیں محسوس ہوتا ہے ان کی میگی کبھی کھوئی بھی نہ تھی۔‘‘

میگی بولی۔ ’’سر جی کے پاس تو بھوت کے علاوہ کئی چڑیلیں بھی ہیں۔ ایک کا دلچسپ قصہ سنایا ہے مگر کچھ ابھی باقی ہیں۔‘‘

میں نے مرعوب ہو کر سر ہلایا اور سر جی سر جھکائے مجھے کن انکھیوں سے دیکھنے لگے۔

بیکری کے ساتھ ایک اسٹال چھوڑ کر کسی ریسٹورنٹ کا اسٹال تھا۔ وہ میرے لیے ایسا منظر تھا کہ ہمیشہ کی طرح میں اپنے بچپن میں پہنچ گیا۔

میں چھوٹا تھا۔ سردیوں میں باورچی خانے کے گرم ماحول میں میری ماں چولہے میں لکڑیاں جلا کر اوپر توا رکھے ہمارے لیے ناشتا بناتی تھی۔ ہر ایک کے لیے پراٹھا بنتا اور چھٹی کے روز میرے لیے ڈشلی بنتی تھی۔ آٹا پانی میں گھول کر اس میں چینی ملانے کے بعد ماں توے پر اسے گھی میں تلتی تھیں۔ آٹے کے محلول کو روٹی کی طرح پھیلا دیتیں، گھی میں آٹا پکتا تو ایک مخصوص خوشبو باورچی خانے میں پھیل جاتی۔ ڈشلی پلٹتے ہوئے ماں کی انگلیاں کبھی کبھار جل جاتی تھیں۔ وہ ساتھ رکھے برتن میں پانی کے اندر انگلیاں ڈبو کر اپنا درد دباتیں اور دوبارہ سے ڈشلی پلٹنے لگتیں کہ کہیں جل نہ جائے۔ میں اور میرا چھوٹا بھائی چولہے کے گرد بیٹھے نظریں توے پر رکھے ہوتے تھے۔ ڈشلی پک جاتی تو میرا صبر بھی لبریز ہو چکا ہوتا تھا۔ ماں ڈشلی اتار کر مجھے دیتیں اور میں کونے میں اس لیے بیٹھ کر کھاتا تاکہ کوئی مجھ سے مانگے نہیں۔

آج میرے سامنے اس ریسٹورنٹ پر ایک چینی لڑکی ہاٹ پلیٹ (یعنی توے) پر وہی ڈشلی تیار کر رہی تھی اور ارد گرد خریدار حیران نظروں سے اس عجیب و غریب روٹی کو پکتے دیکھ رہے تھے۔

میں اٹھ کر اس اسٹال پر گیا، توے پر گھی کی بجائے مکھن تھا۔ چینی لڑکی نے ایپرن پہن رکھا تھا، اس نے ڈشلی کو مکھن میں توے پر سرخ کیا۔ ایک پلیٹ میں رکھا اور اس پر آملیٹ اور پنیر کی تہ لگائی اور پھر پلیٹ کر گاہک کے حوالے کر دی۔

میرے لیے کینیڈا میں یہ ایک نئی چیز تھی۔ میں اپنے دوستوں کے پاس آیا کہ کوئی اس ڈشلی میں دلچسپی لیتا ہو تو میں اس کے لیے بھی آرڈر کر دوں۔ میں نے ارادہ کر لیا تھا کہ ایک پیک بھی کروا لوں گا۔ مفتی سے پوچھا تو وہ بولا۔ ’’لڑکیاں کیا کہیں گی کہ ہم فینسی کیک کی بجائے دیسی روٹی کھا رہے ہیں۔‘‘

سب مفتی سے متفق تھے۔ میں نے لڑکیوں سے کہا۔ ’’میرے دوست تو دلچسپی نہیں رکھتے مگر آپ میں سے کوئی بریڈ (ڈشلی) کھانا چاہے تو بتا سکتا ہے۔‘‘

جولین بولی۔ ’’یہ کوئی خاص بریڈ ہے؟‘‘

میں نے مختصراً سا بتایا تو وہ سب میگی سمیت ڈشلی کھانے کے لیے پُرجوش ہو گئیں۔

اس کی قیمت بھی انتہائی کم تھی یعنی چار ڈالر فی ایک۔

کچھ دیر بعد تمام لڑکیاں اور میں ڈشلی کھا رہے تھے اور میرے ساتھی مجھے گھورتے ہوئے کیک کھا رہے تھے۔

پنیر اور آملیٹ نے اس کا ذائقہ دوبالا کر دیا تھا۔ سب جوش و خروش سے کھانے لگے۔ ایک دوسری لڑکی ساتھ ایک کافی شاپ سے کیپی چینو کافی کا آرڈر دے آئی۔ ایسا سستا اور شاندار کھانا بمشکل ہی ملتا ہے۔

شہباز بول رہا تھا۔ ’’اچھا خاصا میں بھی روٹی اور انڈا کھانا چاہتا تھا مگر خان کے سیاپے سے میں بھی کیک میں پھنس گیا۔‘‘

بیکری اسٹال میں کاؤنٹر پر عجیب و غریب قسم کی روٹیاں رکھی تھیں۔ گول اور بیضوی زیادہ تھیں۔ سائز ان کا ٹینس بال سے لے کر فٹ بال جتنا بڑا تھا۔ کچھ پنیر سے بنی تھیں اور کچھ انڈوں سے کچھ سادہ اور کچھ شیریں، گارلک بریڈ بھی تھی اور ڈرائی فروٹ والی بھی تھیں۔

شوکیس میں کئی اقسام کے کیک رکھے تھے۔ ایک لیمن، اورنج کیک تھا۔ اس پر لیمن اور مالٹے کا رس ڈال کر رکھتے ہیں اور بعد میں کھاتے ہیں۔ ایک گراؤنڈ مارنیز کیک تھا۔ کاؤنٹر کے پیچھے لڑکی مجھے بتا رہی تھی کہ یہ کیک بنانے کے بعد اس پر شراب ڈالی جاتی ہے اور دو دن یہ شراب میں بھیگا رہتا ہے اور تب جا کر ہم اسے بیچتے ہیں۔ اسٹرالین کیک پر وہ آئس کریم ڈال کر دیتے ہیں۔ ہلینڈ کیک کی دو تہیں تھیں اور بیچ میں لڈو جیسے میٹھے دانے رکھے تھے۔ اس کے علاوہ بھی بہت سی اقسام کے کیک تھے اور شکلیں اتنی خوشنما کہ لگتا تھا کہ ڈیکوریشن پیس ہوں۔ ایک کیک تو باربی ڈول (گڑیا) کی شکل کا تھا۔ گڑیا نے گلابی فراک بھی پہن رکھی تھی۔ کارٹون کے جتنے بھی مشہور کردار ہیں، سب کی شکلوں کے کیک بنے رکھے تھے۔ فلوریڈا اورنج کیک پر مالٹے کی قاشیں رکھی تھیں اور وہ کاجو، بادام اور اخروٹ کے ٹکڑوں سے بھرا تھا۔

جولین بھی میرے ہمراہ شوکیس میں جھانک رہی تھی۔ ہم واپس کرسیوں پر بیٹھے تو پوچھنے لگی۔ ’’آپ کو بیکنگ سے بھی دلچسپی ہے؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’نہ میں نے کبھی بیکنگ کی ہے اور نہ ہوتی دیکھی ہے۔‘‘

’’مگر ہر چیز کا جائزہ تو بڑی تفصیل سے لے رہے تھے۔‘‘ وہ بولی۔

میری نے کہا۔ ’’صرف نالج کے لیے۔‘‘

’’سمندروں اور سمندری حیات کے بارے میں تو بہت جانتے ہیں۔ وہ بھی کیا صرف نالج کے لیے؟‘‘ وہ بولی۔

ایک اور لڑکی بولی۔ ’’میں نے سمندری حیات کو بہت پڑھا ہوا ہے۔‘‘ پھر مجھ سے پوچھنے لگی۔ ’’آپ نے وہیل اور ڈولفن فش کا نام تو سنا ہوگا؟‘‘

’’نام تو دونوں کے سنے ہیں، مگر یہ دونوں مچھلیاں نہیں ہیں۔ کیونکہ یہ دونوں اپنے بچوں کو دودھ پلاتی ہیں۔ ان کے علاوہ کوئی سمندری جانور دودھ نہیں پلاتا۔‘‘ میں نے کہا۔

وہی لڑکی بولی۔ ’’میں نے جان بوجھ کر ان کے نام کے ساتھ مچھلی لگایا کہ آپ اس غلطی کو پکڑتے ہیں یا نہیں۔‘‘

میں بولا۔ ’’میں نے غلطی نہیں پکڑی بلکہ تصحیح کی ہے۔‘‘

سر جی بولے۔ ’’ویسے آپ ہر چیز کے بارے میں معلومات کیسے رکھتے ہیں؟‘‘

میں نے کہا۔ ’’پاکستان میں سی ایس ایس کے امتحان کی تیاری کی تھی۔ امتحان میں نہیں بیٹھا مگر پڑھنے کے بعد مختلف چیزوں کے بارے میں معلومات مل گئیں۔‘‘

وہ لڑکی بولی۔ ’’کیا مچھلی کی چار آنکھیں بھی ہوتی ہیں؟‘‘

میں نے مسکرا کر کہا۔ ’’چار نہیں دو ہی ہوتی ہیں۔ Anableps مچھلی کی ہر ایک آنکھ دو حصوں میں تقسیم ہوتی ہے۔ اوپر والا حصہ پانی سے باہر دیکھتا ہے اور نیچے والا حصہ پانی کے اندر۔‘‘

سر جی اور لڑکیاں تالیاں بجانے لگیں۔

میں نے اسی لڑکی سے کہا۔ ’’اگر آپ میرا امتحان لے رہی ہیں تو ایک سوال میں بھی پوچھتا ہوں۔ وہ یہ کہ کون سی مچھلی ہوتی ہے جس کے پر بھی ہوتے ہیں اور پانی کے اوپر پرواز کرتی ہے۔‘‘

وہ سوچنے لگی مگر جواب جولین کی جانب سے آیا کہ وہ Hatchet فش ہوتی ہے جو دس فٹ پانی کے اوپر پرواز کرتی ہے۔

خان نے جولین سے پوچھا۔ ’’وہ کون سی مچھلی ہوتی ہے جس کی تاثیر سب سے گرم ہوتی ہے۔‘‘

وہ سٹپٹا کر بولی۔ ’’اس کا کیا مطلب ہے؟‘‘

میں نے مذاق میں کہا۔ ’’وہ فلیٹ فش کہلاتی ہے۔ اتنی کاہل ہوتی ہے کہ تمام عمر سمندر کی تہ میں ایک ہی سائیڈ پر پڑے پڑے گزار دیتی ہے۔ اس لیے قدرت نے اس کی دونوں آنکھیں دوسری سائیڈ پر بنائی ہوئی ہیں تاکہ جب چاہے وہی دونوں آنکھیں کھول کر آتی جاتی، مچھلیوں کا نظارہ کر سکے۔‘‘

سر جی بولے۔ ’’وہ شہباز کی طرح کاہل اور دل پھینک ہوتی ہے۔‘‘

’’سر جی اگر مجھ سے چھیڑ چھاڑ کی تو سب کے سامنے راز کھول دوں گا کہ نہ تو کوئی بھوت تھا اور نہ کوئی بھتنا اور یہ جو موٹی آپ کو گود میں لیے پھر رہی ہے وہ آپ کو نیچے نہیں اتارے گی بلکہ سیدھا کسی کھولتی کڑاہی میں پھینک دے گی۔‘‘ زرد و افسردہ بیٹھا شہباز اچانک سرخ ہو کر بولا۔

سر جی بات بگڑنے سے بچاتے ہوئے بولے۔ ’’دوستوں میں مذاق تو چلتا رہتا ہے۔ آپ تو شہباز بھائی ہر بات پر غصے میں آ جاتے ہیں۔‘‘

میں نے بات لپیٹی اور سب سے بولا۔ ’’جلدی جلدی

مارکیٹ دیکھ کر باہر نکلتے ہیں۔ مجھے تو لگتا ہے کہ سب سیر و سیاحت پر نہیں بلکہ کسی ٹیسٹ پر آئے ہیں۔"

ہم اٹھے اور دکان دکان گھومنے لگے۔ کہیں کچن کے استعمال کا سامان بک رہا تھا۔ اتنی زیادہ اشیاء جو کسی کچن میں کبھی نہیں سما سکتی تھیں۔ اسٹال سر سے پاؤں تک بھرے تھے۔

سبزی کی دکانوں پر ہر قسم کی سبزی رکھی تھی۔ اگر سبزی ایک ہی قسم کی ہوتی تو گوارا تھا مگر یہاں ایک ہی چیز کئی اقسام، کئی رنگوں اور کتنے ہی نمونوں کی تھیں۔ شملہ مرچ تو شاید دس قسموں کی ہوگی۔ پیاز بھی کئی طرح کئی رنگوں کے تھے۔ ہر دانہ جیسے کئی کئی بار صاف کر کے رکھا تھا۔

پھلوں کے اسٹال بھرے پڑے تھے۔ چیری کئی اقسام کی بچی تھیں۔ کیلے، مالٹے کئی اقسام کے تھے۔ انناس، سیب، آڑو اور انگور اپنی فراوانی اور قسموں کی وجہ سے مجھے حیرت زدہ کر رہے تھے۔

آگے ایک کاؤنٹر بیچ راستے کے لگا تھا۔ وہاں مختلف قسم کے جوس ٹیسٹ کرنے کے لیے رکھے تھے۔ ایک چینی لڑکی چھوٹے چھوٹے گلاسوں میں آپ کو ان کے ذائقے سے روشناس کرا رہی تھی۔ ساتھ ہی ایک بڑا اسٹال تھا جہاں سے آپ اپنی پسند کا جوس خرید سکتے تھے۔ میں نے دیکھا کہ سر جی اپنی میکی کے ہمراہ اسی کاؤنٹر پر کھڑے ہیں۔ دونوں ہنستے ہوئے مختلف جوسز کے ذائقے چکھ رہے تھے۔ میں نے شہباز سے پوچھا۔ "ان کی بات اتنی آگے بڑھ چکی ہے۔"

وہ بولا۔ "سر جی کا بھوت میکی کے سر چڑھ کر بول رہا ہے۔"

آگے چند اسٹال پنیر کے تھے۔ سیکڑوں قسم کے پنیر کی اقسام بچی تھیں۔ اتنی زیادہ چیزوں اور اقسام کی بہتات دیکھ کر اب تو میں نے حیران ہونا ہی چھوڑ دیا تھا۔ آخر اکیلا آدمی کہاں کہاں اور کتنی بار حیران ہو سکتا ہے۔

میکی... پنیر کی اقسام دیکھ رہی تھی۔ دیکھتے ہوئے مطیع میرے پاس آیا اور بولا۔ "یہ میکی بہت کھاتا ہے، دو بار کیک اور ایک وشلی کھا گیا مگر ابھی بھی حسرت سے پنیر کو دیکھ رہا ہے، سر جی تو کم کھاتی ہے۔ دونوں کا گزر بسر کیسے ہوگا؟"

"کیا مطلب؟ کیسا گزر بسر؟" میں نے پوچھا۔

"مجھے لگتا ہے دونوں کو محبت ہو گیا ہے۔ سر جی اسے غلط نظروں سے دیکھتے ہیں اور خود بھی میکی کی جگہ شرماتے ہیں۔ کچھ دیر پہلے میکی بھی سر جی کو بری نظروں سے دیکھ رہا تھا۔"

میں نے کہا۔ "فکر نہ کرو۔ یہ دریا شام تک اتر جائے گا۔"

آگے ایک اسٹال پر چینی لڑکا کھڑا مختلف اقسام کے جام اور مربہ جات بیچ رہا تھا۔ ہر قسم کے پھلوں کے جام اور مربہ جات رکھے تھے۔ کئی ایک شیشے کے مرتبانوں میں تو لگتا تھا کہ جڑی بوٹیوں سے بنی ادویات رکھی ہیں۔ وہ آدھی پنساری کی دکان تھی اور آدھی بیکری تھی۔

میں کھڑا سوچ رہا تھا کہ اس اسٹال پر کس اشیاء کو دیکھوں اور کس کو چھوڑ دوں، کیا چیز نوٹ کروں اور کیا رہنے دوں۔ کس کے بارے میں پوچھوں اور کس کو درگزر کروں۔ کئی قسموں کے تیل بھی بوتلوں میں بند رکھے تھے جن کا معلوم نہیں کیا استعمال ہوگا۔

مطیع مربہ جات وغیرہ دیکھ کر بولا۔ "سوات میں تو میری نانی بہت مربے بناتی تھیں۔ وہی کھا کھا کر تو میرا دماغ کھلا ہے۔"

سر جی بے پروائی سے بولے۔ "مطیع بھائی! کہیں تو استعمال کے لیے خرید لیتے ہیں۔"

پھر اس کے کہنے پر سر جی نے سیب کا مربہ خریدا۔ بیگ مطیع کے حوالے کیا اور سو ڈالر کا نوٹ نکال کر لڑکے کے ہاتھ میں ایسے دیا کہ جیسے کوئی عربی شہزادہ ہو۔ دکاندار نے نوٹ کو کئی بار چیک کیا اور بقایا سر جی کے حوالے کیا۔ سر جی نے بغیر گنے سارے نوٹ اپنی جیب میں ٹھونس لیے اور میکی آنکھیں پھاڑے یہ ساری کارروائی دیکھ رہی تھی۔ سر جی نے مجھ سے کچھ خریدنے کا پوچھا اور میں نے انکار کر دیا۔

مگر پھر انجیر کے جام کے دو جار نسرین کے لیے خریدے۔ مجھے معلوم تھا کہ سعد کو بہت پسند ہیں۔

اوپر والے فلور پر آرٹ گیلری ہے۔ نہ جانے کتنے فنکاروں کی پینٹنگز اور کرافٹ رکھے تھے۔ ٹورنٹو کی تاریخ، ثقافت اور آرٹ کی نمائش ہو رہی تھی۔ کیا خوب صورت طریقہ ہے جس سے یہ اپنے فنکاروں کی حوصلہ افزائی بھی کرتے ہیں اور ساتھ ہی اپنے شہر کی تشہیر بھی اس طرح سیاحوں کو بھی اپنی جانب راغب کر لیتے ہیں۔ ہم گیلری وغیرہ جلدی جلدی اس لیے بھی دیکھ رہے تھے کہ میرے ساتھی یہاں اکتاہٹ کا شکار تھے۔ میکی کے علاوہ دوسری لڑکیاں دلچسپی تو لے رہی تھیں مگر وہ بھی ایک طرح سے ہم سے جڑ گئی تھیں۔ اب ہم کہیں بھی جانا چاہتے یا کہیں نہ جانا

چاہتے تو انہیں کوئی اعتراض نہ تھا۔

لارنس مارکیٹ ایک عجوبہ ہے۔ ان لوگوں کے لیے بہت زیادہ کشش رکھتی ہے جن کو کھانے پینے کا بہت شوق ہو۔ کئی طرح کی اشیاء اور کئی طرح کے ذائقے یہاں ایک چھت تلے سستے داموں ملتے ہیں۔ یہاں آ کر یہ احساس میرے اندر جاگتا تھا کہ شاید دنیا کھانے پینے ہی کے لیے بنی ہے۔ لگتا ہے کہ اللہ نے حضرت انسان کو زمین پر شاید اسی لیے بھیجا ہے کہ جاؤ اور خوب کھاؤ پیو۔ کوئی حساب کتاب نہیں ہوگا بس واپس لوٹ کر آؤ گے تو صرف یہ بتانا کہ کھانے میں کیا کیا رہ گیا ہے، جس نے جتنا زیادہ کھایا پیا ہوگا اسے جنت میں اتنا ہی بڑا درجہ ملے گا۔

سادگی سے ایک ہی اچھا کھانا مل جائے تو یہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے۔ میں ذاتی طور پر کھانے پینے میں زیادہ رغبت نہیں رکھتا، جہاں کسی دعوت میں گیا یا کسی ہوٹل میں، میری بھوک ہی ختم ہو جاتی ہے، اگر زیادہ ڈشیں ہوں۔ کسی بڑے ہوٹل میں کھانے سے زیادہ بہتر مجھے گھروں یا فٹ پاتھ کا کھانا لگتا ہے۔ ذائقے کو تو میں بھی پسند کرتا ہوں مگر اس کے لیے اتنا زیادہ تردد نہیں کرتا۔ ذائقہ پسند نہ ہو تو کھانا چھوڑ دیتا ہوں اور یہ میری بری عادت ہے۔

ہم لارنس مارکیٹ سے نکلے تو میکی کے آس پاس چلتے سر جی سے کسی نے پوچھا۔ "اب کہاں چلنا ہے؟"

تو بڑا سادہ مگر واضح جواب آیا۔ "مجھے کیا معلوم ندیم بھائی ہی بتائیں گے۔"

وہ اب اپنے نقشے اور نوٹس بیگ میں ہمیشہ کے لیے بند کر چکے تھے اور ان کے پاس ایک ہی کھلی کتاب یا ڈکشنری سمجھیں، وہ میکی تھی جس میں ان کے سب الفاظ بھی تھے اور ان سب کے معنی بھی۔

شہباز جھلا کر بولا۔ "سر جی تو میرے خیالوں سے بھی بڑا اسیا ہے۔ مطیع اللہ کی وجہ سے اسے میکی ملی اور اس کی وجہ سے یہ ہمیں نظر انداز کر رہے ہیں۔"

میں نے دیکھا تو سر جی میکی کے پیچھے پیچھے دوڑے چلے جا رہے تھے۔ فطرتاً میکی تیز چلتی ہوگی اور سر جی خراماں خراماں چلنے کے عادی تھے مگر اب انہیں کوئی خاص مجبوری تھی جس کی وجہ سے وہ اپنا بیگ بمشکل اٹھائے بھاگے چلے جا رہے تھے۔

مطیع بولا۔ "عشق ہے ہی بری چیز۔ آدھوں کا بھیجا خراب کرتا ہے اور باقیوں کو رسوا کر دیتا ہے۔"

جرمنی کے شہر لوڈوگز برگ میں کدوؤں سے بنائی گئی کشتیوں کی 14 ویں سالانہ ریس منعقد کی گئی۔ اس ریس کے لیے دیوہیکل کدوؤں کو اندر سے خالی کر کے ان کے خول کو بطور کشتی استعمال کیا جاتا ہے اور اس میں بیٹھ کر چپو چلاتے ہوئے جھیل میں پچاس میٹر کا فاصلہ طے کیا جاتا ہے۔

مرسلہ: بخشی محمد عزیز مے۔ لندن

معروف نعت گو شاعر مظفر وارثی کا انتقال 27 جنوری 2011ء کو ہوا۔ ان کی عمر 77 برس تھی۔ مرحوم نے پسماندگان میں 3 بیٹیاں اور ایک بیٹا چھوڑا ہے۔ کوئی تو ہے جو نظام ہستی چلا رہا ہے، میرا پیمبر عظیم تر ہے، اے خدا، خدا جیسے نعتیہ اور حمدیہ کلام کے خالق مظفر وارثی اسٹیٹ بینک کے ریٹائرڈ آفیسر تھے۔ ان کی 20 کتابیں شائع ہو چکی ہیں، انہوں نے 32 اردو فلموں کے گیت لکھے۔ مرحوم غزلیں اور ایک اخبار میں قطعات بھی لکھتے تھے۔ بعد میں انہوں نے اپنے آپ کو صرف نعت اور حمد تک محدود کر لیا تھا۔ وہ اپنی نعت و حمد کی وجہ سے نہ صرف پاکستان بلکہ بیرون ملک بھی مقبول تھے۔ مظفر وارثی کو تمغۂ حسن کارکردگی سے بھی نوازا گیا۔ مرحوم کے اہل خانہ کے مطابق وہ رعشے کے مریض تھے اور چلنے پھرنے سے قاصر تھے۔ ان کے انتقال پر شاعروں، ادیبوں اور ہر شعبہ زندگی سے تعلق رکھنے والے افراد نے گہرے دکھ اور افسوس کا اظہار کیا اور مرحوم کی مغفرت کے لیے دعا کرتے ہوئے کہا کہ مظفر وارثی کے انتقال سے قوم ایک صاحب طرز شاعر اور حقیقی محب رسولؐ سے محروم ہو گئی ہے۔

مرسلہ: نصیر سیالکوٹی۔ سیالکوٹ

باقی لڑکیاں ہم سے آگے کھڑی شاید ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ سر جی ان کے درمیان کھڑے سستا رہے تھے۔ وہ میکی کے پیچھے دوڑتے دوڑتے تھک گئے تھے۔

خان کہہ رہا تھا۔ "سر جی میکی کے پیچھے جتنا بھی بھاگ لیں اس کی ہوا کو بھی نہیں چھو سکیں گے۔"

شام ابھی نہیں اتری تھی۔ سورج زوال کی منزلوں کی جانب تھا۔ لیک اونٹاریو پاس ہی تھا۔ اس کی وجہ سے ہوا بھیگ کر آ رہی تھی۔ مارکیٹ کے اندر ماحول گرم تھا تو میرا

چھینکنا موقوف ہوگیا تھا۔
ہمارے پیچھے ڈاؤن ٹاؤن کی بلند عمارتیں ہم پر جھکی کھڑی تھیں۔ سامنے مشرقی سمت میں بلند عمارتوں کی جگہ پرانی عمارتیں زیادہ تھیں یہ اولڈ ڈاؤن ٹاؤن تھا۔ ہم لڑکیوں کے قریب پہنچے تو ایک نے پوچھا۔ ''اب کہاں چلنا ہے؟'' مفتی نے میری جانب اشارہ کیا کہ یہی بتائے گا۔ جولین نے مجھے سوالیہ نظروں سے دیکھا تو میں نے کہا۔ ''لارنس ہال کو دیکھتے ہوئے بے اسٹریٹ پر ایٹن سینٹر چلیں گے۔''
ایک اور لڑکی بولی۔ ''ایٹن سینٹر کا ذکر تو ہر گائیڈ بک میں ہے۔ وہاں تو ضرور چلیں گے۔''
جولین میرے قریب آئی اور بولی۔ ''آپ تو پاکستان سے ٹورسٹ آئے ہیں مگر ہر جگہ کا آپ کو علم کیسے ہے؟''
''اس لیے کہ چھ ماہ سے یہاں ہوں، نقشوں کے علاوہ دو بار آکر بھی ڈاؤن ٹاؤن دیکھ چکا ہوں۔'' میں بولا۔
حیرت سے پوچھنے لگی۔ ''چھ ماہ سے ٹورنٹو کی سیاحت کر رہے ہیں؟''
''نہیں! میں تو جاب کرتا ہوں، ٹورسٹ تو میں ہر جگہ ہوتا ہوں۔''
وہ ابھی تک حیرت میں تھی بلکہ سب لڑکیاں حیرت سے ہمیں دیکھ رہی تھیں۔ جولین بولی۔ ''ہم تو سمجھے تھے کہ سرجی صرف یہاں رہتے ہیں اور آپ تمام پاکستان سے یہاں گھومنے آئے ہیں۔''
''ہم سب اپنے آپ کو بھی یہی بتا رہے ہیں کہ سیاح ہیں۔ ندیم نے ہمارا پول کھول دیا... ورنہ ہم سب کو یہی بتا رہے ہیں کہ ہم ٹورسٹ ہیں۔'' خان نے ہنس کر کہا۔
جب ان پر ساری صورتِ حال واضح ہوئی تو انہوں نے اس بات کو خوب انجوائے کیا۔ جولین بولی۔ ''ویسے میرے خیال میں یہ بہت تھرلنگ ہے کہ اپنے ہی شہر میں بھی کبھی اجنبی بن کر گھوما جائے۔''
ہم اسی دوران جارویس روڈ پر شمال سمت کو چلنے لگے، جہاں ایک بلاک دور لارنس ہال تھا۔
میں اور جولین اکٹھے چل رہے تھے۔ سیاحوں کا ہجوم ہمارے ساتھ ساتھ تھا۔ ہر ایک متلاشی نگاہوں سے ارد گرد دیکھ رہا تھا کہ کوئی چیز دیکھنے سے نہ رہ جائے۔
جولین مجھ سے پوچھنے لگی۔ ''یہاں ڈسٹلری ڈسٹرکٹ کہاں پر ہے۔ سنا ہے وہ بھی تاریخی جگہ ہے۔''
میں نے فرسٹ اسٹریٹ پر کھڑے ہو کر دائیں جانب مشرقی سمت میں ہاتھ سے اشارہ کر کے کہا۔ ''چند بلاک دور وہ جگہ ہے جہاں 1832ء سے بیر اور وسکی ڈسٹل کی جا رہی ہے۔'' (یعنی کشید کی جا رہی ہے)۔
وہ بولی۔ ''آپ وہاں جائیں گے؟''
میں نے کہا۔ ''میرے لیے وہاں جانے کی کوئی اہمیت نہیں۔'' پھر اس کی جانب دیکھ کر بولا۔ ''اگر آپ لوگ جانا چاہتے ہیں تو کل چلے جانا۔''
وہ بولی۔ ''آپ لوگ تو کل نہیں آئیں گے؟''
''نہیں سب نے اپنی اپنی جاب پر جانا ہے۔'' میں نے جواب دیا۔
''میں تو سمجھی تھی کہ آپ لوگ بھی ٹورسٹ ہیں۔ اسی لیے سوچا تھا کہ کل اکٹھے سینٹرل آئی لینڈ چلیں گے مگر اب ہمیں اکیلے جانا ہوگا۔'' وہ بولی۔
دراصل چند لمحوں کی رفاقت بھی انسیت پیدا کر دیتی ہے۔ اثر دونوں طرف پڑتا ہے۔ چند گھنٹے کی بات تھی اور پھر ہم سب کہاں اور یہ لوگ کہاں ہوں گے؟ سرجی اور آن کی میگی، دونوں ایک دوسرے کے لیے کوئی خوشگوار یاد ہی رہ جائیں گے۔
میں نے جولین سے کہا۔ ''ہمارے ایک دوست کے فرضی مگر دلچسپ قصے نے ہم سب کو ایک دوسرے کے قریب کر دیا۔ سرجی اور میگی اب ایک دوسرے سے شناساؤں کی طرح مل رہے ہیں۔ ایک جھوٹی داستان خود ایک خوشگوار واقعہ بن گئی ہے۔''
وہ مسکرا کر بولی۔ ''بھوت والی کہانی فرضی تھی؟''
''ہاں فرضی تھی سرجی اور میگی کا تعارف ہی کرانا تھا اس لیے مطیع نے فوراً داستان بنا ڈالی۔'' میں نے جواب دیا۔ ''مگر اپنی سہیلیوں کو مت بتانا۔ ان کی سراسیمگی برقرار رہے تو بہتر ہوگا۔ کچھ انجان کہانیاں وہ بھی بیٹھی کسی کو سنا رہی ہوں گی۔''
''میرے پاس سنانے کو کیا ہوگا؟'' وہ کہہ رہی تھی۔
میں نے ہنس کر کہا۔ ''تم یہ بتانا کہ میرے علاوہ ایک اور بھی تھا جو اپنے دوستوں کو خوش دیکھ کر خوش ہو رہا تھا۔''
وہ خاموش ہوگئی۔
اسے خاموش دیکھ کر میں نے پوچھا۔ ''غلامی کے بارے میں کچھ سنا ہے؟''
میں کچھ بولتا کہ یکا یک بھگدڑ سی مچی۔
(جاری ہے)

ستاروں پہ کمند

منظر امام

کسی نے سچ کہا ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بڑی زرخیز ہے، ہمارے وطن میں صلاحیت و ذہانت کی کمی نہیں ہے تبھی تو یہ نوعمر بچے یورپ و امریکا جاکر وطن عزیز کا نام اونچا کررہے ہیں۔

ان بچوں کا تذکرہ جنہوں نے دنیا کو حیران کردیا ہے

یہ جائزہ ان باہمت اور حوصلہ مند پاکستانی نوجوانوں کا ہے جنہوں نے زندگی کے مختلف شعبوں میں اپنی اعلیٰ کارکردگی کا مظاہرہ کر کے دنیا بھر کو اپنی طرف متوجہ کرلیا ہے اور یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی۔
فیلڈ چاہے کوئی بھی ہو، طب ہو، کمپیوٹر ہو، انجینئرنگ ہو، ہوا بازی ہو، کمپیوٹر گیمز ہوں، زبان دانی ہو، تقریری صلاحیت ہو، کچھ بھی ہو۔ یہ باصلاحیت نوجوان ہر میدان میں اپنی صلاحیت کا لوہا منوا رہے ہیں۔
بدقسمتی یہ ہے کہ ہم نے اپنی ساری توجہ صرف ایک کھیل کرکٹ کی طرف لگا رکھی ہے۔ ان ہی کی خبریں آتی ہیں۔ ان ہی کی فلمیں بنتی ہیں۔ انہی کو کمرشلز میں لیا جاتا ہے۔ ٹی وی چینل ان ہی کو پاکستان کا ہیرو کہتا ہے۔ جبکہ دوسرے شعبے مکمل نظر انداز کر دیے جاتے ہیں اور یہ سراسر زیادتی ہے۔
لیکن یہ نوجوان اس قسم کی پبلسٹی سے بے نیاز ہو کر اپنا کام کیے جا رہے ہیں۔
ہم نے اس مضمون کے ذریعے ان کو متعارف کروانے کی کوشش کی ہے۔ یہ لاکھ بیرونِ ملک مشہور سہی لیکن یہ ان کا حق ہے کہ ہم پاکستانی بھی ان کے بارے میں واقفیت حاصل کریں آئیں۔ اس جائزے کی ابتدا سمیل حسن سے کرتے ہیں۔
یہ باصلاحیت نوجوان 13 فروری 1999ء کو کراچی میں پیدا ہوا۔ اس کا ایک ہی شوق تھا، کمپیوٹر پر گیم کھیلنا۔ اس کے والدین اس کی اس عادت سے نالاں تھے۔ وہ اسے سمجھاتے کہ خدا کے لیے کمپیوٹر کا چکر چھوڑو اور کوئی ڈھنگ کا مشغلہ اختیار کرو لیکن اس پر ایک دھن سوار تھی کہ گیم کو لاسٹ اسٹیج تک کھیلوں گا۔
اس کے والد کا نام سید تطہیر ممتاز ہے اور والدہ کا سیدہ ظل ہما۔ اس کے ایک بڑے بھائی کو بھی کمپیوٹر گیم سے دلچسپی رہی تھی مگر اس کی طرح جنونی نہیں تھا، بس وقت ملا تو کھیل لیا لیکن اس کی تو بات ہی اور تھی وہ کھیلنے بیٹھتا تو کئی کئی گھنٹے گزار دیتا، اس کی ابتدائی تعلیم کراچی ہی میں ہوئی تھی۔ وہ جب صرف سات سال کا تھا تو اس نے ڈوٹا کھیلنا شروع کر دیا تھا۔
ڈوٹا 2۔ کمپیوٹر کا ایک ایسا گیم ہے جس میں ہر مرحلے میں چیلنج ہے اور یہ سنگل پلیئر موڈ کا گیم ہے اسے والو کارپوریشن نے جاری کیا تھا۔

سات سال کی عمر میں سمیل نے اس کھیل میں دلچسپی لینی شروع کی اور اس میں اتنی مہارت حاصل کر لی کہ آج اس کا نام چیمپئنز میں اوّل نمبر پر ہے۔

یہ خاندان 2014ء میں کراچی سے امریکا منتقل ہو



گیا تھا۔ سمیل اس منتقلی سے بہت خوش تھا۔ اسے اُمید تھی کہ یہاں تو وہ کچھ نہ کر سکا مگر امریکا جا کر اس کھیل میں وہ نام پیدا کر لے گا۔ وہ جب کھیلتا تو والدین کی ڈانٹ ضرور پڑتی کیونکہ اس کے والدین کو یہ توقع نہیں تھی کہ یہ کھیل اس کا مستقبل بنا دے گا۔

یہ خاندان روز ماؤنٹ الی نوائے میں جا کر آباد ہوا تھا۔ چھوٹے موٹے کلب میں اس نے اپنی دھاک بندھانی شروع کر دی۔ اس کی خوش قسمتی تھی کہ اسے ایک مشہور کلب ''evil geniuses'' مل گیا۔

اس کے پہلے میچ میں اس کی کارکردگی اتنی اچھی نہیں رہی تھی پھر اس نے جی توڑ کر محنت کی۔

اس کو بریک تھرو اس وقت ملا جب اس نے شنگھائی میں ہونے والی ایشین چیمپین شپ جیت لی اور اسی عمر میں وہ دس لاکھ ڈالر سے زیادہ کمانے والا دنیا کا کم عمر کھلاڑی بن گیا۔

اس کی مقبولیت کا اس سے اندازہ لگالیں کہ مشہور ٹائم میگزین نے اسے دنیا کے متاثر کن نوجوانوں کی فہرست میں شامل کیا تھا۔

کہا جاتا ہے نا کہ کسب کمال کن کہ عزیز جہاں شوی۔ اس وقت وہ کمائی کے لحاظ سے اس گیم میں دنیا کا تیسرا بڑا کھلاڑی ہے۔

اب خود ہی اندازہ لگالیں کہ ہمارے یہاں کتنے لوگ سمیل حسن کو جانتے ہیں۔

اب دوسرے نوجوان کی طرف آجائیں۔

ہارون طارق پاکستانی طالب علم ہے۔ اس نے انٹر نیشنل جنرل سرٹیفکیٹ آف سیکنڈری ایجوکیشن جامع کیمبرج کے عالمی امتحانات میں او اور اے لیول میں 47 اے گریڈ لے کر عالمی ریکارڈ قائم کیا ہے۔

ہارون کی پیدائش 16 مارچ 1984 کو کوہاٹ میں ہوئی۔ اس کے والد آرمی آفیسر ہیں۔ اس نے اپنی زیادہ زندگی کراچی، پشاور اور اسلام آباد میں گزاری۔ اس کی ابتدائی تعلیم آرمی اسکول اور کالج سسٹم پشاور میں ہوئی پھر اسلام آباد جا کر فاربل اسکول میں تعلیم حاصل کی۔

اس کی ذہانت شروع ہی سے اس کے ساتھ رہی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ ہونہار بروا کے چکنے چکنے پات۔ تو وہ شروع ہی سے پڑھائی کا دھنی تھا۔ راتوں کو جاگ جاگ کر اپنی نیند خراب کر کے پڑھتے رہنا اس کا پسندیدہ مشغلہ تھا۔

اس کے والد چونکہ ایک آرمی آفیسر تھے۔ ان کا تبادلہ ہوتا رہتا تھا۔ اسی لیے ہارون نے مختلف شہروں میں تعلیم حاصل کی۔ جیسے کراچی، پنوں عاقل، تربیلہ اور منگلہ وغیرہ لیکن اس کی صلاحیتوں کو جلا پشاور آرمی اسکول جا کر ملی۔ وہیں سے اس نے فیصلہ کیا کہ وہ مختلف عالمی معیار کے امتحانات میں شریک ہو گا اور ایک مقام حاصل کرے گا۔

جس پر کوئی دھن سوار ہو جائے وہ سب کچھ کر گزرتا ہے۔ بس ضرورت سچی لگن اور ان تھک محنت کی ہوتی ہے۔ اس نے وہیں سے g.c.e.ordinary level اور i.g.c.e.international certificate کی تیاریں شروع کر دیں اور ان میں حصہ لے کر خود کو منوالیا اور دنیا کے ذہین ترین طالبعلموں کی صف میں شامل ہو گیا۔

ہارون نے سات ورلڈ ریکارڈز قائم کیے۔

پہلا ریکارڈ: 30 A.in Gce advance level

دوسرا ریکارڈ:۔ 29 a I.g.c.e.

تیسرا ورلڈ ریکارڈ: 28 A ordinary level

چوتھا ورلڈ ریکارڈ: 58A in g.c.e.and I.g.c.e. combined

پانچواں ورلڈ ریکارڈ: 76 A ,camridge international exami nation

چھٹا ورلڈ ریکارڈ: 87 A . G.c.e. advance level

ساتواں ورلڈ ریکارڈ: 40 A g.c.e. advance level

ہارون کی مسلسل کامیابیوں نے پوری دنیا کے میڈیا کی توجہ مبذول کرائی۔ بے شمار اخبارات اور چینلز نے اس کے انٹرویوز لیے۔ خود پاکستان میں بھی اس کو پذیرائی ملی۔

انٹرویوز لینے والے چینلز میں بی بی سی، سی این این، سعودی گزٹ، دی ایشین ٹوڈے۔ جیو نیوز (عالمی) دی نیوز ٹرایب وغیرہ جیسے عالمی چینل شامل ہیں۔ پاکستان کے دنیا نیوز، ڈان نیوز، جیو نیوز اور جیو انٹرٹیمنٹ، پی ٹی وی نیوز، آج، سما، اے آر وائی، اب تک، کیپیٹل، روز، خیبر، اے پلس وغیرہ نے بھی انٹرویو کیے۔

اس سے یہ ظاہر ہوتا ہے کہ ایسا ہرگز نہیں ہے کہ اگر کسی میں صلاحیت ہے تو اس کو نظر انداز کر دیا جائے۔ صلاحیتیں اپنا لوہا منوا ہی لیتی ہیں۔

اور اب ہم آپ کو پاکستان کی پہلی خاتون لڑاکا پائلٹ سے ملواتے ہیں۔ اس بہادر اور ذہین لڑکی نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ پاکستانی عورت بھی کسی سے کم نہیں ہے۔ وہ زندگی کے ہر میدان میں اپنی صلاحیت منوا سکتی ہے۔

لڑاکا پائلٹ ہونا کوئی عام بات نہیں ہے، یہ ایک مشکل اعزاز ہے جس کو مشکل سے حاصل کیا جاتا ہے۔ سخت ترین ٹریننگ، جفاکشی اور بلند حوصلہ، یہ سب اس پیشے کے درکار ہوتے ہیں۔

عائشہ پنجاب کے صوبے بہاولپور میں 24 اگست 1987ء کو پیدا ہوئی تھیں۔ اس کے والد ایک فزیشن تھے۔ ان کے انتقال کے بعد اس گھر کے لوگوں کے لیے زندگی بہت دشوار ہو گئی تھی۔ باپ کی موت کے بعد ہی عائشہ نے یہ فیصلہ کر لیا تھا کہ وہ اپنی زندگی میں مایوس ہو کر نہیں بیٹھے گی۔ کوئی ایسا کام کرے گی کہ اس کی مثالیں دی جائیں۔ یہ اس کی سوچ تھی۔

نیلے آسمان پر اڑتے ہوئے جہاز اسے بہت اچھے لگتے تھے۔ وہ سوچا کرتی تھی کہ کیا وہ خود کوئی جہاز نہیں اڑا سکتی؟ اس نے اپنی ماں سے اپنی اس خواہش کا اظہار کیا کہ وہ پائلٹ بننا چاہتی ہے۔ اس کی خوش قسمتی کہ ماں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور عائشہ نے مطلوبہ معیار مکمل کر کے ائرفورس جوائین کرلیا۔

اب اس کی زندگی کا سب سے اہم موڑ اس کے سامنے تھا۔ اسے اپنی صلاحیت دکھانی تھی ورنہ طعنے سننے پڑتے کہ تم ایک لڑکی ہو۔ ہم نے تو پہلے ہی کہا تھا کہ تم ان چکروں میں نہ پڑو۔ تم کوئی لڑکیوں والے کام تلاش کر لو۔ اسی لیے اس نے اپنے آپ کو اس سخت بھٹی میں جھونک دیا۔

ابتدا میں تو مرد ساتھیوں نے اسے نظر انداز کیا۔ پھر وہ اس کی ہمت اور جذبے کو دیکھ کر اس کا ساتھ دینے لگے۔

وہ ساؤتھ ایشیا کی پہلی خاتون پائلٹ کا اعزاز حاصل کر چکی تھی۔ اس کے باوجود وہ ایک منکسر المزاج لڑکی تھی۔ بے حد رحم دل اور ہمدرد۔ یہ خوبی اسے اپنے مرحوم باپ سے



وراثت میں ملی تھی۔

اس کے والد فاروق صاحب ایک غریب پرور ڈاکٹر تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی میں دعائیں سمیٹی تھیں۔ اسی لیے جب عائشہ کسی کے سامنے اپنے باپ ڈاکٹر فاروق کا نام لیتی تو سامنے والے کی آنکھوں میں آنسو آجاتے۔ وہ ان کی مہربانیاں یاد کر کے افسردہ ہو جاتا تھا۔ عائشہ نے بھی یہ عزم کیا تھا کہ وہ بھی اپنے باپ کے نقشِ قدم پر چلے گی۔

عائشہ کو کبھی اس بات پر احساسِ کمتری نہیں ہوئی کہ وہ ایک عورت ہے اور جنگی طیارہ اڑاتی ہے۔ اس کا کہنا تھا عورت جب پاکستان کی وزیر اعظم بن سکتی ہے ڈاکٹر اور سرجن بن سکتی ہے۔ تو پھر پائلٹ بننے میں کیا رکاوٹ ہے۔

عائشہ جیسی باہمت لڑکی ہی کی جرأت کی وجہ سے آج پاکستان ائرفورس میں چار سو کے قریب خواتین اپنا کردار ادا کر رہی ہیں۔

اب ایک اور نام کی طرف چلتے ہیں۔ یہ نام کسی حد تک پاکستان میں جانا پہچانا ہے۔ یہ اور بات ہے کہ وہ جتنی

پذیرائی اور شہرت کا حقدار ہے۔ اتنی ابھی حاصل نہیں ہوئی۔

علی معین نوازش کی پیدائش 1990ء میں راولپنڈی میں ہوئی۔ وہ ایک ایسے طالب علم ہیں جنہوں نے 21 مضامین میں اے لیول حاصل کیے ہیں جو ایک عالمی ریکارڈ ہے۔ جبکہ بقیہ دو مضامین میں بی اور سی گریڈ حاصل کیا۔



علی معین کے والدین ڈاکٹر ہیں۔ پڑھے لکھے لوگ۔ ان کی خواہش اور تربیت ہی تھی کہ علی نے اتنی کامیابیاں حاصل کرلیں۔

علی نے ان کی خواہشات سے شاید کچھ زیادہ ہی کر دکھایا۔ اس میں علم حاصل کرنے کا جنون تھا۔ اس کو سپورٹ کرنے والوں میں جنگ گروپ بھی تھا جس کے اخبار میں علی نے کالم نگاری شروع کی۔ (ممکن ہے کہ پاکستان میں لوگ اسی لیے علی کو جانتے ہوں)

علی نے سینٹ میری اکیڈمی راولپنڈی اور روٹس اسکول سسٹم سے تعلیم حاصل کی۔

دو ہزار نو میں جب علی نے اے لیول کے 23 مضامین میں عالمی ریکارڈ بنایا تو سب کی توجہ اس کی طرف ہو گئی۔

اس کے مضامین یوں رہے ہیں۔

فزکس، کیمسٹری، بیالوجی، میتھ، ایڈوانس میتھس۔

سوشیالوجی، اردو ادب، ٹریول اور ٹورازم، جنرل فردر میتھ، کمپیوٹر اسٹڈیز، آئی سی ٹی، سائیکلوجی، critical thinking

marine sciences..english language. thinking skills .geography .pure mathematics .general papers...basiness studies..applied geography..general studies and human bialogy ..

ان مضامین سے اندازہ لگالیں کہ علم کی کیا وسعت ہے اور ایک انسان کتنے علوم حاصل کرسکتا ہے۔

علی معین نے ان تمام مضامین میں کمال کی کارکردگی دکھائی اور اپنی ذہانت ثابت کردی۔ عام طور پر ہوتا یہ ہے کہ جو بہت زیادہ اعزازات حاصل کرنے والے طالب علم ہوتے ہیں ان کی نگاہ صرف اپنے مضامین ہی کی طرف ہوتی ہے۔ ان کے یہاں وسعتِ نگاہ نہیں پائی جاتی لیکن علی معین کو اس کے ادبی شوق نے بچالیا۔ ادب کا مطالعہ ذہن کو کھول دیتا ہے اور انسان دور تک دیکھنے اور سمجھنے کی صلاحیت حاصل کرلیتا ہے۔

اتنا ہی نہیں۔ علی معین نے اپنی اسٹڈی کے ساتھ ساتھ زندگی کے سافٹ کارنرز سے بھی اپنا رشتہ ختم نہیں ہونے دیا۔ وہ بہت اچھا گٹارسٹ بھی ہے۔ کرکٹ اور ٹیبل ٹینس بھی کھیل لیتا ہے۔

اس نے جب امریکا کے اعلیٰ معیار کے کالجز اور یونیورسٹی میں اپنے داخلے کی بات کی تو کئی جگہ سے اسے آفرز آئیں۔ اس کی کارکردگی کا ریکارڈ سب کے سامنے تھا۔

اس کی غیر معمولی کامیابیوں نے دنیا بھر کے اخبارات اور چینلز کو اپنی طرف متوجہ کرلیا۔ اس کے انٹرویوز ''ٹائم آن لائن، دی ٹیلیگراف، خلیج ٹائمز، دی انڈیپنڈنٹ میں شائع ہوئے۔ چینلز نے اس کی پذیرائی کی ان میں بی بی سی۔ سی این این، فوکس اور الجزیرہ شامل ہیں۔

علی معین کو کئی اعزازات سے نوازا گیا اور اس کا سب سے بڑا اعزاز صدارتی ایوارڈ برائے حسنِ کارکردگی ہے۔ جو اس وقت کے وزیراعظم یوسف رضا گیلانی نے پیش کیا تھا۔

اس کے علاوہ اور بھی بہت کچھ اس کے کھاتے میں ہے۔ آج کل علی معین جنگ گروپ سے وابستہ ہیں۔

اب خود ہی اندازہ لگالیں کہ ہم نے کتنے ذہین نوجوانوں کو نظر انداز کر رکھا ہے۔ اصل ہیرو یہ لوگ ہیں۔ ہم صرف ایک کھیل کے پیچھے پڑ گئے ہیں۔ مجھے کرکٹ سے کوئی بغض نہیں ہے۔ میں تو صرف یہ چاہتا ہوں کہ ادھر اُدھر بھی نظر دوڑالیں اور بھی شاندار کارنامے انجام دینے والے نوجوان آپ کو مل جائیں گے۔

اب ارفع کریم کی بات ہوجائے۔ بہت ہی دکھ اور افسوس کے ساتھ ایک ایسی پاکستانی لڑکی کا ذکر کہ جس کا نام لیتے ہی طبیعت اداس ہوجاتی ہے۔ شاید ارفع ہی جیسوں کے لیے کہا گیا تھا کہ ''حسرت ان غنچوں پہ ہے جو بن کھلے مرجھا گئے۔''

ارفع کریم کی پیدائش فیصل آباد کے قریب ایک گاؤں رام دیوالی میں 2 فروری 1995ء کو ہوئی تھی۔ ان کے والد عبدالکریم رندھاوا ایک آرمی آفیسر ہیں۔ ارفع نے لاہور گرامر اسکول میں تعلیم حاصل کی اے لیول تک۔ نو برس کی عمر میں ''مائیکرو سافٹ سرٹیفائیڈ پروفیشنل'' کا امتحان پاس کر کے انفارمیشن ٹیکنالوجی کی دنیا میں ایک تہلکہ مچا دیا تھا۔

ارفع نے اس چھوٹی سی عمر میں دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل ہونے کا اعزاز حاصل کرلیا تھا۔

ارفع کریم کے اعزازات۔ مائیکروسافٹ کارپوریشن کی دعوت پر جولائی 2005ء میں امریکا گئی۔ جہاں انہیں دنیا کی کم عمر ترین مائیکروسافٹ پروفیشنل کی سند دی گئی۔

ارفع کا تعارف بل گیٹس سے یہ کہہ کر کرایا گیا کہ یہ پاکستان کا دوسرا روشن چہرہ ہے۔ دوسرا رخ ہے۔ بل گیٹس نے ارفع سے دس منٹ تک ملاقات کی ورنہ وہ شخص کسی کو لفٹ نہیں کرتا۔

دبئی میں انفارمیشن ٹیکنالوجی کے ماہرین کی طرف سے دو ہفتوں کے لیے انہیں مدعو کیا گیا جہاں انہیں مختلف تمغہ جات اور اعزازات دیئے گئے۔

ارفع کریم نے دبئی کے فلائنگ کلب میں صرف دس سال کی عمر میں ایک طیارہ اڑایا اور طیارہ اڑانے کا سرٹیفکیٹ بھی حاصل کرلیا۔



ارفع کریم کو 2005ء میں ''صدارتی ایوارڈ'' ''پرائیڈ آف پرفارمنس'' دیا گیا۔

اس نے مادرِ ملت طلائی تمغہ بھی حاصل کیا۔ سلام پاکستان یوتھ ایوارڈ سے بھی اسے نوازا گیا۔

مائیکروسوفٹ نے 2006ء میں بارسلونا میں ایک انٹرنیشنل کانفرنس منعقد کی جس میں دنیا بھر سے پانچ ہزار مندوبین شریک ہوئے۔ پاکستان سے نمائندگی ارفع کریم نے کی تھی۔

حکومت نے بعد از مرگ لاہور کے ایک پارک اور کراچی کا آئی ٹی سینٹر ارفع کے نام سے منسوب کردیا۔ ان کے گاؤں کو بھی ارفع کریم کا نام دے دیا گیا۔

جنوری دو ہزار بارہ میں ارفع کے نام کا یادگاری ڈاک ٹکٹ جاری کرنے کی منظوری دی گئی۔ ارفع کریم کو 22 دسمبر 2012ء کو مرگی کا دورہ پڑا تھا۔ طبیعت بگڑنے پر انہیں لاہور کے سی ایم ایچ اسپتال میں داخل کرا دیا گیا جہاں وہ کومے کی حالت میں رہی اور 14 جنوری 2012ء کی شب خالقِ حقیقی سے جاملیں۔ اس وقت وہ صرف سولہ برس کی تھی۔ مختصر سی زندگی۔ لیکن کارنامہ ایسا کہ برسوں پر بھاری ہو۔ شاید یہاں یہ بات بالکل صادق معلوم ہوتی ہے، قدرت کسی کو اس وقت تک زندہ رکھتی ہے جب تک وہ اپنی ڈیوٹی نہ پوری کرلے۔ اس نے ادھر اپنا وہ فرض پورا کیا جس کے لیے اسے دنیا میں بھیجا گیا تھا پھر اس کو بلا لیا گیا۔

''آسماں تیری لحد پر شبنم افشانی کرے۔''

اب نائیزہ خان پر بھی بات ہوجائے۔ کتنے لوگ ہوں گے جو اس باصلاحیت آرٹسٹ کو جانتے ہوں گے۔

نائیزہ خان کی پیدائش 1968ء کی ہے۔ اس کا تعلق کراچی سے ہے۔ اس نے فائین آرٹ کے شعبے میں کام کر کے اس فن کے جاننے والوں اور ناقدین کو چونکا دیا ہے۔ اس نے فائین آرٹ کے مختلف شعبوں میں اپنی صلاحیت ثابت کردی ہے۔ جیسے مجسمہ سازی (sclupturing) فوٹوگرافی، پینٹنگ اور پرنٹ میکنگ۔ وغیرہ۔

اس کی ابتدائی تربیت لندن کے رسکن اسکول آف آرٹ میں ہوئی۔ اس کے بعد اس نے آکسفورڈ اور ومبلڈن اسکول آف آرٹ سے تربیت حاصل کی۔ اس کے آرٹ کی نمائش کئی ملکوں میں ہوچکی ہے۔ جیسے پاکستان، نیو یارک، دبئی، ہانگ کانگ، بیروت وغیرہ۔ ہر جگہ اسے سراہا گیا ہے۔



نائیزہ خان کی رہائش اس وقت دو مختلف مقامات پر ہے۔ یعنی لندن اور کراچی۔ اس وقت وہ کراچی یونیورسٹی کے visual art کے شعبے میں سینئر ایڈوائزر ہے۔ اس کے علاوہ وہ انڈس ویلی جیسے مشہور اور مستند ادارے کے بورڈ آف گورنرز کی ممبر بھی ہے۔ اس نے بی ایف اے اسکول آکسفورڈ اور رسکن اسکول آف آرٹ لندن میں

تعلیم حاصل کی ہے۔

اس کے فن کی نمائشوں کی فہرست بہت طویل ہے۔ مختصر یہ کہ اس کے فن کو بین الاقوامی سطح پر سراہا گیا ہے۔

اس کو حاصل ہونے والے اعزازات کی فہرست بھی خاصی طویل ہے۔ جیسے 2002ء میں پہلا لکس ایکسی لینسی ایوارڈ حاصل کیا۔ 2003ء میں اٹلی سے ایوارڈ حاصل کیا جس کا نام پریمیو سوزارا ایوارڈ ہے۔ 2006ء میں بھارت بھون ایوارڈ حاصل کیا۔ 2006ء میں ٹی وی ون کی طرف سے women strenght ایوارڈ حاصل کیا۔ 2011ء میں پاکستان لیکچر سیریز ایوارڈ دیا گیا۔

2013ء پرنس کلاوس ایوارڈ۔ آرٹ سے دلچسپی رکھنے والے جانتے ہیں کہ آرٹ کی دنیا میں اس ایوارڈ کی کتنی اہمیت ہے۔

ہالینڈ کا فائین آرٹ ایوارڈ۔ تہذیب فاؤنڈیشن کا ایوارڈ۔

اس کی صلاحیتیں... دوسرے میدان میں بھی سامنے آتی رہی ہیں۔ وہ دنیا کے کئی تعلیمی درس گاہوں میں آرٹ کے موضوع پر لیکچرز بھی دیتی رہی ہے۔

مہک گل بھی ایک ایسا نام ہے جس پر ہم فخر کر سکتے ہیں۔

بہت چھوٹی سی عمر ہے اس کی لیکن اس نے ایک مشکل گیم میں اپنے ذہن کا ایسا استعمال کیا کہ دیکھنے والے اس کی مہارت دیکھ کر حیران رہ گئے۔ وہ کھیل ہے شطرنج۔ خالص دماغ کا کھیل۔ اس میں بے پناہ ذہانت کی ضرورت ہوتی ہے۔ اس کے علاوہ قوتِ فیصلہ کا بھی کمال ہوتا ہے۔

مہک گل نے صرف سات سال کی عمر میں یہ کھیل شروع کیا تھا۔ اس کی تربیت اس کے والد نے اس وقت شروع کی جب انہوں نے دیکھا کہ مہک شطرنج کے کھیل کو دیکھا کرتی ہے اور اس میں دلچسپی لیتی ہے تو انہوں نے مہک کو یہ کھیل سکھانا شروع کر دیا کیوں کہ وہ خود بھی شطرنج کے بہت اچھے کھلاڑی ہیں۔

مہک گل نے صرف سات سال کی عمر میں شطرنج کے کھیل میں اپنی مہارت دکھانی شروع کر دی تھی۔

اس نے شطرنج کے عالمی مقابلے میں ویمن کینڈیڈیٹ کا ٹائیٹل حاصل کر لیا تھا۔ اس وقت اس کی عمر صرف 12 سال تھی۔ یہ مقابلہ استنبول میں ہوا تھا۔ جہاں اسے دنیا کی کم عمر ترین شاطر کا خطاب دیا گیا۔ اس سے پہلے اس نے پنجاب چیس مقابلے میں تیسری اور پانچویں پوزیشن حاصل کی تھی۔

آذربائی جان میں ہونے والے مقابلے میں اس نے گیارہ کھیلوں میں سے چھ میں کامیابی حاصل کر لی۔ لعل ماسٹر چیس ٹورنامنٹ میں اس نے تیسری پوزیشن حاصل کی تھی۔ یہ مقابلہ 2016ء میں ہوا تھا۔

شطرنج جیسے کھیل میں اتنی کامیابیاں حیرت کی بات ہے۔ 2012ء میں اسے عالمی مقابلے میں شرکت کا موقع دیا گیا۔ یہاں بھی اس کی کارکردگی شاندار رہی۔

مہک گل اس وقت تیرہ یا چودہ برس کی ہے اور اس کی کامیابیوں کا سفر جاری ہے۔ اُمید ہے کہ یہ لڑکی شطرنج کے عالمی مقابلے کا ٹائیٹل پاکستان لے آئے گی۔

اندازہ لگالیں کہ پاکستان میں صرف کرکٹ ہی نہیں ہے بلکہ اور بھی بہت کچھ ہے اور بھی ایسے باصلاحیت نوجوان لڑکے اور لڑکیاں موجود ہیں۔ جنہوں نے یہ ثابت کر دیا ہے کہ ذہانت کے لحاظ سے پاکستان ایک زرخیز ملک ہے۔

مہک گل کا ایک عالمی ریکارڈ اور بھی ہے۔ اس نے صرف پینتالیس سیکنڈ میں چیس کی میز ترتیب دے دی تھی۔

مہک کے ذکر کے ساتھ اگر شطرنج کی تاریخ بھی بتا دی جائے تو پڑھنے والوں کی دلچسپی اور بڑھ جائے گی۔

یہ کھیل ہندوستان میں ایجاد ہوا تھا۔ یہ عہد گپتا خاندان کا تھا۔ یعنی ساڑھے تین ہزار سال پہلے۔

سیزا نام کے ایک ماہر نے یہ کھیل ایجاد کیا اور بادشاہ کے پاس پہنچ گیا۔ بادشاہ اس کھیل کو دیکھ کر بہت خوش ہوا۔ اس نے دریافت کیا "مانگو۔ تمہیں کیا چاہیے؟"

سیزا نے کہا۔" جناب۔ آپ چاول کا ایک دانہ پہلے دن شطرنج کے ایک خانے میں رکھ دیں۔ دوسرے دن اس مقدار کو دگنا کر دیں۔ یعنی دوسرے خانے میں دو دانے۔ تیسرے دن تیسرے خانے میں دو کا دگنا یعنی چار۔ اسی طرح بڑھاتے چلے جائیں۔ قارئین یہاں سے وہ کھیل ایجاد ہوا۔ جو مائیکروسوفٹ جیسی کمپنی کی بنیاد بنا۔ بل گیٹس کے اندازے

کے مطابق اس طرح ایک کے آگے انیس صفر لگا دیں۔ یعنی 10000000000000000000 یعنی گنتی ختم ہو جائے گی۔

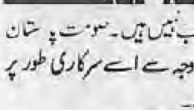
تو یہ ہوتی ہے ذہانت۔ اور ایسے ذہانت کے کھیل پر مہک گل کو جو مہارت حاصل ہے۔ اس کے لیے ایک ہی دعا مانگی جاسکتی ہے کہ خدا نظر بد سے بچائے۔

نمیرہ سلیم پہلی پاکستانی خلا باز ہے۔ جس کو اسپیس میں بھیجا گیا۔

ہوسکتا ہے کہ اس کے بعد اور بھی لوگ سامنے آئیں لیکن جو دو اعزازات اس کے پاس ہیں وہ اس سے کوئی چھین نہیں سکتا۔

نمبر ایک یہ کہ وہ پہلی پاکستانی خلا باز ہے اور دوسرا اعزاز یہ ہے کہ وہ پہلی پاکستانی خاتون ہے جس نے 2007ء میں قطب جنوبی اور 2008ء میں قطب شمالی کی مہم سر کی تھی۔ اس کے علاوہ وہ پہلی پاکستانی ہے جس نے ہمالیہ کی بلند ترین چوٹی سے اسکائی ڈائیو کا مظاہرہ کیا۔

نمیرہ کی پیدائش 1975ء میں کراچی میں ہوئی۔ اس کو ابتدا ہی سے خلابازی کے سبجیکٹ سے دلچسپی تھی۔ آسمان اس کا شوق تھا اور اس کی جستجو کا مرکز بھی۔ ستارے اسے



اپنی جانب متوجہ کرتے تھے۔ چاند اس کو اپنی طرف بلایا کرتا تھا۔ کالج اور یونیورسٹی میں وہ "اسٹرونومی کلب پاکستان" کی سرگرم رکن رہی ہے۔ خلائی سفر کے لیے اس کا انتخاب ڈھائی ہزار اُمیدواروں میں سے ہوا تھا۔

یہ اتفاق ہے کہ اس کی زندگی کے زیادہ حالات دست یاب نہیں ہیں۔ حکومت پاکستان نے اس کے شاندار ریکارڈ کی وجہ سے اسے سرکاری طور پر پاکستان کی پہلی خلا باز قرار دیا ہے۔

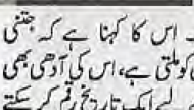
نمیرہ سلیم 1997ء سے مناکو کی معزز شہری ہے۔ اس نے کولمبیا یونیورسٹی سے انٹرنیشنل افیئر میں ڈگری حاصل کی اور اپنی کوششوں سے پاکستان اور مناکو کے درمیان ایک مضبوط رابطے کا ذریعہ بن گئی۔

اس نے خلابازی کی تربیت "nastar" سینٹر امریکا سے حاصل کی۔ اس نے 2008ء میں سرٹیفکیٹ حاصل کر لیا تھا۔ یہ کسی پاکستانی کے لیے بہت بڑا اعزاز تھا۔ اس نے اپنا یہ سرٹیفکیٹ جنرل پرویز مشرف کو پیش کیا تھا۔ اسی کی کوششوں سے مناکو میں پاکستان کا سفارت خانہ قائم ہوا تھا۔ 23 مارچ 2011ء کو پاکستان کے سابق صدر آصف علی زرداری نے نمیرہ کو "تمغۂ امتیاز" سے نوازا تھا۔

شوق کے ساتھ اگر لگن بھی ہو تو کام بن ہی جاتا ہے۔ سعد علی کا شوق گاڑیاں تھیں۔ اس کے خوابوں میں بھی گاڑیاں تھیں۔ نئی چمکتی ہوئی گاڑیاں جن کی رفتار ہواؤں سے بھی زیادہ تیز ہوتی ہیں۔ وہ ہمیشہ سے خواب دیکھا کرتا تھا کہ وہ فارمولا ون میں حصہ لے رہا ہے۔ فارمولا ون دنیا بھر میں تیز رفتاری کا سب سے بڑا گیم ہے۔ اس میں دنیا بھر کے ریسر حصہ لے کر اپنی مہارت کا اظہار کرتے ہیں۔ سعد علی فارمولا ون میں حصہ لینے والا اب تک کا واحد پاکستانی نوجوان ہے۔

فارمولا ون یک نشستی آٹو ریسنگ کی سب سے مقبول کلاس ہے۔ یہ ریس پوری دنیا میں ہوا کرتی ہے۔ اس میں خاص قسم کی تیز رفتار گاڑیاں استعمال کی جاتی ہیں۔ اس کے چیمپین عام طور پر یورپ اور امریکا کے نوجوان ہوا کرتے ہیں۔ اس ریس کو F 1 بھی کہا جاتا ہے۔

اس ریس میں پاکستان سے اب تک کسی کھلاڑی نے



حصہ نہیں لیا تھا۔ سعد علی نے پہلی بار 2006ء میں اس ریس میں حصہ لیا اور تیسری پوزیشن حاصل کر لی۔ کسی کی ہمت افزائی اور حوصلہ افزائی کے بغیر۔

سعد علی کو اس بات کا شکوہ ہے کہ پاکستان میں کھیلوں کے حصے کا سارا پیسا کرکٹ میں چلا جاتا ہے۔ اس کا کہنا ہے کہ جتنی facilities کرکٹ والوں کو ملتی ہے، اس کی آدھی بھی ہمیں ملے تو ہم اپنے ملک کے لیے ایک تاریخ رقم کر سکتے ہیں۔

اس نے بتایا کہ یہ ایک مہنگا شوق ہے۔ اس میں عام گاڑیاں استعمال نہیں ہوتیں، گاڑیاں بنانی پڑتی ہیں۔ اس کے علاوہ ایک رکاوٹ یہ بھی ہے کہ پورے ملک میں کہیں بھی ایسا ٹریک نہیں ہے کہ جہاں پریکٹس کی جائے۔ اوندھے سیدھے

راستوں پر گاڑیاں چلانی پڑتی ہیں۔
اس کا عزم ہے کہ وہ formula 3...gp 3 awr gp 2 کیٹیگری میں حصہ لے گا۔ اس نے 2014ء میں ابوظہبی میں ہونے والی گلف 1000 سیریز میں حصہ لے کر کامیابی حاصل کی۔
اس کا کہنا ہے کہ یہ ایسا گیم ہے، جس میں خطرے بہت ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ کوئی اس گیم کو اسپانسر بھی نہیں کرتا۔
ایک انٹرویو میں اس نے کہا تھا کہ رفتار میری کمزوری ہے لیکن اسی کمزوری کو طاقت بنا کر مجھے دنیا کے سامنے پیش کرنا ہے۔
لاریب عطا: اب ذکر ہے ایک ایسی باصلاحیت لڑکی کا جس نے ایک مختلف فیلڈ میں کام کیا اور یہ ثابت کر دیا کہ پاکستانی لڑکی سب کچھ کر سکتی ہے۔ کوئی بھی شعبہ ہو۔ کوئی بھی میدان ہو۔ اس کی صلاحیتیں اس کو اوروں سے ممتاز کرتی رہیں گی۔
لاریب عطا نے جس فیلڈ میں اپنی موجودگی ظاہر کی اور اپنے ہونے کا ثبوت دیا، وہ فیلڈ ہے۔ visual effects کی۔
اس کی پیدائش لاہور کی ہے۔ اس کے والد عطا اللہ خان عیسیٰ خیلوی ہیں۔ لاریب کی وجہ شہرت ہالی ووڈ کی فلموں میں visual effects کی ہے۔ اس نے اس مشکل فن یا ہنر میں اپنی کارکردگی اس طرح ظاہر کی کہ ہالی ووڈ کی کئی مشہور فلموں میں اس نے visual effects دیئے۔ جس کا اردو ترجمہ بصری تاثرات ہے۔ چند مشہور فلموں کے نام یہ ہیں۔

10000 B C ....the chronicle of narnia.....prince of persia ...God zila and x man ...Days of future past.

ممکن ہے کہ آپ میں سے بہت سوں نے ان فلموں کو دیکھا ہو اور تعریف کر رہے ہوں کہ واہ کیا بصری تاثرات ہیں لیکن کتنوں کو معلوم ہوگا کہ یہ کمال ایک پاکستانی لڑکی کا ہے۔
عطا لاریب کے حوالے سے ایک دلچسپ بات یہ بھی ہے کہ اس کے والد عطا اللہ خان نیازی پاکستان کے ایک مشہور گلوکار ہیں جن کی آواز پاکستان کے ہر شہر میں گونجا کرتی ہے۔ انہوں نے اپنی بیٹی کو اس مشکل فن کی ٹریننگ دلوائی اور اس قابل کیا کہ آج وہ ہالی ووڈ میں اپنے جوہر دکھا رہی ہے۔
لاریب پاکستان کی پہلی بصری تاثرات کی آرٹسٹ ہے۔ وہ بی بی سی ٹیلی ویژن سینٹر میں بھی کام کر چکی ہے۔
اس نے اپنے باپ کی شہرت کا کوئی فائدہ نہیں اٹھایا بلکہ اپنے لیے ایک نئی راہ تلاش کر لی اور وہ اس راہ کی ایک کامیاب مسافر ہے۔
فاطمہ خلود ضیا: کیا آپ نے اس بچی کا نام سنا ہے؟ چلیں ہم بتاتے ہیں کہ فاطمہ کیا ہے۔
دنیا بھر میں ذہانت کو جانچنے کا ایک ٹیسٹ ہوا کرتا ہے جس کو mensa test کہتے ہیں۔ فاطمہ کے والدین



نے اپنی بچی کی ذہانت کو دیکھتے ہوئے اس کا نام اس ٹیسٹ میں شامل کرا دیا اور حیرت انگیز طور پر فاطمہ نے یہ ٹیسٹ پاس کر لیا۔ اس طرح اسے دنیا کے ذہین ترین افراد میں شامل کر لیا گیا۔
اس ٹیسٹ کو پاس کرنے کے وقت فاطمہ کی عمر تھی چھ سال، جی ہاں، صرف چھ سال، اب کون کہہ سکتا ہے کہ پاکستان میں ٹیلنٹ کی کمی ہے؟
فاطمہ ابھی ابتدائی کلاس کی طالبہ ہے لیکن اس کی ذہانت اسے کہیں آگے لے جا رہی ہے۔ وہ کہانیاں لکھتی ہے۔ پینٹنگ کرتی ہے اور خلا باز بننے کے خواب دیکھتی ہے۔
یہ چند نام ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان ذہین ترین افراد کی بھرپور حوصلہ افزائی کی جائے تاکہ پوری دنیا میں پاکستان کا امیج بہتر ہو سکے۔



آدم خور

انجم فارق ساحلی

انسان اور درندوں میں مقابلہ ازل سے جاری ہے۔ جسے موقع ملا اس نے مقابل کو پچھاڑ دیا۔ ابتدائی دور میں درندوں کا پلہ بھاری ہوتا تھا لیکن حضرتِ انسان کے پاس عقل زیادہ تھی۔ انہوں نے درندوں کو پچھاڑنے کے لیے نت نئے ہتھیار بنائے اور انسان کا پلہ بھاری ہو گیا۔ اب وہ درندوں سے اپنی حفاظت کے لیے مقابلہ نہیں کرتا بلکہ انہیں صفحہ ہستی سے مٹانے کے لیے مقابلہ کرتا ہے۔ اس مقابلے کو شکار کا نام دے دیا۔ شکار کی سنسنی خیزی میں اس وقت اضافہ ہو جاتا جب شیر آدم خور ہو۔

پاکستان کے معروف شکاری کی داستانِ شکار

ہمالیہ کے دامن میں ہماری رہائش گاہ سے اٹھارہ میل دور پہاڑیوں کا ایک سلسلہ ہے جو مشرق و مغرب میں پھیلا ہوا ہے۔ اس سلسلے کی پہاڑیاں کوئی نو ہزار فٹ بلند ہیں۔ مشرقی پہاڑیوں میں، "جو" کی فصل خوب ہوتی ہے۔ دور دور تک کھیت لہراتے نظر آتے ہیں۔ کھیتوں کے اختتام پر پہاڑیاں ایک دم خطرناک ڈھلوان کی صورت میں دریائے ... تک چلی جاتی ہیں۔
ایک دن قریبی گاؤں کی چند عورتیں اور لڑکیاں ان پہاڑیوں پر اپنے مویشیوں کے لیے بطور چارا جو کے پودے کاٹ رہی تھیں کہ اچانک انہیں ایک شیر دکھائی دیا اور ان میں بھگدڑ مچی ایک عورت کا پاؤں پھسل گیا اور وہ نیچے کھڈ میں جا گری۔ عورتوں کی چیخ و پکار سے گھبرا کر شیر جس خاموشی سے آیا تھا اسی طرح غائب ہو گیا۔ شیر کے جانے پر جب عورتوں کے حواس درست ہوئے اور وہ دوبارہ جمع ہوئیں تو انہوں نے دیکھا کہ ان کی ساتھی نیچے کھڈ میں گری کراہ رہی تھی۔
نیچے جا کر دیکھا تو وہ بری طرح زخمی تھی۔ وہ اٹھ نہیں سکتی تھی۔ کھڈ زیادہ گہرا نہیں تھا پھر بھی اس عورت کو نکالنا آسان نہیں تھا۔ انہوں نے فیصلہ کیا کہ گاؤں سے مردوں کو بلا لیا جائے لیکن ان عورتوں میں سے کوئی بھی اکیلے جانے پر تیار نہ تھی اور نہ کوئی وہاں ٹھہرنے پر رضامند تھی۔

انہوں نے اس عورت سے کہا کہ وہ سب مردوں کو بلانے کے لیے واپس گاؤں جا رہی ہیں۔ زخمی عورت نے التجا کی کہ اسے تنہا چھوڑ کر نہ جایا جائے۔ آخر ایک سولہ سالہ لڑکی رضا کارانہ طور پر اس کے پاس ٹھہرنے کے لیے تیار ہو گئی۔ باقی عورتیں گاؤں کی سمت چل پڑیں اور وہ لڑکی چٹانوں پر سے ہوتی ہوئی زخمی عورت کے قریب آ گئی مگر اب بھی دونوں کے درمیان تھوڑا سا فاصلہ تھا۔ لڑکی اپنی سمجھ کے مطابق زخمی عورت کو تسلیاں دیتی رہی۔ گاؤں وہاں سے چار میل دور تھا۔ دونوں عورتیں وہاں بیٹھی اندازہ کرتی رہیں کہ عورتوں کو گاؤں پہنچنے میں کتنی دیر لگے گی اور کتنی دیر بعد مردان کی مدد کے لیے وہاں پہنچ جائیں گے۔ اس خوف کے تحت کہ کہیں شیر قرب و جوار ہی میں نہ ہو۔ وہ سرگوشی کے عالم میں باتیں کر رہی تھیں۔

یکا یک عورت کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ لڑکی اس کے چہرے پر خوف دیکھ کر اس طرف دیکھنے لگی جدھر عورت دیکھ رہی تھی۔ اس نے منہ موڑ کر دیکھا تو اس کے کندھے والی چٹان پر شیر کھڑا دونوں کو دیکھ رہا تھا۔

جب عورتیں گاؤں میں پہنچیں تو میرا یعنی سید مقصود علی کا ایک پرانا دوست موتی سنگھ اپنی بیمار لڑکی کو دیکھنے وہاں آیا ہوا تھا۔ وہ بہادر اور دلیر تھا چنانچہ وہ امدادی پارٹی کا سربراہ بن گیا۔ جائے حادثہ پر جا کر انہوں نے چٹان کے کنارے کھڑے ہو کر نیچے دیکھا تو زخمی عورت غشی کی حالت میں کھڈ میں پڑی تھی اور اس کے قریب ایک دوسری چٹان پر خون بکھرا ہوا تھا۔

زخمی عورت کو اٹھا کر گاؤں لے جایا گیا اور جب اسے ہوش آیا تو اس نے پوری کہانی سنائی۔ یہ کہانی سن کر موتی سنگھ میری طرف چل پڑا۔ میری رہائش اس وقت اس گاؤں سے اٹھارہ میل کے فاصلے پر بنے ڈاک بنگلے میں تھی۔ وہ میرے پاس پہنچا سارا واقعہ سنا چکا تو میں نے اس سے کہا کہ وہ رات آرام کرے، صبح ہم گاؤں کی طرف چل پڑیں گے لیکن وہ میری تجویز سے متفق نہ ہوا اور مجھے اسی وقت اس کے ساتھ چلنا پڑا۔ موتی سنگھ کی عمر ساٹھ برس تھی۔ اتنا لمبا سفر طے کرنے کے باوجود اس کے چہرے پر تھکاوٹ کے آثار نمایاں نہ تھے اور وہ دوبارہ سفر کرنے کو تیار تھا۔

لڑکی کے لیے میں کچھ نہیں کر سکتا تھا۔ چوبیس گھنٹے سے زیادہ وقت گزر چکا تھا۔ اس وقت تک چند ہڈیوں کے سوا اس بہادر لڑکی کا کچھ نہ بچا ہوگا۔ یہ اس شیر کی پہلی انسانی خوراک تھی۔ میں نے وہاں پہنچ کر اسے ڈھونڈنے کی بہت کوشش کی مگر وہ نہ ملا۔ شاید وہ موسم سرما گزارنے ''کوسی وادی'' میں چلا گیا تھا۔ اطلاعات کے مطابق راستے میں وہ مزید انسانی شکار کرتا گیا تھا۔ اس نے محکمہ تعمیرات عامہ کے دو ملازم اور دستور ساز اسمبلی کے ایک ممبر کی بہو کا بھی شکار کر لیا تھا۔ میں واپس آ گیا تھا لیکن جونہی موسم گرما آیا شیر بھی وہیں چلا آیا۔ مجھے اطلاع ملی تو میں نے شکار کے سامان جمع کر کے اس گاؤں کا رخ کیا اسی دن بچے کو ہلاک کرنے کے واقعے پر ردِعمل شدید طور پر الموڑہ کے ڈپٹی کمشنر کا پیغام ملا کہ میں ضلع کے دیہاتی عوام کو خونی شیر کی مصیبت سے نجات دلاؤں۔ شیر اب تک سو کے قریب باشندوں کو ہلاک کر چکا تھا۔ کچھ بہادر زمیندار اور دلیر نوجوان زخمی بھی ہوئے تھے لیکن نہ شیر انہیں ہلاک کر سکا نہ وہ شیر کو ختم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ شیر کی دہشت بدستور اس علاقے پر چھائی ہوئی تھی۔

میں اپنے دو ملازموں اور چھ مزدوروں کے ہمراہ جنہیں میں نینی تال سے ہمراہ لایا تھا، رام نگر کے اسٹیشن پر گاڑی سے اترا اور پچیس میل دور کرتھانوالا کی طرف پیدل چل پڑا۔ ہمارے سفر کی پہلی منزل وہاں سے سات میل دور تھی۔ جب ہم وہاں پہنچے تو شام ہو چکی تھی۔ چونکہ مجھے ... جلدی میں مسٹر پائنز کے فارسٹ ریسٹ ہاؤس میں ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی تھی لہٰذا ہم نے وہ رات باہر میدان میں بسر کی۔

دریائے کوس کے کنارے پر ایک سرخ پہاڑی ہے جو چند ہزار فٹ بلند ہے۔ جب میں سونے کی کوشش میں مصروف تھا مجھے محسوس ہوا کہ پہاڑی پر سے ننھے ننھے پتھر نیچے گر رہے ہیں لیکن بعض اوقات ایسی آواز آتی جیسے دو پتھر زور سے ایک دوسرے کے ساتھ ٹکرا رہے ہوں۔ چاندنی پورے شباب پر تھی اور زرد روشنی میں ماحول بڑا پُراسرار اور سحر انگیز دکھائی دے رہا تھا۔ آواز کی تحقیق کے لیے میں پہاڑی کی سمت چل پڑا کچھ آگے بڑھنے پر معلوم ہوا کہ یہ آواز مینڈکوں کا ایک گروہ سڑک کے کنارے ایک دلدل میں کر رہا ہے۔ میں نے اپنی شکاری مہمات کے دوران دنیا کے مختلف علاقوں میں مینڈکوں کی آوازیں سنی تھیں لیکن وہاں کے مینڈکوں کی آوازیں تو نہایت عجیب و غریب تھیں۔ وزنی، بھاری، بوجھل اور غراہٹ کا عنصر بھی نمایاں تھا۔

اگلی صبح ہم منہ اندھیرے ہی روانہ ہو گئے اور بارہ میل کا سفر تیز دھوپ نکلنے سے پہلے ہی طے کر لیا۔ ایک دوسرے ریسٹ ہاؤس میں جب میرے ملازم ناشتا تیار کرنے میں

مصروف تھے تو ریسٹ ہاؤس کا چوکیدار جنگل کے دو نگراں اور قریبی گاؤں کے چند لوگ میرے پاس آئے اور آدم خور شیر کے متعلق سنسنی خیز قصے سنانے لگے۔ میں مسکرانے لگا۔ وہ حیرت میں مبتلا ہو گئے جب میں نے شیروں اور درندوں کو ہلاک کرنے کے اعداد و شمار بتائے تو ان کے منہ کھلے کے کھلے رہ گئے۔ بیگ میں ایک شیر کی دم اکڑی ہوئی ابھی تک موجود تھی میں نے وہ نکال کے ایک آدمی کے ہاتھ میں تھما دی۔ باقی بھی دلچسپی سے دیکھنے لگے۔

وہاں سے ہمیں موہن نامی پہاڑی کی طرف جانا تھا۔ اس سفر کے لیے ہم دوپہر تک تیار ہو گئے۔ اس جگہ سے کرتھانوالا چار ہزار فٹ کی بلندی پر واقع تھا اور راستہ گھنے جنگل میں سے گزرنے کے باعث دشوار گزار تھا۔ ہمارے سفر کی رفتار بڑی مدھم تھی۔ میرے آدمیوں نے بھاری سامان اٹھا رکھا تھا۔ چڑھائی خطرناک تھی اور گرمی شدت کی پڑ رہی تھی۔ چونکہ اس علاقے میں روزمرہ کی اشیاء کا ملنا مشکل تھا لہٰذا ہم ہر چیز اپنے ساتھ لائے تھے اور اسی باعث ہمارا سامان بھاری ہو گیا تھا۔ راستے میں ایک جگہ دم لینے کے بعد آخر سہ پہر تک چلتے رہے اور ہم زیرِ کاشت زمین کے کنارے پہنچ گئے۔ چونکہ وہاں شیر کے آنے کا کوئی خطرہ نہ تھا لہٰذا میں انہیں وہاں چھوڑ کر جنگل کے محافظوں کی جھونپڑی کی سمت چل پڑا جو موہن پہاڑی سے صاف دکھائی دے رہی تھی۔ مجھے بتایا گیا تھا کہ کرتھانوالا میں رہائش کے لیے وہ بہترین جگہ ہے۔ یہ جھونپڑی ایک ایسی پہاڑی کے کنارے پر واقع تھی جو موہن پہاڑی سے بلند تھی اور بالکل مقابل ہی واقع تھی۔ ابھی میں نے تھوڑا سا فاصلہ ہی طے کیا تھا کہ مجھے ایک عورت دکھائی دی۔ جو ایک چھوٹے سے آبشار سے گھڑا بھر رہی تھی۔ اس کی توجہ اپنی طرف پھیرنے کے لیے میں زور سے کھانسا۔ مجھے دیکھ کر وہ تیز تیز قدموں سے چلنے لگی۔ میں نے بھی اپنی رفتار بڑھا دی اور اس سے چند گز کے فاصلے پر کھڑا ہو کر سگریٹ سلگانے لگا۔ دو منٹ بعد میں نے اس کی طرف دیکھے بغیر پوچھا ''کیا یہ جگہ محفوظ ہے؟''

اس نے تھوڑی سی ہچکچاہٹ کے بعد جواب دیا۔ ''نہیں بالکل نہیں لیکن کیا کیا جائے پانی بغیر گزارہ بھی تو ممکن نہیں۔ چونکہ گھر میں کوئی مرد نہیں تھا اس لیے مجھے اکیلے ہی آنا پڑا۔''

''تمہارا شوہر کہاں ہے؟'' میں نے پوچھا۔

''وہ کھیتوں میں ہل چلا رہا ہے۔ ویسے بھی دیہاتوں میں پانی لانا عورتوں کی قسمت میں لکھا ہوا ہے۔''

اب تک عورت اپنے شرمیلے پن پر قابو پا چکی تھی۔ اس نے مجھ سے پوچھا۔ ''کیا تم سپاہی ہو؟''

''نہیں۔'' میں نے مختصر سا جواب دیا۔

''تو پھر فارسٹ آفیسر؟''

''نہیں۔''

''تو پھر آپ کون ہو؟'' عورت نے حیرت سے ہاتھ نچا کر پوچھا۔

''ایک انسان ہوں۔''

''وہ تو نظر آ رہے ہو لیکن یہاں کیا لینے آئے ہو؟''

''شیر کو ہلاک کرنے۔'' میں نے مسکراتے ہوئے اپنی رائفل کی طرف اشارہ کیا جو بیگ سے نکال لی تھی۔

جب وہ ہر طرح سے اپنی تسلی کر چکی تو اس نے پہاڑی کے جنوب کی سمت اشارہ کرتے ہوئے کہا۔ وہاں ایک بڑے درخت کے نیچے تین دن پہلے شیر نے ایک عورت ہلاک کی تھی۔ وہ درخت جنگل کے محافظوں کی جھونپڑی سے تقریباً تین سو گز دور تھا۔

اب ہم اس پگڈنڈی پر آ گئے تھے جو پہاڑی کے اوپر جاتی تھی۔ اس نے کہا کہ اس کا گاؤں پہاڑی کے عقب میں واقع ہے اور بالکل محفوظ ہے۔

عورت سے واقفیت میں نے اس لیے پیدا کی تھی کہ وہ میری آمد کی خبر سارے گاؤں میں پھیلا دے اور لوگ جان جائیں کہ میں آدم خور شیر کو ہلاک کرنے کے لیے آیا ہوں۔ جنگل کے محافظوں کی جھونپڑی اس پگڈنڈی سے بائیں طرف بیس گز کے فاصلے پر واقع تھی۔ دروازے کی زنجیر لگی تھی۔ اسے کھول کر میں اندر داخل ہو گیا۔ کمرا تقریباً دس مربع فٹ کا تھا اور صاف ستھرا بھی ہے لیکن اس کے اندر سے ایسی بو آ رہی تھی جیسے اسے عرصے سے استعمال نہ کیا گیا ہو۔ بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ جب سے آدم خور شیر وہاں آیا تھا۔ جنگل کے محافظ وہ جھونپڑی چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ بڑے کمرے کی دونوں جانب دو چھوٹے چھوٹے کمرے تھے۔ ایک بطور کچن استعمال ہوتا تھا اور دوسرا بطور گودام، جھونپڑی بہترین پناہ گاہ ثابت ہو سکتی تھی۔ میں نے اس کے تمام دروازے کھول دیے۔ تازہ ہوا کے جھونکے کمرے میں سرسرانے لگے۔ جھونپڑی سے باہر آ کر میں نے اپنے خیمے کے لیے ایک مناسب جگہ منتخب کی، کمرے میں کسی قسم کا فرنیچر نہ تھا۔ لہٰذا میں سڑک کے کنارے ایک پتھر پر بیٹھ کر اپنے آدمیوں کا انتظار کرنے لگا۔

وہاں مجھے دس منٹ ہوئے ہوں گے کہ گاؤں کی جانب سے پگڈنڈی کے موڑ پر ایک چہرہ نمودار ہوا۔ اس کے پیچھے دوسرا اور پھر تیسرا چہرہ نظر آیا۔ اس عورت نے گاؤں میں میری آمد کی خبر پہنچانے میں دیر نہ کی تھی۔ نزدیک آنے پر میں ان لوگوں سے باتیں کرنے لگا۔ ان میں سے ایک کرتھانوالا کا نمبردار تھا۔ اتنی دیر میں میرے آدمیوں نے آکر کچھ خشک لکڑیاں جمع کرکے آگ جلائی اور اس پر چائے کی کیتلی رکھ دی۔ مزدور میرا سامان کھولنے لگے۔ اب گاؤں سے اور آدمی بھی آرہے تھے۔ جب مزدور کھلی جگہ پر میرا خیمہ نصب کرنے لگے تو دیہاتیوں کے چہرے خوف زدہ ہوگئے۔ انہوں نے ایک زبان ہوکر کہا۔ ”کیا آپ واقعی خیمے میں رہیں گے؟ کیا آپ اس حقیقت سے واقف نہیں کہ اس علاقے میں آدم خور شیر گھومتا ہے اور وہ ہر روز باقاعدگی سے اس راستے سے گزرتا بھی ہے۔“

انہوں نے یہ بھی خدشہ ظاہر کیا کہ وہ میرے ملازموں کو بھی ہلاک کرسکتا ہے۔ کیونکہ جھونپڑی میں کوئی ان کی حفاظت کے لیے نہ ہوگا۔

ان کے الفاظ سچائی پر مبنی تھے۔ میں نے خیمے کی بجائے کمرے میں ٹھہرنے کا ارادہ کرلیا حالانکہ خیال کھلی جگہ پر شیر سے دو دو ہاتھ کرنے کا تھا۔ میرے ملازمین کے لیے کچن اور گودام کافی تھے۔

اِدھر اُدھر کی باتوں کے بعد گفتگو اپنے اصل موضوع کی طرف آگئی۔ آدم خور شیر کے متعلق میں زیادہ سے زیادہ معلومات حاصل کرنا چاہتا تھا۔ تین دن پہلے شیر نے عورت کو جن حالات میں ہلاک کیا تھا، وہ پوری تفصیل سے مجھے سنایا گیا۔ مجھے بتایا گیا کہ شیر ہر روز آتا ہے۔ پھر مشرق میں چتل گھاٹ تک جاتا ہے۔ اس ندی کی ایک شاخ موہن سے ہوکر مغرب میں چکنال کے پاس دریائے رام گنج کے کنارے ختم ہوتی ہے۔ اس راستے کا چکنال سے کرتھانوالا کے درمیان والا حصہ جو تقریباً چھ میل لمبا ہے، بے حد خطرناک سمجھا جاتا ہے۔ جب سے آدم خور شیر اس علاقے میں نمودار ہوا تھا لوگوں نے اسے استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا۔ بعد میں معائنہ کرنے پر مجھے معلوم ہوا کہ وہ راستہ کھیتوں میں سے گزر کر گھنے جنگل تک جاتا ہے۔

موضع کرتھانوالا کے زیادہ تر کھیت پہاڑی کے شمالی حصے پر تھے۔ کھیتوں سے پرے چھوٹی چھوٹی پہاڑیوں کا سلسلہ ہے جن کے درمیان تھرے ندی نالے بہتے ہیں۔ ان پہاڑیوں کے قریب تر اور محافظوں کی جھونپڑی سے کوئی ایک ہزار گز کے فاصلے پر دیودار کا ایک بڑا درخت ہے۔ دس دن قبل اس درخت کے قریب آدم خور شیر نے ایک عورت کو ہلاک کیا تھا اور دو دن کے بعد قریب ہی گھاس چرتی ہوئی ایک گائے کو بھی شکار کیا تھا۔

دیہاتیوں نے مجھے شیر کے متعلق ایک بڑی دلچسپ خبر سنائی۔ انہوں نے کہا کہ جب بھی شیر گاؤں میں آتا ہے۔ وہ مدھم آواز میں غراتا ہے۔ اس کی غراہٹ سے ہمیں اس کی آمد کی اطلاع ہوجاتی ہے۔ مزید سوالات کے بعد مجھے معلوم ہوا کہ بعض اوقات تو شیر کی غراہٹ مسلسل جاری رہتی ہے۔ بعض دفعہ تھوڑے تھوڑے وقفے اور بعض مرتبہ لمبے وقفے سے گونجتی سنائی دیتی ہے۔ ان اطلاعات سے میں نے مندرجہ ذیل نتائج اخذ کیے۔ (1) شیر زخمی ہے۔ (2) زخم کی تکلیف اسے محسوس ہوتی ہے جب وہ حرکت کرتا ہے۔ (3) زخم اس کی ٹانگ میں ہے۔ مجھے یقین تھا کہ اس زخم کے باعث ہی وہ آدم خور بنا ہے۔

رام نگر سے گزرتے وقت میں نے وہاں کے تحصیل دار سے کہا تھا کہ وہ میرے لیے دو بھینسے خرید کر انہیں موہن بھیج دے جہاں میرے آدمی موجود ہوں گے۔ میں نے دیہاتیوں سے کہا کہ ایک بھینسا تو اس درخت کے نیچے باندھ دو۔ جہاں وہ عورت شکار ہوئی تھی اور دوسرا بھینسا چکنال جانے والی سڑک پر۔ وہ لوگ میری اس تجویز سے مکمل طور پر متفق تھے۔ رات کے سائے گہرے ہونے لگے تھے۔ نمبردار نے رخصت ہونے سے پہلے کہا کہ وہ آس پاس کے دیہاتوں میں میری آمد کی خبر پہنچادے گا اور لوگوں سے کہے گا کہ اگر شیر نے کوئی تازہ شکار کیا ہو تو اس کی اطلاع جلد از جلد مجھ تک پہنچادیں۔

اب تک کمرے کی بدبو بڑی حد تک ختم ہوچکی تھی۔ میں نے نہا کر لباس تبدیل کیا چونکہ دن بھر کی مسافت سے تھکا ہوا تھا۔ لہٰذا دروازے پر دو بڑے پتھر رکھ کر سونے کی غرض سے بستر پر لیٹ گیا۔ میری نیند بڑی ہلکی ہے۔ دو تین گھنٹے بعد جب میری آنکھ کھلی تو مجھے کسی جانور کے چلنے پھرنے کی آواز سنائی دی۔ میں نے اپنی رائفل اور ٹارچ اٹھائی اور ایک پتھر کو دروازے سے الگ کرتے ہوئے باہر نکل آیا۔ جونہی میں آگے بڑھا وہ جانور پرے چلا گیا۔ قدموں کی آہٹ سے تو وہ مجھے شیر معلوم ہوا تھا لیکن ممکن ہے چیتا یا خارپشت ہو۔ بہرحال جنگل اس قدر گھنا تھا کہ وہاں نظر کام نہیں کرسکتی تھی۔

جنگل کے مختلف حصوں کو گھورتے اور رائفل گھماتے ہوئے میں کمرے میں لوٹ آیا اور دروازہ بند کرکے لیٹ گیا۔ سفر اور آب و ہوا کی تبدیلی کے سبب میرا گلا دکھنے لگا تھا۔ یہی حالت میرے آدمیوں کی تھی۔ دن بھر سفر کرنے کے بعد انہیں بخار آنے لگا۔

صبح ناشتے سے فارغ ہوکر میں نے چار آدمی موہن بھیجے تاکہ وہ بھینسوں کو لے آئیں اور میں وہ جگہ دیکھنے چل پڑا جہاں تین دن قبل آدم خور نے عورت کو ہلاک کیا تھا۔ عورت وہاں گھاس کاٹنے آئی تھی۔ کٹی ہوئی گھاس اور اس کا رسہ وہاں پڑے تھے۔ دیہاتیوں نے مجھے بتایا کہ عورت کی لاش نہیں ملی تھی مگر حقائق کا جائزہ لینے سے معلوم ہوا کہ اس لاش کو تلاش کرنے کی کوشش ہی نہ کی گئی تھی۔

آدم خور عورت کو ہلاک کرکے پہاڑی کے نیچے گھنی گھاس میں لے گیا تھا۔ وہاں اس نے لاش کا کچھ حصہ ہڑپ کیا پھر اسے اٹھا کر ڈیڑھ میل تک گھنے جنگل میں سے گزر کر ایک دوسری پہاڑی پر لے گیا۔ چونکہ اس کے پنجوں کے نشان چار دن پرانے تھے لہٰذا میں واپس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔

واپسی پر چڑھائی بڑی دشوار تھی۔ دوپہر کے قریب جب میں جھونپڑی میں پہنچا تو برآمدے میں دودھ سے بھرے کئی برتن پڑے تھے۔ یہ سارا دودھ میری چائے کے لیے آیا تھا۔ اتنے سارے دودھ سے تو میں نہا بھی سکتا تھا۔ میرے آدمیوں نے بتایا کہ ہمارے انکار کے باوجود گاؤں والے دودھ کے بھرے برتن چھوڑ گئے ہیں۔ میرا خیال تھا کہ میرے آدمی شام سے پہلے موہن سے بھینسے لے کر واپس نہیں آئیں گے۔ لہٰذا میں چکنال سڑک کا جائزہ لینے کے لیے چل پڑا جو پہاڑی ڈھلوان کی شکل میں تقریباً چار سو فٹ تک اوپر چلی گئی تھی۔ سڑک تقریباً نصف میل تک کھیتوں میں سے گزر کر تیزی سے بائیں سمت مڑ گئی تھی۔ دوپہر سے شام تک کا سارا وقت میرے پاس تھا۔ اس عرصے میں، میں نے تین میل لمبے سڑک کے ایک حصے کا جائزہ لیا۔ جب کوئی شیر ایک راستہ مسلسل استعمال کرتا ہے تو سڑک کے کنارے اپنے پنجوں کی لکیریں چھوڑ جاتا ہے۔ یہ لکیریں گھریلو بلی کے پنجوں کے مشابہ ہوتی ہیں اور شکاریوں کے لیے دلچسپی کا سبب بنتی ہیں کیونکہ ان سے ذیل کی مفید معلومات ملتی ہیں۔

1۔ یہ لکیریں پنجوں کی ہیں یا نقش پا ہیں۔
2۔ اسے وہاں سے گزرے کتنی دیر ہوئی ہے۔
3۔ شیر نے کس سمت میں پیش قدمی کی ہوگی۔
4۔ اس کی رہائش گاہ قیاساً کتنی دور ہوسکتی ہے۔
5۔ اس کے شکاروں کی نوعیت۔
6۔ اسے انسانی گوشت کھائے کتنی دیر ہوئی ہے۔

سڑک کا وہ حصہ لوگوں نے عرصہ سے استعمال کرنا چھوڑ دیا تھا جس کے باعث اس پر خودرو گھاس اُگی ہوئی تھی۔ گھاس پر شیر کے پنجوں کے نشانات تلاش کرنا مشکل تھا۔ ایک جگہ راستہ سے ہٹ کر ایک چھوٹا سا جوہڑ تھا جس کا پانی چوپایوں کے استعمال میں آتا تھا۔

راستہ زیر کاشت کھیتوں کو چھوڑ کر جب بائیں جانب مڑتا تھا تو وہاں موڑ پر شیر کے پنجوں کی کچھ لکیریں موجود تھیں۔ یہ لکیریں اندازاً زیادہ سے زیادہ تین دن پرانی تھیں۔ ان لکیروں سے کوئی دو سو گز دور سڑک اپنی اصلی چوڑائی سے ایک تہائی ہوکر ایک جھکی ہوئی چٹان کے نیچے سے گزرتی تھی۔ یہ چٹان کوئی دس فٹ اونچی تھی اور اس کے آگے کوئی دو مربع گز ہموار جگہ تھی۔ یہ جگہ فقط گاؤں سے آتے ہوئے دکھائی دیتی تھی۔ اس چٹان سے تھوڑا آگے چل کر مجھے شیر کے پنجوں کے نشانات دکھائی دیے جو زیادہ سے زیادہ ایک دن پرانے تھے۔ وہ ایک بڑے مگر بوڑھے شیر کے نشانات معلوم ہوتے تھے۔ جب کوئی شکاری کسی آدم خور شیر کے علاقے میں گھوم رہا ہو تو وہ بہت پھونک پھونک کر قدم رکھتا ہے اور ہر جھاڑی اور ہر درخت کو بغور دیکھتا ہے۔ مبادا شیر کے بھیس میں ان کے پیچھے موت نہ چھپی ہو اگر ہوا بند ہو تو احتیاطی تدابیر میں اضافہ ہوجاتا ہے۔ اس صورت میں دائیں بائیں کے علاقہ اور آگے پیچھے کی طرف بھی دھیان رکھنا پڑتا ہے۔

جب میں جھونپڑی میں واپس آیا تو دونوں بھینسے وہاں موجود تھے لیکن اب شام ہوچکی تھی۔ میرے آدمیوں نے سارا دن جھونپڑی میں آگ جلا رکھی تھی جس کے باعث وہاں بسی بدبو جاتی رہی۔ اس کے باوجود میں کسی ڈر سے دروازے کو بند کرکے سونا نہیں چاہتا تھا۔ لہٰذا میں نے اپنے آدمیوں سے کہا کہ وہ کچھ کانٹے دار جھاڑیاں کاٹ کر انہیں مضبوطی سے دروازے کے ساتھ باندھ دیں۔

میں نے ایک بھینسا اس درخت کے نیچے باندھ دیا جہاں چار روز پہلے آدم خور شیر نے عورت کو ہلاک کیا تھا اور دوسرا بھینسا اس جگہ باندھا جہاں راستے پر شیر کے پنجوں کے نشانات دکھائی دیے تھے۔

دوسری صبح دیکھا دونوں بھینسے اپنا چارا ختم کرنے کے بعد بڑے آرام سے بیٹھے جگالی کرنے میں مصروف تھے۔ اس سے مجھے قدرے مایوسی ہوئی۔ اس شام میں نے دوسرے بھینسے کی جگہ بدل دی اور اسے سڑک کے پاس جوہڑ کے کنارے باندھ دیا۔

چار دن گزر گئے بھینسے بدستور اپنی اپنی جگہ بندھے ہوئے تھے، آدم خور ان کے قریب تک نہ آیا تھا۔ چوتھی شام جب میں درخت کے نیچے بندھے ہوئے بھینسے کو دیکھ کر واپس آرہا تھا تو اچانک مجھے پہلی مرتبہ خطرے کا احساس ہوا۔ خطرہ میرے سامنے والی چٹان پر موجود تھا۔ پانچ منٹ تک میں اپنی جگہ پر خاموش کھڑا چٹان کے بالائی کنارے کو دیکھتا رہا وہاں سے میں ہلکی سے ہلکی جنبش بھی دیکھ سکتا تھا۔

لیکن چٹان کے اوپر خاموشی طاری تھی دس قدم آگے چل کر میں پھر خاموش کھڑا ہو گیا۔ اگرچہ میں نے چٹان پر جنبش نہ دیکھی تھی لیکن اس کے باوجود میری چھٹی حس مجھے خطرے کا احساس دلا رہی تھی۔ اب سوال یہ تھا کہ مجھے کیا اقدام اٹھانا چاہیے تھا۔ سورج غروب ہونے میں نصف گھنٹا باقی تھا۔ اگر زیادہ وقت ہوتا تو میں الٹے قدموں پہاڑی کے گرد لمبا چکر کاٹ کر چٹان کے سر پر آجاتا اور وہاں سے آدم خور شیر پر گولی چلانے کی کوشش کرتا۔ اس کے علاوہ ابھی میں نے ایک میل مزید سفر طے کرنا تھا۔ لہٰذا رائفل کی لبلبی پر انگلی رکھے اور اس کا منہ چٹان کی طرف کیے میں آگے بڑھنے لگا۔

وہاں سے راستہ کوئی آٹھ فٹ چوڑا تھا۔ میں راستے کے بالکل باہر والے کنارے پر چل رہا تھا۔ وہاں سے دو فٹ پرے گہری کھائی سڑک کے ساتھ ساتھ چل رہی تھی۔ مجھے یہ دھڑکا بھی لگا ہوا تھا کہ کہیں شیر سے بچتے بچتے نیچے کھائی میں ہی نہ لڑھک جاؤں۔ میں بہت آہستہ آہستہ قدم اٹھا رہا تھا لیکن جب میں آگے کو جھکی ہوئی چٹان کے مقابل آیا اور وہاں سے آگے بڑھا تو مجھے اُمید تھی کہ شیر اتنی دیر تک وہیں کھڑا رہے گا جہاں وہ اس وقت موجود تھا اور تھوڑا آگے چل کر جب راستہ بلند ہو جائے گا تو میں اسے وہاں سے دیکھ سکوں گا لیکن شیر مجھے چوکنا دیکھ کر خود بھی چوکنا ہو گیا تھا۔ جب میں چٹان کے قریب سے صحیح سلامت گزر گیا تو مجھے اپنے پیچھے چٹان پر غراہٹ سنائی دی۔ مڑ کر دیکھا تو کچھ نہ تھا تبھی بندروں کی تیز تیز آوازیں سنائی دیں اور دو ہرن اس سمت سے بھاگتے ہوئے آئے۔

آدم خور فرار ہو گیا تھا یعنی جان بچانے میں کامیاب ہو گیا تھا اور یہی حال میرا بھی تھا۔ اس لیے کفِ افسوس ملنے کے سوا کچھ نہ کرسکا لیکن ایک بات کی مجھے قدرے تسلی تھی وہ یہ کہ جہاں شیر کھڑا تھا وہاں سے وہ جوہڑ کے قریب بندھے ہوئے بھینسے کے گلے میں پڑی گھنٹی کی آواز بخوبی سن چکا ہوگا۔ جب میں کھیتوں کے قریب پہنچا تو دیہاتیوں کا ایک گروہ میرا منتظر تھا۔ بندروں کی آوازیں سن کر اور ہرنوں کو دیکھ کر انہیں مایوسی ہوئی تھی کہ میں نے شیر کو نہیں دیکھا تھا لیکن جب میں نے انہیں بتایا کہ اگلی صبح میں نے بہت سی امیدیں وابستہ کر رکھی ہیں تو وہ بہت خوش ہوئے۔

رات پہلے تو تیز آندھی چلتی رہی پھر موسلادھار بارش برسنے لگی مجھے یہ جان کر سخت کوفت ہوئی کہ جھونپڑی کی چھت جگہ جگہ سے ٹپک رہی تھی۔ بہرحال مجھے ایک ایسا گوشہ مل گیا جہاں سے چھت کم برستی تھی۔ لہٰذا میں اپنا بستر گھسیٹ کر وہاں لے گیا اور کمبل سمیٹ کر دوبارہ خراٹے لینے لگا۔ صبح جب بیدار ہوا تو آسمان دھلا دھلا اور نکھرا ہوا تھا۔ بارش نے گرمی کی شدت فضا سے دور کر دی تھی اور درختوں کے پتے سورج کی اولین کرنوں میں چمک رہے تھے۔

اب تک میرا یہ معمول تھا کہ میں قریب والے بھینسے کو دیکھنے پہلے جایا کرتا تھا لیکن اس مرتبہ میں نے اپنا معمول بدل دیا اور پہلے اس بھینسے کو دیکھنے گیا جسے چکنال سڑک پر جوہڑ کے کنارے باندھ رکھا تھا لیکن جھونپڑی سے نکلنے سے پہلے میں نے اپنی 450/400 رائفل کو تیل دیا اور صاف کیا۔ یہ کئی برس سے ایک باوفا دوست کی طرح میرا ساتھ دیے جا رہی تھی۔ اس صبح جب میں گزشتہ شام والی چٹان کے قریب سے گزرا تو مجھے ذرہ بھر خطرہ محسوس نہ ہوا۔ حالانکہ گزشتہ شام اسی جگہ فضا وحشت ناک سی معلوم ہوئی تھی۔ میں نے وہاں راستے پر شیر کے پنجوں کے نشان تلاش کرنے کی کوشش کی مگر بارش نے راستہ ہموار کر دیا تھا لیکن جب میں جوہڑ کے قریب نم دار جگہ پر آیا تو وہاں مجھے شیر کے پنجوں کے تازہ نشانات گیلی زمین پر ثبت دکھائی دیے۔ اس جگہ کے قریب ہی سڑک کے کنارے تین فٹ اونچی ایک چٹان تھی۔ اب میں نے اس چٹان پر چڑھ کر بھینسے کی طرف دیکھا تو وہ غائب تھا۔

میں نے ربڑ کے بے حد ہلکے جوتے پہن رکھے تھے۔ اس لیے سبک روی سے چلتا ہوا بھینسے والی جگہ گیا اور اس زمین کا بغور معائنہ کیا۔ بھینسے کو آندھی سے قبل ہلاک کیا گیا تھا لیکن شیر اسے بارش رکنے کے بعد اٹھا کر لے گیا تھا۔

وہاں اس نے بھینسے کے جسم کا کوئی حصہ نہیں کھایا تھا۔

میرے منصوبے کے تار و پود بکھر گئے لیکن خوش قسمتی سے بارش میری مدد کو پہنچ گئی تھی۔ راستے میں بکھرے ہوئے گیلے پتوں پر شیر کے پنجوں کے نشانات موجود تھے۔ کسی ایسے جنگل میں داخل ہوتے وقت جہاں چشم زدن میں گولی چلانے کی ضرورت محسوس ہو میں کبھی خوش نہیں ہوتا کیونکہ بعض دفعہ دوسرے جانور بھی بلاوجہ نشانے کی زد میں آکر ہلاک ہو جایا کرتے ہیں۔ چٹان کے قریب جا کر میں نے رائفل دوبارہ کھولی اور اس میں سے مشکوک کارتوس نکال کر نئے کارتوس بھرے۔ رائفل کے منہ پر میں نے کارک نہ لگایا کیونکہ بعض اوقات تو کارک ہٹانے کا موقع بھی نہیں ملتا۔ اس کے بعد میں شیر کے نشانات کا تعاقب کرنے لگا۔ یہاں پر بات یاد رکھنی چاہیے کہ شیر اپنے شکار کو گھسیٹتا نہیں جیسا کہ عام طور پر سمجھا جاتا ہے بلکہ وہ اپنے شکار کو اٹھا کر چلتا ہے۔ شکار وزنی ہو تو وہ اسے چھوڑ جاتا ہے۔ اس سلسلے میں شکار کا سائز بھی بڑی اہمیت رکھتا ہے۔ مثلاً اگر ہرن ہو اور شیر نے اسے گردن سے پکڑ رکھا ہو تو ظاہر ہے کہ ہرن کی پچھلی ٹانگیں زمین کے ساتھ ضرور گھسٹیں گی۔ اس کے برعکس اگر شیر نے ہرن کو کمر سے پکڑ رکھا ہو تو پھر ممکن ہے کہ ہرن کی ٹانگیں زمین کے ساتھ نہ لگیں۔

موجودہ صورتِ حال میں شیر نے بھینسے کو گردن سے پکڑ رکھا تھا جس کے باعث بھینسے کی پچھلی ٹانگیں زمین پر لکیریں چھوڑ گئی تھیں اور اس کا پیچھا کرنا آسان تھا۔ کوئی سو گز متوازی چل کر شیر قدرے دائیں جانب مڑ گیا۔ وہاں مٹی کا ایک بند تھا۔ وہ بند عبور کرتے وقت شیر کی اپنے شکار پر گرفت ڈھیلی پڑ گئی تھی۔ شکار کے منہ سے چھوٹنے کے بعد شیر اپنی سمت بھول گیا تھا اور فیصلہ نہ کرسکا تھا کہ اسے کس طرف لے جائے۔ پہلے تو وہ تقریباً دو سو گز تک داہنی طرف گیا پھر تقریباً سو گز سیدھا گھنے بانسوں کے درختوں سے گزرا۔

بانسوں کے جھنڈ سے گزرتے وقت اسے خاصی دقت کا سامنا کرنا پڑا۔ یہ جھنڈ عبور کرنے کے بعد وہ پھر داہنی جانب مڑ گیا اور دو سو گز چلنے کے بعد ایک چٹان کے پاس ٹھہر گیا تھا۔ یہ چٹان کوئی بیس فٹ اونچی تھی۔ چٹان کا جھکاؤ مجھ سے مخالف سمت میں تھا اور میرا خیال تھا کہ شاید وہاں شیر کی کچھار وغیرہ ہوگی۔ لہٰذا میں شیر کے پنجوں کے نشانات سے ہٹ کر چٹان کے اوپر چڑھ کر آہستہ آہستہ رینگنے لگا پھر میں اچانک ہی بے حد چوکنا ہو گیا تھا اور گرد و پیش کو بغور دیکھ رہا تھا۔ چٹان کے اختتام پر پہنچ کر اوپر دیکھ کر مجھے بہت مایوسی ہوئی کہ وہاں کسی قسم کی کچھار نہ تھی بلکہ پہاڑی کا آخری حصہ چٹان سے مل گیا تھا۔

چونکہ چٹان سے میں گرد و نواح کا جنگل بخوبی دیکھ سکتا تھا اور وہ جگہ آدم خور کے حملے سے بھی محفوظ تھی لہٰذا میں ستانے کی غرض سے تھوڑی دیر وہاں بیٹھ گیا۔ ابھی میں وہاں بیٹھا ہی تھا کہ سامنے ایک گھنی جھاڑی میں پچاس گز کے فاصلے پر مجھے ایک سرخ اور سفید چیز دکھائی دی۔ چند منٹ تک میں اس چیز کو بغور دیکھتا رہا پھر اچانک مجھے احساس ہوا کہ جس چیز کو میں دیکھ رہا ہوں وہ شیر نہیں بلکہ اس کا شکار ہے۔ سرخ سرخ اس کا خون اور سفید سفید اس کی پسلیاں تھیں جن سے شیر نے گوشت اتارا تھا۔ خدا کا شکر ہے کہ میں نے اس وقت تک گولی نہیں چلائی تھی ورنہ شیر کو ہلاک کرنے کا موقع کھو بیٹھتا۔

جب کوئی شیر اپنا شکار کھلی جگہ پر چھوڑ جائے تو یہ تصور کیا جاتا ہے کہ وہ کہیں قریب ہی لیٹا اپنے شکار کی حفاظت کر رہا ہے۔ اگرچہ شیر مجھے نظر نہ آیا تھا لیکن اس کا مطلب یہ نہیں تھا کہ وہ چٹان پر لیٹا ہوا ہی نہیں تھا۔

شیروں کو مکھیاں تنگ کرتی رہتی ہیں اور وہ ایک پوزیشن میں زیادہ دیر نہیں لیٹے رہتے۔ لہٰذا میں نے وہیں بیٹھ کر شیر کی حرکات و سکنات کا معائنہ کرنے کا فیصلہ کرلیا لیکن ابھی میں نے یہ فیصلہ کیا ہی تھا کہ میرے گلے میں خراش ہونے لگی کھانسی سے میں ابھی کلی طور پر صحت یاب نہ ہوا تھا۔ میں نے کھانسی کو دبانے کی کوشش کی مگر جتنا اسے دباتا نفسیاتی طور پر اتنا ہی زیادہ کھانسنے کو جی چاہتا۔ ایسے موقعوں پر ایک طریقہ کارگر ثابت ہوتا ہے اور وہ یہ کہ انسان اپنا سانس روک لے لیکن موجودہ صورتِ حال میں یہ طریقہ بھی کارگر ثابت نہ ہوا اور آخر گلے کی تسکین کے لیے میں نے کھانسی کو لنگور کی آواز میں ڈھال لیا۔ ایسی آواز کی نقل اتارنا بہت مشکل ہوتا ہے مگر شکاری اس فن میں اپنے تجربات کی بدولت خاصے ماہر ہو جایا کرتے ہیں۔

اس کے بعد تقریباً نصف گھنٹے تک میں چٹان پر بیٹھا جنگل کے باسیوں کی طرف سے کسی خبر کا منتظر رہا جب مجھے اطمینان ہو گیا کہ شیر گرد و نواح میں موجود نہیں تو چٹان سے اٹھا اور بڑی احتیاط سے چلتا ہوا شکار کے پاس گیا۔ شیر نصف کے قریب بھینسا کھا چکا تھا۔ اس قدر کھانے کے بعد مجھے یقین ہو گیا کہ وہ زیادہ دور نہیں گیا ہوگا۔ چونکہ زمین کو ابھی

مزید دو تین گھنٹے گیلا رہنا تھا لہٰذا میں نے فیصلہ کیا کہ شیر کو تلاش کیا جائے اور اگر ممکن ہو تو اسے ہلاک کرنے کی بھی کوشش بھی کی جائے۔ شکار کے پاس پہنچ کر یہ اندازہ کرنا مشکل ہوگیا کہ شیر کس سمت گیا تھا۔ آخر تھوڑی سی کوشش کے بعد میں نے اس کی سمت کا یقین کرلیا۔ سخت پنجوں والے جانوروں کے برعکس نرم پنجوں والے جانوروں کا کھوج لگانا آسان ہوتا ہے۔ میں شیر کے پنجوں کے نشانات پر چل پڑا۔ مجھے یہ بھی احساس تھا کہ شیر زیادہ دور نہیں بلکہ کہیں قریب ہی ہوگا۔ ابھی سو گز ہی چلا تھا کہ بیس مربع فٹ کے قریب مجھے ایک چوڑی جگہ دکھائی دی۔ اس جگہ چھوٹی چھوٹی گھاس بچھی ہوئی تھی۔ وہاں کچھ ایسے نشانات تھے جیسے اس گھاس پر شیر لیٹا تھا۔ میں ان نقوش سے شیر کی جسامت کے متعلق اندازہ کرنے میں محو تھا کہ گھاس کی کچھ پتیاں خود بخود کھڑی ہو گئیں۔ اس سے پتا چلا کہ شیر ابھی ابھی اٹھ کر گیا ہے۔

گھاس کی پتیاں کھڑی ہوتے دیکھ کر سب سے پہلے جو خیال میرے ذہن میں آیا وہ یہ تھا کہ شیر نے مجھے دیکھ لیا ہے اور دیکھتے ہی اٹھ کر وہاں سے چلا گیا ہے مگر گردوپیش کا جائزہ لینے سے میرا یہ خیال غلط ثابت ہوا کیونکہ گھاس کے اس تختے سے نہ تو شیر کا شکار دکھائی دے رہا تھا اور نہ ہی وہ چٹان جس پر میں تھوڑی دیر پہلے بیٹھا ہوا تھا۔ تو پھر دو منٹ پہلے وہ اتنی آرام دہ جگہ چھوڑ کر کیوں چلا گیا اس کا جواب میری گردن کی پشت پر چمکتے ہوئے سورج نے دیا۔ نو بج چکے تھے اور وہ مئی کے ایک ناخوش گوار دن کی صبح تھی۔ سورج کی تیز شعاعیں تقریباً دس منٹ سے براہ راست گھاس کے اس تختے پر پڑ رہی تھیں۔ شیر کرنوں کی حدت برداشت نہ کرسکا اور کسی سایہ دار جگہ کی تلاش میں میرے آنے سے قبل اٹھ کر چلا گیا۔ گھاس کے اس تختے کے دوسرے کنارے پر ایک درخت شمال جنوب کی سمت میں گرا پڑا تھا۔ اس درخت کا قطر کوئی چار فٹ تھا۔ میں گھاس کے تختے کے وسط میں کھڑا تھا اور وہ درخت مجھ سے دس فٹ کے فاصلے پر تھا۔ درخت کی جڑوں کے آس پاس کئی قسم کے خودرو پودے اُگے ہوئے تھے۔ ایک پودے کے پھولوں سے بھینی بھینی خوشبو اٹھ رہی تھی۔

اگر شیر دھوپ سے تنگ آکر وہاں سے اٹھا تھا تو اس صورت میں اس کے لیے بہترین جگہ گرے ہوئے درخت کا سایہ تھا۔ میں احتیاط سے قدم اٹھاتا ہوا دبے پاؤں درخت کی سمت چل پڑا۔ مجھے اپنے سامنے پتھریلے راستے پر ایک کالی اور زرد چیز دکھائی دی جو تقریباً تین انچ لمبی تھی میں اسے بغور دیکھتا رہا۔ آخر مجھے یقین ہوگیا وہ شیر کی دم کا آخری حصہ ہے۔

میں پاؤں کے بل بیٹھ گیا اور آہستہ آہستہ آگے بڑھنے لگا حتیٰ کہ مجھے واضح طور پر شیر کی دم اور پچھلی ٹانگیں دکھائی دینے لگیں۔ شیر کے پیٹ کے مدوجزر سے صاف معلوم ہوتا تھا کہ وہ گہری نیند سویا ہوا ہے۔ میں احتیاط سے تین چار قدم آگے بڑھا، اب پورا شیر میری نظروں کے سامنے تھا۔

میں نے رائفل سیدھی کی لیکن پھر مسکرا کر لبلبی پر دباؤ نہ ڈال کر انگلی باہر نکال لی۔ سوئے ہوئے شکار پر گولی چلانا سید مقصود علی کی شان کے خلاف تھا۔ میں نے آج تک کسی سوتے جانور کو گولیوں کا نشانہ نہیں بنایا تھا۔ اِدھر اُدھر نگاہ دوڑانے پر مجھے قریب ہی ایک گول پتھر ایک جھاڑی کے قریب پڑا دکھائی دیا۔ میں نے دبے پاؤں جھاڑی کی طرف پیش قدمی کی اور ایک پتھر اپنے دائیں ہاتھ میں اٹھا لیا۔ میرے بائیں کندھے سے ٹکی رائفل کی لبلبی اب انگلی کی جنبش سے فائر کرنے کے لیے تیار تھی۔ میں نے شیر کے سراپا پر ایک بھرپور نگاہ ڈالی پھر تیزی سے پتھر اس کے پیٹ پر کھینچ مارا۔ شیر ہڑبڑا کر اٹھ بیٹھا غرایا میری طرف دیکھا، چنگھاڑا لیکن اس سے قبل کہ وہ جست لگاتا میں نے لبلبی دبا دی۔ بے آواز فائر کے ساتھ ہی خون کا فوارہ اس کے پیٹ سے ابل پڑا۔ شیر دردناک آواز میں چنگھاڑا لمحہ بھر کے لیے جنگل ہل کر رہ گیا اور اردگرد اڑتے بیٹھے پرندے بھی سہم کر پھڑ پھڑائے اور چیختے چلاتے دور ہٹنے لگے۔ شیر نے زخمی ہونے کے باوجود میری طرف جست لگائی۔ میں نے پے در پے دو فائر کیے۔ دونوں گولیاں نشانے پر بیٹھیں اور اس کی دونوں آنکھوں کو پھاڑتی ہوئی بھیجے میں گھس گئیں۔ شیر کی چیخوں سے جنگل کانپنے لگا۔ وہ زمین پر گر پڑا اور تڑپنے لگا۔ اس عالم میں بھی اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ اس نے اپنی تمام تر آخری طاقت کا مظاہرہ کیا اور پھر ایک جست لگائی لیکن میری رائفل سے ہونے والے مسلسل فائروں نے اسے پھر زمین چاٹنے پر مجبور کردیا۔ میری رائفل کی نالی سے دھواں نکل رہا تھا اور شیر کے جسم کے مختلف حصوں سے سرخ سرخ خون نکلتا ہوا ایک ہولناک منظر پیش کر رہا تھا۔ اس کے اردگرد کی زمین خون سے سرخ ہوگئی۔ وہ اب ہچکی لے کر بے حس وحرکت ہوچکا تھا۔

میں چند لمحے کھڑا خونی شیر کو خون میں لت پت دیکھتا رہا پھر حسب معمول آگے بڑھتے ہوئے میں نے اپنی پنڈلی سے بندھا شکاری چاقو نکالا اور شیر کی دم کو ہاتھ میں لے کر جڑ سے کاٹ ڈالا۔ میری جیب میں لمبا مومی لفافہ موجود تھا جس

میں دم ڈال کر میں نے منہ بند کردیا اور واپس جھونپڑی کی طرف چل پڑا۔ میرے بستی پہنچنے سے قبل ہی میرے آدمیوں نے گولی کی آواز سن کر دیہاتی جمع کرلیے تھے۔ میرے کہنے پر وہ تھوڑی دیر بعد دو مضبوط بانس اور رسے لے آئے اور شیر کو درخت کے پاس سے اٹھا کر گھاس کے تختے پر لے آئے۔ یہاں میں اس کی کھال اتارنا چاہتا تھا لیکن دیہاتیوں نے ایسا نہ کرنے کی درخواست کی۔ انہوں نے کہا کہ اگر کرتھانو الا اور گردونواح کے دیہات کی عورتوں، بچوں اور ان کے مردوں کو ان کے بدترین دشمن کو دیکھنے کا موقع نہ دیا گیا تو وہ بہت مایوس ہوں گے۔

آخر شیر کی لاش کو اٹھا کر جھونپڑی کے قریب لایا گیا۔ جب گردونواح کے دیہات کی عورتیں، بچے اور مرد حضرات خوشی سے شور کرتے ہوئے آدم خور شیر کا نظارہ کر چکے تو میرا لمبا شکاری چاقو ایک بار پھر حرکت میں آیا اور میں اس کی کھال اتارنے لگا تو میں نے دیکھا کہ اس کی اگلی بائیں ٹانگ کی سمت سے کچھ بال اڑے ہوئے تھے۔ وہاں جلد میں جگہ جگہ چھوٹے چھوٹے سوراخ تھے جن سے بھورے رنگ کا سیال مادہ نکل رہا تھا۔

کھال اتارنے کے بعد جب میں نے بائیں ٹانگ کے پنجے کو تھوڑا چیرا دیا تو اس میں سے خارپشت کے پندرہ بیس کانٹے نکلے۔ سب سے بڑا کانٹا تقریباً چار انچ لمبا تھا۔ اسی باعث اسے چلتے وقت تکلیف ہوتی تھی اور وہ درد سے کراہتا تھا۔ اس کے آدم خور بننے کی بھی یہی وجہ نظر آتی تھی۔ کیونکہ خارپشت کے کانٹے چاہے کتنی دیر ہی جلد کے اندر رہیں وہ کبھی نہیں گلتے۔ میں آدم خور شیروں کے جسموں سے تقریباً دو سو کے قریب خارپشت کے کانٹے نکال چکا ہوں۔ ان میں سب سے بڑے کانٹے کی لمبائی تقریباً نو انچ تھی اور وہ پینسل جتنا موٹا تھا۔ ان میں سے زیادہ تر کانٹے سخت پنجوں میں کھبے ہوئے تھے بعض مضبوطی سے ہڈیوں میں گڑے ہوئے پائے گئے تھے۔

یہ کانٹے بلاشبہ انہیں خارپشت کو غذا کی خاطر ہلاک کرتے وقت چبھے ہوں گے لیکن سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ شیر جیسا سمجھ دار جانور خارپشت کو ہلاک کرتے وقت اس کے کانٹوں کو اپنے جسم میں گھسنے کیوں دیتا ہے۔ اس کا جواب آج تک میری سمجھ میں نہیں آسکا۔ اس کے علاوہ خارپشت کے کانٹے تیز نہیں ہوتے۔ وہ اس کی جلد میں اتنی دور تک کیسے چلے جاتے ہیں۔ چیتے بھی خارپشت کے جانی دشمن ہوتے

ہیں لیکن جب وہ انہیں ہلاک کرتے ہیں تو ان کے کانٹے ہرگز اپنے جسم میں نہیں گھسنے دیتے۔ وہ خار پشت کو گردن سے پکڑ کر ہلاک کرتے ہیں۔ شیر بھی یہی طریقہ کیوں استعمال نہیں کرتا یہ راز آج تک مجھ پر نہیں کھل سکا۔

کرتھانوالا کے دیہاتیوں کے اصرار پر میں ان کی دعوت رد نہ کرسکا۔ وہ مجھے اپنے گاؤں سے چند میل دور ایک پُر فضا پہاڑی مقام کے دامن میں لے آئے۔ ہمارا سفر بیل گاڑیوں پر طے ہوا تھا۔ میرے لیے ایک خوب صورت کرسی سجا کر گاڑی کے وسطی مقام پر رکھی گئی تھی۔ ایک دیہاتی لڑکے نے اپنے پرانے کیمرے سے میری اور میری رائفلوں کی تصاویر بھی اتاریں۔ اس نے دم کی تصویر بھی لے لی کیونکہ میں نے مسکراتے ہوئے تھیلا اس کے سامنے ڈال دیا تھا۔

اس پُر فضا پہاڑی مقام کے دامن میں ایک سرسبز و شاداب گول میدان تھا جس میں چند شکاری جھونپڑے تھے۔ سامنے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹی سی جھیل تھی جو لمبی ہوتی ہوئی ایک لکیر کی مانند دریائے کوسی کی طرف نکلتی چلی گئی تھی۔ یہاں تین طرف سرخ سرخ پہاڑ محافظوں کی طرح کھڑے عجیب بہار دکھلا رہے تھے۔ جھونپڑوں کے سامنے موسمی تہوار منانے والا چبوترا تھا جس پر بستی کا سردار بیٹھا کرتا تھا لیکن آج مجھے اس لکڑی کے منقش پرانے تخت پر احترام سے دھکیل دیا گیا تھا جس کے تینوں اطراف میں نرم نرم گدیاں لگی ہوئی تھیں۔ میرے سامنے ایک شکار شدہ ہرن روسٹ کیا گیا اور پھر جنگلی پھل اور دودھ وغیرہ سب اشیا تخت کے سامنے بڑی میز پر سجا دی گئیں۔ مجھے اس وقت بھوک لگ رہی تھی۔ چنانچہ پُر تکلف کھانے پر ٹوٹ پڑا۔ مجھے لذت کا اظہار کرنا پڑا۔ پھر میرے آدمیوں نے بھی پیٹ بھر کر کھایا۔ گاؤں کے چند رقاص چرواہوں اور ان کی بیگمات نے میرے سامنے ایک جنگلی رقص بھی پیش کیا۔ وہ آدم خور سے نجات حاصل کرکے خوشیاں منا رہے تھے۔

ایک مچھیرا جھیل کے کنارے مچھلیاں پکڑنے میں مصروف تھا اور دو ایک پرانی کشتی پر سوار جھیل میں جال ڈالے دکھائی دے رہے تھے۔ شام ہو رہی تھی اس لیے رات کو سردار کے جھونپڑے میں مجھے ٹھہرا دیا گیا۔ میرے جھونپڑے میں جگہ جگہ چراغ روشن کیے گئے۔ میرے آدمی بھی میرے ساتھ تھے اور رائفلوں کی صفائی میں مصروف تھے۔

ایک چھوٹی جھونپڑی میں قیام پذیر چوکیدار چرواہا اپنی بھیڑوں کو تلاش کرنے میرے سامنے شام کے سائے گہرے ہوتے ہی میدان سے نکل کر پہاڑوں کی طرف چلا گیا تھا۔ وہ باڑے کا دروازہ بند کرنا بھول گیا تھا لہٰذا جانور باہر نکل کر دور بھاگتے چلے گئے۔ میں جھونپڑی کی کھڑکی سے چرواہے کو کچھ دیر تک تیز تیز قدم اٹھاتا ہوا دیکھتا رہا پھر کرسی گھسیٹ کر سیاہ آسمان پر چمکتے گول روشن زرد چاند کو تکنے لگا۔ وہ کتنا خوب صورت اور دلفریب دکھائی دے رہا تھا۔ میں چاندنی کا دیوانہ تھا۔ سنہری کرنیں میرے جھونپڑے کے ارد گرد چل رہی تھیں۔ میں سگریٹ پر سگریٹ پھونکنے لگا۔ رات کے دو بج گئے میرے ایک ماتحت نے ریڈیو پر موسیقی کا پروگرام لگا رکھا تھا۔ رسیلے گیتوں نے وقت گزرنے کا احساس ہی محو کردیا۔ مجھے اعتراف کرنا پڑا کہ موسیقی روح کی غذا ہے۔

میں اس وقت ایک جنگلی میگزین کا مطالعہ کر رہا تھا جو پرانی دہلی سے شائع ہوتا تھا۔ اچانک ایک انسانی چیخ سناٹے میں گونج اٹھی۔ بڑی دردناک آواز پھر کسی شیر کی دھاڑ سے ماحول لرز اٹھا۔ میں نے جلدی سے میگزین پرے پھینکا اور باہر اندھیرے میں آنکھیں پھاڑنے لگا۔ چاند اسی وقت سیاہ بادلوں کے ٹکڑوں سے آنکھ مچولی کھیل رہا تھا۔ ارد گرد کے جھونپڑوں میں سوئے ہوئے بستی کے لوگ بھی بیدار ہوگئے۔ دو آدمی مشعلیں اٹھائے دروازوں پر نمودار ہوکر پہاڑیوں کی طرف دیکھنے لگے۔ میں تیزی سے بھاگتا ہوا باہر نکلا اور جلدی میں اس طرف آتے بستی کے سردار سے ٹکرا گیا۔ وہ بے چارہ تو گر ہی پڑا تھا۔ وہ ہانپ رہا تھا۔ خوف سے اس کی آنکھیں پھیلی ہوئی تھیں اور رنگ زرد پڑ چکا تھا۔ ”وہ...... وہ......“ اس سے زیادہ وہ کچھ نہ کہہ سکا۔

میں رائفل اور شکاری چاقو ہاتھ میں لیے بھاگتا ہوا پہاڑی غار کی طرف بڑھنے لگا جہاں چرواہا میری نظروں سے اوجھل ہوا تھا۔ میرے آدمی اور بستی کے دوسرے لوگ میرے پیچھے پیچھے بھاگتے ہوئے جب زلزلے سے ٹوٹ کر گرنے والے ایک پہاڑی ٹکڑے کے عقب میں پہنچے تو منظر بڑا بھیانک تھا۔ ایک خودرو جھاڑی کے پاس چرواہا خون میں لت پت مرا پڑا تھا اور اس کے جسم کے کئی حصوں سے گوشت غائب تھا۔ بستی کے لوگوں نے تو جھرجھری لے کر منہ موڑ لیا۔ عین اس وقت پورا گول روشن چاند بادلوں کی اوٹ سے نکل آیا اور اس کی چاندنی میں لاش بڑی بھیانک دکھائی دینے لگی۔ چرواہے کی بھیڑ بکریاں اِدھر اُدھر بھاگتی پھر رہی تھیں۔ اس وقت شیر کی ڈکار سے ماحول لرزتا تھا۔ کوئی بڑا اور وزنی شیر بڑی غضب ناک آواز میں غرّایا تھا۔ میں چند قدم آگے بڑھ کر دلیری سے رائفل چاروں طرف گھمانے لگا۔ میں نے زرد چاندنی میں غار کے دہانے پر ایک غضب ناک شیر کا منہ اور خونی آنکھیں دیکھ لیں۔ میں نے ایک لمحہ ضائع کیے بغیر غار کی طرف مسلسل فائر کیے لیکن شیر یا شیرنی غار میں گھس کر غائب ہوگئی۔ غار کے کنارے کے چند پتھر خوفناک انداز میں اڑے اور آگ کی کچھ چنگاریاں بھی اندھیرے میں چمکیں۔ اس وقت بستی کے لوگوں میں سے ایک بوڑھا لیکن لمبا سا آدمی تیزی سے چل کر میرے قریب آکر کھڑا ہوگیا۔ میں نے سوالیہ نظروں سے اس کی طرف دیکھا۔ وہ مجھے اور سامنے سرخ غار کی طرف دیکھ کر مخاطب ہوا۔

”سید مقصود علی صاحب! کبھی میں بھی شکاری رہا ہوں لیکن بڑھاپے اور ریڑھ کی ہڈی کے مہروں کی تکلیف کی وجہ سے اب کنارہ کشی اختیار کرچکا ہوں۔ میں جنگل سے گزرتے وقت شیر اور شیرنی کو اکٹھے دو ہرنوں کو تالاب کے کنارے شکار کرتے ہوئے دیکھ چکا ہوں۔ یہ ضرور شیرنی ہے جو اپنے ساتھی کی ہلاکت پر غضب ناک ہوکر چرواہے کو چیر پھاڑ چکی ہے۔“

”بزرگوار! آپ کی معلومات کا شکریہ پر میرا بھی کچھ ایسا ہی شبہ ہے۔“ میں نے مسکراتے ہوئے تائید میں سر ہلاتے ہوئے پھر سرخ غار کی طرف دیکھا۔

”میرے خیال میں شیرنی حاملہ ہے اور حاملہ شیرنی بڑی خطرناک اور وحشی ہوتی ہے۔“ بزرگ شکاری نے اپنا خیال ظاہر کیا۔

”ممکن ہے آپ کا خیال درست ہو۔“ میں نے اثبات میں سر کو جنبش دی۔

”بہرحال آپ بڑے نامی گرامی شکاری ہیں۔ اس کا خاتمہ بھی آپ کے ہاتھوں ہی ہوگا۔“ بوڑھے نے پُر اعتماد لہجے میں میرے کندھے پر ہاتھ رکھتے ہوئے کہا۔

”آپ کی پذیرائی کا شکریہ۔ سب اللہ کا کرم ہے ورنہ بندہ کس قابل ہے۔“ میں نے عجز و انکسار سے سر جھکاتے ہوئے کہا جس سے میرے گلے میں لٹکتا ہوا لفظ اللہ کا سونے کا لاکٹ سنہری چاندنی میں جگمگانے لگا۔ اس وقت پھر شیرنی کی غراہٹ سنائی دی۔ میں تیزی سے سرخ غار کی طرف بھاگنے لگا۔ آسمان پر اب تیزی سے سیاہ بادل پھیلنے لگے تھے اور چاند ان میں پھنس کر وقفے وقفے سے اپنی چاندنی نچھاور کرنے لگا تھا۔

سرخ غار کے دہانے کے قریب چھوٹی چھوٹی ہری بھری اور خشک جھاڑیاں آپس میں ہوئیں اِدھر اُدھر پھیلتی چلی گئی تھیں۔ اچانک ایک گھنی جھاڑی سے ایک چھوٹا سا لیکن بے حد خطرناک سرخ سانپ نکل کر میری دائیں ٹانگ پر حملہ آور ہوا۔ میں نے برقی سرعت کے ساتھ اپنا جوتا ہوا میں اٹھایا اور پھر جیسے ہی زور سے زمین پر مارا میرا نشان خطا نہ گیا۔ سانپ کا کچومر نکل گیا اور اس کا سبز سبز زہر میرے جوتے پر چمکنے لگا۔ میں نے دوربین سینے سے اٹھاتے ہوئے آنکھوں پر لگائی تو سامنے غار حد نگاہ تک ویران دکھائی دے رہا تھا۔ خطرہ کہیں دور جا چکا تھا۔ غار تقریباً ایک فرلانگ تک سیدھا گولائی کی صورت میں آگے بڑھتا چلا گیا تھا پھر بائیں طرف اس کا موڑ دکھائی دے رہا تھا۔

میں جوتے کو صاف کرنے کے لیے جیب سے رومال نکالنا ہی چاہتا تھا کہ ایک اور آفت نازل ہوگئی۔ جھاڑیوں کے درمیان اُگے ہوئے اکلوتے درخت سے روپے کے برابر کی ایک زہریلی مکڑی میرے کندھے پر چھلانگ مار کر گری اس سے قبل کہ وہ زبان نکال کر زخم ڈالتی میں نے اپنے دستانے والے ہاتھ سے اسے برقی سرعت کے ساتھ کندھے سے جھٹک کر پایاں جوتا پوری طاقت کے ساتھ اس پر جما دیا۔ چند لمحے کشمکش سی ہوتی رہی یہ جنگلی مکڑی جو جنگلوں اور ویرانوں میں بسیرا کرتی ہے۔ کافی طاقتور ہوتی ہے۔ وہ میرے جوتے کی نوک کے نیچے مچلتی رہی لیکن سید مقصود علی کی ساری قوتیں اس وقت پوری طرح بیدار ہوچکی تھیں۔ مکڑی کشمکش کے بعد دم توڑ گئی اس کا اوپری حصہ جو کسی گول چھت کی مانند سخت اور کھردرا ہوتا ہے۔ جوتے کے دباؤ سے ٹوٹ چکا تھا اور اس کا وجود پس گیا تھا اس کا نیلا نیلا زہر زرد چاندنی میں عجیب سی سنسنی پیدا کرنے لگا لیکن میں بارہا ایسے مراحل سے گزر چکا تھا چنانچہ میں نے اسے گیند سمجھ کر ٹھوکر ماری اور اس کا مردہ وجود گڑھے میں جا گرا۔ عین اسی لمحے غار کے اندر سے شیرنی کی غراہٹ سنائی دی۔ موسم اچانک ہی بدل کر شدید ہوتا چلا گیا۔ آسمان پر سیاہ بادل پوری طرح پھیل چکے تھے بجلی چمک چمک کر بارش کا اعلان کر رہی تھی۔ ٹھنڈی ہوا کے جھونکے جھاڑیوں سے شائیں شائیں کا شور مچاتے ہوئے گزرتے تو خاموشی کی روح لرز جاتی۔ بعض اوقات تو ایسا گمان ہوتا کہ جیسے ان کے اندر کوئی چھپا ہوا ہے۔

دفعتاً موسلا دھار بارش برسنے لگی۔ میں نے اپنی جیکٹ کے کالر کھڑے کرلیے اور چند لمحے منجمد بارش میں ٹھہرا رہا۔ میرے جوتوں پر لگا سبز اور نیلا زہر دھل گیا۔ عین اسی لمحے

شیرنی کی گرج پھر غار کے اندر سے سنائی دی۔ میرے جسم کے اندر برق سی دوڑ گئی میں رائفل سیدھی کرتے ہوئے غار کی طرف بھاگنے لگا۔ بیس گز کا فاصلہ مجھے بیس فٹ معلوم ہوا۔ غار کے اندر موت تھی لیکن میں غار میں داخل ہونے کے لیے تیار تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے رائفل کندھے سے لٹکا لی اور لمبا شکاری ریوالور نکال کر دائیں ہاتھ میں لے لیا اور بائیں ہاتھ میں چھوٹی مگر طاقتور ٹارچ نکال کر آگے بڑھنے لگا۔

میں غار میں داخل ہوگیا۔ میرے انگ انگ اور رگ رگ میں برقی طاقت سی دوڑ رہی تھی۔ غار کے ماحول میں ایک پُراسراری خاموشی رچی بسی ہوئی تھی۔ راستہ گرد آلود تھا جس پر شیرنی کے آنے اور جانے کے نشانات دکھائی دے رہے تھے۔ غار کی دیواروں پر کثرت سے بڑی بڑی سیاہ مکڑیاں چپکی ہوئیں اپنے جالوں میں اضافہ کررہی تھیں۔

میں جیسے ہی غار کا موڑ مڑا تیز ہوا کا ایک بھیگا ہوا جھونکا میرے چہرے سے ٹکرایا۔ اس کے ساتھ ہی ایک آفت بھی نازل ہوئی۔ غار کے سوراخ سے اندر گھس کر چھپی ہوئی چگادڑیں میری ٹارچ کی روشنی سے بے چین اور مشتعل سی ہو کر میرے چہرے پر حملہ آور ہوئیں۔ میں ریوالور اور ٹارچ مار مار کر انہیں فضا میں منتشر کرنے لگا۔ غار کے سناٹے میں بڑی بڑی سیاہ چگادڑوں کی پھڑ پھڑاہٹ بڑی سنسنی خیز معلوم ہورہی تھی لیکن خوف مجھ پر سوار نہ ہوسکا۔ میں بارہا موت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال چکا تھا۔

کچھ دیر تک مکروہ سی آوازوں میں چلاتیں چگادڑیں غار کے دہانے کی طرف پرواز کرنے لگیں لیکن غار کے باہر موسلا دھار بارش اور تیز ہوا چل رہی تھیں۔ وہ پھر پلٹ کر میری طرف آنے لگیں میں نے بے آواز ریوالور سے مسلسل تین فائر کیے۔ کئی چگادڑیں بھیانک آوازوں کے ساتھ گریں اور باقی طوفانی موسم کی پروا کیے بغیر باہر ٹھنڈی تیز ہوا میں پھڑ پھڑانے لگیں۔

عین اسی لمحے پھر شیرنی کی ایک گرج سے غار گونج اٹھا میں رائیڈر ہیگرڈ کے ناول کے کسی پُراسرار ہیرو کی طرح غار میں آگے بڑھتا رہا۔ غار کی چھت میں دو عدد سوراخ تھے جن سے سرد ہوا اور بارش اندر داخل ہوکر فرش پر پھسلن پیدا کرچکی تھی میں گرتے گرتے بچا لیکن ہمت نہ ہاری اور رفتار کم کرتے ہوئے مسلسل آگے بڑھتا چلا گیا۔

تقریباً ایک فرلانگ کے مسطح راستے کے بعد غار پھر بائیں جانب مڑ گیا تھا۔ میں موڑ پر کھڑا پلکیں جھپکائے بغیر سن گن لیتا رہا لیکن شیرنی وہاں موجود نہیں تھی میں نے موڑ کی طرف جھانکا تقریباً ایک فرلانگ کا راستہ سامنے کھنڈراتی میدان کی طرف نکلتا چلا گیا تھا۔

سیاہ کھنڈرات کے میدان میں کھڑا چاروں طرف اپنا ریوالور گھما رہا تھا۔ بارش اب ہلکی پھوار میں تبدیل ہوچکی تھی۔ آسمان پر بادل پھٹ چکے تھے اور کبھی کبھی زرد چاندنی اور ستاروں کی چمک بادلوں کی اوٹ سے جھانکنے لگتی۔ منظر بڑا ویران اور بھیانک ہورہا تھا۔ یہ کسی تاریخی قلعے یا محل کی مسمار شدہ عمارت تھی۔ میدان کے ارد گرد گول دائرے میں محرابیں اب بھی سلامت تھیں۔ ان کے دوسری جانب گرے ہوئے عمارتی حصے صاف دکھائی دے رہے تھے۔ بڑے بڑے برجوں اور کمروں کے کھنڈر اس وقت سیاہ دیو کی صورت میں بھیانک معلوم ہورہے تھے۔ کہیں سے ایک منحوس الو کے بولنے کی آواز بھی سنائی۔ میں نے چاروں طرف ماحول کا بغور جائزہ لیا اور پھر اپنی ٹارچ کو رائفل کے پوائنٹ پر فکس کر کے رائفل چٹانوں کی طرف گھمانے لگا میرا خیال تھا کہ شیرنی انہی جگہوں پر کہیں چھپی ہوئی ہے۔

میں جیسے ہی کھنڈر میں پہنچا چٹانی حصے میں قدم اٹھا کر اوپر جانے کا قدرتی راستہ دکھائی دے گیا لیکن اچانک کوئی وزنی سی شے میرے دائیں جانب واقع چٹان سے بڑے غضب کے ساتھ حملہ آور ہوکر میرے اوپر آگری۔ میرے ہاتھ سے رائفل نکل گئی۔ میں زمین پر جا گرا لیکن فوراً ہی سنبھل گیا۔ میں اس وقت خود فرشتہ اجل بنا ہوا تھا۔

شیرنی نے پوری طاقت سے غرا کر اپنے پنجے میرے چہرے پر گاڑنے کی کوشش کی۔ میں اس وقت اس کے نیچے دبا ہوا تھا۔ اس کے پنجے میرے جیکٹ میں الجھ کر پھنس گئے جو لچکدار مضبوط ریشوں سے بنوائی گئی تھی۔ شیرنی نے اپنا منہ کھولا اس کی زبان تازہ لہو جیسی سرخ تھی۔ بوجھ سے سانس رکنے لگی۔ میرے ہاتھ اور شیرنی کے پنجے آپس میں الجھے زور آزمائی کررہے تھے۔ میں نے ذرا سا موقع پاکر پستول نکالنے کی کوشش کی لیکن وہ بھی جیب سے پھسل کر کہیں گرچکا تھا۔ اس لمحے بجلی سی چمکی اور میرا وار چل گیا میری پنڈلی سے بندھا ہوا لمبا شکاری چاقو جو کئی مرتبہ درندوں کے خون میں بھیگ چکا تھا ہاتھ میں آیا اور فوراً شیرنی کی گردن میں پیوست ہوگیا۔ اگر میں ایک لمحہ بھی دیر کرتا تو شیرنی میرا چہرہ ہی گردن سے اکھاڑ دیتی لیکن قسمت مہربان تھی۔



پیدل مارچ

طارق عزیز خان

برّاعظم آسٹریلیا کے دشوار گزار صحرائی علاقے کی پیمائش کے لیے پا پیادہ سفر کرنے والے سر پھرے افراد کی انوکھی مہم کا احوال جب رسل و رسائل کا انتظام صفر تھا۔

مہم جوئی کے قصے پسند کرنے والوں کی مدارات

یہ جکارتہ سے ملبورن جانے والی معمول کی پرواز تھی۔ چار سو سیٹوں والا بڑا جمبو جیٹ اس وقت آسٹریلیا کے شمالی حصے پر پرواز کررہا تھا۔ میری سیٹ کھڑکی کے پاس تھی اور نظریں نیچے زمین پر جمی ہوئی تھیں۔ مجھے ہزاروں کلومیٹر دور تک گہرے زرد رنگ کی چادر سی بچھی دکھائی دے رہی تھی۔ یہ وسطی آسٹریلیا کا طویل صحرائی علاقہ تھا۔ میرے لیے یہ حیران کردینے والا منظر تھا۔ میری نظریں گو کہ زمین پر تھیں لیکن دماغ صدیوں پہلے کی ان مہمات میں کھویا ہوا تھا جب چند سر

پھرے بہادر مہم جوؤں نے پیدل اس سرزمین کو پار کرنے کا حیرت انگیز کارنامہ سرانجام دیا تھا۔ میں آپ کو بتاتا چلوں کہ مجھے رائل جیوگرافیکل سوسائٹی آف لندن کی طرف سے ملبورن میں منعقدہ ایک تقریب میں شرکت کرنی تھی۔ یہ تقریب آسٹریلیا کو پیدل پار کرنے والے مہم جوؤں کی یاد میں منائی جارہی تھی۔

میں بیس ہزار فٹ کی بلندی سے آسٹریلیا کی طویل صحرائی وسعت کا اندازہ لگا رہا تھا اور دل ہی دل میں ان بہادروں کو خراج تحسین پیش کررہا تھا جنھوں نے صدیوں پہلے اس خوفناک صحرائی علاقے کو پیدل پار کیا تھا۔ اس سے پہلے کہ میں آپ کو ایک ایسی ہی مہم کا حال بتاؤں ضروری معلوم ہوتا ہے کہ آپ کو آسٹریلیا کے بارے میں بنیادی معلومات فراہم کردی جائیں۔

دنیا کے سب سے چھوٹے براعظم پر مشتمل آسٹریلیا، جنوبی نصف کرّے کا ایک آزاد و خودمختار ملک ہے۔ یہ ایشیا کے جنوب مشرق اور بحرالکاہل کے مغرب میں واقع ہے۔ شمالاً جنوباً تین ہزار اور شرقاً غرباً چار ہزار کلومیٹر لمبے آسٹریلیا کا کل زمینی رقبہ 76لاکھ 82ہزار 300مربع کلومیٹر اور موجودہ (2011) دو کروڑ دس لاکھ نفوس پر مشتمل ہے۔ آسٹریلیا کے ساحلوں کی لمبائی 34218 کلومیٹر ہے اور یہ چاروں طرف سے سمندر میں گھرا ہوا ہے۔ ان سمندروں میں شمال میں واقع آبنائے ٹورس، خلیج کارپینٹریا، بحیرہ آرافورا اور بحیرہ تیمور، جنوب اور مغرب میں بحرہند، مشرق میں بحرالکاہل، شمال مشرق میں بحیرہ کورل اور جنوب مشرق میں بحیرہ تسمانیہ واقع ہیں۔ سمندر پار واقع آسٹریلیا کے قریب ترین ہمسایہ ممالک میں شمال میں نیوگنی، انڈونیشیا اور مشرقی تیمور جنوب مشرق میں نیوزی لینڈ، مشرق میں فجی اور شمال مشرق میں وینا تو اور سولومن اہم ہیں۔ آسٹریلیا سات اکائیوں یا انتظامی حصوں (مغربی آسٹریلیا، شمالی علاقہ، جنوبی آسٹریلیا، کوئنزلینڈ، نیوساؤتھ ویلز، وکٹوریا اور تسمانیہ) پر مشتمل ایک دولت مشترکہ ہے جس کا موجودہ دارالحکومت کینبیرا اور سب سے بڑا شہر اور بندرگاہ سڈنی ہے۔ جبکہ دیگر اہم شہروں میں برسبین، ملبورن، ایڈیلیڈ، ہوبارٹ اور پرتھ نمایاں ہیں۔ آسٹریلیا کو دنیا کا چپٹا ترین براعظم کہا جاتا ہے جس کا 90فیصد حصہ خشک بنجر صحراؤں پر مشتمل ہے۔ جنوبی نصف کرّے میں ہونے کی وجہ سے یہاں جون جولائی میں سردی اور دسمبر میں گرمی پڑتی ہے۔ بیشتر وسطی حصہ خشک صحرائی موسم، شمالی ساحلی علاقے استوائی جبکہ جنوب مشرقی اور جنوب مغربی ساحل معتدل درجہ حرارت ... ہیں۔

آسٹریلیا پر پہلے انسانی قدم 40ہزار سال پہلے ... جب انڈونیشیا سے تعلق رکھنے والے قدیم با... (Aboriginal) نے سمندر پار کرکے شمالی آسٹریلیا میں ... رکھا۔ گوکہ آسٹریلیا کی موجودہ آبادی کا بیشتر حصہ 18... صدی کے بعد یہاں آنے والے یورپین پر مشتمل ہے ... آج بھی براعظم کے شمالی حصے میں آباد قدیم قبائلی اپنی ... شناخت برقرار رکھے ہوئے ہیں۔ یورپین اقوام کو آسٹریلیا ... بارے میں پہلی باقاعدہ معلومات 13ویں صدی عیسوی ... دوران ملیں جب یونان اور اٹلی کی بندرگاہوں تک ر... حاصل کرنے والے عرب تاجروں نے ایشیا کے جنوب ... میں ایک وسیع صحرائی علاقہ واقع ہونے سے متعلق انکشاف کیے۔ اطالویوں نے اسے "ٹیرا آسٹریلیس" (Terra Australis) کا نام دیا جس کا لاطینی زبان میں مطلب "جنوب میں واقع سرزمین" ہے۔ اس نام کی وجہ تسمیہ وہ ... رومن کہانیاں ہیں جن کے مطابق قدرت نے زمین کا توازن قائم کرنے کے لیے جنوبی نصف کرّے کے انتہائی جنوب ... ایک وسیع خطہ پیدا کیا تھا۔ تاہم ان کہانیوں میں مو... آسٹریلیا سے متعلق کوئی حقیقی معلومات نہیں ملتیں۔ 16... صدی کے آغاز پر انڈونیشیا کی سیاحت کرنے والے پرتگا... نے آسٹریلیا سے متعلق افواہوں کو درست قرار دیا۔ ... پرتگالیوں کی توجہ ہندوستان پر مرکوز ہونے کا فائدہ انگریز... نے اٹھایا اور سولہویں صدی کے آخر میں ایک سے زیادہ مہمات آسٹریلیا کی طرف روانہ کی گئیں۔ متعدد مہم جوؤں ... آسٹریلیا کا نظارہ کرنے کا دعویٰ کیا لیکن وہ اپنے دعوے ... حق میں کوئی دلیل پیش نہ کرسکے۔ آسٹریلیا کو دریافت کر... والا سب سے پہلا غیر متنازعہ یورپی، ولندیزی مہم جو "ولیم جا... تھا جس نے مارچ 1606ء میں شمالی آسٹریلیا میں وا... جزیرہ نما کیپ یارک میں قدم رکھا۔ ولیم جانز نے خلیج ... رسائی کا باقاعدہ نقشہ تیار کرکے برطانیہ روانہ کیا۔ 18ویں صدی کے آخر میں برطانیہ نے آسٹریلیا کی ملکیت کا دعویٰ کیا۔ 19ویں صدی کے دوران یورپی تاجروں اور عا... باشندوں نے سونے کی تلاش میں آسٹریلیا کا رخ کیا جن ... اکثریت برطانیہ سے تعلق رکھتی تھی۔ یورپ سے آنے وا... بیشتر لوگوں نے آسٹریلیا کے معتدل ساحلوں کو آباد کیا۔ جن ... میں جنوب میں نیوساؤتھ ویلز اور وکٹوریا کے جنوب مشرقی ...

...نمایاں تھے۔ آج بھی آسٹریلیا کی 80فیصد آبادی ...شرقی ساحلی علاقے، 10فیصد مغربی اور باقی شمالی ...پر آباد ہے۔

...آسٹریلیا کی پانچ فیصد سے بھی کم آبادی ملک کے وسطی ...حصے میں واقع قصبوں میں آباد ہے۔ ملک کی انتظامیہ ...کینبرا میں ہے لیکن انھیں چار ہزار کلومیٹر کے ...میں پھیلی ہر چھوٹی بڑی آبادی کے بارے میں مکمل ...حاصل ہیں۔ ملبورن اور سڈنی کو شمال میں ڈارون ...میں پرتھ سے ملانے کے لیے جدید ترین ہائی ویز کی ...موجود ہے۔ ملک کے ہر گھر میں بجلی اور انٹرنیٹ کی ...موجود ہے۔ یہ ممکن ہی نہیں کہ ملک کے طول و عرض ...کوئی آبادی کسی بھی نوع کی ناگہانی آفت سے دوچار ...کینبرا انتظامیہ اس آفت سے بے خبر رہ جائے۔ ...ت میں آسٹریلیا کی برق رفتار ترقی کا راز صدیوں پہلے ...اس پیدل چھان بین کا نتیجہ ہے جس کے دوران کئی ...ویر اپنی جان سے ہاتھ دھو بیٹھے۔

قریب دوسو سال پہلے آسٹریلیا کے ہزاروں کلومیٹر کے ...اور غیر دریافت شدہ علاقوں کی پیدل چھان بین کوئی ...کام نہیں تھا لیکن ملک کو یکجا اور مساوی ترقی دینے کے ...چھان بین نہایت ضروری تھی۔ 19ویں صدی کے وسط ...کٹوریا کی انگریز انتظامیہ نے آسٹریلیا کے ساحلی شہروں کو ...گراف سروس سے منسلک کرنے کے اقدامات شروع ...یہی وہ پس منظر تھا جس میں آئرش نژاد آسٹریلوی مہم جو ...اوہارا برکے نے سروے کی غرض سے آسٹریلیا کو جنوب ...شمال تک پیدل پار کرنے کی مہم ترتیب دی۔

رابرٹ اوہارا برکے چھ مئی 1820ء میں آئرلینڈ کی ...ساحلی پٹی پر واقع شہر گیل وے میں پیدا ہوا۔ اس نے ...1ء میں وولوچ رائل ملٹری اکیڈمی انگلینڈ میں داخلے ...لیے امتحان دیا جس میں ناکامی کے بعد وہ قسمت آزمائی ...لیے بلجیم چلا گیا۔ برکے نے بلجیم سے فوجی تربیت مکمل کی ...1841ء میں آسٹرین فوج میں شمولیت اختیار کرلی۔ اس ...اگلے چھ سال فوج میں گزارے لیکن کوئی نمایاں کارنامہ ...انجام نہ دے سکا۔ فوج کی گھٹی بندھی زندگی اسے راس نہ ...اور ایک دن آسٹریا کو خیر باد کہہ دیا۔ وہ 1847ء میں ...لینڈ پہنچا۔ کچھ عرصہ آوارہ گردی میں گزارا اور 1848ء ...آئرش پولیس سے وابستہ ہوگیا۔ 1852ء میں وہ پولیس کی ...سے بھی تنگ آگیا اور 1853ء میں برطانیہ کی نوآبادی آسٹریلیا ہجرت کرگیا، جہاں اسے جنوب مشرقی آسٹریلیا کی ریاست وکٹوریا کی نئی تشکیل شدہ پولیس فورس میں بھرتی کرلیا گیا۔

برکے کو آسٹریلیا راس آگیا۔ یہاں ترقی اور کام کرنے کے بے شمار مواقع تھے۔ برکے نے اگلے چھ سال وکٹورین پولیس کی ملازمت میں گزارے اور بتدریج ترقی کرتے ہوئے نمایاں عہدے پر پہنچ گیا۔ یہ وہ وقت تھا جب وکٹوریا کی حکومت آسٹریلیا کے جنوبی و شمالی ساحلی شہروں کو ٹیلی گراف سروس سے منسلک کرنے کے اقدامات میں مصروف تھی۔ اس سلسلے میں سب سے پہلا مرحلہ جنوب سے شمال تک کے 3250 کلومیٹر طویل علاقے کا سروے تھا۔ یہ ایک جان لیوا اور مشکل کام تھا۔ کوئی نہیں جانتا تھا کہ آسٹریلیا کا وسطی علاقہ کیسا ہے؟ وہاں کا موسم کیسا ہے؟ راستے میں کس قسم کی مشکلات پیش آسکتی ہیں؟ تاہم ملک کو یکجا رکھنے کے لیے یہ کام کرنا نہایت ضروری تھا۔ وکٹورین حکومت نے برطانوی اخبارات میں اشتہارات دیے اور آسٹریلیا کو پیدل پار کرنے والے جانبازوں کے لیے مراعات کا اعلان کیا۔ درجنوں مہم جوؤں نے آسٹریلیا کا رخ کیا۔ انھی میں سے ایک 43 سالہ اسکاٹش مہم جو جان میکڈوئل اسٹوارٹ بھی تھا۔ اسٹوارٹ نے 1858ء سے 1860ء کے درمیانی عرصے میں آسٹریلیا کو پار کرنے کی پانچ مہمات سرانجام دیں۔ تاہم وہ وسطی آسٹریلیا کے خشک صحرائی موسم اور خوراک کی کمی کی وجہ سے آدھا فاصلہ ہی طے کرپایا۔ اسٹوارٹ اپنی چھٹی مہم کی منصوبہ بندی میں مصروف تھا کہ رابرٹ اوہارا برکے نے اس سے ملاقات کی۔ برکے نے اسٹوارٹ سے راستے کی مشکلات پر بات چیت کی۔ اس نے اسٹوارٹ کے بنائے نقشے دیکھے اور اعلان کیا کہ وہ آسٹریلیا کو پار کرنے کی کوشش کرے گا۔ برکے نے ملبورن کے پولیس چیف سے ملاقات میں اپنے ارادے کو ظاہر کیا۔ یہاں تک کہ اسے ایک ٹیم کے ساتھ مہم کی اجازت دے دی گئی۔ برکے کی مہم کا مقصد ملبورن سے شمال میں خلیج کارپینٹاریا تک کے علاقے کا سروے تھا۔ مہم میں حصہ لینے کے لیے برکے سمیت کل 19افراد کا انتخاب کیا گیا جن میں برکے کا نائب جارج جیمز لینڈلز، چارلس گرے، جون کنگ، ولیم براہے اور سینئر سرویئر، ولیم جون وِلز (1834-1861) نمایاں تھے۔ مہم کے لیے ضروری سازوسامان کے ساتھ 27اونٹ اور 23صحت مند گھوڑے مہیا کیے گئے۔

رابرٹ اوہارا برکے نے اپنی قیادت میں چھ لوگوں پر

مشتمل ایک ایڈوانس پارٹی تشکیل دی۔ اس نے جارج جیمز لینڈلز کی قیادت میں مہم کے بڑے حصے کو پیچھے آنے کی ہدایت کی اور 20 اگست 1860ء میں ملبورن سے اپنی پیدل مہم کا آغاز کیا۔ اس وقت تک جنوب کے علاقوں میں موسم سرما اپنے عروج پر تھا اور ملبورن سمیت گردونواح کے علاقے برف میں ڈھکے ہوئے تھے۔ تاہم برکے جانتا تھا کہ جوں جوں وہ شمال کی طرف بڑھے گا موسم بتدریج گرم مرطوب ہوتا جائے گا۔ اس نے اونٹوں پر شمال کی طرف سفر کا آغاز کیا۔ وہ ستمبر میں نیوساؤتھ ویلز کی حدود میں داخل ہوا۔ اس نے 23 ستمبر کے دن نیوساؤتھ ویلز کے مغرب میں خط استواء سے 32.24 ڈگری جنوب اور 142.25 ڈگری مشرق کے خط پر واقع مے نائن ڈی کے قصبے میں پہلا پڑاؤ ڈالا۔ دو دن کے وقفے سے اس کی پیچھے رہ جانے والی ٹیم بھی ان سے آملی۔ تاہم اس مقام پر سات افراد برکے کا ساتھ چھوڑ گئے، جن میں اس کا نائب جارج جیمز لینڈلز نمایاں تھا۔ جانے والے اپنے ساتھ سات گھوڑے اور تین اونٹ بھی لے گئے۔ اب برکے کے ساتھ اس سمیت کل بارہ افراد کا گروپ تھا۔ ان کے پاس اب بھی خشک خوراک کا ایک بڑا ذخیرہ جبکہ 24 اونٹ اور 16 گھوڑے تھے۔ برکے نے ولیم جون ولز کو اپنا نائب مقرر کیا اور ایک ہی گروپ بنا کر مہم دوبارہ شروع کی۔

اس کے قافلے نے اکتوبر کے آخر میں نیوساؤتھ ویلز کے شمال میں آسٹریلیا کے سب سے لمبے دریا ڈارلنگ (لمبائی 2739 کلومیٹر) کو پار کیا۔ وہ نومبر کی شروعات میں کوینز لینڈ کے جنوب میں واقع مقام کوپر کریک پہنچے۔ اس وقت تک انھوں نے اٹھارہ سو کلومیٹر کا پیدل سفر طے کرلیا تھا۔ برکے کو اندازہ تھا کہ انھیں لگ بھگ اتنا ہی سفر اور درپیش تھا۔ اس علاقے میں دلدلی جھیلوں کی بھرمار تھی اور شکار کی بھی کوئی کمی نہیں تھی۔ اب موسم گرما شروع ہوچکا تھا۔ برکے نے کوپر کریک کے مقام پر ایک سپلائی ڈپو کی بنیاد رکھی۔ اس نے ولیم براہے کو ڈپو کا نگران مقرر جبکہ اس کے ساتھ پانچ دیگر لوگوں کو بھی وہیں رکنے کا حکم دیا۔ برکے نے ڈپو میں 22 اونٹ اور 12 گھوڑے چھوڑ دیے۔ اس نے ولیم کو ہدایات دیں کہ وہ ان کی واپسی تک خوراک کے لیے شکار پر انحصار کریں اور اونٹوں کو بچا کر رکھیں۔

برکے کی قیادت میں جون کنگ، چارلس گرے اور ولیم جانز ولز پر مشتمل چار لوگوں کے گروپ نے چار گھوڑوں اور دو اونٹوں کے ساتھ 16 دسمبر 1860ء کے دن اپنا سفر دوبارہ شروع کیا۔ انھوں نے جنوری 1861ء کے وسطی علاقے خط جدی کو پار کیا۔ یہ آسٹریلیا میں موسم گرما کا عروج تھا۔ مقام پر انھیں پہلی مرتبہ براعظم کی وسعت کا احساس ہوا۔ وہاں پانی ناپید تھا اور میلوں تک خشک بنجر علاقے کے سوا کچھ دکھائی نہ دیتا تھا۔ برکے اور اس کے ساتھی تمام تر مشکلات باجود اپنے راستے کا نقشہ بنانے، موسمی حالات کو نوٹ کرنے اور راستے میں آنے والی ہر نمایاں شے پر نشان لگانے کا کام کرتے جارہے تھے۔

خوش قسمتی سے آنے والے ہفتوں کے دوران کچھ معمول کے مطابق رہا اور وہ 9 فروری 1861ء کے دن کارپینٹریا کے کنارے پہنچ گئے۔ انھوں نے خط استواء سے 17.30 ڈگری جنوب اور 141 ڈگری مشرق کے خط پر دریائے فلنڈر کے دہانے کے قریب سے خلیج کا نظارہ کیا۔ ایک تاریخی دن تھا۔ وہ آسٹریلیا کو پار کرنے والے پہلے افراد بن چکے تھے انھوں نے ناممکن کو ممکن کر دکھایا تھا۔ برکے نے خلیج کے کنارے ایک پتھر پر اپنے وہاں پہنچنے کی تاریخ لکھی اور چند نشانات لگائے۔ اس نے وہاں کیمپ لگا کر چار دن تک آرام کیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں سے کہا کہ چند ہفتوں تک موسم گرما ختم ہوجائے گا اور وہ آنے والی سردیوں کے دوران واپسی کا سفر مکمل کرنے کی کوشش کریں گے۔ اس نے اپنے ساتھیوں کا حوصلہ بڑھایا۔

"دوستو، ہمیں اپنی خوراک بچا کر رکھنی ہوگی اور اپنا ارادہ بھی۔"

رابرٹ او ہارا برکے نے 13 فروری 1861ء کے دن واپسی کا سفر شروع کیا۔ وہ جنوب کی طرف جانے والے مقررہ راستے پر چلتے رہے۔ مارچ کی شروعات میں بارشوں میں کمی کی وجہ سے ان کی مشکلات کا آغاز ہوا۔ مارچ کے وسط میں وہ لوگ خط جدی پر پہنچے۔ ان کے پاس خشک خوراک کا ذخیرہ ختم ہوچکا تھا۔ برکے اور اس کے ساتھیوں نے شکار کی تلاش میں کیمپ لگایا۔ یہ ایک دلدلی علاقہ تھا۔ انھوں نے رات کے وقت خرگوشوں اور گلہریوں کی تلاش شروع کی۔ خرگوش تو نہ ملے البتہ برکے کو ایک دلدل میں سے پانچ کلو وزنی سانپ پائی تھن مل گیا۔ اس نے اپنے ساتھیوں کی مدد سے سانپ کا شکار کیا۔ اس کا سر کچل کر کھال اتاری اور گوشت بھون کر کھایا۔ وہاں دلدل میں سانپوں کی بھرمار تھی۔ تاہم برکے اور اس کے ساتھیوں کی اصل مشکل پانی کا حصول تھی۔ اپریل کے آغاز تک چاروں یورپین پانی کی کمی کی وجہ سے انتہائی کمزور ہوچکے

انھوں جنوب کی طرف پیدل سفر جاری رکھا۔ وہ نشان لگے ہوئے اپنے جانے پہچانے راستے پر سفر کر رہے تھے لیکن ان کی مشکلات بڑھنے لگی تھیں۔ جنوبی نصف کرّے میں موسم سرما شروع ہوچکا تھا۔ گو کہ درجۂ حرارت پانچ ڈگری سینٹی گریڈ کے آس پاس تھا، تاہم خشک سرد موسم کی وجہ سے بھوک اور پیاس دونوں ہی ناقابل برداشت تھے۔ وہ لوگ سانپ اور چھپکلیاں کھا کر عاجز آچکے تھے۔ ایک دن برکے نے ساتھیوں کے اصرار پر بھوک مٹانے کے لیے ایک اونٹ ذبح کیا تاہم بھنا ہوا گوشت معدے میں پہنچتے ہی پانی کی طلب بڑھ گئی۔ اگلے ایک ہفتے کے دوران وہ لوگ نمی کی تلاش میں راستے میں آنے والی ہر سبز شے کو کھا گئے لیکن ان کے جسم سوکھ کر کانٹا ہوگئے تھے۔ برکے کی تحریک پر انہوں نے اپنا پیشاب تک پیا لیکن صورت حال جوں کی توں رہی۔ یہاں تک کہ 17 اپریل کے دن چارلس گرے کمزوری کے باعث نڈھال ہو کر گر گیا۔ اس کے ساتھیوں نے دکھی دل کے ساتھ گرے کو ایک درخت کے نیچے دفنایا اور سفر جاری رکھا۔ خوش قسمتی سے اگلے چار دن خیریت سے گزر گئے اور وہ بالآخر 21 اپریل 1861ء کے دن اپنے سفر کے ابتدائی پڑاؤ کوپر کریک تک پہنچنے میں کامیاب رہے۔ وہ لوگ دیوانہ وار سپلائی ڈپو کی جانب بڑھے تاہم یہ دیکھ کر ان کی مایوسی کی انتہا نہ رہی کہ قریبی میدان میں دوڑتے دو بھوکے گھوڑوں کے سوا وہاں اور کوئی موجود نہیں تھا۔ ولیم جون ولز نے کوپر کریک میں وقت ضائع کرنے کی بجائے جنوب میں واقع سفر کے پہلے پڑاؤ مے نائن ڈی جانے کی تجویز پیش کی جسے برکے نے مسترد کردیا۔

برکے نے اپنے ساتھیوں کو قائل کرلیا کہ انھیں امداد آنے تک کوپر کریک ہی میں رکنا چاہیے۔ بدقسمتی سے کوپر کریک میں قیام کے دوران حالات بد سے بدتر ہوگئے۔ جون کے دوران درجۂ حرارت نقطۂ انجماد سے گر گیا۔ پہلے ہی خوراک کی کمی کا شکار تینوں مہم جو بے رحم سردی کا شکار ہو کر بیمار پڑ گئے۔ وہ آنکھوں میں امید کے دیے جلائے کسی انہونی کے منتظر تھے کہ 28 جون 1861ء کے دن رابرٹ او ہارا برکے اور ولیم جون ولز زندگی کی بازی ہار گئے۔ جون کنگ نے حوصلہ کرکے دونوں ساتھیوں کو سپلائی ڈپو کے صحن میں دفنایا۔ اس نے سروے سے متعلق نقشے اور ضروری سامان کو سب سے بہتر گھوڑے پر لادا اور کوپر کریک سے روانہ ہوگیا۔ جون کنگ کا گھوڑا کمزور چال چلتا ہوا دریائے ڈارلنگ کے قریب پہنچا جہاں شکار پر نکلے مقامی ابورجنل قبائلیوں کی اس پر نظر پڑ گئی۔ مقامی لوگ، جون کنگ کو اپنی بستی میں لے گئے۔ انھوں نے اسے خوراک مہیا کی اور اس کا علاج کیا۔

جولائی کے آخر میں ایڈیلیڈ سے روانہ ہوئی ایک امدادی پارٹی جون کنگ تک پہنچ گئی۔ اس امدادی پارٹی کی راہنمائی ولیم براہے کررہا تھا جسے برکے نے کوپر کریک کے ڈپو کا انچارج مقرر کیا تھا۔ جون کنگ نے ستمبر اکتوبر میں ملبورن پہنچ کر وکٹوریا کی انگریز انتظامیہ کو مہم سے متعلق ولیم جون ولز کی تحریر اور راستے کا نقشہ پیش کیا۔ یہ تحریر اس بات کا ثبوت تھی کہ رابرٹ او ہارا برکے اور اس کے جواں ہمت ساتھی مرنے سے پہلے اپنی ذمہ داریاں بخوبی پوری کرچکے تھے۔ جون کنگ کی نشاندہی پر 1862ء کی شروعات میں برکے اور ولز کے مردہ جسموں کو کوپر کریک سے ملبورن لایا گیا۔ 23 جنوری 1862ء کے دن دونوں مہم جوؤں کی ملبورن ... میں آخری رسومات ادا کی گئیں، ٹھیک اسی دن اسکاٹس نژاد آسٹریلوی مہم جو، جون میڈول اسٹورٹ نے اپنی چھٹی مہم (1861-62) کے دوران آسٹریلیا کو جنوب سے شمال تک پار کرنے کے بعد ایڈیلیڈ میں اپنی کامیابی کا جشن منایا۔ گو کہ مہم سے زندہ سلامت واپس لوٹنے کی وجہ سے اسٹوارٹ کی مہم کو آسٹریلیا پار کرنے والی پہلی کامیاب مہم کا درجہ حاصل ہے، تاہم رابرٹ او ہارا برکے، اسٹوارٹ کے خلیج کارپین ٹاریا تک رسائی سے کئی ماہ پہلے ہی آسٹریلیا کو پار کرنے کا مشن پورا کرچکا تھا۔

رابرٹ او ہارا برکے نے آسٹریلیا کو جنوب سے شمال تک پار کرنے کی مہم کے دوران کل 7 ہزار کلومیٹر کا سفر طے کیا۔ گو کہ وہ زندہ ملبورن واپس نہ پہنچ سکا تاہم اس نے مرنے سے پہلے اپنے سپرد کیا گیا مشن کامیابی سے مکمل کیا۔ اس کی مہم کے نتیجے میں وکٹوریا، نیوساؤتھ ویلز اور کوینز لینڈ کے علاقے کا سروے ممکن ہوا۔ جس کے بعد جنوبی اور شمالی آسٹریلیا کو نہ صرف ٹیلی گراف سروس سے منسلک کردیا گیا بلکہ ملبورن سے براستہ کوپر کریک ایک پکی سڑک خلیج کارپین ٹاریا تک تعمیر کردی گئی۔ آج آسٹریلیا میں رابرٹ او ہارا برکے اور اس کے بہادر ساتھیوں کو قومی ہیروز کا درجہ حاصل ہے۔ آسٹریلیا کے طول وعرض میں متعدد مقامات کو ان کے نام سے منسوب کیا گیا ہے جن میں خلیج کارپین ٹاریا کے کنارے واقع قصبہ برکے ٹاؤن نمایاں ہے۔

ماڈل گرل

اے آر بھٹی

بالی ووڈ کے بے شمار ستارے ابھرے اور ڈوب گئے لیکن اس ماڈل گرل کی بات ہی کچھ اور تھی۔ مختصر سی زندگی لائی تھی مگر یادوں کی صورت میں بہت کچھ چھوڑ گئی۔



ہالی ووڈ کی ایک ساحرہ کا بیان

”نکی...... نکی...... کم آن...... چھوڑو ان گندے لڑکوں کو...... یہ تمہیں چوٹ لگا دیں گے۔“

گیارہ سالہ نکی کی ماں بیلہ نے اسے پکارا۔ بیلہ ایک تمیں بتیس سالہ قبول صورت اور مناسب خدوخال کی خاتون تھی۔ اس نے لمبا سا اسکرٹ پہن رکھا تھا، جو خاصا میلا ہو رہا تھا۔ سر پہ بندھے سفید اسکارف سے پتا چلتا تھا کہ وہ اس وقت کچن میں مصروف تھی اور اسی دوران اسے اپنی سات سالہ بیٹی کا خیال آ گیا تھا جو بیک یارڈ میں کھیل رہی تھی۔ تب تک وہ اس سے مطمئن تھی، لیکن جب اس نے مسٹر جارج، روبن اور مسز کیتھرین...... کے لڑکوں کی آوازیں سنی تو کام چھوڑ کر اسے باہر آنا پڑا۔

”ممی! پلیز! تھوڑا سا اور کھیل لینے دو ناں، ابھی تو جنگل (اسٹاپو ٹائپ کی گیم) شروع ہوئی ہے۔“

گیارہ سالہ گول مٹول سی گڑیا جیسی شکل و صورت کی بچی نے گردن موڑ کر ماں کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔ جوڈی اور پال جو نکی سے ایک دو برس ہی بڑے تھے۔ انہوں نے نکی کو دبوچ رکھا تھا۔ پال نے اس کی ٹانگیں پکڑ رکھی تھیں اور جوڈی اس کے جسم کے اُوپری حصے کو تھام رکھا تھا گویا ڈنڈا ڈولی کیے تھے۔ نکی کی ماں کو دیکھتے ہی انہوں نے اسے فوراً چھوڑ دیا۔

”یہ کیسا گندا کھیل، کھیل رہے ہو تم...... مجھے بالکل پسند نہیں۔“ بیلہ اپنے ہاتھ اسکرٹ سے پونچھتی ہوئی چوبی تھڑے سے اتر کر بیک یارڈ میں اُتری اور جوڈی اور پال کی طرف غصے سے گھورتے ہوئے انداز میں بڑھی۔ وہ دونوں بچے سہم گئے۔ باقی بچے دم دبا کر بھاگ کھڑے ہوئے۔

”تمہیں شرم نہیں آتی...... اس طرح ایک معصوم سی بچی کو اٹھاتے ہیں؟“

”مم...... میڈم! اس نے خود کہا تھا کہ مجھے ایسے اُٹھاؤ۔“ پال نے ہمت کر کے کہا۔

”یس مما! ان کا کوئی قصور نہیں ہے، میں نے ہی کہا تھا ایسا کرنے کو۔“ نکی نے اپنے ہم عمر دوستوں کی حمایت کی مگر وہ سب اس کی ماں کا غصہ دیکھ کر بھاگ کھڑے ہوئے۔ نکی رو پڑی۔ بیلہ کے دل پر اس کے رونے کا کوئی اثر نہ ہوا۔ وہ اسے بازو سے کھینچ کر اندر لے آئی۔

بیلہ کے مزاج میں یہ سختی دراصل ان پیش آمدہ حالات کے سبب تھی جو نکی کے باپ گرے اسکپ کے اس ناروا سلوک کی وجہ سے تھی جو اسے چھوڑ کر نجانے کہاں جا چکا تھا، اس بات کو اب دس سال بیت چکے تھے۔

بیلہ فطرتاً رومان پسند تھی۔ اگر اس کا کوئی پرانا ساتھی اس کے آج والے مزاج کو دیکھ لیتا تو حیران ہوئے بغیر نہ رہتا بلکہ اس کے چڑچڑے پن کو دیکھتے ہوئے بے اختیار کہہ اُٹھتا کہ ”کیا یہ وہی دس سال پہلے والی بیلہ ہے، جو نرم گفتار تھی، محبت بھرا دل رکھنے والی، مسکراہٹ کی حامل ہوا کرتی تھی؟“

بیلہ نے نکی کے باپ سے ٹوٹ کر محبت کی تھی۔ مگر گرے اسے چھوڑ کر جا چکا تھا۔ بیلہ کو پہلے پہل گرے کے اس طرح چھوڑ کر چلے جانے کا یقین ہی نہیں آتا تھا۔ اس نے اسے بہت ڈھونڈنے کی کوشش کی تھی۔ پولیس میں بھی اس کی گمشدگی کی رپورٹ درج کرا چکی تھی، کیونکہ کچھ لوگوں کا کہنا تھا کہ ممکن ہے گرے کے ساتھ کوئی حادثہ پیش آ گیا ہو۔

یہ قلعی بھی دس پندرہ دن بعد کھل گئی جب گرے کا اسے فون موصول ہوا۔ وہ کسی دوسرے شہر کے پبلک بوتھ سے بول رہا تھا۔

”بے وقوف! میرے پیچھے پولیس کیوں لگا دی ہے؟ میں کوئی کھو یا تھوڑی ہوں، بس تم سے بیزار ہو گیا تھا۔ ہمارے راستے جدا ہیں۔ لہٰذا پولیس کو بتا دو کہ ایسی کوئی بات نہیں وہ میرا پیچھا چھوڑ دیں۔“

اس کی بات سن کر بیلہ کا دل اس قدر ٹوٹ گیا کہ اس نے گرے کو لعن طعن بھی نہ کی اور خاموشی سے فون رکھ دیا۔ یہی وہ وقت تھا جب اس نے چپ سادھ لی اور گیارہ ماہ کی نکی کو ہی اپنی توجہ کا مرکز بنا لیا۔

نکی گیارہ برس کی ہو چکی تھی مگر اسے اپنی ماں بالکل پسند نہ تھی، اسے اپنے دوست عزیز تھے، وہ بھی صرف لڑکے۔ لڑکیوں سے اس کی کبھی دوستی نہیں ہوئی۔ پتا نہیں کیا بات تھی کہ وہ اپنے گروپ میں لڑکوں کو ہی رکھتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ کسی لڑکی کے ساتھ کوئی لڑکا بھی دیکھ لیتی تو اسے اپنی طرف کھینچ لیا کرتی تھی۔

ماں کی پابندیاں اور ڈانٹ پھٹکار نے نکی کی نفسیات پر منفی اثر ڈالا تھا۔ وہ اس سے ناراض رہنے لگی۔ سولہ سال کی عمر میں اس کی ماں کا اچانک انتقال ہو گیا۔

نکی کو دکھ بھی تھا مگر اب وہ خود کو ہلکا پھلکا اور آزاد محسوس کر کے خوش اور مطمئن تھی۔ یہاں تک کہ اسے پرسے کے لیے آئے ہوئے لوگوں سے بھی اُلجھن ہونے لگی۔ وہ اکیلے گھر میں آزادی سے دوڑتی اور خوش ہوتی پھر رہی تھی۔ نہیں جانتی تھی کہ ماں کے بعد اس کے لیے آیندہ کے حالات کس قدر سخت آنے والے تھے۔ ابھی اس کا ذہن کچا تھا۔

تیسرے دن لینڈ لارڈ کی طرف سے اسے مکان خالی کرنے کا نوٹس مل گیا۔ کیونکہ نکی اب کرایہ ادا کرنے کے قابل تھی نہ ہی گھر سنبھالنے کے۔ جو کچھ جمع جتھا تھا وہ ختم ہو چکا تھا۔

نکی کو وہ دن اچھی طرح یاد ہے جب اس کے پاس کھانے کو کچھ نہ بچا تھا اور وہ کسی چوہیا کی طرح کچن میں گھٹنوں ... اور کہنیوں کے بل رینگ رینگ کر کچھ کھانے کو تلاشتی پھر رہی تھی۔

یہاں اس کی زندگی نے ایک عجیب پلٹا کھایا۔ اسے رشتوں سے زیادہ دولت کی اہمیت کا اندازہ ہونے لگا۔ مکان ابھی اس نے نہیں چھوڑا تھا۔ سوشل سیکیورٹی سے اسے تھوڑے بہت پیسے ملنے لگے تھے۔ لینڈ لارڈ کو اس نے کسی طرح بے دخل کرنے سے روک دیا تھا مگر اسے کرایہ ملتے رہنے کی تسلی کرانا ضروری تھا، صرف سوشل سیکیورٹی کے ہر ماہ ملنے والے چیک سے بات نہیں بن سکتی تھی، چیک کی رقم بس اتنی ہی ہوتی کہ نکی دو وقت کی روٹی کھا سکتی تھی اور کسی بار یا پب میں آدھا پیگ یا ایک کافی پی سکتی تھی۔

خود نکی کو سوشل سیکیورٹی والوں سے ملنے والے یہ چیک ہزیمت کا باعث محسوس ہوتے تھے جنہیں وہ عجیب و غریب انسانوں کے درمیان میں گھنٹوں لائن لگا کر کھڑی ہو کر حاصل کرتی تھی۔

وہ صورت سے ہی شہزادی لگتی تھی لیکن حقیقت ایک یہ بھی تھی کہ ذلت کی کھائی میں ہی انسان کو اپنے بارے میں صحیح پتا لگتا ہے۔ جب وہ اس ''خیرات'' کی لائن میں کھڑی ہوتی تو کئی لوگوں کے جملے سننے کو ملتے۔ ''اوہو...... کیسی حسین شہزادی ہے۔ دولت تو خود اس کے قدموں میں ہونی چاہیے، یہ بھلا یہاں کیوں آگئی؟''

''ہائے! اس پری وش کو تو کسی محل میں ہونا چاہیے تھا، قسمت بھی کیسے کیسے لوگوں کو کہاں لے آتی ہے۔''

''اسے تو ہالی ووڈ کی ایکٹریس ہونا چاہیے تھا۔''

نکی کو اپنے بارے میں سننے والے یہ جملے ہرگز برے نہیں لگتے تھے۔ تب اُس نے ایک دن آئینے میں اپنا تفصیلی جائزہ لیا۔ وہ خوبصورت نہیں تھی، نہ ہی اس میں حسینوں والی کوئی کشش تھی۔ آنکھوں میں بھی کوئی دلکشی نہیں تھی۔ بہت بے کشش سی چھوٹی آنکھیں تھیں۔ قد البتہ دراز تھا، یہ کوئی بڑی خوبی نہ تھی۔ بال گولڈن تھے۔ رنگ گورا تھا۔ ان خوبیوں کو بھی حسن کے پہلے درجے میں شمار نہیں کیا جا سکتا تھا۔

''پھر وہ لوگ جو لائن پر لگے تھے، کیا بکواس کر رہے تھے۔''

نکی جھلا کر بڑبڑائی۔

صرف سترہ برس کی عمر میں وہ ایک لوکل فرائیڈ چکن ریسٹورانٹ میں نوکری کرنے لگی۔ زندگی کی گاڑی کو کچھ دھکا لگ گیا تھا۔ مگر وہ خود کو لوگوں کی نظروں سے کھوجنے کی کوشش کر رہی تھی جن کا خیال تھا کہ نکی ایک شہزادی ہے اور یہ ہالی ووڈ پر راج کر سکتی ہے۔

سوچ سوچ کر وہ پاگل ہوئی جا رہی تھی۔ بالآخر یہ بھید اس کے بچپن کے پڑوسی اور دوست جوڈی نے ہی کھولا۔ ''نکی! تم بہت حسین ہو...... بہت زیادہ......''

وہ دونوں اس وقت نکی کے گھر کے بیک یارڈ میں ایک چوبی بینچ پر بیٹھے تھے۔ شام جھکنے لگی تھی اور نیلا آسمان سیاہ ہونے لگا تھا۔

''بکواس کرتے ہو تم سب۔'' وہ چڑ کر کہتی اور دوسروں کی باتیں بھی بتاتی جو اس کے بارے میں ایسے ہی خیالات رکھتے تھے۔

''میں تمہارا بچپن کا دوست ہوں، کیا میں بھی بکو[illegible] کر رہا ہوں۔'' جوڈی بولا۔

''میں نے تو آئینے میں خود کو ہزار بار دیکھا ہے، [illegible] خاص خوبی نہیں ہے مجھ میں۔'' وہ منہ بسور کر بولی۔ ''[illegible] سترہ سال ہے اور ابھی سے میرا وزن۔''

''یہی تو تمہاری غلطی ہے کہ تم اپنا حسن آئینے میں [illegible] کرتی ہو۔'' جوڈی نے اس کی بات کاٹی۔

''کیا مطلب؟'' نکی نے سوالیہ نگاہوں سے اس [illegible] طرف دیکھا۔

''یہی کہ اگر تم خود کو آئینے میں دیکھو گی تو بے [illegible] لگو گی۔''

''تو پھر تم ہی مجھے ایسا کوئی آئینہ لا دو جس میں، میں [illegible] نظر آؤں۔'' نکی نے ہنس کر کہا۔

''تم ایک مخصوص مزاج کے لوگوں کے لیے واقعی [illegible] ہو۔ مگر اب تم اپنا حسن آئینے میں مت دیکھنا۔''

''تو کہاں دیکھوں پھر؟''

''باتھ روم میں......'' جوڈی نے معنی خیز مسکراہٹ [illegible] کہا اور نکی کا چہرہ شرم سے سرخ ہو گیا۔ اس نے ہنستے ہو[illegible] مصنوعی غصے کے اظہار میں جوڈی کی پشت پر ایک عدد تھپڑ [illegible] کر دیا۔ پھر دونوں ہنستے ہوئے ایک دوسرے کے پیچھے دوڑ[illegible] لگے۔

☆......☆

نکی...... یعنی اینا نکول اسمتھ 28 نومبر 1967 [illegible] میکسیا میں پیدا ہوئی۔ اس کی مشکل حل کرنے والا اس کے بچپن کا دوست جوڈی ہی تھا۔ اینا نکول کو وہ کبھی نہیں بھولا تھا۔ نکول نے اس کے مشورے پر عمل کیا تو وہ خود ہی حیران ہو گئی۔ وہ واقعی ایک مخصوص مزاج کے لوگوں کے لیے شہزادی ہی تھی۔ اس [illegible] خدوخال بہت قیامت خیز تھے۔

وہ سستے سے ریستوران کی گھٹیا نوکری کرتے کر[illegible] اُکتا گئی تھی۔ ملکی سیاسی حالات خراب ہونے کے باعث ا[illegible] سوشل سیکیورٹی کی طرف سے چیک ملنا بھی بند ہو گئے [illegible] گزارا مشکل ہونے لگا تھا۔ لینڈ لارڈ نے ایک بار پھر ا[illegible] مکان خالی کرنے کا الٹی میٹم دے دیا تھا کیونکہ اینا نکول دیر دیر سے کرایہ دے پاتی تھی۔

مجبوراً اس نے بلے اسمتھ نامی شخص سے صرف سترہ برس کی عمر میں شادی کر لی۔ جو صرف ایک سال ہی چل سکی اینا نکول نے بھی اپنی ماں جیسی ہی قسمت پائی تھی کہ اس

[illegible] شوہر بھی ایک بچہ اس کی گود میں تھما کر کہیں [illegible] بنا۔ اینا کو مردوں سے نفرت ہونے لگی اور اس نے سوچا کہ [illegible] انہیں صرف یوز ٹو کے سوا، کوئی اہمیت اور حیثیت نہیں دے [illegible]۔ اسی سوچ کے متوازی اس نے آگے چل کر بڑی تہلکہ [illegible] حرکت کی تھی اور وہ بھی اس وقت جب وہ اپنے [illegible] (ماڈلنگ) کے نقطۂ عروج پر تھی۔

ڈینئل Daniel کی پیدائش 1984 میں ہوئی تھی۔ [illegible] کی پرورش اب اینا نکول کے ہی ذمے تھی، مگر اسے اپنے بیٹے [illegible] محبت تھی۔ اس نے اسے ایک لمحہ کے لیے بھی خود سے جدا نہ [illegible] کیا تھا لیکن اپنی زندگی میں آنے والے پہلے مرد کی بے وفائی [illegible] اس کا دل اندر سے جھیروں جھیر کر ڈالا تھا۔ وہ اپنے حوالے [illegible] ہی نہیں اپنے ننھے منے بیٹے ڈینئل کے حوالے سے بھی یہ [illegible] سوچ کر گھٹ جاتی تھی کہ کاش اس کا باپ (شوہر) اسے [illegible] چھوڑ کر نہ جاتا تو کتنا اچھا ہوتا۔ ڈینئل بھی ماں کے ساتھ اپنے [illegible] کی شفقت و محبت کے زیر سایہ رہتا۔ ادھر ہی پہلی بار اس [illegible] سگریٹ نوشی شروع کر دی۔

اس نے ایک دن اپنی کچھ تصاویر ''پلے بوائے'' نامی [illegible] مشہور میگزین کو بھیج دیں۔ بس! وہ دن تھا اس کی کایا پلٹ [illegible]۔ اسے ماڈلنگ کی آفرز آ گئیں۔

وہ ''پلس سائز لیڈیز فیشن میگ'' کے زیر جامہ کی [illegible] ماڈلنگ کے لیے چن لی گئی تھی۔

وہیں سے اس کی تقدیر بدلنے لگی۔ اس نے ماڈلنگ کے [illegible] اپنی آنکھوں میں مستقبل کی ''مارلن منرو'' Marilyn Monroe بننے کے خواب سجائے تھے۔ مگر وہ جوڈی کی بات [illegible] بھول گئی تھی کہ وہ صرف ایک مخصوص مزاج کے حامل لوگوں کے [illegible] دلوں کی رانی بن سکتی تھی۔

اینا نکول جسم کی بھاری تھی۔ تاہم اسمارٹ تھی۔ ماڈلنگ [illegible] اس نے بہت نام کمایا۔ اپنے عروج کے دور میں اسے جب [illegible] فلموں میں کام کرنے کی آفرز ملیں تو وہ خوشی سے نہال [illegible] ہو گئی۔ اسے اپنے خوابوں کی تعبیر چند گام کے فاصلے پر ہی [illegible] نظر آنے لگی۔

اس کی چند مشہور فلمیں قابلِ ذکر ہیں، جن میں، اسکائی [illegible] اسکریپر، ایک ایکشن مووی تھی۔ نیکڈ گن، ایک کامیڈی ایکشن [illegible] ٹو دی لمٹ، ایکشن فلم۔

نکول اسمتھ ترقی کی شاہراہ اوج پر ابھی گامزن ہی تھی [illegible] نہ جانے اسے کیسے اندازہ ہونے لگا کہ اس کی شہرت اور کام [illegible] چراغ ڈوبنے والا ہے۔ دولت کمانے کا جو خواب اس نے

ذات پات کی تقسیم

برہمن کے وجود میں آنے سے وہ آریہ جو کھلے میدانوں میں سورج اور روشنی کی عبادت کرتے تھے، مندروں کی تعمیر میں مصروف ہو گئے۔ ہزاروں دیوی دیوتاؤں کے لیے ہزاروں اقسام کے مندر تعمیر کیے گئے، جن پر برہمن مسلط ہو گئے۔ معاشرت کی اس منزل پر پہنچنے کے بعد اونچی اور نیچ ذاتیں مختص کی گئیں۔ یہ تخصیص برہمنوں کے ایماء پر کی گئی۔ نیچ ذاتوں کا کام صرف اونچی ذات والوں کی سیوا تھا۔ انسانی تاریخ نے اپنے کسی دور میں بھی اتنے ذلیل فلسفہ عمل کو نہیں اپنایا۔ اونچ نیچ کا تصور کسی انتظامی بنیاد پر قائم نہیں تھا بلکہ برہمنوں نے اس کی دوامی بنیادیں وضع کرنے کے لیے ایک فلسفے کی تخلیق کی تھی جو آوا گون یا تناسخ کہلاتا ہے۔

مرسلہ: ظہیر الدین۔ مظفر گڑھ

لڑکپن سے دیکھا تھا وہ پورا ہوتے ہوتے اُدھورا رہ جانے والا تھا۔ بعض لوگوں میں یہ صلاحیتیں ہوتی ہیں کہ وہ اپنے اطراف میں اور خود پر بڑی گہری نگاہ رکھتے ہیں اور انہیں اندازہ ہونے لگتا ہے کہ یہ سب زیادہ عرصہ نہیں چل سکتا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ نکول اسمتھ میں کوئی فن کمال نہ تھا، جو کچھ اسے حاصل ہو رہا تھا وہ صرف اور صرف اس کی جسمانی حشر سامانی کا ہی مرہونِ منت تھا۔

یہ ایک ایسا ہتھیار تھا جس کے کارتوس ایک حد تک ہی چلا کرتے تھے، کیونکہ اس نے ماڈلنگ یا فلموں میں کلی طور پر عریانیت پر ہی انحصار کیا تھا اور مغربی معاشرے میں یہ چیزیں بہت سستی کہلاتی تھیں۔ لیکن ناقدین کے خیال کے مطابق جب نکول اسمتھ کو ''مارلن منرو'' سے مماثلت کا خطاب ملا تھا تو اسے چاہیے تھا کہ عریانیت کو چھوڑ کر خالصتاً فن پر توجہ دیتی تو بہت آگے جاتی۔

اینا نکول نے ایک دھاکا کر ڈالا۔ یہ وہی دھاکا تھا جس کا ذکر ہم مندرجہ بالا سطور میں کر چکے ہیں، اینا نکول نے محض چھبیس سال کی عمر میں ایک ننانوے سالہ (89) بوڑھے اور ضعیف شخص سے شادی کر لی۔ اس کے شوہر کا نام مارشل تھا۔ وہ

ایک نہایت دولت مند اور ایک بڑا بزنس ٹائکون تھا۔ یہ بے جوڑ شادی 1994 میں ہوئی تھی۔ اس کا شوہر زیادہ عرصہ زندہ نہ رہ سکا۔ اینا نکول نے اپنی حق وراثت کے لیے کورٹ میں دعویٰ کردیا کیونکہ مارشل کا جوان شادی شدہ بیٹا، روبرٹ اور بیٹی شیمن اینا نکول کو اپنے باپ کی بیوی سمجھتے ہی نہیں تھے۔ اینا نکول نے اپنا سارا زور اس مقدمے کو لڑنے میں لگادیا۔ اس کا مرحوم اور عمر رسیدہ شوہر ایک بڑے اسٹیٹ کا مالک تھا، اینا نکول اس میں حصہ چاہتی تھی تاکہ باقی زندگی سکون سے اپنے بیٹے ڈینئل کے ساتھ سکون اور عیش سے گزار سکے۔ مگر وائے تقدیر اور ہائے نصیب کہ اسے تھوڑی سی دولت کے سوائے کچھ حاصل نہ ہوسکا۔

اینا نکول سخت دل برداشتہ ہوگئی۔ اس نے دوبارہ ماڈلنگ کا رخ کیا، مگر اس کے شائقین، اس کی ایک بڈھے سے شادی کے بعد وہ پہلے والا رسپانس نہ دے سکے۔ وہ ان کے دل سے اُتر چکی تھی۔ ابھی نکول اس ''نقصان'' سے سنبھل بھی نہیں پائی تھی کہ اس کا بیٹا جو عنفوان شباب کی منزل پر پہنچ چکا تھا۔ ایک دن اچانک اینا نکول پر یہ انکشاف ہوا کہ اس کا اٹھارہ سالہ بیٹا ڈینئل ''ڈرگ ایڈیکٹو'' ہے۔ وہ اینٹی ڈیپریسنٹ کے ساتھ ساتھ ماری جوانا اور دیگر نشہ آور اشیاء کا عادی ہوگیا تھا۔

یہ بارہ نومبر کی شام کا ذکر تھا۔ ڈینئل اوور ڈوز کا شکار ہوا تو اینا نکول پر یہ تھرا دینے والا انکشاف ہوا۔ جب اس نے بیٹے کے کمرے سے عجیب و غریب آوازیں آتی ہوئی سنیں۔ وہ اسی طرح اُٹھ کر اس کے کمرے کی طرف بھاگی، کمرا خالی اور اندر اندھیرا تھا۔ باتھ روم میں روشنی ہورہی تھی۔ اینا نکول ہراساں دوڑتی اور بیٹے کو پکارتی ہوئی باتھ روم کی طرف لپکی۔

''ڈینئل......ڈینی......ڈینی......'' اس نے زور سے دروازے کو ٹھوکر مارا دروازہ کھل گیا اندر کا منظر اس کے لیے، ایک ماں کے لیے دل دہلا دینے کے لیے کافی تھا۔

اس کا جواں سال بیٹا ڈینئل جو اس وقت بیس سال کا تھا۔ باتھ روم کے فرش پر بے سدھ گرا لیٹا پڑا تھا۔

ڈینئل جانبر نہ ہوسکا تھا۔ ڈرگ اوور ڈوز اس کے جواں سال بیٹے کی موت کا سبب بنی تھی۔

ڈینئل کے دوستوں سے اینا نکول نے شکایت کی کہ انہوں نے اسے کیوں نہیں بتایا کہ اس کا بیٹا پہلے سے ڈرگ ایڈیکٹو تھا، انہوں نے کوئی جواب نہ دیا۔ وہ شرمندہ تھے۔ چند ایک نے کہا کہ ڈینئل نے سختی سے منع کر رکھا تھا۔ البتہ ڈینئل کی گرل فرینڈ للی نے اینا کو رُندھے ہوئے لہجے میں حقیقت بتائی کہ ڈینئل کو لڑکوں کا ایک شرارتی ٹولہ اس کی ماں کے حوالے سے ذہنی کچوکے لگایا کرتا تھا۔

مگر اینا نکول نے اپنے مرحوم بیٹے کی اس گرل فرینڈ للی کی بات کو من گھڑت قرار دیا۔ اس کا کہنا تھا کہ ڈینئل نے آج تک اس سے اس موضوع پر کوئی بات تک نہ کی تھی۔ وہ اس کے ساتھ خوش تھا۔ بہت خوش اور مطمئن۔

اینا نکول نے ہمت نہیں ہاری......اس نے پھر ایک سے گنتی اسٹارٹ کی اور ایک بار پھر ماڈلنگ کے بام عروج پر جا پہنچی۔ دوسری بار کامیابی حاصل کرنا معمولی بات نہ تھی۔ یا پھر شاید اینا نکول کو زندگی نے اتنے جھٹکے دیئے تھے کہ وہ بھی اس کی ایک طرح سے ''شہرت'' کا ہی سبب بنے تھے۔ تاہم اس میں کیمرا مین اور ماہر فوٹو گرافر شیمون پال کا بھی ہاتھ تھا۔ وہ اس کا بوائے فرینڈ بنا۔ اسی نے ہی اینا نکول کو نئے سرے سے ڈھال کر ایک بار پھر فیشن اور ماڈلنگ کی دنیا میں مقبول کروایا۔ اس سے اینا نکول کی بیٹی بھی تھی۔ بعد میں اینا نے اسی فوٹو گرافر سے شادی کرلی تھی۔

سب کچھ اب معمول پر آگیا تھا۔ اینا نکول اپنے فوٹو گرافر شوہر اور بیٹی، کوہی کے ساتھ ہنسی خوشی اور گھریلو زندگی گزار رہی تھی۔ مگر لوگ دبے دبے لفظوں میں یہ کہتے پائے گئے تھے کہ اینا کے اندر اپنے جوان بیٹے ڈینئل کی موت کا دکھ ہے۔ مگر اس سے زیادہ دکھ اینا کو اس بات پر تھا کہ اسے پتا ہی نہ چل سکا کہ اس کا جواں سال بیٹا ڈینئل ڈرگ ایڈیکٹو (منشیات کا عادی) تھا اور اسے پتا ہی نہ چلا۔ کاش! معلوم ہوجاتا تو وہ اپنے بیٹے کا بروقت علاج کروالیتی۔

کہتے ہیں یہ ایک پھانس تھی جو نکول کو اندر سے تڑپائے ہوئے تھی۔

8 فروری 2007 کو صرف 39 برس کی عمر میں ماڈلنگ اور فیشن میگزین کی دنیا میں چمکنے والا یہ ستارہ اچانک غروب ہوگیا۔

اینا نکول اپنے بیڈ روم میں اسی طرح مردہ حالت میں پائی گئی تھی جس طرح اس کا بیٹا کچھ عرصہ پہلے باتھ روم میں مردہ پایا گیا تھا۔ اینا کے جواں سال بیٹے کی اچانک موت اور اب اینا نکول کی بھی بالکل اسی طرح مرگ ناگہاں پر ایک عرصے تک اس کے شائقین کو یقین نہیں آرہا تھا۔ کیونکہ اینا نکول کی موت بھی اپنے بیٹے ڈینئل کی طرح تنہائی میں منشیات کی زیادہ مقدار لینے پر واقع ہوئی تھی۔

حقیقی اداکار

عمر جٹ

اس نے اداکاری کی دنیا میں خود کو مستحکم کرنے کے لیے دن رات ایک کردیا اور عالمی طور پر ایوارڈز حاصل کرنے کا فخر حاصل کیا۔ اس نے ثابت کیا کہ اداکاری میں جان ڈالنے کے لیے انتھک محنت ضروری ہے۔

ہالی ووڈ کے ایک اداکار کی جہد مسلسل کا مختصر سا جائزہ

ہالی ووڈ کی فلمیں ہر عمر، رنگ، نسل اور قوم کے لوگوں کی پسندیدہ ہیں۔ اسی طرح کچھ ستارے جو اپنے کام اور پرفارمنسز کی وجہ سے جیتے جی امر ہوجاتے ہیں ایسے ہی ستاروں میں ایک نام ہے۔

لیونارڈو ڈی کیپریو کا۔

لیونارڈو گیارہ نومبر 1974 کو لاس اینجلس کیلیفورنیا میں پیدا ہوا۔ لیونارڈو کی والدہ لیگل سیکرٹری جبکہ والد ایک آرٹسٹ، پروڈیوسر اور کتابوں کا ڈسٹری بیوٹر تھا۔ ڈی کیپریو



اپنے آپ کو آدھا روسی بھی کہتا تھا کیونکہ اس کے گرینڈ پیرنٹس کا تعلق روس سے تھا۔

لیونارڈو کا نام لیونارڈو رکھنے کے پیچھے بھی ایک مزیدار کہانی ہے۔ جب لیونارڈو پیدا ہونے والا تھا اس کی ماں ایک گیلری میں گئیں جب وہ مشہور مصور لیونارڈو ڈی ونچی کی بنائی ہوئی تصاویر دیکھ رہی تھیں اس وقت لیونارڈو نے پہلی دفعہ کک کیا اس لیے اس کی ماں نے اس کا نام لیونارڈو رکھ دیا۔ لیونارڈو ایک سال کا تھا جب اس کے والدین کے درمیان علیحدگی ہوگئی اس لیے اس کا بچپن گھن چکر کی طرح کبھی یہاں کبھی وہاں گزرا۔

لیونارڈو نے اپنی تعلیم سیڈز ایلیمنٹری اسکول اور جانارشل ہائی اسکول سے حاصل کی۔ ہائی اسکول کے تیسرے سال وہ ڈراپ ہوگیا کیونکہ وہ GED کرنا چاہتا تھا۔

لیونارڈو کا بچپن اپنے گرینڈ پیرنٹس کے ساتھ جرمنی اور اٹلی میں گزرا۔

لیونارڈو نے اپنے سفر کا آغاز کمرشلز اور تعلیمی شارٹ فلمز سے کیا۔ لیونارڈو کو ٹی وی پہلا بریک 1989 میں ملا جب انہیں ایک شارٹ لیوڈ سیریز میں شامل کیا گیا جو کہ پیرنٹ ہڈ فلم پہ بنائی گئی تھی۔ اس سیریز سے لیونارڈو کو پہلے ایوارڈ کے لیے نامزد کیا گیا۔

لیونارڈو نے اپنا فلمی سفر اسکائی فائی ہارر فلم کرٹر تھری سے کیا جس میں لیونارڈو نے ایک لینڈ لارڈ کا کردار نبھایا تھا اس کے فوراً بعد اس نے ABC پہ چلنے والے ایک سٹ کام میں شمولیت اختیار کی۔ لیونارڈو کو پہلا بریک تھرو 1992 میں ملا جب رابرٹ ڈی نیرو نے چار سو نوجوانوں میں سے لیونارڈو کو دی بوائز لائف میں مرکزی کردار کی پیشکش کی۔

1993 میں لیونارڈو نے واٹس ایٹنگ گلبرٹ گریپس نامی فلم میں جانی ڈیپ کے بھائی کا کردار ادا کیا۔ اس کردار کے لیے لیونارڈو کو متعدد ایوارڈز کے لیے نامزد کیا گیا۔ 1995 میں لیونارڈو کی پہلی فلم دی کوئیک اینڈ دی ڈیڈ تھی اس کے بعد لیونارڈو نے متعدد فلمز میں کیا جن میں ٹوٹل ایکلپس شامل ہے۔

1996 کا آغاز کافی اچھا رہا لیونارڈو نے ولیم شیکسپیئر کے لکھے مشہور ڈرامے جولیٹ میں اپنی اداکاری کے جوہر دکھائے جو کہ باکس آفس پہ ہٹ ثابت ہوئی۔

1997 کا سال لیونارڈو کی زندگی کا بہترین سال ثابت ہوا اس سال وہ جیمز کیمرون کی رومینٹک ٹریجک ڈراما فلم ٹائٹینک میں جلوہ گر ہوئے اور راتوں رات شہرت کے آسمان کی بلندیوں پہ پہنچ گئے۔ 23 سال کی عمر میں نبھایا ہوا ان کا کردار امر ہو گیا اور ٹائٹینک دنیا کی سب سے زیادہ بزنس کمانے والی فلم بن گئی اور اس کا یہ ریکارڈ جیمز کیمرون کی ہی فلم اوا تار نے توڑا۔ ٹائیٹینک سب سے زیادہ آسکرز جیتنے کا بھی ریکارڈ رکھتی ہے۔ اس فلم نے گیارہ آسکرز اپنے نام کیے جس میں بیسٹ فلم کا ایوارڈ بھی شامل ہے اس کے علاوہ ابھی تک گیارہ ایوارڈ کا ریکارڈ بین ہار اور دی لارڈ آف رنگز: ریٹرن آف کنگ کے پاس ہے۔

☆......☆

لیونارڈو نے اپنے فلمی سفر میں پچاس سے زیادہ فلموں اور ڈراموں میں کام کیا اور 200 سے زیادہ ایوارڈز کے لیے نامزد ہوئے جن میں چھ آسکر چار بافٹا اور گیارہ گولڈن گلوب کی نامزدگیاں شامل ہیں۔ لیونارڈو نے اپنا پہلا اکیڈمی ایوارڈ فلم دی ریوینٹ میں اپنی عمدہ اداکاری کے جوہر دکھا کر حاصل کیا اس کے علاوہ وہ تین گولڈن گلوب ایوارڈز سمیت چھیاسی ایوارڈ جیت چکے ہیں۔

لیونارڈو کا کیریئر بہت سی عمدہ فلموں اور ... بہت سے جاندار کریکٹرز سے بھرا ہوا ہے جس میں دی باسکٹ بال ڈائریز، ٹائیٹینک، دی بیچ، کیچ می اف یو کین، ایوی ایٹر، بلڈ ڈائمنڈ، دی ڈیپارٹڈ شٹر آئی لینڈ، انسپشن، دی گریٹ گیٹس بائی، وولف آف وال اسٹریٹ ریوینٹ اور بیفور دی فلڈ شامل ہیں۔ لیونارڈو نے 2004 میں اپنا پروڈکشن ہاؤس شروع کیا جس کے اندر وہ اب تک پندرہ سے زائد فلمز پیش کر چکے ہیں۔

لیونارڈو اداکار اور سپر اسٹار ہونے کے ساتھ ساتھ بہت اچھے دل کے مالک ہیں اور سوشل سرگرمیوں میں کافی آگے آگے رہتے ہیں۔ ماحولیاتی تبدیلیوں کے متعلق ان کے کام کو بہت سراہا گیا اسی وجہ سے انہیں 2001 میں مارٹن لتھن انوائرمنٹ ایوارڈ سے بھی نوازا گیا۔ 2007 میں گلوبل وارمنگ کے متعلق ڈاکومینٹری دی الیونتھ آر میں مرکزی کردار ادا کیا۔ لیونارڈو بہت سی آرگنائزیشن کا حصہ ہیں جن میں ورلڈ وائلڈ لائف، گولڈن گرین یو ایس اے اور انٹرنیشنل فنڈ فار اینیمل فیئر شامل ہیں۔

نومبر 2010 میں ایک زلزلے کے بعد متاثرین کے لیے ایک ملین ڈالر کا عطیہ دیا اور اسی سال وائلڈ لائف کنزرویشن کو بھی ایک ملین ڈالر کا عطیہ دیا۔ 2013 میں لیونارڈو نے گلاڈ میں 61000$ کا عطیہ دیا۔

فلموں میں بھرپور کامیابی اور خوش قسمتی کے باوجود اپنی نجی زندگی میں وہ اب تک اکلوتے ہیں بہت سی ہیروئنز اور ماڈلز کو ڈیٹ کرنے کے باوجود وہ غیر شادی شدہ ہیں جن میں بار ریفلی، ایما برٹن اور گزیل شامل ہیں۔

لیونارڈو نے اپنی زندگی میں کبھی ڈرگز نہیں لیں۔ جب وہ اپنی فلم دی وولف آف وال اسٹریٹ کا کردار ادا کر رہے تھے تو کردار میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے انہوں نے آن سیٹ ایک ڈرگ ایکسپرٹ ہائر کیا تھا اور یوٹیوب وڈیو دی ڈرنکیسٹ مین آف دی ورلڈ سے کافی مدد حاصل کی۔

☆......☆

جیسے ہی لیونارڈو کی فلم ٹائٹینک ریلیز ہوئی افغانستان میں طالبان نے زیادہ باربرز کو گرفتار کرلیا جو نوجوانوں کے بال لیونارڈو کے اسٹائل میں کاٹ رہے تھے۔ تمام باربرز کو گورنمنٹ کی طرف سے ایک خط لکھا گیا جس میں اس ویسٹرن ہیئر کٹ کی مذمت کی گئی اور ٹائٹینک کو افغانستان میں بین کر دیا گیا۔

لیونارڈو اس وقت سب سے زیادہ ہائی گروسنگ ایکٹر ہیں اور انہوں نے آج تک کسی سیکوئل میں کام نہیں کیا۔ پانچ سال کی عمر میں پہلی دفعہ کیپریو نے ٹی وی شو میں حصہ لیا۔ امیٹیشن گیم میں پہلے کیپریو کو کاسٹ کیا تھا لیکن کچھ ذاتی وجوہات کی بنا پر وہ یہ کردار ادا نہ کر سکے۔

لیونارڈو جب پہلی دفعہ آڈیشن دینے گئے تو ان سے کہا گیا کہ اپنا نام بدل لیں کیونکہ یہ نسلی تعصب کو شو کرتا ہے لیکن لیونارڈو نے ایسا کرنے سے انکار کر دیا اس لیے انہیں وہ کردار نہ مل سکا۔ لیونارڈو اپنی ساری زندگی آبسیسو کمپلسو ڈس آرڈر کے ساتھ گزار رہے ہیں اور وہ اس بیماری کی وجہ سے بہت سے کام ایک سے زیادہ دفعہ کرنے کی کوشش کرتے ہیں۔

بلڈ ڈائمنڈ کی شوٹنگ کے درمیان لیونارڈو نے ایک افریقن بچی کو گود لیا اور اس کی کفالت کی ذمہ داری لی اور آج تک ہر مہینے اسے ایک چیک بھیجتے ہیں اور اس سے بات کرتے ہیں۔

ڈیاگو ان چینجڈ کی شوٹنگ کے دوران اس کے ایک شدید ڈرامہ سین کے لیے اپنی مٹھی اتنی زور سے میز سے ٹکرائی کہ خون نکل آیا اور اسی حالت میں لیونارڈو نے سین مکمل کروایا۔ اپنے کرداروں میں حقیقت کا رنگ بھرنے کے لیے لیونارڈو کسی بھی حد تک چلے جاتے ہیں ریوینٹ کی فلمبندی منفی پچیس ڈگری درجہ حرارت میں کروائی۔

لیونارڈو کی زندگی محنت اور لگن سے بھرپور ہے۔ اپنی محنت اور حوصلے کی بدولت وہ شہرت کی بلندیوں پہ پہنچ گئے۔ لیونارڈو کی زندگی سب کے لیے ایک خوبصورت سبق رکھتی ہے اگر آپ اپنا کام محنت اور ایمانداری سے کرتے رہتے ہیں تو منزل ایک دن آپ کے قدم ضرور چومتی ہے اور آپ کامیاب ہوتے ہیں جس طرح لیونارڈو چھ آسکرز کی نامزدگیوں اور بہت سے سالوں کی محنت کے بعد اکیڈمی ایوارڈ جیتنے میں کامیاب ہوئے۔

سراج الدین ظفر

اپنے زمانے کی نامور ادیبہ بیگم زینب عبدالقادر کے فرزند سراج الدین ظفر ولد عبدالقادر مشہور اشاعتی ادارے فیروز سنز لمیٹڈ لاہور کے مالک و بانی مولوی فیروز الدین کے داماد اور کراچی میں ان کے شوروم کے منیجر تھے۔ لائٹ ہاؤس کراچی میں ان کی دکان میں کراچی کے تمام ہی معروف اہل قلم اور شعراء کی آمدورفت رہتی تھی۔ 25 مارچ 1912ء کو وہ جہلم میں پیدا ہوئے۔ تاہم شادی کے بعد کاروبار کے باعث عمر کا تمام حصہ کراچی میں گزارا۔ اردو کے علاوہ انگریزی میں بھی ان کے مضامین اور نظمیں شائع ہوا کرتی تھیں ان کو جسٹس آف پیس کا خطاب بھی دیا گیا۔ آغاز میں چند رسائل کی ادارت کی اور محکمہ تعلیم کی درخواست پر اسکول کے لیے نصابی کتب تحریر کیں۔ پہلا مجموعہ ''غزال وغزل'' 1968ء میں اور دوسرا ''زمزمہ حیات'' 1970ء میں شائع ہوا۔ افسانوں کا مجموعہ آئینے، مشاہیر کے خطوط، جمعیت اقوام پر ایک نظر اور تنقیدی مطالعہ کا مجموعہ صحیفہ ادب سراج الدین ظفر کی مشاقی فکر اور مطالعے کے آئینہ دار و ثبوت ہیں۔ 6 مئی 1972ء کو اپنے منفرد لب ولہجہ کا یہ شاعر دنیائے فانی سے رخصت ہو کر اپنی یادوں کے انمٹ نقوش چھوڑ گیا۔ فوجی قبرستان کراچی میں آخری آرام گاہ ملی۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم

مرسلہ: ظفر عابدی۔ کراچی

ناسور

ڈاکٹر عبدالرب بھٹی

وہ ایک سیدھا سادہ معصوم فطرت نوجوان تھا اور اس کے گرد سازشی ذہنیت والوں کا انبوہ تھا۔ ایسے سازشیوں کے لیے وہ ترنوالہ تھا۔ یہی وجہ تھی کہ وہ ان کے پھیلائے ہوئے تارعنکبوت میں پھنسا چلا جارہا تھا کہ اسے احساس ہوا کہ اب مفر کی کوئی راہ نہیں ہے۔ اسے بھی ان کا جواب دینے کے لیے خم ٹھونکنا ضروری ہے اور پھر اس نے کمر کس لی۔ انہی کے لہجے میں انہیں جواب دینے کی کوشش کی۔

ایک ایسی طویل کہانی جس کا ہر باب ایک نئی کہانی ہے۔

قسط نمبر: 17

گذشتہ اقساط کا خلاصہ

رانا بشیر نے پولیس بلوائی۔ پولیس کے سامنے شاہ میر کے آدمیوں نے بیان دیا کہ وہ لوگ شاہ میر کو نہیں جانتے۔ ہم وہاں سے نکلے تو فوزیہ کا فون آگیا کہ کچھ کرو۔ میں نے چاچا انور سے بات کی۔ انہوں نے فکرمندی کا انداز اختیار کیا اور اس سوچ میں پڑ گیا کہ انور شاہ ایسی کیا بات کرنا چاہتے ہیں۔ پھر وہ مجھے ساتھ لے کر نکل پڑے۔ راستے میں بولے کہ عطا محمد انکار کرسکتا ہے کیونکہ یہ لوگ برادری سے باہر رشتہ نہیں کرتے ہیں گھر پہنچ کر میں نے عاصمہ کو بتایا اسی وقت دستک ہوئی۔ باہر پولیس والے تھے۔ وہ بولے کہ تمہیں ثمیر کے اغواء کے الزام میں گرفتار کیا جاتا ہے۔ مجھے تھانے لایا گیا۔ وہاں انسپکٹر رجب علی تھا۔ زنیرہ نے ضمانت کرائی کالیا کے ساتھ آرہا تھا کہ راکا سے مڈبھیڑ ہوگئی۔ اس نے ہمیں گھیرنے کی کوشش کی فائرنگ کی آواز پر بھیڑ جمع ہوگئی ہم کسی نہ کسی طرح فرار ہونے میں کامیاب ہوگئے۔ عاصمہ کی ضد پر اگلے دن رشتہ مانگنے عطا محمد کے گھر گئے لیکن اس نے انکار کردیا۔ ہم گھر آئے۔ اگلے دن کالیا پہنچا ہی تھا کہ بجی کا فون آگیا۔ اسے ہم نے ثمیر کی حفاظت کے لیے رکھا تھا۔ جب وہاں پہنچے تو بجی نے بتایا ثمیر مرچکا ہے۔ شاہ میر کے بیٹے ثمیر کو اغوا کر کے کالیا نے جہاں رکھا تھا وہاں اس کی نگرانی کے لیے بجی کو بٹھایا گیا تھا اس نے فرار کی کوشش کرنے کی وجہ سے ثمیر کو گولی ماردی۔ اس حادثے پر ہم سب پریشان ہوا تھے تھے لیکن لاش کو چھپانا بھی ضروری تھا، اسے لے جاکر میں نے ہائی وے پر پھینکا۔ ادھر رانا بشیر اپنی بیٹی کے لیے پریشان تھا کیونکہ وہ شاہ میر کے قبضے میں تھی۔ تھانے سے انسپکٹر دلشاد کا فون آگیا کہ فوراً آکر مجھ سے ملو۔ اس سے ملاقات ہوئی تو احساس ہوا کہ وہ بھی میرے دشمنوں کے ساتھ ملا ہوا ہے۔ لاری اڈے کی نوکری ختم ہوچکی تھی۔ رانا بشیر نے مجھے اپنی کمپنی میں عہدہ دے کر بحرین بھیجنے کا کہا۔ میں باہر جانے سے قبل فوزیہ سے ملنا چاہتا تھا۔

(اب آگے پڑھیں)

میری خود اپنی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ آخر فوزیہ کا نمبر کیوں بند جارہا تھا؟ ایک تو میں پہلے ہی اس کی وجہ سے اداس اور پریشان تھا اور اب تو اس کی طرف سے مجھے تفکیر آمیز تشویش بھی ہونے لگی تھی۔

نجانے وہ بے چاری کس حال میں تھی؟ فون پر بات ہوجاتا بھی تو اب غنیمت ہی رہا تھا۔ اس طرح کم ازکم دل کا بوجھ ہلکا ہوجاتا اور ایک دوسرے کی خیروعافیت کا بھی معلوم ہوتا رہتا۔ حالات سے بھی آگاہی رہتی مگر اب تو جیسے سب کچھ تاریکی کے دبیز پردے کے پیچھے چلا گیا تھا۔ ایسے میں جبکہ میں ایک مہم پر بیرون ملک جانے والا تھا۔ مجھے جانے سے پہلے فوزیہ سے بات کیے بغیر کہاں چین آتا؟

''ابے لے جگری! تو کہاں گم ہوگیا؟'' اچانک کالیا نے مجھے گہری سوچ میں ڈوبا پا کر کہنی کا ٹہوکا مار کے کہا۔

''ادھر ہی ہوں یار!'' بے اختیار میرے منہ سے نکلا اور کالیا ہلکے سے ہنس پڑا لیکن پھر فوراً ہی سنجیدہ ہوتے ہوئے بولا۔

''سوچ لیتے ہیں کچھ جگری! پریشان کیوں ہوتا ہے۔''

''پریشانی کی بات تو ہے یار!'' میں نے کہا۔ ''مجھے عطا محمد سے ایسی تنگ نظری کی اُمید نہ تھی کہ وہ اپنی بیٹی سے سیل فون بھی چھین لے گا۔''

''ابے لے تجھے کیا الہام ہوا ہے؟''

''کیا مطلب؟''

''تم سے کس نے کہہ دیا کہ باپ نے بیٹی سے سیل فون ہی چھین لیا ہوگا۔''

''تو پھر فوزیہ کا فون بند کیوں جارہا ہے؟'' کہتے ہوئے میں نے سوالیہ نظروں سے کالیا کی طرف دیکھا۔ ''یار! میں اس سے بات کیے بغیر کیسے اس ملک کی سرحدیں پار کروں گا؟'' میں جیسے روہانسا سا ہونے لگا۔ کالیا نے میرا شانہ تھپتھپاتے ہوئے کہا۔

''تو اللہ کا نام لے کر بے غم ہوکے نکل چل، میں یہاں ہوں ناں..... فوزیہ سے تیری بات کی کوئی نہ کوئی صورت نکال ہی لوں گا۔''

ایک لمحہ کے توقف کے بعد وہ بولا۔ ''ویسے مجھے لگتا ہے یا تو تیرا نمبر بلاک کردیا گیا ہوگا، یا پھر فوزیہ کے نمبر کی سم بلاک کردی گئی ہوگی۔ ٹھہرا میں اپنے موبائل سے ایک ٹرائی مار کے دیکھتا ہوں۔''

''میں نے سب آزما لیا کالیا!'' میں نے کہا۔ ''تیری یہی بات درست لگتی ہے کہ اس کی سم بند کروادی گئی ہوگی۔''

''یار جگری! اگر ایسا ہے بھی تو کیا فوزیہ نے اپنے باپ کی اس قبیح حرکت پر کچھ کہا بھی نہ ہوگا اس سے؟''

''ممکن ہے کہا ہو.....'' میں نے پھیکے سے لہجے میں کہا۔ ''لیکن اب سوال تو یہ پیدا ہوتا ہے کہ فوزیہ سے بات کیسے کی جائے اور رابطہ کیسے ممکن ہو؟''

''ویسے ایک اور بات پر مجھے حیرت ہوتی ہے۔'' کالیا نے جواب دینے کی بجائے خیال انگیز لہجے میں کہا۔

''کون سی بات؟''

''اگر اس کے باپ نے ایسا کچھ کیا بھی ہے تو پھر فوزیہ کو تیرا نمبر تو ازبر ہوگا ہی، کم ازکم وہ کسی طرح تجھ سے رابطہ تو کرلیتی، دوسرے کسی سیل سے؟''



''یہ بات تو میں نے بھی سوچی تھی۔'' میں نے ایک گہری سانس لے کر کہا۔ ''ہوسکتا ہے، اسے اب تک ایسا کوئی موقع نہ ملا ہو؟''

''تیرے جانے میں کتنے روز باقی ہیں؟'' کالیا نے اچانک پوچھا۔

''میں تو تیار ہوں، رانا بشیر کی طرف سے گرین سگنل کا انتظار ہے۔''

''ٹھیک ہے، مجھے یہ بتا وہ کہیں آتی جاتی بھی ہے؟ میرا مطلب کالج، یونیورسٹی یا اپنے کسی رشتے دار کے ہاں وغیرہ۔''

''مجھے اس کے معمولات کا کچھ علم نہیں۔ مگر کالج اور یونیورسٹی وہ نہیں جاتی۔ اس نے اپنی پڑھائی مکمل کرلی ہے۔'' میں نے جواب دیا۔

''اس کی کسی قریبی سہیلی کو جانتے ہو؟'' کالیا نے پوچھا۔ میں نے نفی میں سر ہلادیا۔

''ابے لے...... تو کیسا عاشق ہے جگری؟ تجھے اپنی محبوبہ کی سہیلیوں کا بھی نہیں پتا۔''

''ارے یار! وہ بے چاری اتنا باہر کہیں آتی جاتی بھی کب ہے، نہ ہی میرے ساتھ کہیں نکلی۔ خود ہماری ملاقات بھی بس! عطا محمد سے ملنے کے لیے جانے تک محدود اور بالکل تھوڑے لمحات کے لیے ہوتی تھی۔'' میں نے جواب دیا۔

''ہم...... معاملہ واقعی گمبھیر ہے۔'' کالیا پُرسوچ لہجے میں بڑبڑایا۔

''ایسا کرتے ہیں پھر کہ اس کے گھر کے آس پاس مٹر گشت کرتے ہیں، بھیس بدل کر، آخر کبھی اور کہیں ضروری کام سے جانے کے لیے تو نکلے گی ہی، بس! لگ جائیں گے پیچھے۔''

کالیا کی بات سن کر میں پھیکے سے انداز میں مسکرادیا اور اسی لہجے میں بولا۔

''اب یہ بھی کرنا پڑے گا۔''

''ابے لے جگری! یہ کیا کہہ رہا ہے تو؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا۔ ''عشق میں تو اس سے بھی زیادہ پاپڑ بیلنے پڑتے ہیں، یہ تو کچھ بھی نہیں۔ ویسے ایک یہی طریقہ مجھے سمجھ میں آرہا ہے، تیرے ذہن میں کچھ اور ہے تو بتا؟''

''سر دست تو کچھ نہیں، شاید یہی کرنا پڑے۔'' میں نے مبہم سے لہجے میں کہا تو کالیا نے میری پیٹھ ٹھونکی۔

''چل پھر ابھی سے یہ کام شروع کرتے ہیں، آخر عشق کا معاملہ ہے ورنہ تو تو فکر و سوچ میں آدھا رہ جائے گا۔''

''نہیں یار کالیا! تو کیوں خوار ہوتا ہے، یہ کام میں اکیلا کرلیتا ہوں۔'' میں نے کہا۔

''ہرگز نہیں۔'' کالیا نے انکار میں سر ہلایا۔ ''دیکھ نہیں رہا ہے کہ حالات کیسے ہیں، میں تجھے اکیلا نہیں چھوڑ سکتا، اب دیر مت کر شام ہوجائے گی اور پھر رات۔ ابھی دن دن میں یہ کام نمٹا لیتے ہیں، پتا چیکتے ہیں، کوئی نہ کوئی کھڑ تیل تو نکلے گا ہی۔''

ہم دونوں بائیک میں سوار ہوکر قائد آباد روانہ ہوگئے۔

☆......☆

دوپہر کا وقت تھا۔ دو بج رہے تھے۔ کھانا ہم نے قائد آباد میں ہی ایک پٹھان کے ہوٹل میں کھانے کا ارادہ باندھا تھا۔ یہ ہوٹل عطا محمد کے گھر سے قریب ہی تھا۔ یعنی ہم وہاں بیٹھ کر بھی اس کی رہائش گاہ پر نظر رکھ سکتے تھے۔

یہ ہوٹل حال ہی میں کھلا تھا اور اس کا کھانا اچھا تھا۔ ایک دن چاچا انور شاہ اور میں نے وہاں کھانا کھایا تھا۔ اچھا خاصا بڑا ہوٹل تھا اور یہاں دال فرائی سے لے کر تکہ بوٹی، کڑھائی اور بچی کباب بھی ملتے تھے۔ بریانی اور پلاؤ بھی ملتا تھا۔ ہر قسم کے لوگ یہاں آتے تھے اور کھانا وغیرہ پارسل بھی کروانے آتے تھے، زیادہ تر ٹرکوں اور بسوں کے ڈرائیور نظر آتے تھے۔

ہم سیدھا اسی ہوٹل پر پہنچے، بھیس بدلنے کی ہم نے فی الحال کوئی خاص ضرورت نہیں سمجھی تھی۔ ہوٹل میں اس وقت بھی ٹھیک ٹھاک رش تھا۔ ہم نے کچھ ایسے رخ کی میز سنبھالی تھی کہ عطا محمد کے بنگلے نما مکان کا مین گیٹ یہاں سے صاف نظر آتا تھا۔

کچھ کھانے کو جی تو نہیں کررہا تھا، مگر کھانا تو تھا ہی کچھ نہ کچھ۔

''جی صاحب؟''

ہمارے براجمان ہوتے ہی بوتل کے جن کی طرح...... ایک بیرا دو کانچ کے گلاس اور پانی کا جگ میز پر دھرتے ہوئے بولا۔

''ایک چکن کڑھائی اور دال فرائی لے آؤ۔ چپاتی کی

بجائے نان لانا۔'' کالیا نے فوراً آرڈر دیا۔

میری نظریں مکان کا طواف کررہی تھیں۔ دل سینے میں بے طرح دھڑک رہا تھا۔ سوچ رہا تھا کہ اندر فوزیہ مکان کے جانے کس گوشے میں بیٹھی، میری یاد میں آنسو بہارہی ہوگی اور ادھر میں اس کے لیے تڑپ رہا تھا۔ ایسے میں میرا دل بری طرح مسوس کر رہ گیا تھا۔

''دھیرج...... جگری! سب ٹھیک ہوجائے گا۔'' بیرے کے آرڈر لے کر جاتے ہی کالیا نے ذرا جھک کر ہولے سے کہا۔ اس نے شاید میری نظروں کا رخ، آنکھوں سے جھلکتی بے چینی اور چہرے سے ٹپکتی اداسی کو بھانپ لیا تھا۔

میں ایک بے اختیار ایک سرد سی آہ...... سے مشابہ ہنکاری خارج کرکے رہ گیا۔

تھوڑی دیر بعد ہی اس نوجوان پٹھان بیرے نے کھانا لگادیا۔ کالیا کو بھوک لگی ہوئی تھی، وہ کھانا کھانے لگا۔ میں بھی بیدلی سے کھانے لگا۔ ہم اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے جاتے، میری بے چین اور متلاشی نظریں بار بار مکان کی طرف اٹھ جاتی تھیں۔

کھانا ختم کرکے کالیا نے دو چائے منگوالی۔

یوں ہمیں وہاں بیٹھے لگ بھگ پون گھنٹا بیت چلا تو اچانک میں چونکا۔ مکان کے مین گیٹ سے میں نے ایک پرانے ماڈل کی مگر اچھی کنڈیشن والی لینڈ کروزر کو نکلتے دیکھا، میری نظریں گاڑی پر جیسے ''کیل'' ہوگئیں۔ کالیا بھی میری نظروں کے تعاقب میں اسی طرف دیکھنے لگا۔

گاڑی نے سڑک کی جانب موڑ کاٹا۔ یہ سڑک ون وے یعنی دوسری جانب کی تھی۔ اس نے فوراً انڈیکیٹر دیا، میرا دل دھڑکا۔ وہ آگے سے ایک یوٹرن پر اس سڑک پر گھومنے والی تھی جدھر ہوٹل میں ہم بیٹھے تھے۔ ہم نے دانستہ ہوٹل کے باہر والی جگہ پر چھجے کے نیچے والی میز منتخب کی تھی کیونکہ یہاں سے گھر کا گیٹ قریب اور واضح نظر آتا تھا۔

''گاڑی اسی طرف آرہی ہے، اگر اس میں فوزیہ ہوئی تو پیچھے نکلنا پڑے گا۔'' کالیا نے ہولے سے کہا۔

''ہمم......'' میرے منہ سے نکلا۔ ہم بل وغیرہ دے کر فارغ ہوچکے تھے۔

گاڑی یوٹرن لے کر اسی لائن میں آگئی اور اب ہمارے قریب سے گزرنے والی تھی، میں نے دانستہ اپنے چہرے کے آگے ہاتھ اس طرح ٹکادیا تھا کہ ہاتھ کی ہتھیلی نے میرے نصف چہرے کو ڈھانپ لیا۔

اس سڑک پر خاصی ٹریفک تھی۔ لینڈ کروزر دھیمی رفتار سے آرہی تھی، میرا دل بے طرح دھڑک رہا تھا۔ یہ گاڑی عطا محمد کی نہیں تھی ممکن تھا کسی مہمان وغیرہ کی ہو، چونکہ مطلوبہ گھر سے نمودار ہوئی تھی اسی لیے میری توجہ مبذول کرنے کا سبب بنی تھی۔ یوں میرا نہیں خیال تھا کہ اس میں فوزیہ ہوسکتی تھی۔

گاڑی قریب آگئی۔ سب سے پہلے مجھے اس کی ڈرائیونگ سیٹ پر ایک ہلکے براؤن رنگ کی گھنی داڑھی والا رعب دار سا چہرہ نظر آیا۔ وہ عطا محمد کی ہی عمر کا لگتا تھا۔ اس کے برابر میں عطا محمد براجمان تھا۔ عقبی سیٹ میں ایک عورت اور ایک تقریباً میری ہی عمر کا جوان لڑکا براجمان تھا۔

یہ دونوں ہی میرے لیے اجنبی تھے، براؤن داڑھی والا چہرہ بھی غیر شناسا تھا۔ البتہ جوان لڑکے کے برابر میں بیٹھے ہوئے ایک اور نوعمر ٹین ایجر سے لڑکے کو فوراً میں نے پہچان لیا تھا۔ وہ فوزیہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ اس کا نام فرخ تھا۔

''ابے لے جگری! اس گاڑی کا تعاقب تو بے کار ہے۔ فوزیہ تو نہیں ہے اس میں؟'' کالیا نے ہولے سے کہا۔ (فوزیہ کی واٹس اپ پر میرے موبائل میں بہت سی تصویریں تھیں جو کالیا کو میں نے دکھا رکھی تھیں)۔

''پیچھے جانے کی ضرورت بھی نہیں ہے، لگتا ہے وہ گھر میں اکیلی ہے۔'' میں نے کہا۔ میرا دل کسی خیال کے تحت یکبارگی زور سے دھڑکا تھا۔

''پھر کیا خیال ہے، اندر چلیں؟''

''یہی کرنا پڑے گا۔'' میرے دل نے جوش مارا۔

''شریفوں کی طرح دروازے پر دستک دے کر اندر داخل ہوں یا......'' کہتے ہوئے کالیا نے دانستہ اپنا جملہ ادھورا چھوڑا۔

''نہیں، نقب لگا کے اندر داخل ہونا پڑے گا۔'' میں نے ہولے سے کہا۔

''چلیں پھر؟'' اس نے پوچھا۔

ابھی ہم اٹھنے کا ارادہ کررہی رہے تھے کہ ایک رکشا آکر مکان کے گیٹ پر رکا۔ ہم وہیں جمے بیٹھے رہے۔

''ابے لے...... یہ اب کون آگیا؟'' کالیا کے منہ سے بے اختیار نکلا۔ میں بھنویں سکیڑے اس طرف دیکھنے لگا۔ ایک جوان لڑکی رکشے سے اتر رہی تھی۔ اس نے اپنے پرس سے رکشے والے کو کرایہ دیا اور پھر گیٹ پر لگے انٹر کام

کا بٹن دبا دیا۔ تھوڑی دیر بعد خودکار قفل کھل گیا اور وہ لڑکی ہمارے دیکھتے ہی دیکھتے اندر داخل ہوگئی۔

''فوزیہ نے شاید اپنی کسی سہیلی کو بلوایا ہے۔'' میں نے تیزی سے سوچتے ہوئے ذہن سے کہا۔

''ابے نے جگری! مارا ماری کے ساتھ عشق میں بھی تیرا ذہن خوب چلتا ہے۔'' کالیا اپنے مخصوص لہجے میں مسکرا کر بولا۔ میں نے کوئی جواب نہ دیا اور کسی گہری سوچ میں ڈوبا رہا۔ کالیا بھی خاموش رہا۔ اس نے پھر مجھے نہیں چھیڑا۔

تھوڑی ہی دیر گزری تھی کہ اچانک میرے سیل کی بیل گنگنائی۔ میرا دل کسی متوقع خیال سے یکبارگی سے زور سے دھڑکا۔

بلاارادہ میں نے اپنا سیل نکالا اور ڈسپلے پر ایک نگاہ ڈالی۔ اسکرین پر کسی کا ''انون'' نمبر تھا۔ میں نے فوراً کسی خیال کے تحت کان سے لگا کر ہیلو کہا۔ ''نن.....نعمان!''

دوسری جانب سے فوزیہ کی مترنم مگر رنجیدہ، اداس اور کچھ جوشِ جذبے کا شائبہ دیتی آواز ابھری تو جیسے مجھے اپنا دل رک رک کر دھڑکتا ہوا محسوس ہونے لگا۔

''فف.....فوزیہ.....! تت.....تم.....کک.....کیسی ہوتم؟'' جوشِ مسرت تلے مجھ سے جملہ مکمل نہ ہو پایا تو دوسری جانب سے اس کی غم زدہ سی آواز ابھری۔

''نومی! تم کہاں ہو؟ حالات بہت خراب ہوگئے ہیں۔''

''میں ادھر ہی ہوں جان! تمہارے بالکل پاس..... تمہارے گھر کے سامنے۔ یوں سمجھو دروازے پر بیٹھا ہوں، فقیر بنا۔'' میں جذباتی سا ہوگیا۔

''ہولے جگری! خود کو سنبھال کر بات کر.....'' میری رقت آمیز اور حد سے زیادہ بے چین کیفیات کو دیکھتے ہوئے کالیا نے مجھے ہولے سے ٹوکا۔

''ہائے اللہ! تت.....تم ادھر ہی ہو؟'' اس کی چونکتی ہوئی نرم سی آواز کے اس جادو نے میرا دل بے اختیار سا کردیا۔ ''کہاں ہوتم بتاؤ نومی! میری تو جان ہی نکلی جارہی ہے، کب سے یہاں ہو؟'' وہ بیقراری ہوئی جارہی تھی۔

''میں اپنے ایک دوست کے ساتھ تمہارے مکان کے بالکل سامنے والے ہوٹل میں بیٹھا ہوں، پرلی سڑک پر.....''

میں نے جلدی سے کہا۔ ''میں نے ابھی ابھی تمہارے گھر سے ایک لمبی سی گاڑی کو نکلتے دیکھا تھا۔ اس میں تمہارے بابا جانی.....''

''ہاں، ہاں!'' اس نے فوراً بات کاٹی۔ ''وہ.....وہ وہی ہیں، مچھ (کوئٹہ) سے آئے ہیں۔ گل شیر خان اور ان کا بیٹا مسعود، ان کی والدہ۔ خالہ رشیداں بھی ساتھ ہیں مگر وہ میرے پاس موجود ہیں۔'' اس نے تھوڑا توقف کیا۔ میرا دل و دماغ یورش زدہ سا ہونے لگا۔

''لیکن ہوا کیا تھا؟ تمہارا نمبر بند جارہا تھا اتنے دنوں سے، میں تو تمہاری خیر خیریت سے متعلق سوچ سوچ کر پاگل ہورہا تھا۔'' میں نے ستے ہوئے لب و لہجے میں اسے اپنی حالتِ زار کے بارے میں بتایا تو وہ جیسے سسکتے ہوئے غمناکی سے بولی۔

''نومی! میں کیا کرتی؟ پتا نہیں کیوں بابا جانی کو ایسی کیا پرخاش ہوگئی ہے کہ وہ تم سے شدید نفرت کرنے لگے ہیں، انہوں نے مجھ سے میرا موبائل فون چھین لیا۔ اس کی سم تک بند کروادی۔ اب مجھے کوئی فون رکھنے کی بھی اجازت نہیں۔ پہلے تو میں گاڑی میں کسی ملازمہ اور ڈرائیور کے ساتھ آتی جاتی رہتی تھی، وہ تک میرا بند کردیا۔ جب سے تم نے میرا رشتہ مانگا ہے، اسی دن سے ہی بابا جانی کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے، ان کی بے چینی بڑھ گئی ہے، اسی سبب انہوں نے فوراً میرا رشتہ اب زبانی کلامی ہی نہیں بلکہ باقاعدہ رسم کرکے منگنی کی صورت طے بھی کردیا ہے۔ گاڑی میں جن لوگوں کو تم نے دیکھا ہے، ان میں بابا جانی سمیت گل شیر خان، ان کی بیوی شاہینہ اور میرا منگیتر مسعود.....''

''شٹ.....'' میرے منہ سے ایک دم برآمد ہوا۔ فوزیہ چپ ہوگئی مگر ایک دم دوبارہ اسی طرح روہانسی لہجے میں بولی۔

''نن.....نومی! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتی۔ کچھ کرو پلیز!'' وہ دل ہاری رہی تھی اور میرے پاس تو اب اسے طفل تسلیاں دینے کے لیے بھی کچھ نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے میں اسے کیا تسلی دیتا؟ طفل تسلیاں بھی تو کسی اُمید پر ہی اچھی لگتی ہیں، یہاں تو ہر آس ہر اُمید دم توڑ چکی تھی۔ جیسے میرے اور فوزیہ کے بیچ ایک خطِ تنسیخ کھینچ دیا گیا تھا۔ تقدیر نے مسکت فیصلہ سنا دیا تھا۔ ہمیشہ کی جدائی کا۔ میرا وجود غم اور جوش تلے کپکپا رہا تھا۔ میری آنکھیں جلنے لگی تھیں۔ کالیا نے ہولے سے بازو تھام کر دبایا تھا۔

''فوزیہ! مجھ سے ملوگی؟'' میں نے اپنے اندر کے ابال پر قابو پاتے ہوئے کہا۔

''کیسے ملوں؟'' وہ بولی۔ ''گھر میں خالہ رشیداں موجود ہیں۔ میری سہیلی ارم کی بات اور ہے، وہ میری رازدار اور میری غم خوار ہے۔ میرے ہی کہنے پر آئی تھی وہ اور اب میں چھپ کر اسی کے موبائل سے بات کررہی ہوں تم سے۔''

وہ ذرا سانس لینے کو رکی، پھر بولی۔ ''اب ملنے میں کیا رہ گیا ہے نعمان؟ سوائے اپنی نامراد محبت کی لاش پر ماتم کرنے کے کوئی ایسی صورت نکالو کہ ہمارے راستے جدا نہ ہوسکیں۔''

اس کی بات نے میرا دل چیر کر رکھ دیا۔ وہ ٹھیک ہی تو کہہ رہی تھی، اب ملنے کے لیے کیا باقی رہ گیا تھا؟ ماسوائے آنسوؤں اور حسرتوں کے اظہار کے۔

''کوئی ایسی صورت تو نکالو رابطے کی فوزیہ؟''

''بتایا نا میں نے، یہ نمبر میری رازداں سہیلی ارم کا ہے، اسے سیو کرلو، یہ میرے پاس ملنے کے لیے آتی جاتی رہتی ہے۔'' فوزیہ نے جواب دیا۔

میں ہونٹ بھینچے چند لمحہ کچھ سوچتا رہا، میں اس کے دیدار کے لیے تڑپ رہا تھا کیونکہ میں بیرونِ ملک جارہا تھا اور میرا اسے ایک نظر دیکھے بنا جانے کو دل نہیں چاہ رہا تھا۔ بے تابی سے بولا۔

''فوزیہ! میری جان! تمہاری فقط ایک دید کے لیے ترس رہا ہوں، میری منتظر دید کی پیاس بجھادو، نجانے پھر کب تمہیں دیکھنا نصیب ہو؟''

''ہائے اللہ! یہ کیا کہہ رہے ہیں آپ؟ خدانخواستہ ایسی کیا بات ہوئی؟'' وہ یک دم تڑپ کر بولی۔

''کچھ نہیں، وہ بس ایک اچھی جاب ملی ہے ناں اسی سلسلے میں مڈل ایسٹ جارہا ہوں، کچھ دنوں کے لیے۔''

''تمہیں دیکھنے کو ایک نگاہ کے لیے میں بھی سسک رہی ہوں، اچھا، میں کچھ کرتی ہوں۔ چند سیکنڈز کے لیے فون بند کررہی ہوں۔'' اس کی آواز، اس کا مرتعش لہجہ اس کے اندر کی بے چینی کا پتا دیتا تھا۔ میں نے فون بند کردیا۔

''ابے لے..... جگری! تو اندر جائے گا؟ کسی کی نظر پڑگئی تو؟'' کالیا حیرت آمیز پریشانی سے بولا۔

''ہاں! میں جاؤں گا اندر.....فوزیہ کو دیکھے بنا میں نہیں رہ پاؤں گا۔'' میں نے ضد کی۔ کالیا ایک گہری سانس لے کر خاموش ہوگیا۔

مجھے فوزیہ کے فون کا بے چینی سے انتظار تھا جس کا ایک سیکنڈ کا انتظار بھی صدی برابر محسوس ہورہا تھا۔

جلد ہی فون کی بیل گنگنائی، سیل میں نے ہاتھ میں ہی پکڑے رکھا تھا۔ فوراً کان سے لگالیا۔

''ہاں، نومی! آجاؤ، ذرا جلدی، خالہ کو اندر ارم نے مصروف کرلیا ہے۔'' دوسری طرف سے اس کی تھرتھراتی ہوئی آواز ابھری۔ میرا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔ کالیا کو وہیں رکے رہنے کا کہہ کر میں دوڑا۔ فوزیہ سے ملنے، اسے فقط ایک نظر بھر کر دیکھنے کی میرے اندر اس قدر بے تابی تھی کہ میں مصروف سڑک پر چلتی ٹریفک کی بھی پروا کیے بغیر دوسری سمت بھاگتا چلا گیا، دو ایک گاڑیوں کے ٹائروں کے چرچرانے کی آوازیں اور تیز ہارن گونجے، مگر میں ان کی پروا کیے بغیر سڑک پار کر گیا اور سیدھا فوزیہ کے گھر کے گیٹ پر ہی جا کر دم لیا۔

وہاں کوئی نہیں تھا۔

آہ.....عاشق بھی کیسے سر پھرے ہوتے ہیں، عشق کی دھن سوار ہو تو پھر کسی بات کا ہوش نہیں کرتے۔ میں جانتا تھا کہ کالیا بیٹھا مجھے اس طرح اندھادھند اور خطرناک انداز میں سڑک پار کرتا دیکھ کر اندر ہی اندر ہول رہا ہوگا۔

دروازے پر پہنچا تو وہ تھوڑا کھلا ہوا پایا۔ فوزیہ کی جھلک نظر آگئی۔ وہ وہیل چیئر پر تھی، جھری سے میں نے اندر جھانکا۔ اس نے ہولے سے اثبات میں اپنے سر کو جنبش دی، میں دروازہ مزید دھکیل کر اندر داخل ہوگیا۔ فوزیہ نے آہستگی سے مجھے دروازہ اندر سے بند کرنے کو کہا اور پھر اپنی خودکار وہیل چیئر کو لیے دائیں جانب بنے ایک کمرے میں لے گئی، میں اس کے پیچھے ہولیا۔ کمرا خالی تھا۔ یہ بیٹھک سی تھی۔ اندر ہم دونوں کے سوا اور کوئی نہ تھا۔

''فوزیہ.....!'' میں آپے میں نہ رہ سکا اور عقب سے جا کر کھڑے کھڑے جھک کر اس کے گلے میں اپنے بازو حائل کردیے، اس نے بھی سسکتی ہوئی سی آواز میں میرے بازو اپنے دونوں مرمریں ہاتھوں سے تھام لیے اور اپنا نرم و گداز گال میرے ایک ہاتھ پر ٹکا دیا۔ جلد ہی مجھے اپنے ہاتھ پر گرم گرم پانی بہنے کا احساس ہوا، وہ رو پڑی تھی۔ میں سامنے سے آکر اکڑوں ہوکے اس کے قدموں کے قریب اس کے بالکل قریب بیٹھ گیا۔ یہاں تک کہ مجبور اور مغلوبِ عشق ہوکر اپنا سر اس کی گود میں رکھ دیا۔

وہ میرے بالوں کو پیار سے سہلانے لگی۔ وقت تھم رہا تھا، سانسوں کا تموج غارت ہورہا تھا، جذبات شوریدہ سری

پر مائل ہو رہے تھے، میں نے سر اٹھا کر اس کی طرف دیکھا، احتیاط سے تھوڑا اور اس کے قریب ہوا، اس نے بھی اپنا گلِ گلنار چہرہ مجھ پر جھکایا اور پھر جیسے مجھے دنیا و کائنات کی ساری دولت ایک نکتے میں سمٹتی محسوس ہونے لگی، وہ نقطہ جو زندگی تھا، حیاتِ نو کا وہ سرچشمہ جو ابلا پڑ رہا تھا۔

"فوزیہ......! میں تمہارے بغیر نہیں رہ سکتا، تم مجھے مل جاؤ بس یہی میری زندگی کی تمنا ہے۔" میں تڑپ کر اور قدرے رندھے ہوئے لہجے میں بولا۔

ایسے میں فوزیہ کی بھی مرتعش آواز ابھری۔ "میرا ابھی سب کچھ تم ہو نعمان! ابھر لو مجھے اپنے بازوؤں میں اچھی طرح، بھینچ لو، کبھی نہ چھوڑنے کے لیے۔" وہ بھی میری طوفانی اور جنونانہ محبت پر وارفتانہ انداز میں بولی۔ اس نے اپنے دونوں مرمریں بازو پھیلا دیے، میں نے بھی۔ اسے تھام لیا۔ اسے خود سے بھینچ لیا۔ میں اس پر جھکا رہا اور تب ہی ایک آہٹ پر ہم چونکے۔

وہ جیسے ایک دم بیدار ہونے کی سی کیفیت میں بولی۔ "اوہو شش شاید خالہ آ رہی ہیں تمہیں دیکھ لیا انہوں نے تو قیامت آ جائے گی۔"

میرے حلق سے بے اختیار ایک سرد سی سانس خارج ہوگئی اور پھر ہم دونوں حسرت زدہ سی نظروں سے ایک دوسرے کو تکتے ہوئے رخصت ہوئے، میں باہر نکل گیا تھا۔

فوزیہ سے ملنے کے بعد میرا روم روم سرشار ہو رہا تھا اور اسے جلد سے جلد پانے کی تڑپ اور تمنا زور پکڑنے لگی تھی، میں بیدلی سے چلتا ہوا واپس ہوٹل میں آ گیا۔

"ابے لے جگری! تو نے میرا خون ہی خشک کیے رکھا تھا۔ سب خیریت تو رہی ناں؟ میرا مطلب ہے کسی کی نظر تو نہیں پڑی تم پر؟"

"نہیں۔" میں نے کہا۔

"جگری! تیرا عشق تو بہت سر پھرا ہے یار! ذرا ہولے رہا کر کسی زمانے میں عشق تو میں نے بھی کیا تھا...... مگر تیرا عشق...... خیر چھوڑ یہ بتا آگے بات کرنے کی کیا سبیل بنی؟"

میں ارم کا موبائل نمبر سیو کر چکا تھا اس کے بعد کالیا کو میں نے ساری بات دھیرے دھیرے بتا دی۔

"چلو شکر ہے، ایک مسئلہ تو حل ہوا، کم از کم اب فوزیہ سے کسی نہ کسی صورت میں تمہارا رابطہ تو قائم رہے گا۔" کالیا نے تشفی آمیز لہجے میں کہا۔

"لیکن اصل مسئلہ بڑا گھمبیر ہو گیا ہے یار کالیا!" میں نے کہا۔ "سمجھ نہیں آتا کیا کیا جائے؟ عطا محمد کو تو مجھ سے جیسے خدا واسطے کا بیر ہو گیا ہے۔"

"سیانوں نے کہا ہے کہ...... گھی نہ نکلے تو انگلی ٹیڑھی کرنی چاہیے۔"

"کیا مطلب ہے تیرا؟"

"فوزیہ تیرا ساتھ دینے پر آمادہ ہے تو کورٹ میں لے جا کر اس سے شادی کر لے۔" کالیا نے مشورہ دیا۔

"یہ مجھ سے نہیں ہو سکے گا کالیا! نہ ہی ایسا فوزیہ بھی کرنا پسند کرے گی۔" میں نے مبہم سی آواز میں کہا۔

"ان حالات میں یہ تو کرنا ہی پڑے گا۔ ورنہ دونوں ٹھنڈی آہیں بھرتے رہو گے ساری عمر۔"

"یار! اب ایسی بددعائیں تو نہ دے، میں پہلے ہی بہت پریشان ہوں۔" میں نے اپنی عرق آلودہ پیشانی مسلتے ہوئے افسردہ لہجے میں کہا۔

"ابے لے جگری! میں بھلا اپنے ہیرے جیسے یار کو کیوں بددعا دوں گا بھلا؟، میری تو دعا ہے اللہ پاک سے کہ وہ تمہاری جوڑی کا ملن اور نصیب آسمان پر ہمیشہ کے لیے لکھ دے۔" کالیا بڑے پیار سے میرے کندھے پر اپنا ہاتھ دھرتے ہوئے بولا۔

"پر دیکھ جگری! یہ محبت کے معاملات بھی بڑے حساس ہوتے ہیں۔ نہ ملے تو انسان کا دل ایسے ٹوٹ جاتا ہے جیسے شیشہ، جو پھر نہیں جڑتا۔ یہ بہت نازک ہوتا ہے۔ ہتھیلی پر ٹپکے ہوئے آنسو کی طرح، جو بالکل کسی آبگینے کی طرح دکھتا ہے۔ ادھر ذرا دھچکا لگا اور ادھر ٹوٹ کر بکھر گیا۔ بہت کم لوگ ہوتے ہیں، جو ایسے ٹوٹے ہوئے دل کے ساتھ غمِ نہاں چھپائے چہرے پر بہ ظاہر مسکراہٹ لیے پھرتے ہیں، پر اندر سے اس قدر ٹوٹے ہوئے ہوتے ہیں کہ بس...... چھوڑ یار جگری! میں بھی کیا باتیں لے کر بیٹھ گیا، اب چلیں؟"

میں نے غور سے کالیا کی طرف دیکھا۔ اس کا لہجہ، اس کی آواز اور آنکھوں سے مترشح غم ناگفتہ کا کرب صاف جھلکتا تھا۔ وہ بھی جانے کب سے دل کی چوٹ کھائے ہوئے تھا۔ پہلے بھی وہ اس کا اشاروں میں اظہار کر چکا تھا۔

میرا وہاں سے اٹھنے کو جی نہیں کر رہا تھا، بچوں جیسی بے چینی اور ضدی گھر کرنے لگی تھی دل و دماغ میں کہ بس نہیں چلتا تھا ابھی گھر میں جا گھسوں اور فوزیہ کا کبھی نہ چھوڑنے کے لیے ہاتھ پکڑ کر اسے اپنے ساتھ کھینچ کر باہر لے آؤں۔

"چل شہزادے! کیا سوچنے لگا؟" مجھے بدستور خاموش اور سوچتا پا کر کالیا نے مجھے ہلکے سے ٹہوکا دیا تو میں چونکا، پھر جیسے بے خیالی میں بولا۔

"کالیا! تو جا، میں ابھی ادھر ہی بیٹھوں گا۔"

میری بات سن کر اس کی آنکھیں حیرت سے پھیل گئیں۔ اسی لہجے میں بولا۔ "ابے لے کیا کہہ رہا ہے تو جگری؟ باؤلا تو نہیں ہو گیا؟ کیا کرے گا یہاں بیٹھ کر؟ اور کب تک بیٹھے گا؟"

"یار! میرا یہاں سے اٹھنے کو دل نہیں چاہ رہا ہے۔" میں نے غم سے چور لہجے میں کہا۔

"پاگلوں والی باتیں مت کر اور خود کو سنبھال ابھی کچھ نہیں بگڑا۔ سوچ لیتے ہیں کچھ اس بارے میں بھی چل اٹھا باش!" کالیا نے جیسے بچوں کی طرح مجھے پچکارا۔

میں بیدلی سے اٹھا اور پھر ہم بائیک میں سوار ہو کر روانہ ہو گئے۔

☆......☆

آج میرا دل واقعی بے طرح تڑپ رہا تھا۔ ٹوٹ رہا تھا اور جیسے بکھرنے کے قریب ہوا جا رہا تھا۔ روح نے جیسے کرب کا زہر پی لیا تھا، اس نے جسم کی طاقت سلب کر لی تھی۔

گھر پہنچے تو کالیا نے دروازے کے قریب ہی بائیک روک لی۔ میں اترا تو کالیا میرا چہرہ دیکھ کر سناٹے میں آ گیا۔

میری آنکھیں اور چہرہ آنسوؤں سے تربتر اور سرخ ہو رہا تھا۔

"ابے لے جگری! تو نے تو بالکل ہی اپنا دل کھوٹا کر لیا۔"

اس نے بائیک سائیڈ اسٹینڈ پر کھڑی کر دی تھی۔ ہم دروازے پر ہی کھڑے رہ گئے تھے۔

"میری زخمی سماعتوں میں ابھی تک فوزیہ کی درد بھری سسکیاں گونج رہی ہیں کالیا!" میں نے جیسے گم صم سی آواز میں اس سے کہا۔ "وہ کچھ کر نہ بیٹھے۔ وہ بہت زیادہ پریشان اور بے دل ہو رہی ہے۔ مجھ سے وہ بڑی اُمید لگائے بیٹھی ہے، اگر...... اگر یہ اُمید ٹوٹ گئی تو...... تو کالیا! ارے یار! میں سمجھتا ہوں پھر سب کچھ ٹوٹ جائے گا۔" یہ کہتے میں پھر آبدیدہ ہو گیا۔

"ابے لے تو تو بچوں کی طرح رو پڑا۔" کالیا ایک دم گھبرا کر بولا اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے دروازے پر دستک دی، اس کے بعد کہا۔

"جگری! سنبھال خود کو اندر آرام سے بیٹھ کر اس مسئلے پر غور کرتے ہیں۔"

عاصمہ کی رخصتی کے بعد فہیم گھر پر اکیلا ہی ہوتا تھا۔ رہا میں تو، میرا ابھی کچھ پتا نہیں ہوتا تھا، کبھی کہاں اور کبھی کہاں ہوتا، مطلب یہ کہ گھر پر کم ہی ہوتا تھا۔ محلے ہی کی ایک غریب سی عمر رسیدہ خاتون کو گھر پر ملازمہ کے طور پر رکھ لیا گیا تھا۔ یہ فریضہ عاصمہ نے اپنی غیر موجودگی میں ہم دونوں بھائیوں کی ضرورت کو مدنظر رکھتے ہوئے انجام دیا تھا۔ محلے کے لوگ اسے خالہ اماں کہتے تھے۔ وہی کھانا پکاتی تھیں اور ضرورت پڑنے پر بازار سے چھوٹا موٹا سودا سلف بھی لا دیا کرتی تھیں۔ یہ اسلم موکا کی کوئی جاننے والی ہی تھیں جو حاجی صاحب کے ہاں ملازم تھا۔

وہی میری غیر موجودگی میں فہیم کا خیال رکھتی تھی۔ دروازہ بھی اسی نے ہی کھولا تھا۔ ہم اندر داخل ہو گئے۔

فہیم اپنے کمرے میں تھا۔ میں نے باہر سے ہی اسے آواز دی اور پھر غسل خانے کی طرف بڑھ گیا۔ وہاں جا کر میں نے ہاتھ منہ دھویا اس کے بعد فہیم کے کمرے میں آ کر اس کا حال چال پوچھا۔ وہ اپنے بستر پر لیٹا ہوا کوئی کتاب پڑھ رہا تھا۔

اس کے بعد میں اور کالیا دوسرے کمرے میں آ کر بیٹھ گئے۔ عاصمہ کے گھر سے رخصت ہونے کے بعد ہم نے ہلکا پھلکا فرنیچر ڈال کر اسی کمرے کو نشست گاہ بنا لیا تھا۔

خالہ اماں پانی لائی تو میں نے انہیں چائے بنانے کا کہہ دیا۔ وہ تھوڑی دیر بعد ہی چائے لے آئی۔

میں اور کالیا چائے پینے لگے۔ باتوں کے دوران میں نے یونہی اپنی جیب سے سیل فون نکال کر سامنے تپائی پر رکھنے لگا تو دیکھا ارم کے نمبر سے ہی ایک ایس ایم ایس آیا ہوا تھا۔ میں نے بلا دیر میسج اوپن کیا۔ وہ فوزیہ کا ہی تھا۔ لکھا تھا۔

"خالہ رشیداں کے اچانک کمرے میں آ جانے سے میں بات مکمل نہ کر سکی تھی۔ تھوڑی دیر بعد موقع نکال کر پھر کرتی ہوں۔"

میں نے کالیا کو جب فوزیہ کا یہ ایس ایم ایس پڑھایا

تو اسے بھی حیرت ہوئی۔

”آخر وہ مزید کیا کہنا چاہتی ہوگی؟“ میں نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

”وہ جلدی میں اور ڈر ڈر کے کر رہی تھی فون، ممکن ہے کوئی ایسی ضروری بات کرنے سے رہ گئی ہو۔“ کالیا نے خیال ظاہر کرتے ہوئے کہا۔

کافی دیر گزر گئی، مگر فوزیہ کی کال نہ آئی۔ مجھے فکر ہوئی۔

”یار کالیا! فوزیہ کا فون نہیں آیا؟ اب تک تو شاید اس کی وہ سہیلی ارم بھی چلی گئی ہوگی اپنے گھر۔“ میں نے کالیا سے کہا اور اس سے پہلے کہ وہ کوئی جواب دیتا، اچانک میرے فون کی بیل گنگنائی۔ میرا دل یکبارگی زور سے دھڑکا، دیکھا، کال ارم کی ہی تھی۔ مجھے حیرت ہوئی اور خوشی بھی کہ ارم ابھی تک فوزیہ کے ہاں ہی تھی، لیکن موبائل کان سے لگایا تو چونک پڑا۔ دوسری جانب سے اجنبی لڑکی کی آواز ابھری۔

”آپ نعمان صاحب؟“ دوسری جانب سے استفساریہ کہا گیا۔

”جی...... جی آپ غالباً فوزیہ کی سہیلی ارم ہیں؟“ میں نے فوراً کہا۔

”جی ہاں! انہوں نے آپ کا نمبر مجھے دے دیا ہے، آپ نے میرا نمبر تو سیو کرلیا ہے ناں؟“ اس نے پوچھا۔

”جی ہاں! ارم صاحبہ! مگر فوزیہ...... کہاں ہے؟“ میں نے پوچھا۔ ”اس نے بعد میں مجھے آپ ہی کے سیل سے میسج کیا تھا کہ وہ کوئی بات......“

”جی ہاں! وہی میں آپ کو بتانے والی تھی، اسی لیے فون کیا تھا میں نے آپ کو۔“ اس نے میری بات کاٹ کر جواب دیا۔

”میں اپنے گھر آچکی ہوں۔ فوزیہ نے ہی مجھ سے کہا تھا میں گھر پہنچ کر آپ کو وہ بات ذرا تفصیل سے بتادوں۔“

”کون سی بات ہے؟“ میں نے دھڑکتے دل اور بے چینی سے پوچھا۔

”نعمان صاحب!“ وہ ایک گہری سانس لے کر بتانے لگی اور میں بھویں سکیڑے بہ غور اس کی بات سنتا رہا پھر کچھ سوالات پوچھے اس کے بعد رابطہ منقطع ہوگیا۔

”کیا ہوا؟ کیا کہہ رہی تھی؟“ کالیا نے بے چینی سے پوچھا۔

میں نے کہا۔ ”بڑی عجیب سی صورت حال ہوگئی ہے یار کالیا!“

”ابے لے جگری! ایسا کیا ہوگیا ہے؟ خیریت تو ہے ناں؟“ وہ پریشانی سے بولا۔

”خیریت ہی ہے اور شاید ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ہے۔“ میں نے گومگو سے لہجے میں کہا۔

”ابے لے جگری! میں تجسس سے مرا جارہا ہوں اور تجھے پہیلیاں بجھوانے کی پڑی ہوئی ہے، بتا تو سہی، ہوا کیا ہے؟“

میں ارم کی زبانی اسے بتانے لگا۔

”دبئی کے ایک بڑے اسپتال میں عنقریب ملک بھر کے مایہ ناز آرتھوپیڈک سرجنز، نیوروفزیشنز اور نیوروسائیکٹرسٹس (Neuropsychiatry) کی ایک مشترکہ بین الاقوامی میڈیکل کانفرنس ہونے والی ہے۔ یہ ایک طرح سے ورک شاپ بھی ہوگی، جو درحقیقت ایک بڑی ملٹی نیشنل فارماسیوٹیکل کمپنی اور میڈیکل این جی او کے تعاون سے منعقد کی جارہی ہے۔

جس میں ان مریضوں کا خصوصی علاج بھی کیا جائے گا جو لوگ کسی اچانک حادثے، نیورو یا سائیکٹرک ٹراما کے سبب عصبی یا جسمانی و دماغی طور پر متاثر ہوکر ہاتھوں پیروں سے معذور ہوگئے ہوں۔ ایسے مریضوں کے لیے باقاعدہ آن لائن رجسٹریشن کروانے کی سہولت بھی موجود تھی۔

یہ پندرہ روزہ کانفرنس ہے۔ مذکورہ اسپتال میں جسمانی حادثے میں متاثر ہونے والے مریضوں کے لیے بھی ایک خصوصی لچک کی حامل پلاسٹک فائبر یا ووڈ کی مصنوعی ٹانگیں لگوانے کا بھی جدید انتظام کیا گیا ہے۔

یہ بات گل شیر خان نے انہیں بتائی ہے اور اسی کی یہ تجویز ہے کہ ان دونوں کو یعنی فوزیہ اور اس کے منگیتر مسعود کو بہ غرض علاج دبئی لے جایا جائے۔

پاکستان کے دو معروف ڈاکٹرز کو بھی اس کانفرنس میں شرکت کی دعوت دی گئی ہے۔

عطا محمد اور گل شیر خان مزید معلومات وغیرہ کے لیے ان دونوں ڈاکٹرز سے ملنے گئے تھے۔ وہ لینڈ کروزر میں ان سے ہی ملنے جارہے تھے۔ گل شیر خان کی ان دو میں سے ایک ڈاکٹر توصیف رضا کے ساتھ اچھی جان پہچان ہے۔

شاہ میر سے بھی فون پر عطا محمد نے بات کی تھی کہ وہ اس سلسلے میں ان کی مدد کرے، وہ آج کل ابوظہبی میں ہی

ہے اور اس نے پرانی دوستی اور ”رشتے داری“ کی خاطر ان کی نہ صرف بھرپور مدد بلکہ ان کی رہائش وغیرہ کا بھی بندوبست کرنے کا وعدہ کیا ہے۔ اب یہ لوگ کچھ روز میں دبئی روانہ ہونے والے ہیں۔ عطا محمد، گل شیر خان، مسعود اور فوزیہ۔“

میں اتنی صراحت بتانے کے بعد خاموش ہوا تو کالیا کو جیسے ایک عجیب سی چپ کھا گئی لیکن پھر فوراً ہی کچھ سوچ کر بولا۔

”اس کا مطلب ہے یہ چٹ منگنی اور پٹ بیاہ والا معاملہ نہیں تھا اور تو جگری ابھی سے ہی اتنا پریشان ہوا جارہا تھا۔ تو بھی تو ابوظہبی یا بحرین روانہ ہونے والا ہے، فوزیہ کو لے کر عرب کے صحراؤں میں نکل جانا، کوئی تمہارے سائے کو بھی نہ ڈھونڈ سکے گا۔“ وہ آخر میں ازراہِ تفنن بولا تو بے اختیار مجھے ہنسی آگئی۔

درحقیقت مجھے اس خبر سے کافی تسلی ہوگئی تھی کہ فوزیہ اور مسعود کا معاملہ ابھی منگنی کی حد تک ہی ہے، ممکن تھا اس سے آگے بھی جلد ہی باقی کا ”معاملہ“ بھی طے کر دیا جاتا، مگر اب چاہے کچھ عرصے کے لیے ہی سہی تعطل کا شکار بہرحال ہو ہی گیا تھا۔

”لیکن یار! سوچنے کی بات یہ ہے کہ مجھے وہاں فوزیہ کے حصول کے سلسلے میں کیا کرنا چاہیے؟“

”ابے لے! بتایا تو ہے کہ......“

”یار کالیا! مذاق کے علاوہ بات کر۔“ میں نے اسے گھور کر کہا۔ وہ شرارتی انداز میں ہنسا اور پھر ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا۔ بولا۔

”دیکھ جگری! مجھے ایسا لگتا ہے کہ تقدیر تجھے بیک وقت کوئی ایسا موقع دے رہی ہے، جہاں تو ایک طرف اپنے دشمنوں سے نبرد آزما ہوگا تو دوسری طرف محبت کا میدان بھی فتح کرنے کے لیے کھلا ہوگا۔ اللہ کا نام لے اور روانہ ہو جا اور کیا خبر وہاں کوئی ایسی سبیل نکل آئے کہ تیرا فوزیہ کے ساتھ معاملہ بن جائے۔ پر جگری! میں بھی تیرے ساتھ......“

”پھر وہی بچوں والی ضد؟“ میں نے اس کی بات کاٹ کر اسے گھورا۔

پھر اس کی بات پر کچھ سوچنے کے سے انداز میں بولا۔

”یار میں بھی جیسے ہوا میں تیر چلا رہا ہوں، یہاں میں کچھ کر نہ سکا اب بھلا وہاں جا کر فوزیہ کے حصول کے سلسلے میں کیا کرلوں گا؟ لیکن نہیں یار کالیا! تیری بات بھی صحیح ہے، جس طرح موت کا ایک دن معین ہوتا ہے، مرنے والے کی جگہ بھی متعین ہوتی ہے بہ عین اسی طرح تقدیر بھی کسی اہم کام کی انجام پذیری کا ایک وقت اور ایک جگہ ضرور رکھتی ہوگی۔ میرا دل کہہ رہا ہے کہ......“

”امارات کے صحراؤں میں بڑا دمادم مست قلندر ہو گا۔“ کالیا نے ازراہِ تفنن میری بات کاٹ کر کہا تو میں ہنس دیا لیکن دوسرے ہی لمحے ایک خیال بجلی کی سی سرعت کے ساتھ میرے ذہن میں چمکا۔

”کیا ہوا؟“ مجھے اس طرح اچانک پُرسوچ انداز میں خاموش ہوتا پا کر کالیا سوالیہ نظروں سے میری طرف تکنے لگا۔

”دبئی میں ہونے والی اس میڈیکل کانفرنس میں کیوں نہ میں فہیم کو بھی لے جاؤں آخر وہ کب تک بے چارہ اپنی جوانی معذوری میں گزارے گا، زیادہ نہیں تو کم از کم مصنوعی ٹانگیں لگ جانے سے کافی حد تک اسے سہارا تو مل ہی جائے گا۔“

”ابے لے جگری! تو نے تو ایک دم سولہ آنے بات درست کی ہے۔“ کالیا خوش ہو کر بولا۔ ”پھر تو میرا بھی تیرے ساتھ چلنا ضروری ہوگیا۔“

”تیری سوئی ابھی تک وہیں پر اٹکی ہوئی ہے۔“ میں نے اسے گھورا۔

”ابے لے! کیا اب بھی؟“ وہ رکا پھر سنجیدہ لہجے میں بولا۔

”دیکھ جگری! اب تو میرا یہاں رہنے کا جواز بھی نہیں رہا۔ تو جس مشن پر جارہا ہے وہ بھی تو تیرے لیے اہم ہے، فہیم کو دبئی میں لے جاؤں گا تو اپنا بحرین نکل جانا، انشا اللہ وہاں موقع نکال کر مل لیں گے۔ سوچ لے اچھی طرح جگری! میں غلط نہیں کہہ رہا ہوں، ایک سے دو بھلے ہوتے ہیں۔ سنا نہیں تو نے ایک اور ایک گیارہ ہوتے ہیں۔“

کالیا کی بات غلط نہیں تھی۔ میں نے اس سلسلے میں مزید سوچنے کے لیے سردست خاموشی اختیار کرلی۔ پھر موضوع بدلا۔

”رانا بشیر کو اپنے تازہ پروگرام سے آگاہ کرنا ضروری ہوگا۔ فہیم کی رجسٹریشن کے لیے بھی کچھ کرنا ہوگا۔ ہماری کسی ایسے ڈاکٹر سے جان پہچان بھی نہیں جو اس سلسلے میں ہماری رہنمائی یا مدد کرسکے؟“

’’ارم کو فون کر کے فوزیہ کو بھی اپنے تازہ معاملات سے آگاہ کردو۔‘‘ کالیا بولا۔ ’’اور اس سے بھی معلومات حاصل کر سکتے ہو اور کچھ نہیں تو کم از کم آن لائن رجسٹریشن فارم کی ویب سائٹ ہی بتا دے گی وہ۔‘‘

’’ہم...... یہی کرنا پڑے گا۔‘‘

☆......☆

اگلے چند ایام نہایت مصروفیت اور تیزی سے بیتے، بحرین والی مہم کو التواء میں ڈال کر ہم مزید خطرے کو آواز دے رہے تھے۔ فہیم کے سلسلے میں بھاگ دوڑ وغیرہ کر کے میں نے اس کی رجسٹریشن کروا دی اور ادھر رانا بشیر نے بھی گرین سگنل دے دیا۔ میرے کاغذات تیار ہو چکے تھے اور دو روز بعد میری بحرین کے لیے فلائیٹ تھی۔ یہ رات آٹھ بجے کی فلائٹ تھی۔ اس کے دو روز بعد کالیا فہیم کو لے کر دبئی کے لیے روانہ ہونے والا تھا۔

سچی بات تھی کہ اس مہم میں کالیا کی موجودگی کی سبیل نے میری ہمت بڑھا دی تھی۔

بحرین، ابوظہبی اور دبئی قریب قریب اماراتی ریاستیں تھیں۔ پھر ڈومیسٹک پروازوں، تیز رفتار بسوں اور لگژری کروزرس نے یہ اندرونی طویل فاصلے بھی گھٹا دیے تھے۔

میں نے ان چند دنوں میں متحدہ عرب امارات کی دیگر تمام ریاستوں کی معلومات بھی اکٹھی کر لی تھیں، اس سلسلے میں فہیم نے بھی میری مدد کی تھی۔ میں نے عاصمہ سمیت زنیرہ کو بھی بتا رکھا تھا کہ میں آفس کے کام کے سلسلے میں بحرین جا رہا ہوں۔ فہیم نے مجھے انٹرنیٹ سے کچھ مزید ضروری معلومات کی پرنٹ کاپیاں بھی نکال کر دے دی تھیں۔ جن میں راستے، شہر، عام و خاص مقامات کے علاوہ ہوٹلز بھی شامل تھے۔

ایسی بستیاں بھی تھیں جہاں آج بھی لوگ بدوؤں جیسی زندگیاں گزار رہے تھے۔ یعنی خالص دیہاتی انداز کی۔ وہ مختلف قبائل بھی تھے۔ چھوٹی بڑی ریاستیں گلف آف عرب سے خلیج فارس کے جزائر سے عمان تک پھیلی ہوئی تھیں اور ان تک آنے جانے کے لیے لگژری کروزرس، بوٹس، بسیں وغیرہ استعمال لائی جاتی تھیں۔

فہیم کے سلسلے میں بھی کام مکمل ہو چکا تھا۔ وہ بھی خوش تھا کہ اس کی معذوری کا کچھ تو سدِ باب ہونے والا تھا۔ عاصمہ، زنیرہ، فہیم اور چاچا انور شاہ، سب ہی یہ سمجھ رہے تھے کہ میں ایک طرف بحرین اپنی کمپنی کے کام سے جا رہا تھا اور لگے ہاتھوں فہیم کے بھی علاج کی صورت نکالنے کے لیے کوشاں تھا۔

میرے بحرین روانہ ہونے سے ایک دن پہلے تقریباً سب ہی لوگ مجھ سے ملنے کے لیے میرے گھر پر آئے ہوئے تھے۔ مجھے اتنی اچھی نوکری ملنے پر مبارکباد کا سلسلہ بھی ہنوز جاری تھا، تاہم نوکری ملتے ہی بحرین کے پروفیشنل ٹور کو سعد گھڑیوں سے تعبیر کر رہے تھے کہ اس کے بعد ضرور کمپنی میں میری ترقی کے چانسز بڑھ جاتے۔

اب میں اپنے ان معصوم بہی خواہوں کو کیا بتاتا کہ میرا اصل مشن کیا تھا اور کس قدر جان لیوا بھی۔ میں سب کی سنتا رہا اور اپنا سر دھنتا رہا۔

عاصمہ سسرال سے اپنے سسر کے ساتھ ٹیکسی میں ملنے آئی تھی۔ جیسا کہ مذکور ہو چکا، اس کا شوہر کاشف گلفو آئل کمپنی میں کام کرتا تھا۔ وہ ابوظہبی میں تھا۔ شادی کے بعد ایک ماہ کی چھٹیاں گزار کر وہ لوٹ گیا تھا۔

ملنے ملانے اور مجھے ’’وداع‘‘ کرنے کا یہ مرحلہ بھی اختتام کو پہنچا۔

فوزیہ نے مجھے ارم کے ذریعے اپنی روانگی کے پروگرام سے آگاہ کر دیا تھا۔ وہ لوگ میری روانگی کے تین روز بعد دبئی نکلنے والے تھے۔ سوئے اتفاق جس طیارے میں ان کی سیٹیں بک تھیں ان میں کالیا اور فہیم کی بھی سیٹیں ریزورڈ ہو چکی تھیں۔

بالآخر رات دس بجے کی فلائٹ کے لیے میں کراچی ائرپورٹ سے اتحاد ائرویز کے ۷۷۷ بوئنگ طیارے میں سوار ہو کر پاکستان سے پرواز کر گیا۔

☆......☆

میرا ویزا صرف بحرین اور ابوظہبی کے لیے تھا۔ دبئی کا نہیں تھا البتہ رانا بشیر نے میرے پاسپورٹ کے ساتھ منسلک ایک چٹ مجھے دکھا دی تھی جس میں لکھا تھا کہ ’’مزید ویزا درکار ہو تو بحرین میں خلیج فارس کے پولیٹیکل ریذیڈنٹ کے دفتر سے رجوع کیا جائے۔‘‘

ایک اجنبی دیس کی جانب یہ میری زندگی کا پہلا ہوائی سفر تھا۔ طیارے کی فضا بڑی کھلی ڈلی اور آرام دہ اور پُرسکون سی محسوس ہوتی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے میں کسی اور دنیا کی جانب سدھار رہا ہوں۔ ایک نامانوس اور دیارِ غیر کی سرزمین پر قدم رنجہ ہونے کے تصور میں روایتی وسوسے بھی میرے دل و دماغ میں جنم لے رہے تھے۔ تاہم ایک تسلی تو

تھی کہ میں منہ اٹھائے ایک اجنبی دیس کی جانب عازمِ سفر تو بہرحال نہیں ہوا تھا۔ (ہوتا بھی پڑتا تو کیا فرق پڑتا)۔

بحرین انٹرنیشنل ائرپورٹ مناما (Manama) (بحرین کا دارالحکومت) میں بہرام خان مجھے بہ نفسِ نفیس لینے کے لیے پہنچنے والا تھا۔ مجھے اسی کے ساتھ بہ ظاہر ابتدائی کاروباری معاملات نمٹانے تھے پھر مذکورہ کمپنی کے مقتدرہ افراد کے ساتھ ایک عمومی نوعیت کی میٹنگ میں شریک ہونا تھا۔ ممکن تھا مجھے فیلڈ ورک کے سلسلے میں ’’صرافہ‘‘ اور ابوظہبی بھی جانا پڑتا۔

اسی مناسبت سے میں نے بہترین تراش والا لائٹ براؤن لارنس پول کا بیش قیمت کوٹ سوٹ پہن رکھا تھا۔ یہ میرے لمبے چوڑے مگر چھریرے جسم پر خوب جچ رہا تھا۔ پیروں میں ہائی ربر سول کے ای بی ایچ والے براؤن بوٹ تھے۔ اگرچہ مجھے معلوم تھا کہ وہاں کا موسم کیسا تھا۔ تاہم ایک کمپنی کے نمائندے کے لیے ایسی تیاری ازبس ضروری تھی۔

طیارہ جب کراچی ائرپورٹ پر ٹیکسی کرتے ہوئے رن وے کی جانب اپنا رخ کرنے کی تیاری میں تھا پھر اس کے بعد وہ اپنا رخ سیدھا کر کے ذرا رکا تھا، شاید کنٹرول ٹاور سے مزید ہدایت کا منتظر تھا۔ اس کے چند سیکنڈوں بعد اس دیوہیکل آہنی پرندے نے رن وے پر طوفانی رفتار سے دوڑنا شروع کر دیا تھا۔

ٹیک آف کرتے ہی میں نے سیٹ کی پشت گاہ سے اپنا سر ٹکا دیا تھا۔ سامنے چمکتے ہوئے روشن الفاظ میں سیٹ بیلٹ باندھے جانے کی ہدایت کے مطابق وہ میں کس چکا تھا۔ ہر سیٹ کی پشت گاہ کے عقب میں ٹی وی اسکرین نصب تھی تاکہ مسافر بین الاقوامی نشریات سے بھی دورانِ سفر لطف اندوز ہوتے رہیں۔

لطف...... یہ ایک لفظ جسے میرے نصیب سے قدرت نے کھرچ ڈالا تھا۔ کوئی اور موقع ہوتا تو میں یقیناً اس سفر سے لطف اندوز ہوتا مگر ایک اہم مقصد کو کامیابی کے ساتھ پورا کرنے کی ذمہ داری کے بوجھ نے سفر کی یہ انوکھی رنگینی بے مزہ سی کر ڈالی تھی۔

عاصمہ کے فرض سے میں سبکدوش ہو چکا تھا۔ فہیم کے علاج کی بھی بروقت سبیل نکل آئی تھی۔ کالیا جیسا جناور اس کے ہمراہ تھا۔ فوزیہ بھی اسی راستے پر گامزن تھی اور یقیناً اس کی طرف سے بھی اچھی ہی خبر سننے کو ملتی۔ مگر میرا دشمن شاہ میر زندہ تھا۔

یہی ایک ناسور میرے سینے میں ہرے رہنے والے زخم کی طرح چسپاں میری خوشیوں کو غارت کیے ہوئے تھا۔ فوزیہ کا حصول میری زندگی کا سب سے بڑا خواب تھا۔ اس کی تعبیر فی الحال کوسوں دور نظر آتی تھی، مگر میں ناامید نہ تھا۔ یہی تو زندگی ہے، کبھی خوشی کبھی غم مگر شاہ میر جیسا ناسور جب تک تازہ تھا میری لحاتی خوشیاں بھی بے مزہ تھیں۔

انہی سوچوں میں میرا سفر کٹتا رہا۔

کراچی سے بحرین کا سفر دو سے ڈھائی گھنٹوں کا تھا۔ بحرین خلیج فارس میں تھا۔

دیگر فلائٹس سے چار گھنٹے بھی لگتے تھے۔ اتحاد ائرویز امارات کی بہترین ائرلائن کہلاتی تھی۔ یہ ڈائریکٹ فلائٹ تھی۔

جہاز کا عملہ مسافروں کی خدمت داری کے لیے

آفتاب حمیدی بدایونی

کراچی میں حمیدی نسبت رکھنے والے گھرانے کی فاطمہ ثریا بجیا (ڈراما نگار) ان کے برادران احمد مقصود حمیدی (سیکریٹری اطلاعات سندھ) انور مقصود (ڈراما رائٹر ٹی وی کمپیئر) اور ہمشیرگان زہرہ نگاہ سارہ نقوی نے شہرت و مقبولیت حاصل کی۔ اسی گھرانے کے ایک فرد آفتاب حمیدی بدایونی 1921ء میں بدایوں میں پیدا ہوئے تھے۔ ان کا اصل خاندانی نام ضیاء الحسن تھا۔ قیام پاکستان سے قبل بھی اور کراچی آنے کے بعد بھی آپ کو بدایوں کی ممتاز علمی و ادبی شخصیت کی حیثیت سے احترام و عقیدت کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ محشر بدایونی، منظر ایوبی اور انور مقصود حمیدی وغیرہ کے اصرار پر کبھی کبھی شعری نشستوں میں بھی شریک ہوتے تاہم باقاعدہ طور پر شاعری کا مجموعہ مرتب نہ کیا اور جو کلام سنایا اسے بھی محفوظ نہیں رکھ سکے۔ 19 فروری 1991ء کو آفتاب حمیدی نے کراچی میں اپنی جان جانِ آفریں کے سپرد کی اور خفتگانِ خاک کراچی قرار پائے۔

اقتباس: خاک میں پنہاں صورتیں، از سید محمد قاسم
مرسلہ: ظفر عابدی۔ کراچی

متحرک ہو چکا تھا۔ ہوائی میزبانوں میں دو اقسام کی خواتین نظر آ رہی تھیں۔ غیر ملکی ائر ہوسٹس پنک کوٹ سوٹ میں تھیں اور اسی رنگ کا ربن تھا۔ عربی ہوسٹس نے سیاہ عبایا زیب تن کر رکھا تھا۔ کچھ ٹرکش مسلم خواتین بغیر عبایا کے تھیں مگر وہ بھی فل لانگ سلیو میکسی ڈریس یونیفارم میں تھیں۔

میرا کچھ کھانے پینے کو دل نہیں چاہ رہا تھا، تاہم یونہی میں نے ایک عبایا پوش عربی ہوسٹس کو اپنے لیے لیمن جوس لانے کا کہا۔

ایک خوبصورت سے کانچ کے گلاس میں وہ ٹرے میں رکھے لے آئی اور دلکش مسکراہٹ کے ساتھ مجھے پیش کر دیا۔ طیارے میں ہر ملک و قوم اور مذاہب سے تعلق رکھنے والے موجود تھے۔ یہ فلائٹ نیویارک سے آ رہی تھی۔

مشروبات اور جام جم کھنک رہے تھے۔ دور چل رہے تھے۔ لوگ پینے پلانے کے ساتھ خوش گپیوں میں مشغول ہو گئے تھے۔ عملے کی حسین اور اسمارٹ خواتین بھی اپنے تروتازہ سے کھلتے کنول جیسے لبوں اور شفق رنگ مہین سے گالوں پر دل موہ لینے والی مسکراہٹیں بکھیر کر پسنجرز کا بھرپور ساتھ دے رہی تھیں۔ یہ الگ بات تھی کہ ان کی مسکراہٹیں خالصتاً ''پروفیشنل'' تھیں۔

میں تین رو یہ والی اکنامی کلاس کی آخری سرے والی سیٹ پر بیٹھا تھا۔ میرے برابر کی دو سیٹوں پر، یعنی دائیں جانب ایک اطالوی جوڑا براجمان تھا۔ مرد کی عمر چالیس پینتالیس سال سے اریب قریب محسوس ہوتی تھی۔ وہ خاصا سنجیدہ رو نظر آ رہا تھا۔ چہرہ قدرے لمبوترا تھا، آنکھیں چھوٹی مگر بے حد چمکتی ہوئی تھیں۔ وہ ٹھیک ٹھاک ڈیل ڈول کا مالک نظر آتا تھا۔ اس کے بال بھی ''کریوکٹ'' تھے۔ رنگت سرخ و سپید تھی۔ اس کے کھنڈی ہوئی سنجیدگی لیے چہرے اور سپاٹ پتلے ہونٹوں کو دیکھ کر لگتا تھا جیسے اسے مسکرائے ہوئے ایک عرصہ بیت چکا ہو۔ تاہم اس کے چہرے پر زردی مائل رنگت کچھ زیادہ ہی نظر آتی تھی۔ جلد بھی اس کی خاصی کھردری نظر آتی تھی۔

مجھے وہ کوئی پروفیشنل ٹائپ کا آدمی لگ رہا تھا۔ اس کی ساتھی خاتون کی عمر پچیس تیس سے زیادہ کی نہیں لگتی تھی۔ وہ خاصی پُرکشش اور اسمارٹ تھی۔ دونوں شاید میاں بیوی تھے۔

میں نے انہیں اجنبی زبان (اٹالین) میں باتیں کرتے بھی پایا تھا۔ زیادہ لڑکی ہی بول رہی تھی، مرد خاموش تھا۔ وہ کم ہی بول رہا تھا۔ تاہم انہیں انگریزی بھی آتی تھی، عملے کے کسی فرد سے ضرورتاً وہ انگریزی میں ہی مخاطب ہوتے تھے، مگر مختصراً مجھ سے ابھی تک وہ مخاطب نہیں ہوئے تھے بلکہ مجھ سے کیا ہوتے، وہ دونوں آپس میں ہی بہت کم بات کر رہے تھے، تھوڑی بہت بات کی بھی تھی تو وہ اس کی ساتھی جوان عورت نے ہی کی تھی۔

میری والی رو تین تین سیٹوں کی تھی۔ درمیان میں آنے جانے کے خلاء کو چھوڑ کر بیچ میں چار سیٹیں اور اس کے بعد اسی طرح ایک خلا کے بعد تین سیٹوں والی رو۔

میرے بائیں ہاتھ کے درمیان چار کی سیٹوں والی قطار میں کوئی اماراتی فیملی بیٹھی تھی۔ یہ آگے پیچھے کی سیٹوں پر براجمان تھے اور ان کی تعداد دو تین چھوٹے اور نو عمر بچوں کو ملا کر دس بارہ کے قریب بنتی تھیں۔

مردوں نے عربی روایتی لباس پہن رکھا تھا۔ سر پر مخصوص عربی صافہ باندھا ہوا تھا۔ عورتیں لمبے سیاہ جبے میں ملبوس تھیں اور چہروں پہ نقاب تھا۔ ان میں دو تین عمر رسیدہ عورتیں بھی تھیں۔ مرد زیادہ تر سانولے اور گہری رنگت کے تھے۔

ان کی عورتیں البتہ گوری چٹی تھیں۔ جثے اور ڈیل ڈول کے لحاظ دو پکی عمر کے مرد خاصے خرانٹ نظر آتے تھے۔ وہ دونوں آپس میں خاصے جوش بھرے انداز میں باتیں کر رہے تھے۔

ان کے اریب قریب میں موجود اکثر لوگ بیزاری اور کچھ تنبیہی نظروں سے ان کی طرف دیکھ لیتے تھے۔ ان کے ساتھ دو خواتین براجمان تھیں۔ جوانی کی تھیں۔ وہ بھی کبھی کبھار جھک کر ہولے سے ان سے کچھ کہہ لیتی تھیں مگر مردان خواتین کو غصیلی نظروں سے گھورتے تو وہ بے چاریاں سمٹ جاتیں۔

ان دونوں میں شاید کسی بات پر ٹھنی ہوئی تھی اور گرما گرم بحث چھڑی ہوئی تھی۔ عملے کے کچھ افراد نے بھی آہستگی سے انہیں ٹوکنے کی کوشش چاہی تھی مگر وہ دونوں ہی باز نہیں آ رہے تھے، ذرا دیر کے لیے ہلکے پڑ جاتے اور پھر وہی ''تو تڑاک'' جیسی بحث ان کے درمیان شروع ہو جاتی۔

اسی طرح میرے آگے کی طرف والی رو کی تین سیٹوں پر ایک اور مختصر فیملی بیٹھی تھی، یہ مجھے پاکستانی نظر آ رہے تھے۔ ایک تو جوان لڑکی تھی اور اس کے ہمراہ بوڑھی سی عمر رسیدہ خاتون تھیں، ایک آٹھ نو سالہ بچہ تھا۔

وہ بچہ اپنی سیٹ پر بیٹھا غور غور سے اپنی معصوم نظروں کے ساتھ ان دونوں ہٹے کٹے مردوں کو آپس میں باتیں کرتے ہوئے دیکھ رہا تھا پھر نہ جانے کیا ہوا۔ وہ اپنی سیٹ سے اٹھا۔ لڑکی بوڑھی عورت کے ساتھ باتوں میں مشغول تھی۔ وہ بچے کو نہ دیکھ پائی۔ بچہ تھوڑا سرک کر آگے بڑھا اور اماراتی مرد کے سر پر بندھے صافے کو کھینچنے لگا۔

وہ اماراتی اپنے ساتھی سے اب ہاتھ ہلا ہلا کر باتیں کر رہا تھا کہ اچانک صافہ ڈھلک کر بچے کے ہاتھ میں آ گیا۔ مرد کا سر گنجا تھا، کچھ اریب قریب بیٹھے لوگ دبے دبے انداز میں ہنس پڑے۔ وہ لڑکی بھی بوڑھی عورت سے باتیں کرتے کرتے اس طرف متوجہ ہوئی، وہ بچہ شاید اس کا اپنا ہی تھا۔

پھر اس سے پہلے کہ وہ اپنے بچے کو سیٹ پر جھکے جھکے تھامنے کی کوشش کرتی۔ اس آدمی کو غصہ آ گیا اور اس نے طیش میں آ کر اپنے بھاری ہاتھ کا تھپڑ بڑے زور سے اس معصوم بچے کے پھول سے گال پر جڑ دیا۔

بچہ اچھل کر میرے قریب قدموں پہ آن گرا اور بے ہوش ہو گیا۔ اس کا سر پھٹ گیا تھا اور اس کے منہ سے خون کی لکیر بھی دکھائی دینے لگی تھی۔ لڑکی کے حلق سے چیخ نکل گئی اور لوگ بھی اس اماراتی آدمی کے وحشی پن پر چلا اٹھے تھے، کئی لوگ تو بچے کو سنبھالنے کے لیے اپنی سیٹوں سے کھڑے بھی ہو گئے تھے۔ کچھ لوگوں نے بہ آواز بلند اس جاہل اماراتی کو ''شیم...... شیم'' بھی کہا تھا۔

یوں میری سیٹ چونکہ زیادہ قریب تھی اور میں خود بھی اس وحشی عرب کی بربریت پر غصے سے کھل اٹھا تھا۔ میں نے بچے کو جلدی سے اٹھایا اور کسی اور کے حوالے کر دیا۔

عام حالات میں مجھے اس قدر غصہ کم ہی آتا ہے مگر اس موٹے اماراتی کی اس سفاکانہ حرکت اور معصوم بچے کی حالت زار نے مجھے ہتھے سے اکھاڑ دیا۔ دانت پیستا ہوا میں آگے بڑھا اور اس موٹے ظالم اماراتی کے سیاہ رو چہرے پر اپنے دائیں ہاتھ کا ایک گھونسا جڑ دیا۔

میرا جسم دبلا پتلا سہی مگر اس میں طاقت کم نہیں تھی اور جوش غیظ میں تو یہ بھی سوا ہی ہو جاتی تھی۔ میرے گھونسے نے عربی کے موٹے ہونٹوں کو بری طرح پھاڑ کر رکھ دیا۔ اس کا سامنے کا شاید ایک دانت بھی ٹوٹ گیا تھا۔

میں نے انگریزی میں اسے خوب لعن طعن بھی کر ڈالی۔ اس کے ساتھی مرد جارحانہ انداز میں غراتے ہوئے میری جانب لپکے تھے مگر میری جرأت اور دلیری نے طیارے میں موجود اور لوگوں کے اندر بھی غیرت و ہمت جگائی مگر وہ بھی صرف بیچ بچاؤ کی حد تک ہی آگے بڑھے تھے، اس دوران ایک جوان سے اماراتی لڑکے نے مجھ پر لات چلانے کی کوشش چاہی تھی مگر میں نے اس کی لات پکڑ کر اسے مروڑ کر اسی کے زور پر اسے پرے دھکیل دیا۔ وہ برابر کی سیٹ پر بیٹھی اپنی ہی فیملی کی ایک جوان عبایا پوش لڑکی کی گود میں جا گرا۔

یوں تب تک عملہ بھی آگے بڑھا مگر اس پاکستانی لڑکی کی چیخوں سے کلیجہ چھلنی ہوا جا رہا تھا۔

''ہائے ظالم! یہ کیا کر دیا...... ! میرے معصوم کا کیا حشر کر دیا۔ دیکھو لوگو! اسے ہوش نہیں آ رہا، پتا نہیں زندہ بھی ہے کہ نہیں...... میرا بچہ۔'' اس لڑکی کو غش آ رہا تھا۔ عملے کے اور دیگر لوگ اسے سنبھالنے لگے، بچے کو ہوش میں لانے کے لیے کسی ڈاکٹر کو بلوایا گیا۔ وہ طیارے کے عملے سے ہی ایک تھا۔

میرا غصہ ابھی کم نہیں ہوا تھا، عربی تو مجھے آتی نہیں تھی اور پتا نہیں یہ اماراتی انگریزی جانتے بھی تھے یا نہیں تاہم میں نے دل کی مزید بھڑاس نکالتے ہوئے ان سب کو بے نقط سنا ڈالیں۔

عملے سمیت کچھ لوگوں نے ہمارے درمیان بیچ بچاؤ کرا دیا۔ وہ موٹا اماراتی اپنے ہی صافے سے اپنا خون آلودہ منہ صاف کرتے ہوئے میری طرف بڑی خوں ناک نظروں سے گھور رہا تھا۔ اس کا وہ نوجوان ساتھی بھی ہنوز غصے میں تھا۔ مجھ سے وہ دوبارہ بھڑنے کی کوشش میں تھا مگر اس کے اپنے لوگوں نے اسے روکے رکھا تھا۔

کاک پٹ سے کو پائلٹ بھی آ گیا تھا۔ کچھ دیر بعد معلوم ہوا کہ بچے کو ہوش آ گیا ہے اور اس کی مرہم پٹی کر دی گئی ہے تب کہیں جا کر میرا جوش کم ہوا لیکن وہ موٹا اور اس کا نوجوان ساتھی ابھی تک مجھے کینہ توز نظروں سے گاہے بہ گاہے گھور رہے تھے۔

کچھ دیر میں جہاز کا ماحول پُرسکون ہو گیا اور میں بھی اپنی سیٹ پر پشت اور سر ٹکا کر بیٹھ گیا۔ وہ پاکستانی لڑکی اور اس کے ساتھ بیٹھی عمر رسیدہ خاتون بار بار میری طرف متشکر نگاہوں سے دیکھ رہی تھیں۔

میرے برابر کی سیٹوں پر بیٹھا وہ مذکورہ اطالوی جوڑا بھی اب بار بار گردن موڑے میری طرف دیکھ لیتے تھے، میں نے ان سے مخاطب ہونے کی ضرورت نہیں سمجھی تھی۔

"ہائی! تم نے اچھا سبق سکھایا ان کو مجھے تمہاری یہ جرأت بہت پسند آئی"۔
اچانک اطالوی مرد مجھ سے مخاطب ہو کے بولا۔
اس کی انگریزی رواں اور شستہ تھی مگر اس کا لہجہ ٹھنڈا ہوا اور بھاری تھا۔ چہرہ بھی بدستور سپاٹ رہا۔ جیسے وہ مسکرانا تو بالکل ہی نہ جانتا ہو۔ اس کی ساتھی لڑکی البتہ ہلکی سی دل موہ لینے والی مسکراہٹ سے میری طرف دیکھ رہی تھی۔ اس کے نرم ہونٹوں میں بڑی گدازیت محسوس ہوتی تھی۔
"ہائی۔" میں نے بھی خفیف سی مسکراہٹ تلے ہولے سے سر کو اثباتی جنبش دیتے ہوئے کہا اور غبار اگلا۔ "شرم نہیں آتی ان کو ایک معصوم بچے پر ہاتھ اٹھاتے ہوئے۔"
"مجھے اوبرائے گرانٹ کہتے ہیں۔" اس نے مصافحے کے لیے ہاتھ بڑھا دیا۔ حیرت کی بات تھی کہ ایسے میں تو ہر انسان بھی تکلفاً تھوڑا سا مسکرا ہی دیتا ہے لیکن اس شخص کے ٹھنڈے ہوئے چہرے سے تو جیسے مسکراہٹوں کا دور کا بھی واسطہ نہ رہا تھا، جیسے وہ مسکرانا ہی نہ جانتا ہو۔
"اور...... یہ مس لائیلا ہیں۔ میری ساتھی۔" اس نے اپنے ساتھ بیٹھی خوبصورت سی لڑکی کا بھی تعارف کروایا۔ میرا اندازہ غلط ثابت ہوا تھا کہ یہ اس کی بیوی تھی۔ لائیلا نے ایک دلنشین سی مسکراہٹ کے ساتھ اپنا نرم و نازک ہاتھ خیر مقدمی انداز میں میری جانب بڑھا دیا۔ میں نے ہلکی مسکراہٹ سے اس کا ہاتھ مصافحے کے لیے تھاما تو چھوڑنے کو دل ہی نہ کیا۔ اس قدر ہین اور گدازیت تھی اس کے مرمریں ہاتھ میں۔
"مجھے نعمان احمد کہتے ہیں۔" ساتھ ہی میں نے بھی اپنا تعارف کروانا ضروری سمجھا۔
"تم نے ایک ہی گھونسا مار کر اس گینڈے سے اس بچے کا بدلہ چکا تو لیا ہے، مگر میں ان کی فطرت سے اچھی طرح واقف ہوں۔ اونٹ کا کینہ رکھتے ہیں یہ لوگ۔" اوبرائے گرانٹ نے کہا۔ "میں گزشتہ دس سال سے ان کے بیچ رہا ہوں۔" اس نے بات مکمل کی اور مجھے یہ سن کر حیرت ہوئی۔ بات کی تشویش اپنی جگہ۔ یوں بات سے بات میں، میں نے کہا۔
"اچھا! آپ شاید یہاں جاب کرتے رہے ہیں۔ میرا مطلب ہے بحرین میں؟"
"کویت، قطر، سعودی عرب، شارجہ اور دیگر اماراتی و عرابک ریاستوں میں دس سال لگا دیے ہیں، خوب دولت اکٹھی کی اور کر رہا ہوں مگر بحرین اور صرائفہ پہلی بار کام پر جا رہا ہوں۔" اس نے بتایا۔
"اور مجھے لگتا ہے کہ اوبرائے کا وہاں طویل ٹور ہو گا اس بار۔" اس کی ساتھی لڑکی مس لائیلا مسکرا کر ایک نگاہ اپنے ساتھی پر ڈالتے ہوئے مجھ سے بولی تھی، جبکہ میں اوبرائے گرانٹ کے منہ سے "صرائفہ" کا نام سنتے ہی میں چونک پڑا تھا۔
"تم کیا کام کرتے ہو، مسٹر اوبرائے؟" میں نے کسی خیال کے تحت پوچھ لیا۔
"بہت ڈینجرس کام کرتے ہیں یہ۔" لائیلا نے مسکرا کر مجھ سے کہا۔ "تیل کے کنوؤں میں آگ لگ جائے تو پورے عرب کے شیوخ فوراً ان کی خدمات لیتے ہیں۔ انہیں لینے کے لیے خصوصی طیارہ چارٹرڈ کر کے بھیجتے ہیں۔ تیل کی دنیا میں اپنے کام کے مانے ہوئے کھلاڑی ہیں۔"
لائیلا کے لہجے میں فخر تھا۔ میں اس فیلڈ سے متعلق بالکل کورا تھا۔ تاہم میں نے اوبرائے گرانٹ کے "پروفیشن" کا اندازہ لگا لیا تھا۔ میں نے روایتی انداز میں اس کی تعریف میں چند کلمات ادا کرنا ضروری سمجھا مگر میری سوئی صرائفہ میں اٹکی ہوئی تھی لہٰذا برسبیل تذکرہ میں نے بھی گرہ لگا دی۔
"منزل تو میری بھی صرائفہ ہی ہے۔ کیا وہاں کسی تیل کے کنوئیں میں آگ لگ گئی ہے؟"
میری بات پر لائیلا سے زیادہ اوبرائے نے چونک کر میری طرف دیکھا تھا۔ اس کے چہرے پر ٹھنڈی ہوئی سنجیدگی مزید گہری ہو گئی۔ اسی لہجے میں مجھے مخاطب کر کے بولا۔
"مسٹر نومان (نعمان)! تم کسی تیل کی کمپنی میں ملازم ہو؟"
"نہیں۔" میں نے نفی میں سر ہلایا۔ "ملازم تو نہیں ہوں البتہ گلفو آئل نامی کمپنی میں کچھ ہیوی ڈیوٹی مشینیں سپلائی کرنے کے معاہدے کے سلسلے میں پاکستان سے بحرین جا رہا ہوں۔ ممکن ہے صرائفہ بھی جانا پڑے۔"
"اوہ، بہت اچھا اتفاق ہے یہ اسی کمپنی نے ہی تو مجھے ہائر کیا ہے۔" وہ بولا۔ "صرائفہ میں تو ابھی تیل کی تلاش جاری ہے، کھدائی کے دوران آگ لگنے کے اندیشے سے مجھے اس پروجیکٹ کے کیمپ میں قیام کرنا ہوتا ہے کیونکہ ابتداء میں لگنے والی آگ سارا منصوبہ ناکام بنا دیتی ہے۔"

"واؤ...... یہ تو واقعی اچھا اتفاق ہو گیا۔" لائیلا میری طرف دیکھ کر بولی۔ اس کی ہلکی نیلی آنکھوں میں عجیب سی چمک تھی۔ میں نے غور کیا، اوبرائے بدستور سنجیدہ رہا۔ جیسے اسے اس اتفاق سے کوئی دلچسپی نہیں ہو۔ وہ اب خاموش بھی ہو گیا تھا۔ ایک عجیب قسم کی اور ایک دم سے ایک چپ سی لگ گئی تھی۔ یوں لگتا تھا جیسے وہ اب مزید مجھ سے یا ایسے کسی موضوع پر بات ہی نہیں کرنا چاہ رہا ہو۔ میں بھی خاموش ہو رہا۔
اس کے تھوڑی دیر بعد ہی شاید میں گہرے تفکرات کے دباؤ تلے سو گیا تھا اسی لیے ائر ہوسٹس نے ہی میرا کندھا تھپتھپا کر مجھے جگایا تھا۔ جہاز اس وقت رن وے پر اتر چکا تھا، پنکھے بند ہو چکے تھے، مسافر اتر رہے تھے۔ ائرپورٹ کی سرخ اور نیلی بتیاں نظر آ رہی تھیں، چاند کی کرنیں دور افق تک پھیلی ہوئی تھیں۔ یہ بحرین کا ہوائی مستقر تھا۔ جہاز سے اترتے ہی مجھے سخت گرمی اور حبس کا احساس ہوا تو میں نے اپنا کوٹ اتار کر ہاتھ میں تھام لیا۔
کسٹم اینڈ امیگریشن سے فارغ ہونے تک ہم سب لاؤنج میں ہی تھے۔
مجھے بہرام خان نظر نہ آیا۔ میں نے اسے دیکھا تو نہیں تھا، لیکن رانا بشیر نے مجھے اس کی کچھ تصویریں دکھا رکھی تھیں۔ میں اٹھ کر اس حصے میں بھی گیا تھا جدھر اور لوگ بھی اپنے چاہنے والوں کو ریسیو کرنے کے لیے آئے تھے اور کچھ نے ان کے نام کی تختی اٹھا رکھی تھی۔ مجھے اپنے نام کا کوئی آدمی بینر اٹھائے دکھائی نہ دیا۔
"اسے شاید دیر ہو گئی ہو۔" میں نے سوچا اور مسافر لاؤنج میں آ کر میں نے تھوڑی دیر تک اس کا انتظار کیا مگر وہ نہ آیا، مجھے خدشہ ہوا کہ شاید مجھے وہی کرنا پڑے گا جس کی پہلے سے رانا بشیر نے مجھے ہدایت کر رکھی تھی بلکہ یہ بہرام نے ہی اس سے کہا تھا کہ ممکن ہے وہ مجھے لینے کے لیے نہ پہنچ سکے تو ایک پتا بہرام نے رانا بشیر کو لکھوا دیا تھا جو اس نے مجھے بتا دیا تھا کہ ایسی کسی صورت میں، اس پتے پر میں پہنچ جاؤں اور بہرام کا وہیں انتظار کروں۔ یہ پتا منامہ کے ایک قریبی مضافاتی علاقے کا تھا۔ وہاں ایک بی اواے سی ہوٹل تھا، جہاں میرے نام سے ایک کمرا بک تھا۔ بہرام اور میں نے وہیں جانا تھا مگر اب مجھے اکیلے ہی مذکورہ ہوٹل پہنچ کر رات وہیں آرام کرنے کے بعد پھر صبح ہی مجھے بہرام کا اسی ہوٹل کے کمرے میں انتظار کرنا تھا۔ اب تو کافی رات ہو چکی تھی، وہ اب صبح ہی آ سکتا تھا۔
چنانچہ میں نے ایسا ہی کیا۔ بہرام کو شاید اپنی مصروفیات یا اچانک کسی کام میں پھنس جانے کا خدشہ تھا اسی لیے اس نے احتیاط کے پیش نظر یہ کام کیا تھا۔ میرے خدشے کی وجہ بھی یہی تھی اسی لیے میں نے اس کا زیادہ انتظار نہ کیا اور وہاں سے اٹھ گیا۔
ابھی میں گیٹ سے چند قدموں کے فاصلے پر ہی تھا کہ میری نظر اسی اطالوی جوڑے پر پڑی۔ وہ بھی کہیں سے فارغ ہو کے اب تیز تیز قدموں سے گیٹ کی جانب بڑھ رہے تھے۔ مجھ سے انہوں نے کوئی بات نہ کی تھی، وہ مجھ سے یوں لاتعلق سے ہو گئے تھے جیسے ذرا دیر کی شناسائی کو بھول گئے ہوں۔ میں نے بھی کوئی پروا نہ کی لیکن اسی وقت وہی خوبصورت سی پاکستانی لڑکی میرے قریب آ گئی۔ اس کی سانسیں پھولی ہوئی تھیں۔ وہ اکیلی تھی اور اس کے ہاتھ میں کوئی سامان یا ٹرالی بھی نہ تھی۔
"میں آپ کو کب سے دیکھتی آ رہی تھی۔ آپ کے ساتھ رہنا چاہ رہی تھی میں...... آپ کا شکریہ، آپ بلاشبہ ایک دردمند دل کے مالک ہیں۔"
میں نے گیٹ کی طرف بڑھتے ہوئے جہاں ایک چمکتی دمکتی شاندار سی لمبی بس مسافروں کو لے جانے کے لیے کھڑی تھی، رکتے ہوئے اس لڑکی کی طرف دیکھا۔
قریب سے دیکھنے پر مجھے اب صحیح طرح اس کی عمر کا اندازہ ہوا۔ وہ واقعی ینگ تھی۔ لگتی ہی نہیں تھی کہ وہ شادی شدہ اور ایک بچے کی ماں بھی ہو گی۔
"آپ کا بچہ کیسا ہے اب؟"
"پپو بالکل ٹھیک ہے۔ اسے اسپتال لے جایا جا رہا ہے۔ آ...... آپ کو ان کی طرف سے کوئی پریشانی تو نہیں ہوئی ناں؟" اس نے پوچھا۔ پپو شاید وہی بچہ تھا۔ میں نے ایک نگاہ اس کے سراپے پر ڈالی۔ اس کے بال دراز تھے۔ صورت موہنی سی تھی۔ رنگ گورا اور نقش جاذب نظر تھے۔ سرو قد اور خوبصورت تھی۔ اس نے ڈھیلی ڈھالی شرٹ کے نیچے ٹائیٹ جینز پہن رکھی تھی اور پیروں میں اونچی ہیل کے سینڈل تھے۔
"کن کی طرف سے پریشانی ہوگی مجھے بھلا؟" میں نے ادھر ادھر دیکھتے ہوئے پوچھا۔
"وہ...... لوگ، جن سے آپ نے پپو کی خاطر جھگڑا مول لیا تھا۔ اس بدبخت نے اتنی زور سے میرے پھول

سے معصوم بچے کو تھپڑ مارا تھا کہ میرا تو دل ہی کانپ گیا تھا۔ میرا بس نہیں چل رہا تھا کہ اس وحشی کی بوٹیاں نوچ ڈالوں مگر آپ نے اسے گھونسا مار کر یہ بدلہ چکایا تو میرے سینے کی آگ کچھ سرد پڑی۔"

"وہ میرا کیا بگاڑیں گے؟ اگر ایسا ہوتا تو ایک معصوم بچے کو مارنے کے جرم میں خود ہی اندر ہو جاتے، یہاں قوانین یوں بھی سخت ہیں۔"

"میں اسی لیے تو کافی دیر سے آپ کے پیچھے پیچھے رہی تھی کہ اگر انہوں نے ایسی کوئی شرارت کی تو میں ان کا بھانڈا پھوڑ دوں۔"

"اچھی بات ہے، شکریہ۔ بس جانے والی ہے۔" میں نے اس سے جان چھڑاتے ہوئے کہا اور اپنا شولڈر بیگ اٹھائے آگے بڑھ گیا۔

میں بس میں سوار ہونے لگا۔ وہ اطالوی جوڑا پہلے ہی اس میں سوار ہو چکا تھا۔ جن لوگوں کو ان کے اپنے لینے آئے تھے وہ ان کے ساتھ جا چکے تھے۔ باقی بس میں سوار ہو رہے تھے۔ وہ دونوں اگلی سیٹوں پر براجمان تھے۔ میں درمیان کی ایک سیٹ پر بیٹھ گیا۔

تھوڑی دیر بعد بس روانہ ہوگئی۔

رات کافی ہو چلی تھی۔ بس سمندر کے ساتھ ساتھ ایک خاموش سی لمبی سنسان سڑک پر جا رہی تھی۔ دونوں طرف سفید مکان کھمبوں کی ٹمٹماتی روشنی میں یہاں وہاں نظر آ رہے تھے۔

تھوڑی دیر بعد ہم مناما کے اس قصبے میں پہنچ گئے۔ معاملہ رازداری کا تھا شاید اسی لیے مجھے دوسری صورت میں یہاں پہنچنے کی ہدایت کر رکھی تھی۔ کم از کم مجھے ایسا ہی لگا تھا۔

بہرکیف یہاں بھی ہو کا عالم تھا۔ عجیب ویران سا علاقہ تھا، یا پھر شاید رات زیادہ گہری ہو گئی تھی، آدم نہ آدم زاد۔ دور سمندر دکھائی دیا تھا۔ آسمان صاف اور روشن تھا۔ طباق چاند نکلا ہوا تھا اور کھلے آسمان پر تارے قمقموں کی طرح ٹمٹما رہے تھے۔

یہ سارا علاقہ ساحلی لگتا تھا۔ بس کا سفر جاری رہا۔

ادھر سمندر میں کھڑی ہوئی کشتیوں کی روشنیاں تھیں، تاہم اس وقت صرف بی اوسی ہوٹل میں ہی کچھ رونق نظر آتی تھی۔

یہ ہوٹل ایک بغلی اور خاصی چوڑی گلی میں واقع تھا۔ بس کی آواز سنتے ہی گویا ہمارے استقبال کے لیے بیرونی دروازوں کی بتیاں جلا دی گئی تھیں۔ خاصی چکاچوند ہوگئی۔ بس ہوٹل کے گیٹ کے سامنے رک گئی۔ میرے ساتھ چند مسافر اترے باقی آگے روانہ ہوگئے۔ میں یہ دیکھ کر تھوڑا چونکے بغیر نہ رہ سکا تھا کہ اوبرائے گرانٹ اور لائیلا بھی اسی ہوٹل کے لیے اترے تھے۔

جانے کیوں میرے دل کو عجیب اور نامعلوم سی بے چینی گھر کرنے لگی تھی۔ تاہم میں نے ان وسوسوں کو روایتی جان کر دل و دماغ سے جھٹکا اور اندر داخل ہوگیا۔

شکر ہوا کہ بہرام خان نے یہ کام کر رکھا تھا ورنہ تو مجھے اس بات کا بھی خدشہ تھا کہ کہیں وہ اپنی مصروفیات کی وجہ سے کمرا ابھی نہ بک کروا سکا ہو تو میرا کیا بنتا؟ خیر بچہ تو تھا نہیں میں۔ پیسا تھا، میں کسی بھی ہوٹل میں رات تو کم از کم گزار ہی سکتا تھا لیکن شکر رہا کہ کمرا میرے ہی نام سے پہلے سے بک تھا اور مجھے استقبالیہ پر ہی بتا دیا گیا تھا کہ میرے لیے یہ کمرا ایک دو روز پہلے سے ہی بک کروا دیا گیا تھا۔

بہرکیف...... ہوٹل میں مجھے ایسا کمرا ملا جس کے باہر بالکنی تھی۔ سمندر کی گرم مرطوب آب و ہوا کے ساتھ ساتھ مجھے قہقہوں اور جام ٹکرانے کی آوازیں بھی رات بھر آتی رہیں۔

استقبالیہ پر میں نے اپنے بارے میں ضروری اندراجات کروا دیے تھے۔

"ہمم...... یہاں تو رات گئے بھی خوب میلے ٹھیلے کا سماں ہے، سالے گورے ہوں گے۔ ان کا کام ہی راتوں کے پنچھیوں کی طرح پھڑ پھڑاتے رہنا ہی ہے۔" میں سر جھٹک کر خود کلامیہ بڑبڑایا۔

بی اوسی ہوٹل کا عقدہ بھی جلد ہی کھل گیا۔ یہ ایک درمیانے درجے کے سستے ہوٹل کہلاتے تھے، جو تقریباً ہر ملک میں پائے جاتے تھے۔ مجھے اس سے بھلا کیا سروکار تھا؟ جیسا بھی تھا، پناہ میں تو تھا، لیکن میں پاکستان سے یہاں اپنے دل میں جس پروٹوکول اور چمک دمک رونق آفروزی کی امیدیں لے کر آیا تھا وہ سب خاک شدہ ہوگئی تھیں۔ یا پھر شاید یہ مضافاتی علاقہ تھا اور جدید عمارتیں اور ماڈرن مقامات شہر کے وسط میں ہوتے اور مجھے شاید انہی مضافاتی علاقوں کی خاک بلکہ ریت چھاننا تھی۔ یوں گلفو آئل کا کام اور ان کے پروجیکٹ بھی ایسے ہی علاقوں کی مجبوری تھے، اس لیے مجھے ادھر ہی پہنچنے کا کہا گیا تھا۔ خیر ابھی تو ابتداء تھی۔ میں نے خود کو تسلی دی اور میں کون سا یہاں سیر و تفریح

کی غرض سے آیا تھا۔

بہر طور تھکا ہوا تھا، بستر پر جا کے لیٹ گیا۔

☆......☆

صبح آنکھ کھلی تو پتا چلا میں دن چڑھے تک سوتا رہا ہوں۔ گرم ملک کی گرم دھوپ آنکھوں میں چبھی جا رہی تھی۔ میرا جسم بری طرح دکھ رہا تھا، بستر سے اٹھا نہیں جا رہا تھا۔ گرمی کی وجہ سے کھڑکیاں کھلی ہوئی تھیں۔ شاید گرمی اور تیز دھوپ کی وجہ سے اور "کلائمیٹ" بدلنے کے سبب سے میرے پورے وجود میں کسلمندی سی طاری تھی۔ گرمی کے مارے میں ادھ موا ہوا جا رہا تھا۔ اب مجھے دل ہی دل میں بہرام خان کو کوسنا پڑا کہ کیسا کنجوس آدمی تھا، کم از کم ملک اور موسم کو دیکھتے ہوئے کسی اے سی والے ہوٹل میں میرے لیے کمرا بک کروا دیتا یا پھر یہ ذمے داری رانا بشیر کے سر ڈال دیتا۔ اس کا پیسا مجھ پر "حلال" تھا۔ شاید یہاں مہنگائی زیادہ تھی۔ خیر! کچھ بھی تھا اب تو بھگتنا ہی تھا۔

میں بادل نخواستہ اٹھا اور غسل خانے کا رخ کیا۔ آئینے میں شکل دیکھی۔ کئی روز کی شیو بڑھ کر ہلکی داڑھی کی صورت اختیار کر گئی تھی۔ مونچھیں بھی گاڑھی ہو گئی تھیں۔ اسے بھی تراشے ہوئے عرصہ بیت چلا تھا۔ کچھ سوچ کر میں نے سب کچھ ہی مونڈھ ڈالا۔ یعنی کلین شیو کو ہو گیا۔

کلین شیو ہونے کے بعد کسی حد تک صورت میری بدلی بدلی سی نظر آنے لگی تھی۔ روم سروس کے ذریعے ناشتا منگوایا۔ آنے والا ایک پیغام بھی میرے لیے لے آیا۔ یہ بہرام نے فون کے ذریعے استقبالیہ میں دیا تھا اور مجھے گلفو آئل کے ایک فیلڈ آفس جو کیمپ تھری کے نام سے موسوم تھا، پہنچنے کی ہدایت کی تھی۔

"ہومم...... تو گویا موصوف یہاں بھی آنے سے کترا گئے تھے۔" میں نے دل میں سوچا اور ناشتا کرنے لگا۔

گرمی کے مارے برا حال ہو رہا تھا۔ ابھی اپریل تھا۔ یہاں جون جولائی میں جانے کیا ہوتا ہوگا۔

اپنے طور پر مجھے گلفو آئل کمپنی کے بارے میں معلوم ہوا کہ اس کے دفاتر قصبے سے باہر کئی میل کے فاصلے پر "اوالی" روڈ پر واقع تھے۔ ہر دفتر کیمپ نمبرز سے موسوم کیا گیا تھا۔

میں ہوٹل سے باہر نکلا تو دھوپ کی چمک انی کی طرح آنکھوں کو چبھنے لگی۔ مجھے پتا ہوتا تو میں ایک عدد سن گلاس تو ضرور اپنے پاس رکھ لیتا۔

مجھے ٹیکسی درکار تھی اور دور دور تک سر دست مجھے اس کے آثار نظر نہیں آ رہے تھے۔

اچانک میری نظر اوبرائے گرانٹ اور اس کی چھیل چھبیلی سی گرل فرینڈ پر پڑی۔

مجھے حیرت تھی کہ یہ بھی اس ہوٹل میں رات گزارنے پر مجبور تھے پھر اچانک خیال آیا کہ اوبرائے کا بھی گلفو آئل سے کسی نہ کسی طرح تعلق تھا ہی۔

تب میں نے دیکھا کہ ایک ٹیکسی ان کے قریب جا کھڑی ہوئی۔ اوبرائے کھڑکی پر جھک کر ڈرائیور سے بات کرنے لگا۔ اس دھوپ میں مزید کسی ٹیکسی کے آنے کا انتظار کرنے سے بہتر تھا کہ میں ان کے ساتھ معاملات طے کر لوں، یہ سوچ کر میں ان کی طرف بڑھا۔

وہ دونوں سوار ہونے لگے تھے۔ میں نے کہا۔

"اگر تمہیں زحمت نہ ہو تو مجھے بھی اوالی تک لفٹ دے دو، کافی دیر سے ٹیکسی کے انتظار میں کھڑا تھا۔ اب دوسری جانے کب نظر آئے۔"

اوبرائے گرانٹ مجھے دیکھ کر تھوڑا چونکا تھا۔ پھر معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ "کلین شیو ہو کر تو تمہاری صورت بالکل ہی بدل گئی ہے، میں تمہیں آواز سے ہی پہچان پایا ہوں۔ کوئی خاص مقصد ہے بہروپ بدلنے کا؟"

"ہرگز نہیں، بس! گرمی کی وجہ سے بالوں سے چبھن ہو رہی تھی۔" میں نے جواب گڑھا۔

"ہوم...... اچھا جواز ہے۔" وہ یوں بولا، جیسے میری چوری پکڑ لی ہو پھر ٹیکسی کا دروازہ کھولتے ہوئے بولا۔

"بڑے شوق سے...... اور پھر زحمت کس بات کی۔ کار تمہیں اٹھا کر لے جائے گی ہم نہیں۔" اس نے نہایت خوش اخلاقی سے کہا۔ یہ اس کا جملہ ایسا تھا کہ میرے خیال میں اسے تھوڑا سا مسکرانا تو ضرور ہی چاہیے تھا مگر وہ سپاٹ رہا۔

میں نے دونوں کا شکریہ ادا کیا اور ٹیکسی روانہ ہوگئی۔ میرا خیال تھا کہ وہ کوئی بات چھیڑیں گے مگر دونوں ہی چپ رہے۔ یہاں تک کہ ایک دوسرے سے بھی بات کرنے سے کتراتے رہے۔ عجیب سنکی سا ماحول محسوس کرنے لگا تھا میں یہاں۔ پتا نہیں اب اور کیا آگے دیکھنے اور ہونے...... کو ملنے والا تھا۔ ایک وحشت کا احساس ہوتا تھا ہر لمحہ یہاں۔

لیکن ڈرائیور بڑا پرگو اور باتونی ثابت ہوا۔ وہ ہم دونوں کو ہی ایک ساتھ مخاطب کرنے کے انداز میں بولے

چلا جا رہا تھا۔
"آپ لوگ یقیناً گلفو آئل کمپنی کے ملازمین میں سے ہیں۔" اس نے اسی جملے سے ابتداء کی تھی۔ اس کی انگریزی ٹوٹی پھوٹی سی تھی، جیسے بہ مشکل اس کے منہ سے برآمد ہو رہی ہو۔ مگر اوبرائے گرانٹ یا اس کی محبوبہ نے کوئی جواب نہیں دیا تھا، مجھے یہ غیر اخلاقی بات محسوس ہوئی۔ یوں بھی میں اس کے برابر والی سیٹ پر ہی بیٹھا تھا جبکہ اطالوی جوڑا عقبی سیٹوں پر "خاموشی" سے براجمان تھا۔
لہٰذا میں نے ہی اس کی طرح انگریزی میں جواب دینا ضروری سمجھا اور بولا۔
"ہاں! تم نے بالکل ٹھیک اندازہ لگایا۔"
"تم مجھے انڈین یا پاکستانی لگتے ہو۔ کیا نام ہے تمہارا؟" ٹیکسی ڈرائیور نے اس بار اردو میں مجھ سے کہا تو مجھے ایک خوشگوار سی حیرانی ہوئی۔ بولا۔
"نعمان احمد نام ہے میرا اور تم؟" مجھے اب اس سے باتیں کرنے میں مزہ آرہا تھا۔ اس کی عمر کچھ زیادہ نہیں تھی۔ پینتالیس، پچاس کا ہی ہوگا۔ ٹھگنا مگر تومند جسم کا مالک تھا۔
"اسلام علیکم...... مجھے فاران احمد کہتے ہیں۔" اس نے مجھے باقاعدہ سلام پیش کیا اور دوستانہ مسکراہٹ کے ساتھ اپنا ایک ہاتھ مصافحے کے لیے میری طرف بڑھا دیا۔ میں نے بھی اسی گرمجوشی کے ساتھ اس سے ہاتھ ملایا۔
"میں انڈین ہوں۔ احمد آباد کا رہنے والا ہوں، پیسا کمانے یہاں آیا ہوں۔ شہر میں سواریاں کم ملتی ہیں۔ ملتی بھی ہیں تو اتنا کرایہ نہیں بنتا جتنا خرچا ہو جاتا ہے، پھر کئی طرح کی قانونی پاسداریاں کرنا پڑتی ہیں، ٹریفک قوانین میں ذرا غلطی ہو جائے تو بھاری جرمانہ الگ اور جسمانی سزا الگ۔ لائسنس کینسل ہونے کا خطرہ بھی۔"
"اچھا......!" میں نے مزید چھیڑا۔ اسے بھی کوئی میرے جیسا "سامع" اور باتیں کرنے والا چاہیے تھا پھر تو بولتا ہی چلا گیا۔
"یہاں منامہ کے مضافات میں اس طرح کا کوئی ٹینشن نہیں۔ یہ آزاد علاقے ہیں۔ یہاں کالے سونے (تیل) کی دریافت کے سلسلے میں کئی کالونیاں ان صحرائی ویرانوں میں بن گئی ہیں۔ جن کے سواریاں ملتی ہیں اور کرایہ بھی، ٹیکسیاں بھی اتنی زیادہ نہیں ہیں۔ نہ ہی بسیں وغیرہ۔ ماسوائے چند ایک کے...... میں خود ایک عرصے سے گلفو آئل کے ملازمین اور فوری ضرورت کے تحت آفیسرز کو بھی لاتا لے جاتا ہوں۔ وہ مجھے ہمیشہ اجرت خاص سے نوازتے ہیں۔ جیبیں نوٹوں سے بھر جاتی ہیں میری۔"
"اگر یہاں اتنا ہی فائدہ اور آسانیاں ہیں تو پھر اور لوگ بھی یہاں کیوں نہیں کمانے آجاتے؟"
"وہ ڈرتے ہیں ان دور افتادہ... صحرائی علاقوں سے؟" فاران نے جواب دیا۔
"کیوں کیا یہاں ڈاکو رہتے ہیں؟" میں نے پوچھا۔
"پہلے تھے مگر اب نہیں ہیں۔" اس نے جواب دیا اور پھر سگریٹ کا پیکٹ نکال لیا۔
"پیتے ہو؟"
"شوقیہ۔"
"لو پھر پیو اور جیو۔" اس نے مسکراتے ہوئے کہا اور میں نے ایک سگریٹ منتخب کر کے اپنے ہونٹوں میں داب لی۔ اس نے لائیٹر دیا اور پھر خود بھی سگریٹ سلگا کر ایک گہرا کش لیا۔ خاصا دوست نواز اور من موجی آدمی نظر آتا تھا۔
"ان علاقوں کی فضا کسی کسی کو راس آتی ہے۔ یہاں کے حالات خراب ہوتے ہیں۔ اجاڑ جگہ ہے، کوئی رونق نہیں، اسی لیے دیگر ٹیکسی والے اس طرف کا رخ کرنے سے ہچکچاتے ہیں، شہر سے کوئی بھولی بھٹکی سواری یہاں چھوڑنے بھی جاتے ہیں تو فوراً یہاں سے رفو چکر ہونے کی کوشش کرتے ہیں، چاہے واپسی کی سواری ملے نہ ملے۔"
اس نے پھر بولنا شروع کر دیا۔
"گلفو آئل کے تو تقریباً سارے ملازمین مجھے اب اچھی طرح جاننے لگے ہیں۔ میرا اسیل فون نمبر تک رکھ لیا ہے، کہیں بھی ہوں مجھے اجرت خاص دے کر بلا لیتے ہیں۔"
میں نے یونہی پیچھے مڑ کر دیکھا، ریت کا بادل ہمارے تعاقب میں تھا۔ ٹیکسی درمیانی سے دوڑ رہی تھی اور ڈرائیور کی زبان بے تکان۔
"اوالی ...... کے علاوہ "باپکو،" "گلفو مان کو"، اور "آرام کو" کے آدمیوں کو لاتے لے جاتے کئی برس بیت چکے ہیں مجھے۔ یہاں سب کو جانتا ہوں، ایک ایک فرد کو۔ وہ کسی بھی فرد سے پوچھ لیں کہ فاران احمد کیسا آدمی ہے؟"
اتنا کہہ کر وہ ذرا رکا۔
مجھے اس کی باتیں بور یا بیزار نہیں کر رہی تھیں بلکہ میرے اندر زیادہ سے زیادہ جان کاری حاصل کرنے کے خیالات جنم دینے کا باعث بن رہی تھیں۔ وہ بولا۔
"ویسے نعمان صاحب! آپ کو یہاں کس سے ملنا

ہے؟ کیا نوکری مل گئی ہے آپ کو؟ اور لو میں نے تو یہ آپ سے پوچھا ہی نہیں کہ کس ملک سے آئے ہیں آپ؟"
"پاکستان سے......" میں نے سگریٹ کا ایک کش لگا کر اسے بتایا۔
"او...... پاکستان! گریٹ پاکستان ...... لوولی پاکستان۔" وہ مسکرایا۔
"مجھے یہاں کوئی نوکری نہیں ملی ہے۔" میں نے اس کے سوال کا جواب دیتے ہوئے کہا۔
"ایک چھوٹے سے معاہدہ کے سلسلے میں آیا ہوں یہاں۔"
"گلفو آئل کے کسی بڑے آفیسر شفسر سے ملنا ہے تو بتاؤ مجھے۔" وہ بڑے فخر سے بولا۔ "میں آپ کی پوری مدد کر سکتا ہوں۔ میرے یہاں قریبی تعلقات ہیں، خاصی واقفیت ہے یہاں میری، آپ چاہیں تو میں آپ کے کسی کام آ سکتا ہوں۔ مجھے اپنے پاکستانی اور مسلم بھائی کی مدد کرتے ہوئے خوشی ہوگی۔"
کہتے ہوئے اس نے گلو کمپارٹمنٹ سے سیاہ چشمہ نکال کر آنکھوں میں چڑھا لیا۔ دھوپ تیز ہونے لگی تھی۔
"ہاں! ملنا تو تھا میں نے کسی سے، مگر نہ مل سکا۔" میں نے کہا۔ وہ ایک آزاد منش قہقہہ مار کے بولا۔
"کمال کر دیا نعمان صاحب آپ نے بھی۔"
"ارے......! وہ کیا؟" میں نے قدرے چونک کر پوچھا۔
"آپ اپنی منزل پر ابھی پہنچے ہی کب ہو۔"
"نہیں، اس نے مجھے ایئرپورٹ پر لینے آنا تھا مگر نہ آسکا، نہ ہی دوبارہ فون پر رابطہ بھی کیا۔" میں نے جواب دیا۔
"ناممکن ......" وہ اِدھر اُدھر سر دھنتے ہوئے بولا۔ "یہاں کے آفیسرز اور لوگوں کو اتنی فرصت ہی نہیں ہوتی کہ وہ بلاوجہ اِدھر اُدھر ہوں۔"
"ہم...... اسے بھی شاید فرصت نہ ملی ہو۔" میں بہرام کے متعلق سوچتے ہوئے بولا۔
"کون؟" وہ استفساریہ بولا۔
"بہرام خان کو جانتے ہو تم؟"
"اوہو...... بہرام خان! وہ کمپنی کا ملازم جو شاید گلفو آئل میں بڑی پوسٹ پر تھا۔"
"تھا سے کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔

رامائن

رامائن یعنی رام چندر کی سرگزشت ہے تو سنسکرت ہی میں لیکن اس میں فلسفے کی بجائے کہانی بیان کی گئی اور فلسفیانہ مسائل بیان کیے گئے تو وہ بھی کہانی کے پیرائے میں۔ رامائن ایک طویل رزمیہ یا مثنوی ہے جو چوبیس ہزار اشعار پر مشتمل ہے۔ اسے سنسکرت کے شاعر بالمیکی نے تیسری صدی قبل مسیح میں مختلف لوک گیتوں سے استفادہ کر کے تالیف کیا تھا۔ بعد میں کوئی پانچ سو سال تک دوسرے شعرا اپنے اپنے عہد میں اس میں اضافہ کرتے رہے، حتیٰ کہ سب سے آخر میں تقریباً دو سوا دو ہزار سال کے بعد سترہویں صدی عیسوی میں اکبر و جہانگیر کے عہد میں شاعر تلسی داس (1532-1663ء) نے اسے عام بول چال کی زبان ہندی میں لکھا اور تلسی داس کی رامائن ہی نے حقیقی معنوں میں مقبولیت عامہ حاصل کی۔

مرسلہ: نوروز علی۔ کراچی

"بہت افسوس سے کہنا پڑ رہا ہے نعمان صاحب! اگر آپ اسی آدمی سے ملنا چاہتے ہیں تو اب وہ کبھی بھی آپ کو نہیں مل سکتا۔"
"کک...... کیوں؟"
"کیونکہ وہ اب اس دنیا میں نہیں رہا۔" اس نے چونکا دینے والا انکشاف کیا۔
"کیا؟" میں تقریباً چیخ ہی پڑا۔ "لل...... لیکن کیسے؟ کب؟"
"ابھی تقریباً دو گھنٹوں پہلے کی بات ہے، اسے کسی نے لاسی قصبے میں قتل کر ڈالا ہے۔ وہ اپنے کیمپ کچہری والے دفتر میں ایک ضروری میٹنگ اٹینڈ کر کے باہر نکل رہا تھا کہ کچھ نامعلوم لوگ دو فور وہیل بائیک، جسے مقامی زبان میں کیکڑا بائیک کہتے ہیں، پر سوار ہو کر آئے اور اس پر گولیوں کی بوچھاڑ کر کے صحرا کے ویرانوں میں غائب ہو گئے۔"
جانے کیوں میرے پورے وجود میں سردی لہر دوڑ گئی۔ میرے رونگٹے کھڑے ہونے لگے۔ یہاں تو پہلے ہی

قتل و غارت کا بازار گرم تھا۔ نجانے اس کے قتل کے پیچھے کن لوگوں کا ہاتھ ہو سکتا تھا؟ اور کیا اب میری اپنی زندگی بھی خطرے سے دوچار ہو سکتی تھی؟ کہیں ایسا تو نہیں کہ اس اندوہناک واقعے کے سلسلے کی کڑی میرے مشن سے جڑتی ہوں؟

”ممکن ہے یہ وہ بہرام خان نہ ہو جس کی میں بات کر رہا ہوں۔“ میں نے موہوم سی امید تلے اس سے کہا۔ لیکن اس نے مجھے بہرام خان کا ناک نقشہ بتایا جس کی تصویر میں ذہن نشین کر چکا تھا تو حقیقت کھلی کہ وہ اسی بدنصیب بہرام خان کی بات کر رہا تھا۔

”کہو تو تمہیں واپس اسی ہوٹل چھوڑ آؤں؟“ مجھے سوچتا اور خاموش پا کر بولا۔

”آں...... نن...... نہیں...... نہیں۔“ میں گومگو سے خیالات کے بھنور سے ایک دم ابھر کر بولا۔ ”آگے کا سفر جاری رکھو۔ وہاں پہنچنا تو ہے میں نے۔“ ایک لمحہ توقف کے بعد میں نے پوچھا۔

”تمہیں کیسے پتا چلا؟ اور تم کس حد تک بہرام خان سے واقفیت رکھتے ہو؟“

”لو جناب! کیا بات کر دی آپ نے بھی۔“ وہ بے تکلفانہ مروت سے بولا۔

”کہا ناں میں نے کہ میں اس کمپنی کے تقریباً سارے ہی افسروں کو نہ صرف جانتا ہوں بلکہ ان کے کام بھی آتا رہا ہوں۔ اکثر ان کی گاڑیاں خراب ہو جاتی تھیں۔ یہ مجھے ہی کال کر کے بلاتے تھے۔ کہیں جلدی پہنچنا ہوتا تھا ناں انہیں۔“

”ہم......“

”میں تو بہرام کے گھر والوں اور بال بچوں تک سے واقف ہوں۔“

”وہ کہاں رہتے ہیں؟“ میں نے کسی خیال کے تحت پوچھا۔

”شہر میں، بڑی شاندار کوٹھی ہے ان کی۔ ایک بیوی اور دو بچے ہیں۔ بے چارے ابھی پڑھ ہی رہے ہیں، کیسی قیامت ٹوٹ گئی ان بے چاروں پر۔“ اس کا لہجہ متاسفانہ ہو گیا۔

”کبھی کبھی گھمانے کے لیے انہیں بھی یہاں لے آتے تھے وہ...... ہا...... اللہ جنت میں جگہ بہرام صاحب کو......“ اس نے ایک دکھ زدہ سی ہنکاری بھری۔

”آمین!“ میں زیرِ لب بولا تھا۔

میں اس نئی صورتِ حال سے پریشان ہو گیا تھا۔ بہرام میرے مشن کے لیے ان مشکل علاقوں اور شاہ میرا، بن رائد کی گردنوں تک میرا ہاتھ پہنچانے کے لیے بہترین معاون و مددگار ثابت ہو سکتا تھا۔ نیز اس کی موجودگی کے سبب میں اپنے بھی اس علاقے میں کہیں قدم جما سکتا تھا اپنا ٹھکانا کر سکتا تھا۔

یوں میں تفکر آمیز سوچوں میں مستغرق رہا۔ تھوڑی دیر پہلے سب کچھ ٹھیک ٹھاک چل رہا تھا مگر اچانک جیسے سب الٹ پلٹ کر رہ گیا تھا۔ مجھے بہرام کی اچانک موت یا قتل کے سلسلے میں رانا بشیر کو فون پر رابطہ کر کے بتانا چاہیے تھا۔

اب میں سوچ سوچ کر الجھ رہا تھا کہ کیمپ تھری والے دفتر جا کر کس سے ملوں؟ یوں بے دھیانی اور بے خیالی میں، میں شاہ میر یا بن رائد کے کسی آدمی کی نظروں میں آ سکتا تھا۔ بے شک وہ مجھے پہچانتے تو نہیں تھے مگر پاکستان سے آنے والے ایک نئے آدمی کی بھنک پڑتے دیر کتنی لگتی ان کو اور پھر اس کی تصدیق میں تو بالکل بھی نہیں۔

”لگتا ہے جناب! بہرام صاحب سے آپ کو کوئی خاص کام تھا بلکہ آپ تو پاکستان سے آئے ہی اسی سے ملنے کے لیے تھے، کیوں صاحب؟ میں نے غلط تو نہیں کہا؟“

”بالکل ٹھیک کہا تم نے فاران!“

”اے مسٹر! وہ سامنے دھواں اڑاتی چمنی کے پاس کار روک دینا۔“

اچانک عقب سے اوبرائے گرانٹ کی کھرکھراتی ہوئی آواز ابھری۔

میں اِدھر اُدھر دیکھنے لگا۔ ہر طرف اب ریت کا سمندر ہی دکھتا تھا۔ چھوٹے بڑے دفاتر اور تیل کی کھدائی کے سینکڑوں چھوٹے بڑے دفاتر، جن پر دور سے اہرام کا گمان ہوتا تھا، بے ترتیب سے آگے پیچھے بنے نظر آ رہے تھے۔

کار رک گئی اور وہ دونوں فاران کو کرایہ دے کر اتر گئے۔ فاران نے کار آگے بڑھا دی۔

اوبرائے گرانٹ نے مجھے اپنے ہاتھ سے الوداعی اشارہ کیا تھا۔ میں نے مسکرا کر ہاتھ کا جوابی اشارہ دیا تھا۔ مجھے اس کی توقع تو نہیں تھی مگر مجھے اس کا آخر میں اس طرح مجھے یاد رکھنا اچھا لگا تھا۔

”اب آپ کا بھی کیمپ تھری آفس دور نہیں رہا۔“ فاران نے مسکرا کر کہا۔

”یار فاران! ایک کام کرو گے؟“ میں نے اچانک ...سے پُرشور لہجے میں کہا۔ اطالوی جوڑے کو اتارنے کے ...ٹیکسی نصف کلومیٹر ہی آگے بڑھی تھی۔

”جی...... جی حکم کریں جناب؟“ وہ فدویانہ لہجے میں ...لا۔

”ہم دونوں کچھ دیر کہیں آرام سے بیٹھ کر باتیں ...کر سکتے ہیں؟“

”ضرور...... ضرور کیوں نہیں جناب!“ وہ جلدی ...سے سر دھنتے ہوئے بولا۔ اس کی تو جیسے دلی مراد بر آئی تھی۔ ...میرے ساتھ اتنی باتیں کرنے کے باوجود اس کا شاید دل ...نہیں بھرا تھا۔

”بس تو پھر وہیں چلو، دور نزدیک کی پروا نہیں، کرایہ ...ادا کر دوں گا۔“

”ارے نہیں جناب! شرمندہ نہ کریں آپ تو اتنے ...پیارے ملک سے آئے ہیں، ایک طرح سے میرے مہمان ...بھی ہوئے۔“ پھر تھوڑے توقف کے بعد...... ”چلیں پھر میں آپ کو اپنی ایک کارواں سرائے لیے چلتا ہوں۔“

”کارواں سرائے؟“ میں الجھ کر بڑبڑایا۔ ”کیا ایسی ...سرائے بھی ہیں یہاں؟“

”ہاہا...... ہاہا!“ فاران نے ایک آزاد منش قہقہہ رسید ...کیا اور بولا۔ ”صاحب! حیران ہونے کی ضرورت نہیں، ...ایسے علاقوں میں ایسی سرائیں آپ کو بہت ملیں گی۔ مجھے بھی ...اگر رات کو وہاں سواری لاتے ہوئے دیر ہو جاتی ہے تو وہیں ...قیام کر لیتا ہوں۔“

”اچھی بات ہے، پھر وہیں چلو۔“ میں نے کہا۔

اس نے ٹیکسی کی رفتار بڑھا دی۔

شکر تھا کہ اس کی ٹیکسی نئی اور ایئر کنڈیشن تھی ورنہ باہر ...تو چلنے والی بادِ سموم کے تھپیڑے چہرہ ہی جھلسائے دے رہے ...تھے۔ دھوپ گرمی کی شدت تھی۔ مجھے تو ننگے سر اور پیدل ...یہاں چلنے کے تصور سے ہی ہول آ رہا تھا۔

فاران احمد کا انتخاب میں نے سوچ سمجھ کر کیا تھا۔ یہ ...مجھے ایک اچھا، قابلِ بھروسا اور نیک نیت آدمی لگا تھا۔ ...بہرام خان جیسا رول تو ادا نہیں کر سکتا تھا یہ لیکن کافی ...معلومات تو فراہم کر سکتا تھا مجھے، جس کی بنیاد پر میں اپنا یہ ...اہم مشن آگے بڑھا سکتا تھا۔

تھوڑی دیر بعد ہی ایک دو منزلہ مستطیل عمارت کے ...سامنے کار رک گئی۔ میرے تصور میں سرائے کی عمارت کوئی ٹوٹی پھوٹی اور سالخوردہ سی تھی یا پھر خیمہ جیسی مگر یہ تو پرانے زمانے کی یاد تازہ ہو گئی۔ بہت اچھی حالت میں تھی یہ سرائے۔ بس کہنے کو ہی سرائے تھی ورنہ تو ٹھیک ٹھاک آرام دہ ہوٹل ہی تھا۔ اس کا احاطہ بھی وسیع تھا، اندر ایک دو ٹینٹ لگے نظر آئے، وہاں اونٹ بھی بندھے ہوئے جگالی کرنے میں مصروف تھے۔ ایک اونٹ ریڑھا بھی کھڑا تھا۔ ایک چھوٹے سائز کا گول ٹینک والا ٹرک بھی نظر آ رہا تھا۔

عمارت کا رنگ پیلا تھا اور اس پر سستی سی مٹوری کی گئی تھی شاید۔ کمروں کی کھڑکیوں پر خس کی ٹٹیاں نصب تھیں تاکہ اندر کی فضا میں باہر کی جھلسا دینے والی گرمی اور بادِ سموم ٹھنڈی ہو کے داخل ہو۔ ان ٹٹیوں پر تازہ پانی کا چھڑکاؤ ہر روز کیا جاتا تھا۔ اچھا خاصا صحرائی دیہاتی ماحول نظر آتا تھا۔

ہم اندر آ کر ایک کھلی سی نشست گاہ پر بیٹھ گئے۔ جگہ جگہ یہاں کھڑکیوں کے ساتھ خس کی ٹٹیاں نصب تھیں جس کی وجہ سے اندر کی فضا بغیر اے سی کے بھی ٹھنڈی اور خوشگوار سی محسوس ہوتی تھی۔

مقامی لوگ عملے میں شامل تھے۔ نہایت بااخلاق اور سرو کرنے والے۔ ہمیں ایک عمر رسیدہ آدمی نے ٹھنڈا پانی پینے کو دیا۔ پیاس سے حلق پہلے ہی سوکھ رہا تھا۔

فاران نے ایک ٹھنڈا میٹھا خوش ذائقہ مشروب بھی پلایا۔

”یہ بتاؤ فاران! تمہارا اپنا گھر کہاں ہے؟“

”یہی گھر ہے میرا۔ ابھی تھوڑی دیر میں اوپر چلتے ہیں۔ سب سے آخر والے کارنر پر میرا کمرا ہے۔ وہاں سکون ہے، یہاں نیچے گراؤنڈ فلور میں شور ہوتا ہے بہت، میں تھکا ہوا ہوتا ہوں سارے دن کا، پُرسکون نیند چاہتا ہوں، وہاں ہو جاتی ہے۔ آؤ۔“

ہم زینے طے کر کے اوپر آ گئے۔ آخری سرے میں کمرا تھا۔ فاران نے جیب سے چابی نکالی اور تالا کھول کر اندر آ گیا۔ میں بھی اس کے عقب میں تھا۔

کمرا آٹھ بائی دس کا تھا۔ آخری کارنر پر ہونے کے سبب اس میں دو جانب کھڑکیاں تھیں۔ ایک تو عقب میں صحرا کی جانب کھلتی تھی، دوسری دائیں طرف، وہاں سے بل کھاتی ہوئی سنگل بلیٹ سڑک نظر آتی تھی۔ وہاں سے آئل ٹینکر گزرتے ہوئے نظر آ رہے تھے۔

کھڑکیوں پر خس کی ٹٹیاں نصب تھیں۔ جس کی وجہ کمرے کی فضا ٹھنڈی تھی۔ پنکھا چل رہا تھا۔ ایک باتھ روم

تھا۔ کپڑوں کی دیوار گیر الماری تھی۔
ایک لوہے کے اسپرنگوں اور پائپوں والا بیڈ تھا۔ اوپر صاف ستھرا مگر بکھرا پڑا بستر بچھا ہوا تھا۔ ایک کرسی تھی، مجھے فاران نے اس پر بیٹھنے کا اشارہ کیا اور خود بیڈ پر بیٹھ گیا۔
''ہاں، صاحب! اب آپ یہاں آرام اور بے فکری کے ساتھ باتیں کر سکتے ہیں۔''
اس کی بات سن کر میں نے ایک گہری سانس کھینچی اور بولا۔ ''دیکھو فاران! تم مجھے ایک اچھے انسان اور قابلِ بھروسا دوست محسوس ہوتے ہو، لہٰذا تم مجھے اب صرف نعمان احمد کہہ کر پکارو گے اور یہ صاحب واب مجھے پسند نہیں۔''
وہ ہولے سے دوستانہ انداز میں مسکرایا مگر بولا کچھ نہیں۔ میں نے لمحہ بھر کے توقف کے بعد پھر کہا۔
''فاران! جیسا کہ میں تمہیں بتا چکا ہوں، میں اپنی کمپنی کی طرف سے ایک کاروباری سودے کے لیے ہی دراصل بہرام خان سے ملنے آرہا تھا اور اس نے مجھے ایئرپورٹ پر لینے بھی آنا تھا مگر تم سے ہی مجھے اس افسوسناک حقیقت کا علم ہوا ہے کہ بدقسمتی سے بہرام خان کو کسی نے قتل کر دیا ہے، اسی صورتِ حال میں مجھے اپنا بھی ڈر ہو گیا ہے۔ اگر وہ قتل نہ ہوتا تو اور بات تھی، نجانے قاتل لوگ کون تھے اور ان کی بہرام خان کے ساتھ کیا دشمنی تھی۔ میرا ان سے کوئی لین دین نہیں، مگر بہرام خان کیوں قتل ہوا، پولیس تو اس کی تفتیش کرے گی ہی، لیکن بہ قول تمہارے تم یہاں پچھلے کئی سالوں سے موجود ہو اور یہاں کے حالات اور لوگوں کے بارے میں بھی اچھی طرح جانتے ہو، بتا سکتے ہو مجھے تم کہ تمہارا اپنا ذاتی خیال کیا ہے اس قتل کے بارے میں؟ نیز نامعلوم قاتل کون ہو سکتے ہیں؟''
اپنی بات مکمل کر کے میں اب مستفسرانہ نظروں سے اس کا چہرہ تکنے لگا۔
مجھے محسوس ہوا جیسے فاران ایک دم کچھ محتاط سا نظر آنے لگا، اس کی آنکھوں میں میری طرف سے کچھ تشکیک کے سائے بھی ابھرے، پھر وہ اسی لہجے میں بولا۔
''آپ نے مجھے دوست کہا ہے تو پھر پہلے آپ بھی مجھے سچ سچ بتائیں کہ آپ کون ہیں؟''
میں اس کی طرف دیکھ کر ہولے سے مسکرایا۔ مجھے ادراک ہو چلا تھا کہ وہ مجھ سے یہ کیوں پوچھ رہا تھا۔ ہلکی مسکراہٹ سے بولا۔
''تمہیں کیا لگا ہوں میں؟''

''آ...... آپ انٹیلی جنس کے آدمی تو نہیں؟ میرا مطلب ہے کوئی بیرونی ایجنٹ، کسی سپر پاور کے نمائندے، جو کاروباری آدمی کے روپ میں یہاں کے حالات اور راز جاننے کے لیے آیا ہو۔''
اس کی بات پر میں چونکے بغیر نہیں رہ سکا تھا۔ میں سوچنے پر مجبور ہوا کہ کیا یہاں ایسی کوئی بین الاقوامی سازش چل رہی تھی جس نے سپر پاورز ممالک کو بھی اس طرف کی سن گن لینے پر مجبور کر رکھا تھا۔
لہٰذا میں اب ایک دم سنجیدہ نظر آنے لگا اور اسی لہجے میں بولا۔
''فاران! ایسی کوئی بات نہیں ہے، میں واقعی پاکستان سے آیا ہوں اور پرل ٹریڈرز سے تعلق رکھتا ہوں، میرا کسی ایجنٹ یا نمائندے سے دور کا بھی کوئی تعلق نہیں، میں تو بہرام خان کی اچانک موت بلکہ قتل سے پریشان سا ہو گیا ہوں۔ مجھے اپنی کمپنی کے باس کو اس کی رپورٹ دینی ہو گی کیونکہ میں بہرام کو نہیں جانتا، میرے باس سے اس کے کاروباری تعلقات تھے۔ مجھے اسی سے ملنے کی ہدایت کر رکھی تھی، وہ پہلا حکم اب مجھے یہی دے گا کہ مجھے اب اپنے طور پر کچھ کرنا ہو گا مگر مجھے...... ڈر محسوس ہونے لگا ہے کہ نجانے وہ قاتل کون تھے اور میں اب اس ڈیل کو یہیں ختم کر کے واپس بھاگ جاؤں یا اس کا کوئی اور متبادل تلاش کروں، اتنی سی بات ہے میری طرف سے اور بس......!''
میں نے اپنی بات مکمل کی تو فاران بولا۔
''یہاں گلفو آئل میں صرف ایک ہی آدمی کا اثر و رسوخ چلتا ہے، اور وہ ہے...... حسان بن رائد......'' اس نے یہ ایک نام لیا اور میں یک دم اندر سے چونک پڑا، لیکن اس پر ظاہر یہ ہونے دیئے بغیر اس کی طرف مستفسرانہ نظروں سے تکتا رہا۔ وہ آگے بولا۔
''یہاں کے بڑے بڑے ملکی غیر ملکی افسران اس کی بہت اٹھاتے ہیں، وہ مقامی بستی ''خد'' کا سردار بھی ہے اور اس کے بڑے بڑے عرب حکمرانوں اور امیر شیوخ سے اچھے تعلقات ہیں۔ مقامی سطح پر جس قسم کا بھی کوئی مسئلہ ہوتا ہے اسے آگے کر دیا جاتا ہے۔'' وہ رکا اور میں بن رائد اور حسان بن رائد کے درمیان تقابلی موازنہ کرنے لگا کہ کہیں یہ وہی بن رائد تو نہیں ہے جو میرے دشمن شاہ میر کا دست راست ہے؟
''یہ بتاؤ......'' کچھ سوچ کر میں نے محتاط لہجے میں

''حسان بن رائد کے بعد کمپنی میں اور کس کی زیادہ ...ہے؟''
''صرف ان لوگوں کی جو بن رائد کی چمچہ گیری کرتے ...'' اس نے جواب دیا۔ حسان بن رائد کا ادھورا نام لے ...ن نے میرے اس شبے کی تصدیق کر دی کہ یہ وہی بن ...۔ جس کے قبضہ گرفت میں رانا بشیر کی بیٹی فرحانہ تھی ...ی تک شاہ میر یہاں نہیں فٹ ہوا تھا، تاہم فاران کی ...گیری'' والی بات میرے ذہن میں اٹکی ہوئی تھی، بولا۔
''اس کی چمچہ گیری کے چند قابلِ ذکر افراد کے نام؟''
''دو ایک ہی ہیں، ایک تو شائل رضا تھا، وہ عراقی بندہ ...وہ عرصہ ہوا چھوڑ کر جا چکا۔ دوسرا......'' وہ سوچتا بن ...ر میری دھڑکتی نظریں اس کے پُرسوچ چہرے پر اٹکی رہ ...۔
''تھا تو وہ بھی تمہاری طرح ہی پاکستانی ہاں! یاد آیا۔ ...''
بالآخر اس نے میرے مطلوبہ شخص کا نام لے ہی لیا۔
''تمہاری باتوں کا مطلب یہ ہوا کہ شاہ میر کو بن رائد ...ت پناہی حاصل ہے۔''
''بالکل......'' اس نے سر ہلایا۔
''تمہیں فاران! ان سب باتوں کا کیسے علم ہوا؟''
''کمال کرتے ہو دوست!'' وہ میری طرف دیکھ کر ...ایا۔ ''ابھی تو بتایا تھا آپ کو کہ......''
''ہاں...... ہاں ٹھیک ہے۔'' میں نے اسے دوبارہ ...ل کی زحمت سے بچاتے ہوئے اس کی بات کاٹ کر ... ''میرا مطلب تھا کہ یہ تو اندر کی باتیں ہیں جو تم نے ...تائیں۔ جو ان سے متعلق آدمی ہی جان سکتا ہے۔''
''ہاں! میں ان کے ملازمین میں سے تو نہیں ہوں ...ہر مقامی آدمی کی طرح میں بھی ادھر ہی رہتا ہوں اس ...یہ گردش کرتی ہوئی باتیں، لوگوں کی چہ میگوئیاں میرے ...ں تک بھی پہنچتی رہتی ہیں لیکن تمہیں کیا مسئلہ ہے؟'' اس ...اچانک مجھ سے پوچھ لیا۔
میں نے جواب دیا۔
''مجھے یہ مسئلہ ہے کہ اب بہرام خان کی جگہ مجھے کس ...ں سے ملنا چاہیے، جو اس اچانک پڑنے والے خلاء کو پُر ...سکے اور میرا کاروباری نقصان بھی ہونے سے بچ ...'' میں نے چالاکی سے پھر اسے منہ کھولنے کے لیے ...یا، جو کام میرے بہرام نے آنا تھا، وہ میں اپنی ذہنی

فراست سے اس ٹیکسی ڈرائیور کو زیادہ نہیں تو تھوڑا بہت کام میں لانے کی کوشش کر ہی رہا تھا۔
بہرام خان کے قتل کے بعد میں یہاں کے ''معاملات'' سے بالکل کورا تھا، مگر اس کی جان کاری میرے لیے ازبس ضروری تھی ورنہ خدشہ تھا کہ کہیں میں اندھیری راہوں میں مارا نہ جاؤں۔
''اس کا مطلب ہوا بے چارہ بہرام خان مخالف گروپ کا آدمی تھا۔''
''ایک بات کہوں آپ سے؟'' فاران نے اچانک کہا۔
''ہاں...... ہاں، ضرور۔''
''تم نے چوں کہ ان مگرمچھوں کے درمیان جانا ہے تو زیادہ تفصیل حاصل کرنے کے لیے تمہیں میں ایک آدمی کا نام بتائے دیتا ہوں اور یہ بھی کہ وہ کہاں ملے گا، وہ تمہیں مجھ سے زیادہ بہتر طور پر حالات کے بارے میں مفید آگاہی دے سکتا ہے۔''
''ہاں بتاؤ؟''
''وہ ان کے اندر کا آدمی ہے اور مقامی بھی، نیوٹرل ہے یعنی کسی گروپ بندی میں نہیں۔ وہ ڈرلر ہے، ایرانی ہے، نام اس کا محمود الحسن ہے کیمپ تھری کے ہی دفتر میں تمہیں مل جائے گا وہ۔ کہو تو چھوڑ آؤں تمہیں؟''
''تمہارا شکریہ لیکن سب سے پہلے میرے لیے یہاں ایک عدد مستقل کمرے کا بندوبست کروا دو تو مہربانی ہو گی۔''
''یہاں رہو گے تم؟'' وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر بولا۔
''ہاں! تو کیا ہوا؟''
''میرا مطلب تھا، جہاں تم جا رہے ہو وہ لوگ تمہاری اس سے زیادہ اچھی رہائش کا بندوبست کر سکتے ہیں، تم بس اپنے کام سے کام رکھنا، تمہارا بھلا کسی گروپ سے کیا لینا دینا؟''
''وہ تو ٹھیک ہے لیکن میں پہلے وہاں جا کر اپنے طور پر تسلی کر لوں۔'' میں نے محض اسے ٹالنے کی غرض سے کہا۔
میں نے اسے کرایہ دیا، میرا کمرا بک ہو گیا۔ وہ گراؤنڈ فلور پر ہی تھا۔ اس کے بعد میں نے پاکستان رانا بشیر سے فون پر رابطہ کرنے کی خواہش کا اظہار کیا تو فاران نے کہا کہ اس سرائے میں بیرونِ کال کی سہولت موجود نہیں،

یہاں البتہ یہ سہولت مجھے گلفو آئل کے دفتر سے ہی حاصل ہو سکتی ہے۔

پھر دفتر کیمپ تھری کی جانب روانہ ہونے سے پہلے میں نے فاران سے ایک اور گزارش کی۔

"فاران! تمہارے پاس کوئی عربی عبا وغیرہ ہے، کوئی ایسا لباس جو میں......"

"سمجھ گیا دوست!" وہ معنی خیز مسکراہٹ سے بولا۔ خاصا زود فہم تھا وہ۔ اس نے مجھے سفید رنگ کا لمبا سا عربی عبا او کفہ لا دیا۔ جسے پہن کر اور کالا چشمہ لگا کر میں بھی کوئی مقامی عرب باشندہ ہی نظر آنے لگا۔ میرے دراز قد پر یہ لباس فٹ بیٹھا تھا۔

اس کے بعد ہم دونوں باہر نکل آئے۔

اس کے بعد فاران نے مجھے کیمپ تھری کے دفتر کے سامنے اتار دیا اور خود چلا گیا۔

مجھے یہاں اطراف میں کافی رہائشی کالونیاں نظر آ رہی تھیں، بنگلے بھی تھے، بڑے مکانات اور بیرک ٹائپ کوارٹرز بھی۔ دفتر کی عمارت زیادہ بلند تو نہیں تھی البتہ خاصی وسیع اراضی پر پھیلی ہوئی نظر آتی تھی اور شیپ اس کی تقریباً نصف دائرے جیسی تھی۔

وہاں اس وقت پولیس کی خاصی تعداد موجود تھی۔ گاڑیاں اور ایمبولینس بھی کھڑی تھی ایک جو میرے احاطے کے گیٹ میں داخل ہونے سے پہلے ہی سائرن بجاتی ہوئی روانہ ہوگئی تھی، اس کے پیچھے بحرین پولیس کی ایک جیپ بھی تھی۔ باقی پولیس وہاں موجود تھی۔

میں نے ہونٹ بھینچ کر سوچا کہ بہرام خان کی لاش کو اب لے جایا جا رہا تھا۔ پوسٹ مارٹم کے لیے۔ کہیں میں غلط وقت پر تو نہیں آ گیا ہوں؟ کیونکہ یہاں مجھے افراتفری کا سماں نظر آ رہا تھا، یوں میں نے اپنا حلیہ ایسا بنا رکھا تھا کہ فوری طور پر اگر شاہ میر یا بن رائد ٹکرا بھی جائیں تو مجھے پہچاننے سے قاصر ہی رہیں۔

مجھے سخت پچھتاوا ہوا کہ میں نے تو فاران کو بھی واپس لوٹا دیا تھا۔ تب میں نے اللہ کا نام لیا کہ اسی میں ہی کوئی بہتری ہوگی۔ میں آگے بڑھ گیا۔

ایک تسلی بخش خبر تو ضرور ملی کہ پولیس اپنی تفتیش وغیرہ نمٹا چکی تھی اور اب جانے ہی والی تھی۔

استقبالیہ پر کوئی نہیں تھا۔ تاہم عملے کے لوگ ادھر ادھر مضطربانہ انداز میں آ جا رہے تھے۔

میں چوں کہ کچھ ایسے بھیس میں تھا کہ اسی لیے باگ مجھے وہیں کا ہی کوئی ملازم وغیرہ سمجھے ہوئے تھے۔

اندر تو دفتر کی شان ہی نرالی پائی تھی میں نے تھا کہ میں کسی دور افتادہ صحرائی علاقے کی ایسی شاندار جدید ساز و سامان اور سہولیات سے آراستہ و پیراستہ میں آ گیا ہوں۔

دیواروں کا رنگ ہلکا گرے مگر شائننگ تھا۔ فرنیچر اسٹیل کا تھا، کھڑکیوں پر بے داغ اور نفیس پردے لٹک رہے تھے۔ ایک جگہ دیوار پر جہاں استقبالیہ ڈیسک تھی، وہاں پشت والی دیوار پر ایک بڑا سا آفسٹ کاغذ والے میں کا نقشہ چسپاں تھا۔ جس پر کہیں کہیں چھوٹے چھوٹے جھنڈے پن سے لگے ہوئے تھے۔ ہال یا جسے لاؤنج لیں، وہاں اے سی بھی لگے ہوئے تھے۔ مجھے حیرت اس بات پر ہو رہی تھی کہ ابھی تک کسی نے بھی مجھ پر توجہ دینے کی زحمت ہی گوارانہ کی تھی، حالانکہ ایک اجنبی کو وہاں دیکھ کر کو تو متوجہ ہونا ہی چاہیے تھا بے شک کتنا بڑا ہی ظہور پذیر ہو چکا ہوا۔

ابھی میں یہ سوچ ہی رہا تھا کہ اچانک ایک مردانہ آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"جی جناب! آپ کو کس سے ملنا ہے؟" میں چونکا، جو کوئی بھی تھا میرے عقب سے نمودار ہوا تھا۔ وہ ہلکے آسمانی رنگ کی وردی والا گارڈ تھا۔ میں اسے باہر دیکھ چکا تھا۔ وہ انگریزی میں مجھ سے مخاطب ہوا تھا، لہجہ اس کا عربی تھا۔

"استقبالیہ میں کوئی نہیں؟" میں نے سنجیدگی سے پوچھا۔

وہ چونکا اور سر سے پاؤں تک میرا عجیب سی نظروں سے جائزہ لینے لگا۔ میں سمجھ گیا کہ وہ مجھے لباس سے عربی سمجھا ہوگا مگر لہجے اور انگریزی بولنے پر وہ چونک گیا تھا۔

میرے سوال کا جواب دینے کی بجائے وہ تشکیک بھری نظروں سے دیکھ کر بولا۔ "آپ کون ہو اور ملک سے تشریف لائے ہو؟"

میں نے پورے اعتماد سے جواب میں کہا۔ "قطر سے آیا ہوں اور یہ بھیس بھرنا میری مجبوری ہے۔ کام کی بات کرو گے یا ایسے ہی لوٹ جاؤں؟"

وہ صرفِ نظر کرتے ہوئے بولا۔

"آپ کو اندازہ ہو جانا چاہیے تھا یہاں کی افراتفری سے آپ بتائیں، آپ نے کس سے ملنا ہے؟" اس کے

کا طنز تھا۔ میں اس کا کوئی اثر لیے بغیر بولا۔

"مجھے مسٹر محمود الحسن سے ملنا ہے۔"

"بہتر ہوگا کہ آپ کل کسی وقت تشریف لے آئیں۔ وقت سب لوگ پولیس کی لمبی چوڑی تفتیش سے تھکے ہیں، کوئی آپ سے آرام سے بات نہیں کر سکے گا نہ نے گا۔" اس نے جواب دیا، وہ خود بھی جلدی میں رہا تھا۔

"اچھی بات ہے۔" میں نے کہا اور واپسی کے لیے اٹھائے تو اچانک باہر کسی عورت کے زور زور سے لانے اور واویلے کرنے کی آوازیں آنے لگیں۔ گارڈ سا گیا، خود میں بھی چونک گیا۔

"پلیز، آپ جلدی باہر تشریف لے آئیں۔" وہ مجھ بولا اور باہر کی طرف دوڑا۔ میں بھی تیز تیز قدموں سے ہوا دروازے سے باہر آیا تو ایک خاصی سرو قد اور دی تھیں، پینتیس سالہ عورت کو، جس کے ہمراہ دو ٹین لڑکا لڑکی بھی تھے۔ شور اور واویلا یہی عورت کر رہی وہ ایک بڑی سی جیپ میں شاید ابھی وہاں پہنچی اس کی رنگت سانولی مگر پرکشش تھی۔ جسم بھرا بھرا تھا۔ بیضوی تھی اور سیاہ گیسو دراز تھے، اس نے ساڑھی باندھ تھی۔

لوگ اسے سنبھالنے کی کوشش کر رہے تھے، مگر وہ نی انداز میں چیخے جا رہی تھی۔

"میں کسی کو زندہ نہیں چھوڑوں گی، میں جانتی ہوں ے بے گناہ شوہر کو کن لوگوں نے بیدردی سے ہلاک کیا میں نے پولیس میں اس کے خلاف رپورٹ کر دی میرے پاس ٹھوس شواہد ہیں، میرے شوہر بہرام کو پہلے اپنے اوپر ہونے والے قاتلانہ حملے کا خدشہ تھا اور اس مجھے پیشگی وہ شواہد دے رکھے تھے، سب سن لو کان کھول اسے بتا دینا وہ اب موت کی سزا سے بچنے والا نہیں۔"

وہ یہ کہہ کر غصے سے پاؤں پٹخ کر پلٹی۔ وہ دونوں اسی بچے تھے۔ عورت کا چہرہ آنسوؤں سے لبریز تھا اور یہی اس کے دونوں بچوں کا بھی تھا، مجھے ان پر ترس آیا۔

وہ اپنی جیپ کی طرف بڑھی، جیپ میں ڈرائیور نہیں اسی نے جیپ کی ڈرائیونگ سیٹ سنبھالی تھی۔ لڑکا اس برابر والی سیٹ کا دروازہ کھول کر بیٹھ گیا تھا اور لڑکی عقبی پر سوار ہو گئی تھی۔

جیپ کا انجن اسٹارٹ ہی تھا اور وہ خوبرو سی عورت شاید یہی دھمکانے کے لیے وہاں آئی تھی۔ اب واپس لوٹ رہی تھی۔

مجھے فی الفور ادراک ہو چکا تھا کہ یہ مقتول بہرام خان کی بیوہ کے سواء اور کوئی نہیں ہو سکتی تھی اور یہ دونوں ٹین ایجرز لڑکا لڑکی اسی کے بچے تھے۔

وہ عورت روتے روتے جیپ کو گیئر ڈالے ایک جھٹکے سے آگے بڑھا لے گئی۔

تب ہی اچانک میں نے دیکھا کہ ایک لمبا تڑنگا اور خاکستری رنگت کا شخص اندر ہال کی طرف تیز تیز قدموں سے چلتا چلا گیا۔ میرا ذہن تیزی سے کام کر رہا تھا۔ میں نے اس گارڈ کی طرف دیکھا جس سے میں تھوڑی دیر پہلے مخاطب تھا۔ وہ کہیں اور مگن تھا، میں یونہی ٹہلنے کے انداز میں واپس پلٹا اور اندر آ گیا۔

استقبالیہ پر میں نے اسی گرانڈیل شخص کو کاؤنٹر سے کہنی ٹکائے کسی کو فون پر بات کرتے پایا، وہ میری موجودگی سے غافل تھا اور خاصی عجلت میں اور بوکھلایا ہوا کسی سے فون پر غیر شستہ سی انگریزی میں کہہ رہا تھا۔

"یس باس! اس نے یہی کہا ہے جو میں نے آپ کو بتایا، دھمکی بھی اسی طرح کی دے رہی تھی وہ باس! وہ بہت خطرناک ثابت ہو سکتی ہے ہم سب کے لیے، اس کا منہ بند کرنا پڑے گا۔"

میرا دل تیزی سے دھڑک رہا تھا، میں دروازے کے قریب اور اس کے بالکل عقب میں کھڑا ہوا تھا۔ وہ مجھ سے ہنوز غافل تھا۔ وہ تھوڑی دیر تک سنتا رہا پھر بولا۔

"یس باس! راکا ادھر ہی ہے۔ میں اسے آپ کا حکم دے کر گلنارا کے پیچھے بھیجتا ہوں۔"

"راکا...... راکا!" یہ نام ہتھوڑے کی طرح میرے دماغ میں جیسے اعصاب شکن ضربیں لگاتا ہوا محسوس ہو رہا تھا۔

"گویا...... وہ بھی ادھر ہی کہیں موجود تھا، مگر کہاں؟" میرے ذہن میں ابھرا اور دوسرے ہی لمحے مجھے اپنی پشت پر کوئی آہنی شے چبھتی محسوس ہوئی اور ساتھ ہی ایک شناسا سی غراتی ہوئی آواز میری سماعتوں سے ٹکرائی۔

"خبردار! حرکت کی تو جان سے چلے جاؤ گے......"

یہ خونخوار اور سفاکانہ غراتی ہوئی آواز میں لاکھوں میں پہچان سکتا تھا جو راکا کے سواء کسی کی نہیں ہو سکتی تھی۔

(جاری ہے)

بیت بازی

قارئین

(سدرہ بانو نا گوری کراچی کا جواب)

اشفاق حسن.........بہاولپور

وہ التفاتِ ناز نہیں ہے مگر کوئی
حالِ خراب غم کا نگہباں ہے آج بھی

آفاق حیات.........سرگودھا

وفورِ شوق کی یہ کون سی رنگین منزل ہے
کہ ان کی شکل پر ہونے لگا ہے اب گماں اپنا

(فلک بنت عبدالندیم حیدرآباد کا جواب)

نزہت احمد علی.........کراچی

اک تبسم پہ شکایت کا حریف
اک تجلی ہر تمنا کا جواب

ناہید سلیم.........حیدرآباد

اوٹ سے پلکوں کی چلمن کے لپک رہا ہے کوندا سا
جس نے تن کو پھونک دیا ہے من کو آگ میں ڈالا ہے

حمیرہ علی حسن.........کراچی

آگہی خود سے نہ ہو پائی جسے کیا ہے اگر
چاند کا فاتح بنے ہو جائے انجم آشنا

اشفاق احمد.........سکھر

اس کو کوئی کھیل کہیں یا قسمت کا اندھیر کہیں
جس نے ساری دنیا جیتی اس کو پیار میں مات ہوئی

فرحت حسن.........لاڑکانہ

اِدھر حیات اُدھر موت سامنے تم ہو
یہ کشمکش کی گھڑی ہے ذرا ٹھہر جاؤ

(نیلوفر شاہین اسلام آباد کا جواب)

عشرت جہاں.........کراچی

یہ رات بھیانک ہجر کی ہے کاٹیں گے بڑے آلام سے ہم
ٹلنے کی نہیں یہ کال بلا سمجھے ہوئے تھے شام سے ہم

امجد ادریس.........کوئٹہ

یہاں لباس کی قیمت ہے آدمی کی نہیں
مجھے گلاس بڑا دے شراب کم کر دے

ذیشان مجتبیٰ.........لاہور

یہاں سے شہر کو دیکھو تو حلقہ در حلقہ
کھنچی ہے جیل کی صورت ہر ایک سمت فصیل

ادریس احمد.........کراچی

یہیں پہ جینا یہیں پہ مرنا یہیں ہے دنیا یہیں ہے عقبہ
فنا درِ یار کے علاوہ کہیں ہمارا گزر نہیں ہے

(ہادیہ ایمان، ماہا ایمان فورٹ عباس کا جواب)

ڈاکٹر ادیب عبدالغنی شکیل.........ملتان

اب عمر، نہ موسم، نہ وہ رستے کہ وہ پلٹے
اس دل کی مگر خام خیالی نہیں جاتی

(اقبال علی شجاع آباد کا جواب)

نیلوفر شاہین.........اسلام آباد

وقت ہی بتائے گا کون کس سے ملتا ہے
تم جگہ جگہ محفل، ہم گلی گلی تنہا

(کائنات بتول کا جواب)

شیر نواز گل.........پشاور

بدن کو چھوڑ کے جانا ہے آسماں کی طرف
سمندروں نے ہمیں یہ سبق پڑھایا تھا

(محمد خالد کوئٹہ کا جواب)

محمد آصف علی لہڑی.........نصیر آباد

دردِ دل کے واسطے پیدا کیا انسان کو
ورنہ طاعت کے لیے کچھ کم نہ تھے کروبیاں

(فصیح اللہ پشاور کا جواب)

احمد حمزہ خان.........پشاور

دل راکھ ہو چکا تو چمک اور بڑھ گئی
یہ تیری یاد تھی کہ عمل کیمیا کا تھا

(نزاہت افشاں فتح جنگ کا جواب)

شیخ عنایت.........چنیوٹ

وہ اور ہیں جنھیں گلشن کے قہقہے ہیں نصیب
یہاں تو ہونٹ ترستے ہیں مسکرانے کو



میرے خیال سے اس مرتبہ دریافت کی گئی شخصیت کا نام .... ہے۔

نام: ....

پتا: ....

....

انعام یافتہ ہونے کی صورت میں مجھے جاسوسی ☐ سسپنس ☐ پاکیزہ ☐ سرگزشت ☐ بھجوایا جائے
کسی ایک پر ☑ کیجیے۔

کوپن کے ہمراہ اپنے جوابات مورخہ 30 جون 2018ء تک علمی آزمائش 149 پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی 74200 پر ارسال کریں

مقابلہ بیت بازی

قارئین کے مسلسل اصرار پر ادبی ذوق کی تسکین کے لیے اک نیا سلسلہ ''بیت بازی'' شروع کیا گیا ہے۔ آپ اپنے پسندیدہ شعر کے آخری حرف سے شروع ہونے والا شعر ارسال کر سکتے ہیں۔

نام ....

پتا ....

....

محترم / محترمہ .... کے شعر کے جواب میں شعر ارسال کر رہا ہوں اسے شاملِ اشاعت کر لیں (شعر الگ کاغذ پر ہے)

111

مقابلہ بیت بازی
پوسٹ بکس نمبر 982 کراچی، 74200

علمی آزمائش۔ 149

ادارہ

ماہنامہ سرگزشت کا منفرد انعامی سلسلہ

علمی آزمائش کے اس منفرد سلسلے کے ذریعے آپ کو اپنی معلومات میں اضافے کے ساتھ انعام جیتنے کا موقع بھی ملتا ہے۔ ہر ماہ اس آزمائش میں دیے گئے سوال کا جواب تلاش کر کے ہمیں بھجوایئے۔ درست جواب بھیجنے والے پانچ قارئین کو ماہنامہ سرگزشت، سسپنس ڈائجسٹ، جاسوسی ڈائجسٹ اور ماہنامہ پاکیزہ میں سے ان کی پسند کا کوئی ایک رسالہ ایک سال کے لیے جاری کیا جائے گا۔ تاہم پانچ سے زائد افراد کے جواب درست ہونے کی صورت میں بذریعہ قرعہ اندازی انعام یافتگان کا فیصلہ کیا جائے گا۔

اب پڑھیے اس ماہ کی شخصیت کا مختصر خاکہ

بھارت کے شہر بھوپال میں پیدا ہوئے۔ وہیں ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ قیام پاکستان کے بعد سندھ کے شہر لاڑکانہ آ گئے۔ شعری زندگی کو یک دم سے ان کے ایک قطعے نے اچھال دی۔ وہ قطعہ عبدالرب نشتر نے پارلیمنٹ میں پڑھا۔ اس قطعہ میں پاکستانیوں کا حال زار تھا اس لیے ہر ایک کی زبان پر وہ قطعہ آ گیا۔ یہی ان کی پہچان بن گئی۔

علمی آزمائش 147 کا جواب

بشیر بدر 15 فروری 1935ء میں یوپی کے اس شہر میں پیدا ہوئے جہاں بابری مسجد ہے جسے انتہا پسند ہندوؤں نے شہید کر دیا۔ اردو شاعری میں ایک بڑا نام ہے۔ ان کے اشعار لوگ دل میں بسا کر رکھتے ہیں۔

انعام یافتگان

1۔ سہیل احمد، لاہور   2۔ شیخ حمید الحسن، ڈی جی خان   3۔ انعام الحق، جہلم
4۔ اشفاق انصاری، حیدرآباد   5۔ نسیمہ نرگس، کراچی

ان قارئین کے علاوہ جن لوگوں کے جوابات درست تھے۔

کراچی سے نعمان علوی، نواب سلیم، کاظم پاشا، ذیشان احمد، عنبر افشاں، صباحت مرزا، ندیم اشرف آفتاب تبسم، نسیم منظر، انیس اختر، آغا جعفر رضا، تبسم صدیقی، نگار بٹ، فردوس جبیں، وحید علی، غلام حسین، الیاس محمد، صوفی تبسم، امتیاز احمد، فیاض حسین، محمد شعیب، زاہد طوری بگٹی، اشرف الاسلام، صابر علی ترمذی، احمد علی ضیائی، ناہید خان، نور علی، زبیر علی، سید حیات محمد، ارباز علی، نجمت علی سید، نیاز حسن ملکانی، عنبرین احمد، انعام اللہ خان، نذر حسین۔ لاہور سے نیاز بٹ، سر شفیق احمد، خدا بخش، سنبل یاسمین بھٹ، محمد یاسین انصاری، اکبر علی، شفیق محمد، اظہار الحسن، سلطان علی ریئسانی، اشرف علی، مختار بٹ، زاہد حسن، صدف فاطمہ، ہارون صادق، اشرف حسن خان، خاور جمال، احسن صادق، عنایت گجر۔ ملتان سے باسط سلطان عنایت حسین، نعمان حسن، فیض محمد، کاظم زیدی، عنایت آرائیں، غضنفر علی، سجاد احمد، تبسم جہاں، رسول بخش، کلیم صدیقی۔ حیدرآباد سے فرحت احسن نقوی، کلیم الحق صدیقی، خاور احمد، نذر امام، اسرار الحسن، عنایت علی، فرحت حسن، سبطین سید، باسط فاروقی، یاسین احمد۔ حافظ آباد مولا بخش، نبیل احمد، عنایت حیدر۔ کشمور سے محمد الیاس۔ شہداد کوٹ سے طفیل احمد، انیس الحسن، نظر اختر۔ میر پور خاص وردہ بتول وہارون محمد، سید ترمذی۔ ڈیرہ غازی خان سے فتح یاب خان اچکزئی۔ ڈیرہ اسماعیل خان سے فہیم خان، داور، سعید الحسن۔ لالہ موسیٰ سے محمد فیضان، خیر محمد، رحیم یار خان سے نواز سلیم، امتیاز کھوکھر، اشفاق علی، اکبر حسین، ذاکر حسین۔ خیر پور میرس سے عنایت علی ماتلی، سید شفیق زیدی، فرقان حسن زیدی، نورین اصغر۔ گجرات سے نصیب الحسن فاروقی، فاطمہ علی بخش، یاور علی۔ شادی پور سے نیاز احمد۔ خانیوال سے ارشد علی، جھنگ سے نورین ملک التماس عباس۔ تلہ گنگ سے فصیح الدین۔ شجاع آباد سے غلام پنجتن۔ چنیوٹ سے فتح یاب خان، شیخ فضل الحق، ناہید علی سید۔ سرگودھا سے بشیر احمد، الیاس محمد فقیر، پرویز احمد، ایاز رسول خان۔ لڈن سے نثار احمد۔ بھکر سے الیاس احمد قادری، نوشین ملک۔ اسلام آباد سے زاہد حسن، زوبیا حسن کاظمی، عنایت خان خیلی۔ راولپنڈی سے مہتاب علی فاروقی، ناظم حسن، نگار جعفری، زاہد علی زاہد، محمد ابتسام مرزا، خاقان عباس، فرحین گل، ابرار احمد۔ کوہاٹ سے فدا حسین طوری۔ سرگودھا سے بانو صدیق، اسماعیل شاہ۔



واپسی

محترم ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت

جوائنٹ فیملی سسٹم معاشرے کے لیے کتنی اہم ہے۔ اس کا خلاصہ آپ کو میری روداد میں مل جائے گا۔ ہمارا معاشرہ اپنے آپ میں مکمل ہے پھر بھی ہم اپنی کوتاہیوں سے اسے خاک میں ملا رہے ہیں یہ ایک سبق بھی ہے اس لیے اسے سرگزشت میں ضرور شامل کریں۔

سائرہ
(کراچی)

اس روز موسم بہت خوشگوار تھا۔ آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی بوندا باندی ہو رہی تھی۔ ارسلان رات دیر تک دفتر کا کام کرتے رہے اس لیے صبح آنکھ بڑی مشکل سے کھلی۔ ان کے پاس تیار ہونے اور ناشتا کرنے کے لیے بہت کم وقت تھا۔ حالانکہ میں نے رات کو ہی ان کے کپڑے استری کر دیے تھے اور ان کی تمام چیزیں یعنی والٹ، موبائل، چشمہ اور گاڑی کی چابیاں بھی ڈریسنگ ٹیبل پر رکھ دی تھیں۔ ناشتا بھی تیار تھا۔ وہ جیسے ہی تیار ہو کر

آتے میں چائے نکال کر ان کے سامنے رکھ دیتی۔ میری طرف سے کوئی دیر نہیں تھی لیکن وہ بہت بوکھلائے ہوئے تھے۔ انہوں نے جیسے تیسے اپنی تیاری مکمل کی اور ناشتے کی میز پر آگئے۔ انہوں نے جلدی جلدی ناشتا کیا اور چائے کا گھونٹ لیتے ہوئے بولے۔ ''آج موسم بڑا بے ایمان ہے۔ دفتر جانے کو دل نہیں کر رہا۔''

''تو نہ جائیں۔ ایک دن کی چھٹی سے کوئی فرق نہیں پڑے گا۔''

''یہی تو مشکل ہے۔ چھٹی نہیں کر سکتا۔ آج بڑی اہم میٹنگ ہے۔ رات اسی کی تیاری کر رہا تھا۔''

''میٹنگ تو روز ہی ہوتی ہے۔ میری سمجھ میں نہیں آتا کہ کام کس وقت ہوتا ہوگا۔''

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''یہ بھی کام کا حصہ ہے۔ خیر تم اپنے دماغ پر زیادہ زور مت دو۔ شام کو تیار رہنا۔ کہیں گھومنے چلیں گے۔''

میں نے دل میں سوچا کہ تمہاری اماں جانے دیں تب نا لیکن زبان سے کچھ نہیں کہا۔ میں نہیں چاہتی تھی کہ صبح صبح ان کا موڈ خراب ہو جائے۔ ویسے ہی وہ گھر کی سیاست کی وجہ سے پریشان رہتے تھے۔ شادی سے پہلے مجھے بالکل اندازہ نہیں تھا کہ جوائنٹ فیملی میں رہنا کتنا مشکل ہوتا ہے۔ میری ماں نے بھی ساس نندوں کے ساتھ طویل عرصہ نباہ کیا۔ میری دادی بھی مزاج کی کافی تیز تھیں لیکن انہوں نے امی کے ساتھ کبھی کوئی زیادتی نہیں کی۔ تھوڑی بہت روک ٹوک اور تنقید تو ہوتی تھی لیکن مجموعی طور پر ان کا رویہ بہتر تھا۔ اسی طرح امی نے بھی ان کا احترام کیا اور کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جو ان کی ناراضی کا سبب بنتی۔ وہ اپنی نندوں کو بھی بہنوں کی طرح چاہتی تھیں۔ ان کی ہر ضرورت کا خیال رکھا اور ان کی شادی کی تیاریوں میں بھی بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ یہی وجہ تھی کہ گھر میں پیار محبت کا ماحول بنا رہا۔ ساس کے انتقال اور نندوں کی شادی کے بعد امی مکمل طور پر خودمختار ہو گئیں لیکن نندوں اور دیوروں سے ان کے تعلقات مثالی رہے۔

اس کے برعکس میری سسرال میں حالات بالکل مختلف تھے جس کا اندازہ مجھے شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی ہو گیا۔ حالانکہ یہ شادی میری ساس کی پسند اور مرضی سے ہی ہوئی تھی۔ میں اپنی سہیلی عفت کی شادی میں گئی تو انہوں نے مجھے وہاں دیکھا۔ ان دنوں وہ ارسلان کے لیے لڑکی ڈھونڈ رہی تھیں۔ انہیں مجھ میں نہ جانے کیا بات نظر آئی کہ دیکھتے ہی مجھے پسند کر لیا۔ ان کی عفت سے دور کی رشتے داری تھی۔ انہوں نے عفت کی امی سے ہمارے گھر کا فون نمبر لیا اور ایک ہفتہ بعد ہی امی سے فون پر بات کر لی۔ وہ میرا رشتہ مانگنے کے لیے ہمارے گھر آنا چاہ رہی تھیں۔ امی کو کیا اعتراض ہو سکتا تھا۔ جس گھر میں بیری ہو وہاں پتھر تو آتے ہی ہیں۔ ویسے بھی انہوں نے عفت کی امی کا حوالہ دیا تھا اس لیے امی نے انہیں اتوار کے دن بلا لیا۔

وہ اپنے ساتھ ارسلان اور چھوٹی بیٹی نادیہ کو بھی لے کر آئی تھیں۔ ارسلان نے ایم بی اے کیا تھا اور وہ کسی ملٹی نیشنل کمپنی میں درمیانہ درجے کی پوسٹ پر کام کر رہے تھے۔ کمپنی کی طرف سے گاڑی ملی ہوئی تھی جب کہ گھر ذاتی تھا۔ ارسلان کے والد کا انتقال ہو چکا تھا اور وہ اپنی زندگی میں دو بیٹیوں کے فرض سے سبکدوش ہو چکے تھے۔ نادیہ یونیورسٹی میں پڑھ رہی تھی جب کہ ارسلان کا چھوٹا بھائی اسد بھی برسرِروزگار تھا۔

امی کو یہ رشتہ ہر لحاظ سے مناسب لگا لیکن انہوں نے روایتی انداز اختیار کرتے ہوئے ارسلان کی ماں سے کچھ وقت مانگا تاکہ وہ گھر میں مشورہ کر سکیں۔ ارسلان کی ماں نے امی کو اپنے گھر آنے کی دعوت دی۔ اگلے ہفتے امی، ابو اور میرے دونوں بھائی ارسلان کے گھر گئے۔ ان کا مکان گلشن اقبال میں دو سو چالیس گز پر بنا ہوا تھا اور اوپر کی منزل کرایہ پر دے رکھی تھی۔ گھر میں ضرورت کی ہر چیز موجود تھی۔ امی مطمئن ہو کر آ گئیں اور انہوں نے ارسلان کا رشتہ منظور کر لیا۔ شادی چھ ماہ بعد طے ہوئی۔

امی کو جہیز کے بارے میں زیادہ تردد نہیں کرنا پڑا۔ سب سے بڑا مسئلہ زیور کا ہوتا ہے جس کا انتظام وہ پہلے ہی کر چکی تھیں۔ فرنیچر اور ٹی وی فریج کے لیے ارسلان کی ماں نے منع کر دیا کیونکہ یہ چیزیں ان کے گھر میں موجود تھیں اور مزید اشیاء کے رکھنے کی گنجائش نہیں تھی۔ اب امی کو صرف کپڑے، کھانے، بیڈ روم سیٹ اور کراکری وغیرہ کا انتظام کرنا تھا۔ میں نے فرمائش کر کے اس فہرست میں بیڈ روم فریج اور ٹی وی کا اضافہ کروایا۔ ابو ریٹائر ہو چکے تھے لیکن انہوں نے میری شادی کے لیے الگ پیسے رکھے ہوئے تھے۔ گھر کے خرچ کے لیے بھائیوں کی تنخواہ اور ان کی پینشن کافی تھی۔

میرا سارا جہیز شادی سے دو دن پہلے ارسلان کے گھر

پہنچا دیا گیا۔ جسے دیکھ کر میری ساس کا منہ بن گیا۔ شاید وہ کچھ زیادہ کی توقع کر رہی تھیں اور اس کا اظہار انہوں نے ولیمے کے اگلے روز ہی کر دیا۔ میں پانی پینے کے لیے کمرے سے باہر آئی تو مجھے ان کے بولنے کی آواز آئی وہ اپنی بیٹیوں سے کہہ رہی تھیں۔ ''ہم نے تو اپنا ہیرے جیسا بیٹا ان کے حوالے کر دیا اور انہیں اتنی توفیق بھی نہ ہوئی کہ داماد کو سلامی میں ایک کار ہی دے دیتے۔''

بڑی بیٹی آمنہ بولی۔ ''امی! خدا کے واسطے خاموش ہو جائیں۔ ان کی ساری جمع پونجی تو شادی میں لگ گئی ہوگی۔ کار کہاں سے دیتے۔''

''اے ہے، ساری عمر کمایا ہے اچھی پوسٹ پر تھے۔ اوپر کی آمدنی بھی ہوگی۔ انہیں سوچنا چاہیے تھا کہ کل کو بیٹی کی شادی بھی کرنی ہے۔''

''وہ کالج میں پروفیسر تھے۔ وہاں اوپر کی آمدنی کا کیا سوال۔ اگر آپ کو کار کی خواہش تھی تو ارسلان کے رشتے کے لیے کسی رشوت خور سرکاری افسر کے گھر جاتیں۔''

''اچھا مجھ سے بحث مت کرو۔'' وہ جھلاتے ہوئے بولیں۔ ''لوگ تو اپنی بیٹی کا سر اونچا رکھنے کے لیے بہت کچھ کرتے ہیں۔''

اس سے زیادہ سننے کی مجھ میں تاب نہیں تھی۔ میں روتی ہوئی اپنے کمرے میں واپس آ گئی۔ اس وقت ارسلان بھی گھر میں موجود تھے۔ انہوں نے شادی کے لیے پندرہ دن کی چھٹی لے رکھی تھی۔ انہوں نے میری آنکھوں میں آنسو دیکھے تو پریشان ہو گئے۔ مجھ سے رونے کی وجہ پوچھی تو میں نے ٹال دیا لیکن وہ سمجھ گئے کہ ضرور کوئی بات ہوئی ہے اس لیے اصرار کر کے پوچھنے لگے۔ مجبوراً مجھے بتانا پڑا۔

پوری بات سن کر وہ بولے۔ ''تم دل چھوٹا مت کرو۔ ان کی تو عادت ہے ایسی باتیں کرنے کی۔ آئندہ بھی تمہیں بہت کچھ سننے کو ملے گا اس کے لیے تیار رہو اور اپنے اندر صبر و برداشت کا مادہ پیدا کرو بس کبھی انہیں پلٹ کر جواب مت دینا۔ تم نے سنا ہوگا کہ ایک چپ سو کو ہراتی ہے۔ وہ بھی ایک دن تھک ہار کر خاموش ہو جائیں گی۔''

شادی کے بعد دعوتوں کا سلسلہ شروع ہو گیا۔ میرا میکہ بہت بڑا تھا۔ چچا، پھوپیاں، ماموں اور خالائیں۔ سب ملا کر بارہ گھر تھے۔ ہر کوئی دعوت کرنا چاہ رہا تھا۔ ساس کو اس پر بھی اعتراض ہوا۔ مزے کی بات یہ تھی کہ جہاں پورے گھر کو بلایا جاتا تو وہ خوشی خوشی چلی جاتیں اور جہاں صرف مجھے اور ارسلان کو جانا ہوتا تو ان کا موڈ خراب ہو جاتا اور وہ منہ لپیٹ کر پڑ جاتیں اسی لیے میرا دل کہیں جانے کو نہیں چاہتا تھا۔ میری کئی سہیلیاں بھی دعوت کرنا چاہ رہی تھیں لیکن میں نے مصروفیت کا بہانہ بنا کر انہیں منع کر دیا۔

پندرہ دن میں ہی میں نے اپنی ساس کے مزاج کو اچھی طرح سمجھ لیا تھا۔ انہیں ارسلان کے ساتھ کہیں جانا پسند نہیں تھا۔ یہاں تک کہ میں امی سے ملنے ہفتہ میں ایک بار اپنے گھر جاتی تو وہ بھی انہیں ناگوار گزرتا۔ وہ چاہتی تھیں کہ نہ میں کہیں جاؤں اور نہ کوئی مجھ سے ملنے آئے۔

ارسلان کی بڑی خواہش تھی کہ وہ مجھے لے کر شمالی علاقوں کی سیر کے لیے جائیں لیکن دفتر سے مزید چھٹی نہ ملنے کی وجہ سے ان کی یہ خواہش پوری نہ ہو سکی۔ ایک طرح سے اچھا ہی ہوا ورنہ میری ساس بہت شور مچاتیں۔ ارسلان نے وعدہ کیا تھا کہ جیسے ہی چھٹی ملی وہ مجھے گھمانے کے لیے ضرور لے کر جائیں گے۔ جی میں آیا کہہ دوں کہ اپنی ماں اور بہن کو بھی ساتھ لے چلنا ورنہ میری زندگی عذاب ہو جائے گی لیکن اس لیے خاموش رہی کہ کہیں انہیں برا نہ لگ جائے۔

معاملہ صرف آنے جانے تک ہی محدود نہیں رہا بلکہ وہ مجھے اذیت پہنچانے کا کوئی موقع ہاتھ سے نہ جانے دیتیں۔ شادی کے ایک ہفتہ بعد ہی انہوں نے نام نہاد کھیر کی رسم ادا کر دی۔ جس کا مطلب تھا کہ اب مجھے کچن سنبھالنا ہے جب کہ میں نے گھر میں کبھی کھانا نہیں پکایا تھا۔ پڑھائی سے ہی فرصت نہیں ملتی تھی جو میں کچن کا رخ کرتی۔ تعلیم سے فارغ ہوئی تو امی نے مجھے دو چار چیزیں بنانا سکھا دیں۔ مجھے خود بھی کھانا پکانے کا شوق تھا اور میں رسالوں میں ترکیبیں پڑھ کر تجربے کیا کرتی تھی۔

ساس صاحبہ نے چند روز تو کچن میں میرا ساتھ دیا۔ اس کے بعد ساری ذمے داری مجھے سونپ کر خود فارغ ہو گئیں۔ اب ان کا سارا وقت ٹی وی دیکھنے اور بیٹیوں سے فون پر باتیں کرنے میں گزر جاتا تھا۔ چھوٹی نند نادیہ کو گھر کے کام کاج سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ وہ دوپہر کو کالج سے آنے کے بعد کمرا بند کر کے سو جاتی پھر وہ شام کو ہی کمرے سے باہر نکلتی تھی۔ اس کا یہ حال تھا کہ چائے پینے کے بعد پیالی بھی میز پر چھوڑ دیتی۔ وہ بھی مجھے ہی دھونا پڑتی تھی۔ اس کا بقیہ وقت ٹی وی دیکھنے یا فون پر باتیں کرنے میں گزر جاتا۔

میں صبح چھ بجے اٹھتی۔ ہمارے یہاں ناشتے کے تین

دور ہوتے تھے۔ پہلے ارسلان کو ناشتا دیتی پھر نادیہ اور اسد اور سب سے آخر میں ساس صاحبہ تشریف لاتی تھیں۔ اس طرح میری یہ مصروفیت دس بجے تک جاری رہتی پھر دوپہر کے کھانے کی تیاری شروع ہو جاتی اس کے لیے بھی ساس سے پوچھنا پڑتا کہ کیا پکے گا۔ مجھے اتنا اختیار بھی نہیں تھا کہ اپنی مرضی سے کوئی چیز پکا سکوں۔ رات نو دس بجے تک یہی سلسلہ جاری رہتا۔ جب سب لوگ کھانے سے فارغ ہو جاتے تو میں برتن دھوتی۔ ارسلان کے کپڑے استری کرتی۔ اس کے بعد مجھے کمر سیدھی کرنے کا موقع ملتا۔

پہلے اوپر کا کام کرنے کے لیے ماسی آتی تھی۔ اس سے بھی مجھے بہت سہارا تھا لیکن اچانک ہی ساس کو اس کے کام میں کیڑے نظر آنے لگے۔ کبھی کہتیں کہ وہ کپڑے ٹھیک سے نہیں دھوتی۔ کبھی یہ شکایت ہوتی کہ صوفوں پر گرد جمی رہتی ہے۔ وہ بری طرح اس کے پیچھے پڑ گئی تھیں۔ غرض یہ کہ تنگ آ کر اس نے کام چھوڑ دیا۔ اس کے جانے کے بعد ایک نئی مصیبت کھڑی ہو گئی۔ اس کے سارے کام بھی مجھے ہی کرنا پڑتے۔ میں اپنے ملنے جلنے والوں سے کہہ کر جس ماسی کو بلاتی، ساس صاحبہ لڑ جھگڑ کر اسے چلتا کر دیتیں۔ میں عملاً ایک ایسی ملازمہ بن کر رہ گئی تھی جسے تنخواہ نہیں ملتی۔

ارسلان سب کچھ دیکھ رہے تھے۔ تنہائی میں وہ مجھ سے اظہار ہمدردی ضرور کرتے لیکن ماں سے کچھ کہنے کی ہمت نہیں تھی۔ میں نے ان سے کئی بار کہا کہ وہ کم از کم ایک ماسی کا بندوبست ہی کر دیں۔ میں اتنے سارے کام نہیں کر سکتی۔

وہ میری ہاں میں ہاں ضرور ملاتے لیکن عملی طور پر انہوں نے بھی کوئی قدم نہیں اٹھایا۔ میں بھی احتجاجاً نہ کپڑے دھوتی اور نہ گھر کی صفائی کرتی۔ البتہ برتن دھونا مجبوری تھی۔ چھٹی والے دن میں نے ارسلان کے کپڑوں کی گٹھڑی بنائی اور ان سے کہا کہ وہ انہیں لانڈری میں دے آئیں۔

دو چار دن میں ہی سب گھر والوں کے ہوش ٹھکانے آ گئے۔ صفائی نہ ہونے کی وجہ سے گھر بھوت بنگلا لگ رہا تھا۔ ارسلان نے تو اپنے کپڑے لانڈری میں دے دیے لیکن نائلہ اور ساس صاحبہ کو مصیبت پڑ گئی۔ اتنی ہمت تو ہوتی نہیں کہ مجھ سے کہتیں کیونکہ میں خود اپنے کپڑے امی کے گھر دھلنے کے لیے دے آئی تھی۔ البتہ دبی زبان سے یہ ضرور کہا کہ جب گھر میں واشنگ مشین موجود ہے تو کپڑے اِدھر اُدھر کیوں جا رہے ہیں۔ میں ان کی چالاکی سمجھتی تھی۔ مقصد یہ تھا کہ جب میں واشنگ مشین لگاؤں گی تو وہ بھی اپنے کپڑے اس میں ڈال دیں گی اس لیے میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا جب صورتِ حال قابو سے باہر ہونے لگی تو مجبوراً انہیں ماسی کو بلانا پڑ گیا۔

☆......☆

یہ تھے وہ حالات جن سے میں گزر رہی تھی۔ ایسے میں ان کا یہ کہنا کہ آج کہیں گھومنے چلیں گے، مجھے محض ایک مذاق ہی لگا۔ اس سے پہلے بھی وہ کئی بار ایسے پروگرام بنا چکے تھے لیکن شاید ایک دو مرتبہ ہی اس پر عمل کر پائے ہوں۔ ہمیشہ میری ساس کوئی ایسا مسئلہ کھڑا کر دیتیں کہ سارا پروگرام چوپٹ ہو جاتا۔ کبھی ان کا بلڈ پریشر ہائی ہو جاتا اور وہ دل پکڑ کر بیٹھ جاتیں۔ کبھی ارسلان کے بھائی اسد کو آنے میں دیر ہو جاتی تو وہ بار بار گیٹ پر جاتیں اور ارسلان کو بھی پریشان کرتیں۔ کبھی کہتیں کہ آج نادیہ کو دیکھنے کچھ لوگ آ رہے ہیں اس لیے ہمارا گھر میں رہنا ضروری ہے، بعد میں معلوم ہوتا کہ ان کا پروگرام ملتوی ہو گیا ہے۔ مزے کی بات تھی کہ یہ سارے ڈرامے اس دن ہوتے جب ہمیں کہیں باہر جانا ہوتا۔ عام دنوں میں کچھ نہیں ہوتا تھا۔

میں نے ارسلان کے کہنے پر عمل کرتے ہوئے اپنا سارا کام وقت سے پہلے مکمل کر لیا تا کہ رات کے کھانے پر کوئی مسئلہ نہ ہو۔ کپڑے نکال کر استری کیے اور خود نہانے چلی گئی۔ ساس صاحبہ بڑے غور سے میری تیاریاں دیکھ رہی تھیں۔ بالآخر ان سے برداشت نہیں ہوا جب میں نہا کر آئی تو وہ بولیں۔ ''کہیں جا رہی ہو؟''

''جی!'' میں نے مختصر جواب دیا۔

''کہاں کا پروگرام ہے؟''

''یہ تو مجھے معلوم نہیں۔ انہوں نے صرف یہ کہا تھا کہ تیار رہنا۔''

''اس لڑکے کو ذرا سا بھی اپنا خیال نہیں۔'' ان کی بڑبڑاہٹ شروع ہو گئی۔ ''سارا دن دفتر میں سر کھپاتا ہے اور شام کو تفریح کی سوجھتی ہے۔ واپسی تو بارہ بجے سے پہلے کیا ہو گی کب سوئے گا، کب اٹھے گا۔ نیند بھی پوری نہیں ہوتی۔''

میں نے ان کی بات کا کوئی جواب نہیں دیا۔ البتہ مجھے ارسلان پر غصہ آ رہا تھا۔ وہ ایسی بات کہتے کیوں ہیں جس پر عمل نہیں ہو سکتا اور اگر کہیں چلے بھی جائیں تو واپسی پر کوفت کے علاوہ کچھ حاصل نہیں ہو گا۔ میں نے سوچ لیا کہ ارسلان آئیں گے تو انہیں منع کر دوں گی لیکن جب وہ گھر آئے تو میں کچھ نہ کہہ سکی۔ وہ بہت خوش لگ رہے تھے۔

انہوں نے پُرجوش انداز میں کہا۔ ''تم مجھے ایک چائے کی پیالی دے دو۔ میں تھوڑا ریسٹ کر لوں پھر چلتے ہیں۔''

آٹھ بجے ہم تیار ہو کر کمرے سے باہر آئے تو ساس صاحبہ لاؤنج میں بیٹھی چوکیداری کر رہی تھیں۔ انہوں نے بیٹھے بیٹھے تیر چلایا۔ ''کہاں کی تیاری ہے؟''

''ایک دوست نے کھانے پر بلایا ہے۔''

''دوست کی محفل میں عورتوں کا کیا کام؟''

''فیملی ڈنر ہے۔ سب کی بیویاں ہوں گی۔''

''مجھے یہ بالکل پسند نہیں کہ عورتیں غیر مردوں کی دعوت میں جائیں۔''

''وہ غیر نہیں، سب میرے دوست ہیں۔ میرے ساتھ دفتر میں کام کرتے ہیں۔''

اس سے پہلے کہ وہ کچھ اور کہتیں۔ ارسلان نے مجھے اشارہ کیا اور ہم تیزی سے چلتے ہوئے گھر سے باہر آ گئے۔

ارسلان نے اپنی گاڑی ایک ریستوران کے باہر روکی اور مجھے لے کر اندر چلے گئے۔ انہوں نے پہلے سے ایک میز مخصوص کروا رکھی تھی۔ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا لیکن مجھے ان کا کوئی دوست یا اس کی بیوی نظر نہیں آئی۔ میں نے پوچھا۔ ''آپ کے دوست نہیں آئے ابھی تک؟''

وہ ہنستے ہوئے بولے۔ ''میں نے امی سے جھوٹ بولا تھا۔ کوئی دعوت وعوت نہیں ہے۔ اگر میں کہہ دیتا کہ تمہیں کھانا کھلانے لے جا رہا ہوں تو ایک ہنگامہ کھڑا ہو جاتا اس لیے جھوٹ کا سہارا لینا پڑا۔''

''اوہو۔ آج یہ عنایت کس سلسلے میں؟'' میں نے شوخ لہجہ میں کہا۔

''میں تمہیں سرپرائز دینا چاہ رہا تھا۔ آج میری پروموشن ہوئی ہے۔ معلوم تو مجھے پہلے سے ہی تھا لیکن میں نے سوچا کہ لیٹر مل جائے پھر تمہیں بتاؤں گا۔''

ان کی پروموشن کی خبر سن کر خوشی تو ہوئی لیکن ساتھ ہی یہ خیال بھی آیا کہ اس سے مجھے کیا فائدہ ہو گا۔ وہ جو کماتے گھر میں خرچ ہو جاتا۔ شادی کے بعد انہوں نے میرے کپڑے بنائے، نہ ہی کبھی کوئی گفٹ دیا۔ شاید ان کے پاس کچھ بچتا ہی نہیں تھا یا پھر ماں سے ڈرتے تھے۔

''مبارک ہو۔ اس خوشی میں آپ سے ایک اچھا سا تحفہ لوں گی۔''

''تمہیں کہنے کی ضرورت نہیں۔'' وہ مسکراتے ہوئے بولے۔ ''میں نے پہلے ہی اس کا انتظام کر لیا ہے یہ دیکھو۔''

گوتم کی پیدائش

ہندوستان میں 2600 سال قبل سلطنت مگدھ کا بول بالا تھا اور یہ سلطنت آج کل کے جنوبی بہار میں گنگا کے جنوب میں ندی شوما تک پھیلی ہوئی تھی اس کا دارالحکومت راج گریہہ تھا۔ اس کے شمال میں طاقتور لچھویوں کا جمہوری راج تھا۔ لچھویوں کا دارالحکومت ویشالی گنگا کے شمال میں تھا۔ آج کا مشرقی بہار اس وقت انگا کے نام سے مشہور تھا۔ گنگا کے شمال اور مغربی کناروں پر کوشلوں کا راج تھا۔ اس کا پرانا دارالحکومت ایودھیا اجڑ چکا تھا اور نئے دارالحکومت شراوتی میں زندگی بڑے عروج پر تھی۔ جنوب کی طرف کاشیوں کا پرانا راج تھا جو اس وقت شراوتی کے راجاؤں کے ماتحت تھا۔ کوشل راج کے مشرق کی طرف روہنی ندی کے دونوں کناروں پر آمنے سامنے دو خودمختار قومیں رہ رہی تھیں۔ ان میں ایک ''شاکیہ'' اور دوسری ''کولی'' ذات تھی۔ ان ذاتوں کی خودمختاری ان کی طاقت کی بنیاد پر نہیں بلکہ مگدھوں اور لچھویوں کے ساتھ امن و آشتی کے معاہدے کی بنیاد پر تھی۔ شاکیوں کا دارالحکومت کپل وستو تھا۔ جس زمانے کا ہم ذکر کر رہے ہیں اس وقت شاکیوں پر مہاراج شدھودھن حکمرانی کر رہے تھے۔ مگدھ کی گدی مشہور شہنشاہ بمب سار اور کوشلیوں کی گدی مہاراجا پرسین جیت کے پاس تھی۔ شاکیوں اور کولی سرداروں کا باہمی میل جول اور رشتے داری تھی۔ مہاراجا شدھودھن نے کولی مہاراج کی دو لڑکیوں سے بیاہ کیا تھا۔ بیاہ کے کافی عرصہ بعد ان دونوں میں سے بڑی بہن حاملہ ہوئی۔ زچگی سے کچھ وقت پہلے اس وقت کے رواج کے مطابق اسے باپ کے گھر بھیجا گیا لیکن راستے میں ہی لمبنی نام کے جنگل میں اس کا بیٹا پیدا ہوا۔ بیٹے کے ساتھ رانی باپ کے گھر پہنچی اور ساتویں دن مر گئی۔ اس کی موت کے بعد چھوٹی بہن نے بچے کو پالا۔ یہی بچہ بعد میں گوتم بدھ مشہور ہوا۔

اقتباس: مذاہب عالم کا انسائیکلو پیڈیا

مرسلہ: شہروز عالم۔ کراچی

انہوں نے کوٹ کی جیب سے ایک سفید موتیوں کا ہار نکالا اور بولے۔ ”یہ تمہاری خوب صورت گردن میں بہت سجے گا۔“

وہ بہت قیمتی اور خوب صورت ہار تھا لیکن وہ جگہ ایسی نہیں تھی کہ میں اس ہار کو وہاں پہنتی۔ میں نے اسے اپنے پرس میں رکھ لیا اور بولی۔ ”بہت بہت شکریہ۔“

ہماری واپسی گیارہ بجے ہوئی۔ سب لوگ اپنے کمروں میں بند ہو چکے تھے حالانکہ یہ ان کے سونے کا وقت نہیں تھا۔ میں نے شکایتی لہجے میں ارسلان سے کہا۔ ”دیکھ لیا میں اسی لیے آپ کے ساتھ کہیں نہیں جاتی۔“

”یہ تو روز کا مسئلہ ہے۔ آخر ہم کب تک اپنے دل کو مارتے رہیں گے۔“

”آپ تو صبح دفتر چلے جائیں گے۔ دن بھر میں باتیں سنتی رہوں گی۔“

”سن لینا۔“ وہ بے پروائی سے بولے۔ ”اس مسئلے کا اور کوئی حل نہیں۔“

میں نے کہا۔ ”حل تو ہے لیکن شاید آپ اسے پسند نہ کریں۔“

”وہ کیا؟“

”اگر ہم اپنا گھر الگ کر لیں تو ان پابندیوں سے نجات مل سکتی ہے۔“

”پاگل ہو گئی ہو۔“ وہ غصے سے بولے۔ ”اپنا گھر ہوتے ہوئے میں کرایہ کے مکان میں کیوں رہوں۔“

میں نے اس موضوع پر مزید بات کرنی مناسب نہ سمجھی لیکن اتنا ضرور کہا کہ بہت جلد انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ میں نے کوئی غلط بات نہیں کی تھی۔

دوسرے دن وہی ہوا جس کا مجھے ڈر تھا۔ ساس صاحبہ نے مجھ سے کوئی بات نہیں کی اور اپنے کمرے میں منہ لپیٹے پڑی رہیں۔ لگ رہا تھا کہ جیسے گھر میں کوئی میت ہو گئی ہو۔ اس دن نادیہ بھی کالج نہیں گئی تھی۔ ارسلان اور اسد کے جانے کے بعد وہ میرے پاس آئی اور تیز لہجے میں بولی۔ ”بھابی! آپ کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ امی کو بہت دکھ ہوا ہے۔“

”میں نے ایسا کیا کر دیا۔“ میں حیران ہوتے ہوئے بولی۔

”جب آپ جانتی ہیں کہ امی کو یہ بات پسند نہیں پھر بھی آپ پارٹی میں چلی گئیں۔“

”یہ بات اپنے بھائی سے کہو۔ میں نے ان سے نہیں کہا تھا بلکہ وہ خود مجھے لے کر گئے تھے۔“

”انہیں تو آپ نے اپنی مٹھی میں کر رکھا ہے۔ وہ میری کیا سنیں گے۔“

”یہ بات تمہیں شادی کے بعد معلوم ہوگی کہ مرد وہی کرتے ہیں جو ان کا دل کرتا ہے اور بیوی ان کی بات ماننے پر مجبور ہوتی ہے۔“

”بہتر ہوگا کہ آپ امی سے معافی مانگ لیں۔“

مجھے بھی غصہ آ گیا اور میں اونچی آواز میں بولی۔

”کس بات کی معافی مانگوں۔ میرا قصور تو بتاؤ۔“

میری آواز سن کر ساس بھی کمرے سے باہر آ گئیں اور چیختے ہوئے بولیں۔ ”نادیہ اس بدتمیز عورت کے منہ لگنے کی ضرورت نہیں۔ اس نے میرا بیٹا چھینا ہے۔ اللہ نے چاہا تو یہ بھی اپنے بیٹے کی شکل دیکھنے کو ترس جائے گی۔“

”ابھی تو وہ دنیا میں بھی نہیں آیا اور اسے بددعائیں دینا شروع کر دیں۔“

”مجھ سے زبان چلاتی ہے ذلیل عورت۔“ یہ کہہ کر انہوں نے میرے بال پکڑے اور ایک زوردار تھپڑ میرے منہ پر رسید کر دیا۔ میں نے ان کی مار سے بچنے کے لیے انہیں ہلکا سا دھکا دیا اور دوڑتی ہوئی اپنے کمرے میں چلی گئی۔ اندر سے کمرے کا دروازہ بند کیا پھر میں نے ارسلان کا نمبر ملایا اور بولی۔ ”آپ فوراً گھر آ جائیں ورنہ یہ لوگ مجھے مار ڈالیں گے۔“

وہ میرے رونے کی آواز سن کر گھبرا گئے۔ ”کیا کہہ رہی ہو؟ کون لوگ تمہیں مار ڈالیں گے؟“

”آپ کی ماں اور بہن! انہوں نے میرے بال پکڑ کر کھینچے۔ مجھے تھپڑ مارا۔ میں بڑی مشکل سے اپنے آپ کو چھڑانے میں کامیاب ہو سکی اور اندر سے کمرا بند کر کے فون کر رہی ہوں۔ میری جان کو خطرہ ہے۔ اگر آپ فوراً نہیں آئے تو میں اپنی مدد کے لیے پولیس کو بلا لوں گی۔“

”نہیں نہیں پولیس کو مت بلانا۔ میں آ رہا ہوں۔“

میں نے ایک سوٹ کیس اپنے کپڑے اور ضرورت کی دوسری چیزیں رکھیں اور ارسلان کا انتظار کرنے لگی۔ وہ آدھ گھنٹے بعد آئے۔ میری اجڑی صورت اور گال پر تھپڑ کا نشان دیکھ کر انہیں میری بات کا یقین آ گیا۔ جب میں نے انہیں پوری بات لفظ بہ لفظ سنائی تو وہ بھی غصہ میں آ گئے اور بولے۔ ”میں ابھی ان لوگوں کے دماغ ٹھیک کرتا ہوں۔“

میں نے ان کا ہاتھ پکڑ لیا اور بولی۔ ”اس کا کوئی فائدہ نہیں ہوگا۔ وہ جواب میں مجھ پر دس الزامات اور ڈال دیں گی۔ میں گالیاں سننے اور مار کھانے کے لیے اس گھر میں نہیں آئی تھی۔“

وہ میرا ہاتھ پکڑتے ہوئے بولے۔ ”سائرہ مجھے بہت افسوس ہے کہ امی اور نادیہ نے تمہارے ساتھ یہ سلوک کیا۔ ان کی طرف سے میں معافی مانگتا ہوں۔“

”آپ کے معافی مانگنے سے یہ آگ سرد نہیں ہوگی جس نے میرے پورے وجود کو اپنی لپیٹ میں لے لیا ہے۔ اب میں یہاں ایک منٹ بھی نہیں رہ سکتی۔ آپ مجھے ابھی اور اسی وقت امی کے گھر چھوڑ آئیں ورنہ میں اپنی جان دے دوں گی۔“

”یہ کوئی حل نہیں ہے۔ تم کب تک وہاں رہو گی۔ واپس تو اسی گھر میں آنا ہے۔“

”جب تک آپ الگ گھر نہیں لیتے میں وہیں رہوں گی۔“

وہ سمجھ گئے کہ اس وقت میں شدید غصے میں ہوں اور ان کی کوئی بات نہیں سنوں گی۔ وہ ایک ٹھنڈی سانس لیتے ہوئے بولے۔ ”ٹھیک ہے۔ چھوڑ آتا ہوں لیکن پہلے تم اپنا حلیہ تو ٹھیک کرو۔“

میں نے واش روم میں جا کر منہ دھویا۔ میرے گال پر نیل پڑ گیا تھا جو اتنی جلدی ٹھیک ہونے والا نہیں تھا۔ بیرونی دروازے تک جانے کے لیے لاؤنج سے گزرنا پڑتا اور وہاں میری ساس اپنی چہیتی نادیہ کے ساتھ بیٹھی ہوئی تھیں۔ مجھے سامان سمیت جاتے ہوئے دیکھا تو چلاتے ہوئے بولیں۔

”اب اس گھر میں دوبارہ آنے کی ضرورت نہیں۔ یہاں بدتمیز لوگوں کے لیے کوئی جگہ نہیں ہے۔“

ارسلان کا ضبط جواب دے گیا، وہ بولے۔ ”اتنا کچھ ہونے کے بعد بھی آپ کو چین نہیں آیا۔ آخر کیا چاہتی ہیں آپ؟“

”اگر تجھے میرا ذرا سا بھی خیال ہے تو اسے طلاق دے دے۔ میں تیری شادی کسی ایسی لڑکی سے کرواؤں گی جو بہت سا جہیز لائے۔“

ساری آگ جہیز کی تھی جس کی وجہ سے انہوں نے میرا جینا دوبھر کر رکھا تھا لیکن ارسلان پر ان کی بات کا کوئی اثر نہیں ہوا۔ وہ تیز آواز میں بولے۔ ”خدا کا خوف کریں، امی آپ کی بھی لڑکیاں ہیں اگر کوئی ان کے بارے میں ایسی بات کرے تو آپ کے دل پر کیا گزرے گی۔“

”کیوں ایسی بدفالی منہ سے نکال رہا ہے۔ میری لڑکیاں ایسی نہیں ہیں۔ بس میں نے کہہ دیا۔ تجھے طلاق دینا ہوگی۔ یہ میرا حکم ہے۔“

”معاف کیجیے۔ میں آپ کا حکم ماننے کا پابند نہیں ہوں۔ میرے پاس اسے طلاق دینے کا کوئی شرعی جواز نہیں ہے پھر میں یہ گناہ کیوں کروں؟“

”مجھے معلوم تھا تو یہی کہے گا۔ جا دفع ہو جا اور اس سے کہنا کہ آئندہ یہ منحوس شکل لے کر میرے سامنے نہ آئے۔“

اس کے بعد ارسلان کچھ نہیں بولے۔ انہوں نے اپنی ماں کا اصل روپ دیکھ لیا تھا جو میرے ناکردہ جرم کی پاداش میں مجھے طلاق دلوانے پر کمربستہ تھیں۔ ارسلان نے مجھے امی کے گھر چھوڑا اور دروازے سے ہی واپس چلے گئے۔ انہیں ایک میٹنگ کے سلسلے میں دفتر واپس جانا تھا۔ البتہ انہوں نے جاتے وقت اتنا ضرور کہا۔ ”فی الحال تم یہاں آرام سے رہو اور اپنے ذہن کو پُرسکون رکھو۔ میں شام کو آؤں گا پھر سوچیں گے کہ اب کیا کرنا ہے۔“

میں نے گھر والوں کو زیادہ تفصیل نہیں بتائی۔ بس اتنا کہا کہ میری طبیعت ٹھیک نہیں ہے اس لیے کچھ دن آرام کرنے کی غرض سے یہاں رہنے آئی ہوں۔ وہ حیران تو ہوئے ہوں گے کیونکہ شادی کے بعد میں کبھی ایک رات رہنے کے لیے نہیں آئی تھی لیکن انہیں کریدنے کی عادت نہیں تھی اس لیے کسی نے تفصیل نہیں پوچھی۔

شام کو ارسلان آئے اور میرا دل بہلانے کے لیے اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ انہوں نے میرے ساتھ رات کا کھانا کھایا اور جاتے وقت کہنے لگے۔ ”تم کچھ دن یہاں رہو۔ امی کا غصہ ٹھنڈا ہو جائے تو میں تمہیں لے جاؤں گا۔“

”سوری!“ میں نے کہا۔ ”پہلے انہوں نے مجھ پر ہاتھ اٹھایا پھر گھر سے نکال دیا۔ اب میں یہ منحوس شکل انہیں کیسے دکھا سکتی ہوں۔“

”اوہو! بھئی انہوں نے غصے میں ایک بات کہہ دی اور تم اسے دل پر لے کر بیٹھ گئیں۔“

”بات ہی ایسی ہے۔ میری جگہ آپ ہوتے تو کیا اس گھر میں واپس جانا پسند کرتے؟“

”اس وقت تم غصے میں ہو۔ اس موضوع پر ہم بعد

میں بات کریں گے۔“ یہ کہہ کر وہ چلے گئے۔

میں واقعی غصے میں تھی اور میں نے فیصلہ کرلیا تھا کہ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ میں اس گھر میں واپس نہیں جاؤں گی چنانچہ دوسرے روز جب ارسلان آئے تو میں نے دو ٹوک الفاظ میں انہیں اپنا فیصلہ سنا دیا اور کہا کہ وہ میرے لیے الگ گھر کا بندوبست کریں۔ یہ سن کر وہ سوچ میں پڑ گئے اور بولے۔ ”سائرہ میری اتنی گنجائش نہیں کہ الگ گھر افورڈ کرسکوں۔ میں دو گھروں کا خرچا نہیں اٹھا سکتا۔“

”کیوں؟ کیا ساری ذمے داری آپ کی ہے۔ اسد بھی تو جاب کرتا ہے۔“

”اس کی تنخواہ اور مکان کا کرایہ بینک میں چلا جاتا ہے۔ ہمیں نادیہ کی شادی بھی تو کرنی ہے۔ گھر کا خرچ میرے ذمہ ہے۔“

”اگر یہ بات ہے تو میں ملازمت کرلوں گی۔ مکان کا کرایہ اور گیس بجلی کے بل میرے ذمہ۔ پھر آپ کی پروموشن بھی تو ہو گئی ہے۔ ظاہر ہے کہ تنخواہ میں بھی اضافہ ہوا ہو گا۔“

”میں عورتوں کی ملازمت کے حق میں نہیں ہوں۔ اس طرح اس پر دوہری ذمہ داری آجاتی ہے۔ جاب پر بھی جائے اور گھر کے کام بھی کرے۔“

”یہ میرا مسئلہ ہے۔ اپنی عزت کی خاطر میں بڑی سے بڑی قربانی دے سکتی ہوں۔“

”ٹھیک ہے۔ یہ تجربہ کرکے بھی دیکھ لو لیکن میں نہیں سمجھتا کہ یہ کامیاب ہوگا۔“

دوسرے دن سے ہی میں نے ملازمت کی تلاش شروع کردی۔ میں نے کیمسٹری میں ماسٹرز کیا ہوا تھا اور چاہتی تھی کہ کسی اسکول یا کالج میں جاب مل جائے کیونکہ وہاں کام کے اوقات کم ہوتے ہیں۔ تھوڑی سی کوشش کے بعد مجھے ایک پرائیویٹ کالج میں جاب مل گئی۔ گو کہ تنخواہ اتنی زیادہ نہیں تھی لیکن اس میں سے مکان کا کرایہ اور دیگر اخراجات بآسانی پورے ہو سکتے تھے۔

اب میں نے مکان کی تلاش شروع کردی اور مجھے امی کے گھر کے قریب ہی ایک دو کمروں کا فلیٹ مل گیا کرایہ بھی کچھ زیادہ نہ تھا لیکن ارسلان فلیٹ کے حق میں نہیں تھے۔ انہوں نے ایک بار پھر مزاحمت کی اور بولے۔ ”یہ کیا حماقت ہے کہ ہم اتنا بڑا مکان چھوڑ کر اس ڈربے نما فلیٹ میں رہیں۔ میرا تو یہاں دم گھٹنے لگے گا۔“

”فی الحال اسی میں گزارہ کرلیتے ہیں۔ بعد میں کوئی بڑا مکان دیکھ لیں گے۔“

”ضرورت کیا ہے۔ اس طرح خانہ بدوشوں کی طرح اِدھر اُدھر بھٹکنے کی۔ اب بھی کچھ نہیں بگڑا ہے۔ میری مانو تو واپس گھر چلو۔ وہ تمہیں کھا نہیں جائیں گی، میں تمہارے لیے ایک فل ٹائم ملازمہ کا بندوبست کردوں گا اور امی کو بھی سمجھا دوں گا کہ وہ خوامخواہ تمہارے پیچھے نہ پڑیں۔“

”آپ مجھے لالی پاپ دے کر بہلانے کی کوشش نہ کریں۔ میں کسی قیمت پر بھی واپس نہیں جاؤں گی اور اگر آپ فلیٹ میں نہیں رہنا چاہتے تو ٹھیک ہے۔ آپ اپنے محل میں رہیں۔ میں امی کے گھر میں ٹھیک ہوں۔“

ایک بار پھر انہیں ہار ماننا پڑی اور ہم اس ڈربے نما فلیٹ میں شفٹ ہو گئے۔ اس کے کمرے اتنے چھوٹے تھے کہ ان میں میرے بیڈروم کا سامان بھی نہیں آسکتا تھا۔ لہٰذا ہمیں اپنے سونے کے لیے چھوٹے سائز کا بیڈ خریدنا پڑا۔ اس موقع پر امی نے میری مدد کی اور جہیز میں جو کمی رہ گئی تھی وہ پوری کردی۔ میں نے ایک کمرے میں صوفے رکھ کر اسے ڈرائنگ روم بنایا اور نام نہاد لاؤنج میں ایک چھوٹی سی چار کرسیوں والی ڈائننگ ٹیبل رکھ دی۔ کچن کے لیے بھی سارا سامان خریدنا پڑا۔ بہرحال جیسے تیسے میں نے اس فلیٹ کو رہنے کے قابل بنالیا۔

ارسلان کچھ دن تو بجھے بجھے رہے پھر آہستہ آہستہ نارمل ہو گئے لیکن انہوں نے فلیٹ میں شفٹ ہونے سے پہلے ہی کہہ دیا تھا کہ وہ روزانہ دفتر سے واپسی پر اپنی ماں اور بہن کی خبر گیری کرنے جائیں گے اس لیے میں ان کے دیر سے آنے پر اعتراض نہ کروں میں جانتی تھی کہ وہ کہیں بھی جائیں انہیں واپس تو میرے پاس ہی آنا ہے اس لیے میں نے کچھ نہیں کہا۔

ہمیں فلیٹ میں آئے ہوئے ایک مہینا ہی ہوا تھا کہ ڈاکٹر نے مجھے ماں بننے کی خوش خبری سنائی۔ ارسلان بھی یہ خبر سن کر بہت خوش ہوئے لیکن ساتھ ہی انہیں یہ فکر بھی لاحق ہوگئی کہ بچے کی پیدائش کے بعد اس کی دیکھ بھال کون کرے گا اور اگر میں نے ملازمت چھوڑ دی تو فلیٹ کا کرایہ اور دیگر اخراجات کیسے پورے ہوں گے۔ میں ان کا مطلب سمجھ گئی. وہ اس بہانے مجھے اپنے گھر لے جانا چاہ رہے تھے لیکن مجھے کوئی فکر نہیں تھی۔ ہزاروں عورتیں ملازمت کے ساتھ ساتھ گھر اور بچے بھی سنبھالتی ہیں۔ میں بھی کوئی نہ کوئی بندوبست کرلوں گی۔

نو مہینے خیریت سے گزر گئے اور اللہ نے مجھے ایک چاند سا بیٹا عطا فرمایا۔ میری ساس نادیہ اور اسد بھی بچے کو دیکھنے اسپتال آئے لیکن کسی نے مجھ سے بات نہیں کی۔ ساس نے بچے کو گود میں لے کر پیار کیا۔ اس کی مٹھی میں ہزار کا نوٹ دبایا اور چلی گئیں۔ میں نے ارسلان سے کہا۔ ”دیکھ لیا آج بھی وہ میری بے عزتی کرنے سے باز نہیں آئیں۔“

”ہاں وہ تم سے بہت ناراض ہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں بولے۔ ”اگر تم اسی وقت واپس چلی جاتیں تو نوبت یہاں تک نہ آتی۔“

میں سمجھ گئی کہ اپنے گھر والوں سے الگ ہو کر وہ خوش نہیں ہیں۔ ان کا دل اب بھی وہیں اٹکا ہوا ہے۔ وہ صرف بحالت مجبوری میرا ساتھ دے رہے تھے۔ اسپتال سے ڈسچارج ہوئی تو امی مجھے اپنے ساتھ لے گئیں۔ میں ایک ہفتہ وہاں رہی پھر اپنے گھر واپس آگئی۔ میں نے تین مہینے کی چھٹی لی ہوئی تھی اس لیے سکون سے گھر اور بچے کی دیکھ بھال کرتی رہی۔ ارسلان کو تو جیسے ایک کھلونا ہاتھ آگیا تھا۔ اب وہ دفتر سے سیدھے گھر آتے اور بچے سے کھیلتے رہتے۔

تین مہینے پلک جھپکتے گزر گئے۔ اب مجھے جاب پر جانا تھا۔ سمجھ میں نہیں آیا کہ بچے کو کس کے پاس چھوڑوں۔ آیا رکھنے کی گنجائش نہیں تھی اور نہ ہی میں اکیلے گھر میں بچے کو چھوڑ سکتی تھی۔ مجبوراً مجھے امی کی مدد حاصل کرنا پڑی۔ میری خواہش تھی کہ وہ ہمارے ساتھ آکر رہیں لیکن انہوں نے معذرت کرلی۔ وہ ابو کو تنہا نہیں چھوڑ سکتی تھیں گو کہ ان کی دونوں بہوؤں نے گھر سنبھالا ہوا تھا لیکن ابو کے سارے کام امی ہی کرتی تھیں اور وہ بھی ان کے اتنے عادی ہو چکے تھے کہ ہر کام کے لیے انہی کو آواز دیتے۔ البتہ امی اس پر تیار ہو گئیں کہ وہ میری غیر موجودگی میں بچے کو دیکھ لیا کریں گی۔

اب میری نئی پریڈ شروع ہو گئی۔ صبح چھ بجے اٹھ کر ارسلان کے لیے ناشتا بناتی خود تیار ہوتی۔ بچے کو پیک کر کے امی کے پاس چھوڑتی اور کالج چلی جاتی پھر دوپہر کو واپسی میں فرحان کو گھر لے کر آتی اور گھر کے کاموں میں مصروف ہو جاتی۔ ارسلان نے ٹھیک ہی کہا تھا کہ ملازمت کے ساتھ گھر اور بچے کو سنبھالنا بہت مشکل ہوتا ہے۔ اتنی گنجائش نہیں تھی کہ کوئی کام والی رکھ لیتی۔ مجھے سارے کام خود ہی کرنا پڑ رہے تھے اور میں گھن چکر بن کر رہ گئی تھی۔ رات کو بھی آرام نصیب نہیں تھا۔ فرحان بار بار اٹھ جاتا۔ اس کے رونے سے ارسلان کی نیند خراب ہوتی تھی۔ مجبوراً مجھے اس کو گود میں لے کر ٹہلنا پڑتا۔

اوپر سے فلیٹ کے مسائل اپنی جگہ تنگ کررہے تھے۔ بار بار بجلی چلی جاتی تو گرمی اور حبس کے مارے برا حال ہو جاتا۔ مجبوراً یو پی ایس لگوانا پڑا۔ اس میں بھی اچھے خاصے پیسے خرچ ہو گئے لیکن اس سے بڑا مسئلہ پانی کا تھا۔ کئی کئی روز پانی نہیں آتا تھا۔ لوگوں نے اپنے فلیٹوں میں ٹنکیاں لگوا رکھی تھیں۔ جب تین چار دن بعد پانی آتا تو وہ انہیں بھر لیتے۔ ہمیں بھی یہ انتظام کرنا پڑا۔ اس کے باوجود پورا نہیں پڑتا تھا۔ مجبوراً پانی خریدنا پڑتا۔ میں ہر اتوار کو امی کے گھر جا کر کپڑے دھوتی۔ ارسلان کے کپڑے لانڈری جاتے۔ خرچا بڑھتا جا رہا تھا جس کی وجہ سے میں اور ارسلان دونوں ہی پریشان تھے۔

کئی بار سوچا کہ اپنی انا اور ضد کو بالائے طاق رکھتے ہوئے اپنی سسرال واپس چلی جاؤں۔ الگ گھر میں رہنے کا مزہ چکھ لیا تھا۔ زندگی عذاب بن کر رہ گئی تھی۔ میں صبح سے

حکم

قدرت اللہ شہاب کی بیگم ڈاکٹر عفت لندن کے ایک ہوٹل میں بیٹھی تھیں۔ اسی ٹیبل پر ایک فوجی افسر بھی وردی پہنے بیٹھا تھا۔ فوجی افسر نے ڈاکٹر عفت سے پوچھا۔ ”آپ مسلمان ہیں؟“

”الحمدللہ!“ ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا۔ ”کیا میں آپ سے ایک بات پوچھ سکتا ہوں؟“

”پوچھیے۔“ ڈاکٹر عفت نے کہا۔

فوجی بولا۔ ”آپ لوگ سور کا گوشت کیوں نہیں کھاتے؟“

عفت نے کہا۔ ”میرے اللہ کا حکم ہے کہ مت کھاؤ اس لیے نہیں کھاتی۔“

فوجی بولا۔ ”اس حکم کے پیچھے کیا دلیل ہے؟“

عفت نے کہا۔ ”آپ فوجی ہو کر حکم کے مفہوم کو نہیں جانتے، حکم کی عظمت کو نہیں جانتے حکم دلیل اور مصلحت سے بے نیاز ہوتا ہے۔“

اقتباس: ”تلاش“ از ممتاز مفتی

مرسلہ: امیر حمزہ اشرف۔ ملتان

شام تک پاگلوں کی طرح کام میں جتی رہتی۔ ارسلان بھی چڑچڑے ہوگئے تھے۔ گھومنا پھرنا خواب وخیال بن کررہ گیا تھا۔ جب سے اس فلیٹ میں آئی باہر جانا نصیب نہیں ہوا۔ اب تو میرے پاس اتنا وقت بھی نہیں تھا کہ بیوٹی پارلر جاکر فیشل ہی کروالیتی۔ اس سے اچھی تو میں ارسلان کے گھر میں تھی۔ صرف ساس کی باتیں ہی سننے کو ملتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہر طرح کا آرام تھا۔

نادیہ کا رشتہ طے ہوا تو ارسلان شادی کی تیاریوں میں لگ گئے۔ وہ اکثر دیر سے گھر آتے اور کھانا کھائے بغیر ہی سوجاتے۔ پہلے وہ گھر کا سودا سلف لا دیا کرتے تھے اب یہ ذمے داری بھی مجھ پر آگئی۔ میں فرحان کو گود میں اٹھائے سبزی گوشت اور پرچون کی دکانوں کے چکر لگاتی۔ خدا خدا کرکے نادیہ کی شادی ہوئی تو میں نے سکھ کا سانس لیا۔

نادیہ کی شادی میں، میں نے مہمانوں کی طرح شرکت کی۔ ارسلان نے اس موقع پر مجھے بالکل نظر انداز کردیا۔ انہوں نے یہ تک نہیں پوچھا کہ میرے پاس شادی میں پہننے کے لیے کپڑے ہیں یا نہیں کیونکہ میں نے نادیہ کی شادی میں کوئی کام نہیں کیا اس لیے وہ مجھ سے ناراض تھے۔ حالانکہ شکوہ تو مجھے کرنا چاہیے تھا کہ ساس نے اس موقع پر مجھے پہلے سے کیوں نہیں بلایا اگر وہ اشارتاً بھی کہتیں تو شاید میں چلی جاتی اور شادی کی تیاری میں پوری طرح حصہ لیتی۔

میرے بس میں ہوتا تو ارسلان کی ناراضی ایک پل میں دور کردیتی۔ میں خود اس زندگی سے تنگ آگئی تھی۔ تھکن، کام کی زیادتی اور مسلسل بھاگ دوڑ سے میرے اعصاب کشیدہ ہوگئے تھے اور میں بہت زیادہ چڑچڑی ہوگئی تھی۔ اوپر سے ہر وقت کے مسئلے اور تکلیفیں، کبھی بجلی نہیں ہے تو کبھی پانی نہیں آرہا۔ بغیر اے سی کے سونا پڑ رہا تھا۔ میری تنخواہ تو کرایہ اور بلوں میں چلی جاتی۔ ارسلان گھر کے خرچ کے لیے مجھے ایک لگی بندھی رقم دیتے تھے۔ اس میں اتنی بچت بھی نہ ہوتی کہ میں اپنے لیے ایک سادہ سا سوٹ ہی خرید لیتی۔

میں نے سنجیدگی سے گھر واپس جانے کے بارے میں سوچنا شروع کردیا لیکن میری انا اور خودداری آڑے آرہی تھی۔ میں خود ہی گھر چھوڑ کر آئی تھی۔ اب کس منہ سے واپس جاتی۔ میں دل ہی دل میں دعائیں مانگ رہی تھی کہ کوئی ایسا سبب پیدا ہو جائے کہ میں باعزت طریقے سے اپنے گھر واپس چلی جاؤں۔

میری دعائیں رنگ لائیں اور اللہ تعالیٰ نے سبب بنا دیا۔ ہوا یوں کہ نادیہ شادی کے ایک ماہ بعد ہی لڑ جھگڑ کر میکے واپس چلی آئی۔ اس کے ساتھ بھی وہی سلوک ہوا جو مجھ سے روا رکھا گیا تھا۔ پہلے اسے جہیز کے طعنے ملے پھر پھوہڑ اور بدسلیقہ جیسے خطابات بھی اس کے حصے میں آئے۔ نادیہ نے اپنے گھر میں بھی کام کو ہاتھ نہیں لگایا تھا اس لیے سسرال میں اسے مشکل پیش آرہی تھی۔ اس نے شوہر سے شکایت کی تو اس نے بھی الٹا اسے ہی جھڑک دیا اور کہا کہ سب عورتیں کام کرتی ہیں۔ اگر تم کروگی تو کوئی انوکھی بات نہیں ہوگی۔ اس پر بات بڑھ گئی اور وہ روٹھ کر میکے چلی آئی۔

پرانی فلم نئے پرنٹ کے ساتھ دیکھی تو ساس جی کے ہوش ٹھکانے آگئے اور انہیں اپنی زیادتیوں کا احساس ہونے لگا جو انہوں نے میرے ساتھ کی تھیں۔ دوسری طرف انہیں پوتے کی یاد ستانے لگی۔ نادیہ کو تو اس کا شوہر منا کر لے گیا لیکن اس واقعے کے بعد میری ساس کی ساری اکڑ ختم ہوگئی۔ نادیہ کے جانے کے بعد وہ بالکل اکیلی رہ گئی تھیں۔ ان سے کوئی بات کرنے والا بھی نہ تھا۔ اسد صبح کا گیا شام کو گھر آتا اور کھانا کھا کر سوجاتا اس کا ہونا نہ ہونا برابر تھا اس لیے ساس صاحبہ کو بیٹے، بہو اور پوتے کی یاد شدت سے ستانے لگی۔

انہوں نے ارسلان سے کہا کہ وہ بیوی اور بیٹے کو لے کر واپس آجائے کیونکہ اب ان سے تنہائی برداشت نہیں ہوتی۔ ارسلان کو امید نہیں تھی کہ میں مان جاؤں گی لیکن وہ نہیں جانتے تھے کہ میں اسی وقت کا انتظار کررہی تھی کہ کسی طرح میری واپسی کا راستہ ہموار ہو جائے۔ میں نے اپنے دل کو سمجھا لیا تھا کہ دودھ دینے والی گائے کی دولاتیں بھی سہنا پڑتی ہیں۔ میں نے ارسلان کو مایوس نہیں کیا اور واپس چلی آئی کیونکہ اس میں میری اپنی غرض پنہاں تھی۔ میں نے ملازمت چھوڑ دی ہے اور پورا وقت اپنے بیٹے اور گھر کو دے رہی ہوں۔ ساس کا رویہ بھی حیرت انگیز طور پر بدل گیا ہے اور اب وہ میرے کسی کام میں دخل نہیں دیتیں۔ میری تمام شادی شدہ لڑکیوں سے گزارش ہے کہ وہ الگ گھر لینے کا فیصلہ کرتے وقت اس کے نتائج وعواقب پر بھی غور کرلیا کریں۔ میری کہانی پڑھ کر انہیں اندازہ ہو جائے گا کہ جوائنٹ فیملی سسٹم کے فائدے زیادہ اور نقصانات برائے نام ہیں۔



سزا

محترم مدیراعلیٰ

السلام علیکم

یہ جو سچ بیانی ارسال کررہی ہوں یہ سو فیصد سچی ہے اور اس کی ایک کردار میں خود ہوں، دوسرا کردار نیلوفر کا ہے اور نیلوفر جیسے کردار معاشرے کو دیمک کی طرح چاٹ جاتے ہیں۔ صرف آنکھیں کھلی رکھنے کے لیے اسے پڑھیں، مجھے یقین ہے میری تحریر پسند آئے گی۔

مائرہ جنید
(کراچی)



وہ مجھے بہت دنوں کے بعد اتفاقاً نظر آگئی۔

میں شاپنگ کے لیے اپنے پسندیدہ مال کی طرف جارہی تھی کہ میں نے اسے دیکھ لیا۔ میں اس سے کترا کر گزر جانا چاہتی تھی لیکن خود اس نے بھی مجھے دیکھ لیا تھا۔ وہ تقریباً دوڑتی ہوئی میرے پاس آگئی۔

”ارے جانِ من تم۔“ اس نے اس انداز سے کہا جو اس کے مزاج کا خاصا تھا۔ ”میں تو تمہیں ڈھونڈ ڈھونڈ کر مر گئی تھی۔“

"میں نے تو سنا تھا کہ تم کہیں باہر چلی گئی ہو۔" مجبوراً مجھے بھی گرم جوش انداز سے کہنا پڑا۔

"ہاں ہاں میں یورپ میں تھی۔" اس نے میرا ہاتھ تھام لیا۔ "چلو چل کر کہیں بیٹھتے ہیں۔ تم سے بہت سی باتیں کرنی ہیں۔"

اگرچہ مجھے احساس تھا کہ جنید میرا انتظار کررہے ہوں گے (جنید میرے شوہر ہیں) لیکن یہ کم بخت اتنے دنوں کے بعد ملی تھی اور اتنی گرم جوشی دکھارہی تھی اس لیے میں اس کے ساتھ چل پڑی۔

روڈ کراس کر کے ایک ریستوران تھا۔ ہم اس میں آکر بیٹھ گئے۔ میں بھی یہ جاننے کے لیے بے تاب ہورہی تھی کہ اتنے برسوں میں اس کے ساتھ کیا گزری ہوگی۔ وہ یورپ کیوں چلی گئی تھی۔ اس کے گھر والے کہاں تھے وغیرہ۔

نیلوفر نے ویٹر کو بلا کر اسے کئی چیزوں کے آرڈر دے دیئے تھے۔ اس دوران میں اس کی طرف دیکھتی رہی تھی۔ اس کے چہرے کی شادابی اسی طرح تھی، اس کی آنکھوں میں وہی چمک تھی، جو دیکھنے والوں کو مسحور کردیا کرتے۔

وہ ایک خوب صورت لڑکی تھی (اب تو عورت بن چکی تھی لیکن لڑکی کی طرح ہی تازہ اور شگفتہ تھی)۔

"ہاں سوئٹ ہارٹ اب سنا۔" وہ ویٹر کو فارغ کرنے کے بعد میری طرف متوجہ ہوئی۔ "کیسی گزر رہی ہے، کہاں ہو، شادی تو ہوگئی ہوگی۔"

"ہاں شادی ہوگئی ہے۔" میں نے بتایا۔

"گڈ! کیا نام ہے میاں جی کا، کیا کرتے ہیں؟" اس نے پوچھا۔

"جنید نام ہے ان کا۔" میں نے بتایا۔ "اپنا بزنس ہے۔"

"کوئی بچہ!"

"نہیں ابھی نہیں، ہماری پلاننگ ہے کہ کم از کم تین برسوں تک کوئی ایشو نہیں ہوگا۔ تین برس کے بعد دیکھا جائے گا اس دوران ہم زندگی کو دل بھر کر انجوائے کرلینا چاہتے ہیں۔"

"چلو ایک تو عقل مندی کی بات سننے میں ملی۔" وہ ہنس پڑی۔

"اب تم اپنا بتاؤ۔" میں نے پوچھا۔

"میں بھی ایک عدد شوہر رکھنے لگی ہوں۔" اس نے ہنستے ہوئے بتایا۔ "یار! بندے کو ایک ڈھال تو چاہیے ہوتی ہے نا۔ اب کون دیکھتا ہے کہ اس ڈھال کے پیچھے کیا چھپا ہوا ہے۔"

ویٹر چائے لے کر آگیا تھا۔ وہ چائے بنانے میں مصروف ہوگئی۔ مجھے پرانے دن یاد آرہے تھے۔

نیلوفر کالج ہی کے زمانے سے ایک نمبر کی فلرٹ واقع ہوئی تھی۔ نہ جانے اس کے مزاج اور کردار کا یہ کون سا پہلو تھا کہ وہ دوسری لڑکیوں سے ان کے دوست چھین لیا کرتی۔

اس کے اس عمل کو چھین لینا ہی کہہ سکتے ہیں۔ باقاعدہ چیلنج کر کے یقین دلاتی اس طرح اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کی بددعائیں لی ہوں گی۔ کتنوں کے دل دکھائے ہوں گے۔ انتہا یہ تھی کہ وہ لڑکیوں سے ان کے منگیتروں تک کو اُچک لیتی تھی۔

اور جب اس سے کہا جاتا کہ اسے ایسا نہیں کرنا چاہیے تو ہنس کر کہا کرتی۔ "یار! ان لڑکیوں کو تو میرا احسان ماننا چاہیے۔"

"وہ کیوں۔"

"میں یہ ثابت کردیتی ہوں کہ انہوں نے جس کو اپنا دوست بنایا ہے جس سے محبت کی ہے، یا جس سے منگنی کی ہے وہ کس ٹیچر کا ہے۔ کتنا بے وفا ہے اور آگے جا کر وہ کیا گل کھلائے گا۔"

یہ تھا اس کا فلسفہ۔ پورے کالج کی یہ بدنام ترین لڑکی تھی۔ نہ جانے کیا جادو تھا اس میں جو لڑکا بھی اس سے ملتا اس کا گرویدہ ہو کر رہ جاتا۔

پھر یہ ہوا کہ اسے کالج سے نکال دیا گیا۔ اس کے خلاف شکایتیں بڑھتی جارہی تھیں۔ نہ جانے کہاں چلی گئی تھی اور اب کئی برسوں کے بعد میں اسے دیکھ رہی تھی۔

"کیا سوچ رہی ہو میری جان!" اس کی کھنکتی ہوئی آواز نے چونکا دیا۔

"کچھ نہیں تمہارے گزرے دنوں کو یاد کررہی تھی۔" میں نے بتایا۔

"یاد کرتی ہوگی کہ میں نے کتنی ایڈونچرسی لائف گزاری ہے۔" اس نے ہنستے ہوئے کہا۔

"یہ بتاؤ شوہر کے ساتھ تمہاری کیسی گزر رہی ہے۔"

"تم اندازہ لگاؤ کیسی گزرنی چاہیے۔"

"کچھ نہیں کہہ سکتی۔ خدا جانے تمہارا مزاج اب کیسا ہے۔"

"ارے، وہ پرانی باتیں تھیں۔" وہ ہنس پڑی۔ "اور جہاں تک شوہر کا تعلق ہے تو وہ بے چارہ میرے بغیر سانس بھی نہیں لے گا۔"

"ہاں، یہ جادو تو ہے تمہارے پاس۔"

"اچھا یہ بتاؤ کہاں رہ رہی ہو۔" اس نے پوچھا۔

میں نے سرسری طور پر اسے اپنے مکان کا پتا بتا دیا۔

"ٹھیک ہے میں کسی دن آؤں گی تمہارے میاں سے ملنے۔" اس نے کہا۔ "دیکھوں تو تمہارے میاں جی کیسے ہیں۔"

اور اس وقت مجھے احساس ہوا کہ میں نے اسے اپنا پتا بتا کر شاید غلطی کردی ہے لیکن پھر یہ خیال آگیا کہ جنید ایک پختہ ذہن کے مالک ہیں۔ باکردار انسان ہیں مجھ سے بے پناہ محبت کرتے ہیں، یہ حسین ساحرہ ان پر اپنے چکر نہیں چلا سکتی۔

کچھ دیر اور گپ شپ کرنے کے بعد ہم ایک دوسرے سے رخصت ہوگئے۔ گھر آکر جب میں نے جنید کو اس کے بارے میں بتایا تو وہ بھی حیران رہ گئے تھے۔

"کمال ہے، لڑکیاں بھی اب ایسی ہونے لگیں۔"

"ہم سب کو اس پر حیرت ہوا کرتی تھی۔" میں نے کہا۔ "میں اس کے گھر والوں کو بھی اچھی طرح جانتی تھی وہ سب بہت ہی شریف لوگ تھے۔ پڑھے لکھے اور مہذب، بے چارے اپنی بیٹی کے کارنامے سن سن کر پریشان ہوجاتے ہوں گے۔"

"ویسے تمہیں گھر نہیں بلانا چاہیے تھا۔" جنید نے کہا۔

"بس اتفاقاً اس کو پتا بتا دیا تھا، وہ کہاں آنے والی ہے اور اگر آ بھی گئی تو آپ پر اتنا بھروسا تو ہے نا۔"

جنید نے محبت سے میرا ہاتھ تھام لیا تھا۔

پھر کئی دن گزر گئے۔ میرا خیال تھا کہ نیلوفر نہیں آئے گی میں نے پتا زبانی بتایا تھا اسے یاد بھی نہیں رہا ہوگا۔

لیکن ایک شام وہ آ ہی ٹپکی اپنے اسی انداز میں، لاابالی سی، قیامت بنی ہوئی۔ میں اسے دیکھ کر حیران رہ گئی تھی۔ "یار میں نے تو سمجھا تھا کہ تم پتا بھول گئی ہو۔"

"سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔" اس نے کہا۔ "اس معاملے میں میری یادداشت بہت تیز ہے۔ ہاں خود سے کسی کو بھولنا چاہوں تو اور بات ہے ورنہ کسی کو آسانی سے نہیں بھولتی۔"

میں اسے لاؤنج میں لے آئی۔ اس وقت جنید گھر پر نہیں تھے اور میں یہ دعا کررہی تھی کہ جب تک یہ نیلوفر یہاں موجود ہے وہ نہ آئیں۔

لیکن کچھ دیر بعد جنید بھی آگئے۔ میں نے جب نیلوفر کا ان سے تعارف کروایا تو ایک لمحے کے لیے ان کے چہرے پر ناگواری کے اثرات پیدا ہوگئے۔ پھر وہ ایکسکیوزمی کہہ کر کمرے کی طرف چلے گئے۔ اس وقت میں نے اتنا اطمینان محسوس کیا تھا کہ بتا نہیں سکتی۔

"یار، تمہارا شوہر تو بہت روکھے مزاج کا انسان ہے۔" نیلوفر نے کہا۔

"ہاں وہ کچھ ایسے ہی ہیں۔" میں جلدی سے بولی۔ "ویسے تو ہر طرح سے ٹھیک ہیں۔ میرا بہت خیال رکھتے ہیں، بس خرابی یہ ہے کہ کسی کا آنا جانا پسند نہیں کرتے۔ نہ جانے کیسے ہیں۔"

"کمال ہے، آیندہ سے کم از کم میں تو نہیں آؤں گی۔"

"نہیں یار! اب ایسا بھی نہیں ہے کہ کاٹ کھانے کو دوڑتے ہوں۔" میں نے کہا۔ "تم ضرور آیا کرنا۔"

"نہیں بھائی بس تم اپنا فون نمبر دے دو۔ تم سے فون پر باتیں کرلیا کروں گی۔"

میں نے خوشی خوشی اپنا فون نمبر اسے دے دیا۔ خوشی اس بات کی تھی کہ بہت سستے میں جان چھوٹ رہی تھی۔

نیلوفر کچھ دیر بعد چلی گئی۔

اس کے جانے کے بعد میں کمرے میں داخل ہوئی تو جنید نے پوچھا۔ "وہ چلی گئی؟"

"ہاں وہ چلی گئی لیکن آپ تو کچھ دیر بیٹھ جاتے۔" میں نے کہا۔

"نہیں یار، ایک تو تم نے پہلے ہی کچھ ہوش ربا قسم کا تعارف کروادیا تھا۔ پھر جب میں نے اسے دیکھا پہلی ہی نظر میں وہ مجھے اچھی نہیں لگی۔"

"یہ کیا بات ہوئی، اتنی حسین تو ہے۔"

"اس کا حسن چڑیلوں والا ہے۔" جنید نے بتایا۔ "تم اس کے چہرے کو غور سے دیکھنا۔ بظاہر بہت اچھی ہوگی لیکن اس کے وجود کی چھپی ہوئی خباثت اس کے چہرے پر نظر آجاتی ہے۔"

"اوہو بہت تجربہ ہے آپ کو۔"

"ہاں صرف مجھے نہیں ہر مرد کو اس کا تجربہ ہوتا ہے۔ وہ عورت کو دیکھتے ہی اس کی معصومیت یا اس کے برے

کیریکٹر کا اندازہ لگالیتا ہے۔"
کئی دنوں کے بعد نیلوفر کا فون آیا۔ وہ مجھے اور جنید کو اپنے گھر ڈنر پر بلا رہی تھی۔
"یار، کیا ضرورت ہے اس کی۔" میں نے کہا۔ "ہم ویسے ہی مل لیں گے۔"
"ضرورت تو ہے نا، اس لیے تو بلا رہی ہوں۔ میری جان تم نے تو اپنے میاں سے ملوا دیا اب ذرا میرے میاں سے بھی تو مل لو۔"
میں نے جب جنید سے کہا تو وہ بھی کچھ الجھ گئے۔
"بس یہی سب مجھے پسند نہیں ہے، وہ اس قابل نہیں ہے کہ ہم اس سے ربط بڑھائیں۔"
"وہ تو ٹھیک ہے لیکن ہم کون سا روز روز اس کے پاس جا رہے ہیں۔ اس نے پہلی بار اتنے چاؤ سے بلایا ہے، دعوت دی ہے، ہمیں جانا چاہیے۔"
"چلو ٹھیک ہے۔" جنید نے گہری سانس لی۔
ہم کیک لے کر دعوت والی رات اس کے گھر پہنچ گئے۔ اس نے مجھے اپنے گھر کا ایڈریس سمجھا دیا تھا۔ ایک چھوٹا سا لیکن خوب صورت گھر تھا۔
نیلوفر کا شوہر منور ایک کھچڑ آدمی ثابت ہوا، خوش اخلاق اور ہینڈسم۔ میں بھی اس وقت یہی سوچ رہی تھی کہ اس لڑکی کو اتفاق سے شوہر بھی کتنا اچھا مل گیا ہے۔
نیلوفر اور اس کے شوہر نے کھانے میں خاصا اہتمام کر رکھا تھا۔ ہم بہت دیر تک گھل مل کر باتیں کرتے رہے۔ اس دن مجھے کوئی ایسی غیر معمولی بات محسوس نہیں ہوئی تھی جو میرے لیے کسی خطرے کا سبب بن سکتی لیکن ایک طوفان آہستہ آہستہ بڑھتا آ رہا تھا۔
وہ دو تین بار ہمارے یہاں آئی، اتفاق سے وہ اس وقت آیا کرتی جب جنید گھر پر ہوتے۔ اب جنید بھی اس سے باتیں کرنے لگے تھے ورنہ پہلے پہل تو ان کا رویہ بہت خشک سا تھا۔
ایک شام وہ میرے پاس آئی تو جنید گھر پر نہیں تھے۔ میں نے اس کے لیے چائے بنا دی تھی۔ چائے پینے کے دوران اس نے پوچھا۔ "مائرہ! ایک بات بتاؤ کیا تمہیں جنید سے بہت پیار ہے۔"
"یہ کیوں پوچھ رہی ہو۔"
"کیونکہ میں جو آگے بات کرنے والی ہوں، اس کا تعلق اسی سوال کے جواب سے ہے۔" اس نے کہا۔

"تو پھر یہ سن لو کہ ہم دونوں ہی ایک دوسرے سے بے پناہ محبت کرتے ہیں۔" میں نے بتایا۔ "اگرچہ شادی سے پہلے ہم ایک دوسرے کو جانتے بھی نہیں تھے لیکن ہماری محبت شادی کے بعد شروع ہوئی ہے۔"
"تو اس حساب سے تمہیں اس پر بھروسا بھی ہوگا۔"
"ظاہر ہے، محبت اور اعتماد تو ساتھ ساتھ چلتے ہیں لیکن تم کیا کہنے والی تھیں۔"
"میں تمہیں چیلنج دے رہی ہوں مائرہ۔" اس نے کہا۔ "جس طرح پہلے دیا کرتی تھی کہ میں تمہارے شوہر کو تم سے چھیننے والی ہوں۔"
ایک لمحے کے لیے میرا دل دھڑک اٹھا۔ اس کم بخت نے بات ہی ایسی کی تھی لیکن پھر مجھے جنید کی محبت اور اس کے اعتماد کا خیال آ گیا۔ ایسا تو ہو ہی نہیں سکتا تھا کہ کوئی جنید کو مجھ سے چھین لے اور وہ بھی اس صورت میں کہ جنید کو نیلوفر کے بارے میں سب معلوم تھا۔ وہ اچھی طرح جانتے تھے کہ یہ کس مزاج کی ہے۔
"کیا بات ہے۔ تم خاموش کیوں ہو گئیں۔" اس نے ہنس کر پوچھا۔ "کیا میرے چیلنج سے ڈر گئیں۔"
"ارے نہیں، چلو میں تمہارا چیلنج قبول کرتی ہوں۔ مجھے خود پر اور اپنی محبت پر اتنا بھروسا ہے کہ تم اپنی کوشش میں کبھی کامیاب نہیں ہو سکتیں۔"
ہم پھر اِدھر اُدھر کی باتیں کرنے لگے۔ اس دوران میرے ذہن سے نکل گیا کہ اس نے کچھ دیر پہلے مجھ سے کیا کہا تھا۔ پھر جب جنید گھر آئے تو ان کو دیکھ کر اچانک دل دھڑک اٹھا۔
نیلوفر کا چیلنج یاد آ گیا تھا۔ کیا ایسا ہو سکتا ہے؟ کیا وہ مجھ سے جنید کو چھین لے گی۔ اس کی شیطانی طاقتوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔
"نہیں، اب کچھ نہیں کر سکتی۔ میں نے اپنے آپ کو تسلی دی۔ جنید مجھ سے بہت پیار کرتے ہیں۔ وہ ایک ذمہ دار انسان ہیں۔ وہ مجھے ٹوٹ کر چاہتے ہیں اور سب سے بڑی بات یہ کہ وہ نیلوفر کو سخت ناپسند کرتے ہیں، نفرت کی حد تک۔ اس لیے نیلوفر کامیاب نہیں ہو سکتی۔ اس چیلنج میں اسے ناکامی کا سامنا کرنا پڑے گا۔ گرچہ مجھے جنید کی طرف سے پورا یقین تو تھا پھر بھی میں نے اس خطرے سے جنید کو خبردار کر دیا۔"
وہ یہ سب سن کر بہت دیر تک ہنستے رہے تھے۔ "کمال

کی لڑکی ہے تمہاری دوست، اس نے ہر انسان کو ایک جیسا سمجھ رکھا ہے۔"
"آپ اس کی باتوں میں تو نہیں آئیں گے؟"
"کیا پاگل ہو گئی ہو، میں تو لعنت بھیجتا ہوں اس پر۔ مجھے تو اس کے بے چارے شوہر پر افسوس ہونے لگا ہے کہ اس کی شادی کس بلا سے ہوئی ہے۔"
میں یہ سب سن کر پوری طرح مطمئن ہو گئی اب میرے لیے کوئی خطرہ نہیں تھا۔
لیکن میرا یہ اطمینان اس وقت غارت ہو گیا جب ایک دن نیلوفر کا فون آیا۔ یہ جنید سے گفتگو کے ایک ہفتے بعد کی کہانی ہے۔
"میری جان!" اس کی آواز میں چہک تھی۔ "تم شاید یہ سن کر برداشت نہ کر سکو کہ میں اپنے چیلنج کو جیتنے کے قریب آ چکی ہوں۔"
"کیا مطلب؟" میں نے چونک کر پوچھا۔
"بس یہ سمجھ لو کہ ہم دونوں میں اچھی خاصی دوستی ہو چکی ہے۔" اس نے کہا۔
"کیا بکواس کر رہی ہو۔" میں نے غصے سے کہا۔
"بکواس نہیں ہے جانِ من! ایک بار راستے میں جنید سے ملاقات ہو گئی تھی، پھر ہم ایک ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے۔ وہاں ہم نے ڈھیروں باتیں کیں اور اب ایک دوسرے کے اچھے خاصے دوست ہو چکے ہیں۔"
اس نے فون بند کر دیا۔ میں یقین اور بے یقینی کے درمیان جھول گئی تھی۔ دل کہتا تھا کہ وہ جھوٹ بول رہی ہے۔ اس نے یوں ہی مجھے پریشان کرنے کے لیے ایسی باتیں کی ہوں گی۔
لیکن یہ بھی تو ہو سکتا تھا کہ وہ سچ ہی بول رہی ہو۔ اس کی خباثتوں سے کچھ بعید نہیں تھا۔ وہ کچھ بھی کر سکتی تھی۔ اس کا گھناؤنا ماضی میرے سامنے تھا۔
اس نے نہ جانے کتنی لڑکیوں کو اس طرح برباد کر دیا تھا۔ کتنوں کی محبتیں چھین لی تھیں۔ کتنی لڑکیاں رو دھو کر خاموش ہو گئی تھیں۔ خدایا کہیں اس قسم کی کوئی کہانی میرے ساتھ نہ ہو۔
میں نے اسی شام جنید سے پوچھ لیا۔ بہت ہی سرسری انداز میں۔ "جنید یہ بتائیے کیا نیلوفر سے آپ کی ملاقات ہوئی تھی۔"
"نیلوفر سے۔" جنید کچھ سٹپٹا سے گئے تھے۔ ایسی

صدیق خان

کشمیر میں ہانجیوں کا فرق اپنی بدکرداریوں کی وجہ سے بہت بدنام ہے بلکہ یہ کہنا شاید زیادہ مناسب ہے کہ اس گروہ نے تمام کشمیر ہی کو بدنام کر دیا ہے لیکن علم و فقر و سلوک کی دولت کسی کی میراث نہیں ہے۔ جس کو اللہ تعالیٰ یہ نعمت عطا کر دے خواہ ڈوم ہو یا ہانجی اور خواہ میر ہو یا شیخ وہی صاحب علم اور صاحب سلوک ہے۔ صدیق خان بھی ہانجی تھا لیکن شاہ فرح الدین المشہور بہ شاہ قلندر کے دامن سے وابستہ ہو کر علم و عمل میں سادات و مشائخ سے بھی بڑھ گیا۔ اپنی ساری عمر اس نے علم کی تحصیل میں صرف کر دی۔ اپنے مرشد کی اجازت سے اپنی ساری عمر اس نے بھی مریدوں کا سلسلہ جاری کیا اور بہت لوگوں کو فیض پہنچایا۔ ان کا مزار قریہ راہہ پورہ میں ہے۔

کیفیت اس وقت ہوتی ہے جب کسی کی کوئی چوری پکڑی جائے۔
"بتائیں نا، کیا اس سے ملاقات ہوئی تھی۔" میں نے زور دے کر پوچھا۔
"ہاں وہ ایک بار راستے میں مل گئی تھی۔" جنید نے اقرار کر لیا۔
"اس کے بعد کیا ہوا، کیا آپ دونوں کسی ہوٹل میں جا کر بیٹھے تھے۔"
"اوہو! اب یہ کوئی اتنی خاص بات تو نہیں ہے۔ جس کے لیے اتنی پریشان ہو جاؤ۔" جنید نے کہا۔ "تم اطمینان رکھو، وہ میرا یا تمہارا کچھ نہیں بگاڑ سکے گی۔"
میں کیا خاک اطمینان رکھتی۔ یہ سب سن کر میری تو نیندیں اڑ گئی تھیں۔ کہاں تو جنید کا یہ کہنا تھا کہ انہیں نیلوفر کی صورت تک سے نفرت ہے اور کہاں یہ حال تھا کہ اس کے ساتھ ریستوران میں جا کر بیٹھ گئے تھے۔
اس گفتگو کے بعد جنید خاموش ہو گئے تھے۔ میں نے بھی پھر کچھ نہیں پوچھا۔
کچھ دنوں کے بعد میں نے خود ان دونوں کو اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا۔ جنید آئے نہیں تھے۔ مجھے مال سے ایک دو سوٹ لینے تھے۔ میں نے یہ سنا تھا کہ اس مال میں نئے جوڑوں کی بہت اچھی ورائٹی آئی ہوئی ہے۔ وہ مال گھر

سے کچھ فاصلے پر تھا۔

میں رکشا لے کر وہاں پہنچ گئی۔ میں کئی بار پہلے ہی وہاں اکیلی جا چکی تھی۔ میں نے رکشا والے کو کرایہ دے کر رخصت کیا اسی وقت وہ دونوں دکھائی دے گئے۔

وہ مال ہی سے باہر آرہے تھے۔ ہنستے بولتے ہوئے۔ دونوں کے ہاتھوں میں شاپنگ بیگز تھے۔ میں جلدی سے آڑ میں ہوگئی تھی۔ دونوں پارکنگ لاٹ کی طرف بڑھ گئے اور میں مال سے کچھ لیے بغیر گھر واپس آگئی۔

اب تو سب کچھ کنفرم ہوچکا تھا۔ نیلوفر سے اپنے تعلق کے بارے میں جنید نے مجھ سے جھوٹ بولا تھا۔ وہ اس کمینی کے جال میں پھنس چکے تھے۔

لیکن نیلوفر چاہے جیسی بھی ہو، سوال یہ تھا کہ جنید کو کیا ہوا تھا۔ ان کی وہ وفاداری وہ خوب صورت باتیں کہاں چلی گئی تھیں۔

ان کا یہ کہنا کہ میں اس شخص پر لعنت بھیجتا ہوں جو اپنی بیوی سے بے وفائی کرتا ہو۔ تو یہ بات بس یونہی کہہ دی گئی تھی۔ اس کی کوئی دوست نہیں تھی۔ ایسے شخص کو نیلوفر جیسی عورت کسی وقت بھی بہکا سکتی تھی۔

اب ایسا بھی نہیں تھا کہ میں نے خاموش ہوکر صبر کرلیا ہو۔ میں سن گن لیتی رہتی تھی۔ رشتے کے ایک کزن کو خاموشی سے جنید کے پیچھے لگا دیا تھا۔ وہ مجھے ان دونوں کی رپورٹ دیا کرتا تھا۔

آج وہ دونوں فلاں پارک میں تھے۔ دونوں فلاں ہوٹل میں تھے۔ دونوں نے کیا کیا شاپنگ کی وغیرہ وغیرہ۔ یہ سب کچھ مجھے معلوم ہوتا رہتا تھا۔

نہ جانے اس کیس کا کیا انجام ہونے والا تھا۔ جنید نے کیا سوچ رکھا تھا۔ وہ کیا چاہتے تھے۔ نہ جانے اس کہانی کا انجام کیا ہونے والا تھا۔ کیا نیلوفر جنید کو ہمیشہ کے لیے حاصل کرلے گی، کیا جنید اس کی خاطر مجھے چھوڑ دیں گے۔ کیا نیلوفر اس طرح جنید کو دھوکے دے گی جس طرح وہ دوسروں کو دیا کرتی تھی۔

میں نے نیلوفر کے موضوع پر جنید سے بات کرنی چھوڑ دی تھی۔ جو ہونے والا تھا اسے تو سامنے آنا ہی تھا۔ جنید نے بھی خاموشی اختیار کرلی تھی۔ وہ نیلوفر کی بات بھی نہیں کرتے تھے۔

لیکن ایک دن میرے صبر کا پیمانہ اس وقت چھلک اٹھا۔ جب میں نے سونے کی چوڑیوں کا ایک سیٹ دیکھا۔

وہ چوڑیاں جنید دفتر جاتے ہوئے بھول کر چلے گئے تھے۔

اب سب کچھ برداشت سے باہر ہوچکا تھا۔ کیا کرنا چاہیے تھا مجھے، کیا میں نیلوفر کے پاس پہنچ جاؤں لیکن وہ تو ایک نمبر کی بے غیرت تھی۔ وہ کہتی کہ دیکھ لو میں نے چیلنج دیا تھا اور جیت گئی۔

یا پھر میں جنید سے باتیں کروں۔ یہی بہتر تھا۔ میں نے اسی وقت جنید کو فون کردیا۔

''ہیلو!'' وہ میری آواز سن کر حیران رہ گئے تھے۔ ''خیریت تو ہے اس وقت کیسے فون کرلیا۔''

''یہ پوچھنے کے لیے فون کیا ہے کہ آپ کی یادداشت کیوں خراب ہوتی جارہی ہے۔''

''میری یادداشت! کیا کہنا چاہتی ہو؟''

''ویسے ہی کیونکہ آپ چوڑیوں کا ایک سیٹ کمرے میں بھول گئے ہیں۔'' میں نے کہا۔ دوسری طرف بالکل خاموشی چھا گئی۔ جیسے اچانک شاک سا لگا ہو۔

''کیا ہوا آپ خاموش کیوں ہوگئے۔'' میں نے طنزیہ انداز میں پوچھا۔

''ارے ہاں، وہ تو میں تمہارے لیے لایا تھا۔'' جنید نے بات بنانے کی کوشش کی۔ ''سوچا تھا تمہیں سرپرائز دوں گا، لیکن بھول کر چلا آیا۔''

''بہانہ بناتے ہوئے آپ کو اپنے لہجے پر بھی کنٹرول نہیں ہے۔'' میں نے کہا۔

اس سے پہلے کہ وہ کچھ کہتے میں نے فون بند کردیا۔

جنید اس دن وقت سے پہلے دفتر سے آگئے تھے۔ میں ان کو دیکھ کر خاموش ٹی وی دیکھتی رہی تھی۔ وہ میرے پاس آکر کھڑے ہوگئے۔ ''کیا بات ہے کیا بہت ناراض ہو؟''

''نہیں تو۔'' میں خشک لہجے میں بولی۔ ''میں تو بہت خوش ہوں۔ ایک عورت کے لیے اس سے بڑی خوشی اور کیا ہوگی کہ اس کا شوہر کسی دوسری عورت میں دلچسپی لینے لگے۔''

''مائرہ! جو کچھ تم سمجھ رہی ہو وہ بات نہیں ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''کہانی کچھ اور ہے۔''

''پلیز جنید، مجھے تنہا چھوڑ دیں۔'' میں نے کہا۔

''چلو اس وقت اور کچھ نہیں کہہ رہا۔'' جنید اتنا بول کر اپنے کمرے کی طرف چلے گئے تھے۔

اس کے بعد جنید سے میری کوئی بات نہیں ہوئی۔ ہم دونوں ہی نے خاموشی اختیار کرلی تھی۔ ایک معنی خیز اور گہری خاموشی۔

ایسی خاموشی جو کسی آنے والے طوفان کی خبر دے رہی ہوتی ہے۔

اور ایک دن وہ طوفان آ ہی گیا۔ جنید سے میری گفتگو کے دس بارہ دنوں کے بعد۔ نیلوفر ایک شام اچانک چلی آئی تھی۔

اس کو دیکھ کر کچھ عجیب سا احساس ہوا تھا۔ اس شام بھی جنید گھر پر ہی تھے۔ اس شام اس نے میک اپ بھی بہت ہلکا کر رکھا تھا، ورنہ عام طور پر بہت ہی شوخ قسم کا میک اپ کیا کرتی تھی۔

''خیریت تو ہے۔'' میں نے اوپری دل سے پوچھا۔ ورنہ دل تو ہو رہا تھا کہ اسے دھکے دے کر نکال دوں۔

''مائرہ، میں تیرے پاس دو خبریں لے کر آئی ہوں۔'' اس نے کہا۔ ''ان میں سے ایک خبر تو یہ ہے کہ منور نے مجھے طلاق دے دی ہے۔''

''کیا!'' مجھے یہ سن کر واقعی ایک جھٹکا سا لگا تھا۔ ''طلاق دے دی؟ کب؟''

''آج، اس بات کو پانچواں دن ہو گیا ہے۔'' اس نے بتایا۔

''کمال ہے۔ مجھے کچھ پتا ہی نہیں چلا۔''

''کون بتاتا تمہیں، خیر اب دوسری خبر بھی سن لو۔ میں تمہاری سوتن بن کر اس گھر میں آ رہی ہوں تمہارے جنید کی دوسری بیوی۔''

''کیا بکواس کر رہی ہو تم! تم اپنے ہوش میں تو ہو۔''

''یہ بکواس نہیں ہے، سچائی ہے۔'' اس نے کہا۔ ''اور یہ بھی سن لو کہ یہ طلاق بھی جنید ہی کی وجہ سے ہوئی ہے۔ بات یہ ہے کہ ہم دونوں کے درمیان بہت گہری دوستی ہو گئی تھی۔ منور سے یہ سب برداشت نہیں ہوا اور اس نے مجھے طلاق دے دی۔ حالانکہ اس کے ساتھ جیسے تیسے گزر ... رہی تھی لیکن چلو اب زیادہ بہتر صورتِ حال سامنے آ گئی ہے۔ میری عدت ختم ہو جائے۔ پھر ہم دونوں شادی کر لیں گے۔''

''خاموش رہ کمینی۔'' میں ایک جنون کی حالت میں چیخنے چلّانے لگی۔ ''نکل جا یہاں سے ورنہ میں تیرا خون پی جاؤں گی۔''

اس دوران جنید بھی کمرے سے نکل کر لاؤنج میں آ گئے۔ ''کیا ہو رہا ہے۔ کیوں شور کر رہی ہو۔''

''جنید تم نے مائرہ کو بتایا نہیں کہ ہم دونوں شادی کرنے والے ہیں۔'' نیلوفر نے پوچھا۔

''کیوں، میں ایسی فالتو بات کیوں بتانے لگا۔'' جنید نے بہت ہی ٹھنڈے لہجے میں کہا۔

''فالتو بات، کیا کہہ رہے ہو تم؟'' نیلوفر تڑپ کر بولی۔ ''مجھے منور نے طلاق دے دی ہے اور تم اسے فالتو بات کہہ رہے ہو۔''

''تمہارے شوہر نے تمہاری حرکتوں کی وجہ سے طلاق دی ہے۔'' جنید نے کہا۔ ''کیونکہ تم اسی قابل ہو۔''

''جنید یہ تم کیا کہہ رہے ہو۔''

''میں ٹھیک کہہ رہا ہوں۔ میں نے تو تمہارے ساتھ محبت کے ناٹک کا اسی دن فیصلہ کر لیا تھا جب تم نے چیلنج دیا تھا کہ تم مجھے اس سے چھین لوگی۔ پھر میں نے سوچا کہ تمہیں اپنا کر تمہیں اچانک چھوڑ کر ایک جھٹکا دے دوں لیکن سوری کہ یہ جھٹکا زیادہ زور کا ہو گیا اور منور نے تمہیں طلاق ہی دے دی۔ چلو کوئی بات نہیں، تم ذرا ان لڑکیوں کو بھی یاد کرو جن کو تم نے اس قسم کے جھٹکے دیئے ہوں گے۔ تم تو اس قابل ہو کہ تم کو بار بار اس ٹائپ کی سزا دی جائے۔''

''کمینے انسان۔'' نیلوفر بپھر اٹھی۔ ''تو نے میری زندگی برباد کر دی۔''

''سوچو تو سہی، یاد کرو، خود تم نے کتنوں کی زندگی برباد کی ہے۔ اب پلیز چلی جاؤ یہاں سے اور دوبارہ اس گھر میں آنے کی کوشش مت کرنا۔''

نیلوفر بلبلاتی اور روتی ہوئی چلی گئی تھی۔ اس کے جانے کے بعد جنید نے میری طرف دیکھا۔ ''بے وقوف تم کیا سمجھ رہی تھیں کہ نیلوفر جیسی کوئی عورت مجھے تم سے دور لے جا سکتی ہے۔''

اس وقت میرے آنسو رک نہیں رہے تھے۔ میں دوڑ کر جنید کے بازوؤں میں سمٹ آئی۔

''کچھ بھی ہو جنید تم نے اس کو بہت کڑی سزا دے دی۔'' میں نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے کہا۔

''بے وقوف ہو تم، تم کیا سمجھ رہی ہو کہ وہ ایسی ہی رہے گی۔ تم سن لینا کہ اس نے بہت جلد کسی اور کو اپنے چنگل میں پھانس لیا ہے۔''

جنید ٹھیک کہہ رہا تھا اور میں یہ سوچ رہی تھی کہ خدایا اس معاشرے میں ایسی عورتیں کیوں ہوتی ہیں۔

خدا جانے وہ اب کہاں ہوگی لیکن شاید جنید نے اس کے لیے ٹھیک ہی کہا تھا کہ وہ اکیلی تو نہیں ہوگی۔

جرم چھپتا نہیں

محترم مدیر

السلام علیکم

کچھ لوگ یہ سمجھتے ہیں کہ جرم اگر نظر بچا کر کیا جائے تو وہ پکڑ میں نہیں آتا۔ دراصل وہ بھول جاتے ہیں کہ جرم کبھی بھی نہیں چھپتا، اپنا نشان چھوڑ جاتا ہے۔ ان لوگوں نے بھی بڑی چالاکی سے پلان بنایا تھا لیکن ایک دن خودبخود ان کا جرم سامنے آگیا۔

اسد عباس
(شمالی تحصیل، سرگودھا)

''ناصر صاحب! آپ کو ملک اشرف صاحب بلا رہے ہیں۔'' استقبالیہ گرل نے انٹرکام پر مجھے مطلع کیا۔

میں نے چائے کا آخری گھونٹ حلق میں اتارا اور ملک صاحب کے روم کی طرف چل دیا۔ دروازہ ناک کرکے آفس میں داخل ہوا تو وہ فون پر کسی سے بات کر رہے تھے۔ مجھے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ میں ان کا اشارہ پا کر کرسی پر بیٹھ گیا۔ بات ختم کر کے میری طرف متوجہ ہوئے اور بولے۔ ''اب تمہاری وائف اور بیٹی کی طبیعت کیسی ہے؟''

”پہلے سے کافی بہتر ہے۔ بچے کو ڈاکٹروں نے انکوبیٹر میں رکھا ہوا ہے۔ اُمید ہے اگلے کچھ گھنٹوں میں انکوبیٹر سے نکال لیں گے۔“

”اللہ کرم کرے گا۔ اگر کسی قسم کی مدد کی ضرورت ہے تو بتادو۔“ میرے خاموش ہونے پر وہ گویا ہوئے

”بہت شکریہ آپ کا۔ فی الحال تو کوئی خاص ضرورت نہیں ہے۔ بہرحال کچھ مسئلہ ہوا تو آپ کو بتادوں گا۔ آپ حکم کریں کیسے یاد کیا تھا۔“ ان کے استفسار پر میں نے کہا۔

”اگر تمہاری وائف کی طبیعت بہتر ہے تو کل گاڑی کے ساتھ کچھ دیر چلے جاؤ۔ آج ایک بڑا آرڈر آگیا ہے خوشاب سے۔ اتفاق سے کوئی بھی سیلز مین موجود نہیں ہے ورنہ میں کسی اور کو بھیج دیتا۔ دو، تین گھنٹوں کی بات ہے۔ ایک نئی دکان بنی ہے خوشاب میں۔ صرف وہی آرڈر ڈیلیور کرنا ہے اور پیمنٹ لے کر واپس آجانا ہے۔“ ملک صاحب نے بلانے کا مقصد واضح کیا۔

”ٹھیک ہے اگر ایک ہی دکان کی ڈیلیوری ہے تو کوئی بات نہیں میں چلا جاتا ہوں۔ آپ آرڈر کے مطابق لوڈنگ کرا دیں۔ اگر کچھ اضافی اسٹاک رکھنا ہے تو وہ بھی رکھوا دیں۔“ میں نے ہامی بھرتے ہوئے کہا۔

”ٹھیک ہے تم جاسکتے ہو۔ صبح ڈرائیور سے رابطہ کرلینا۔ وہ تمہیں پک کرلے گا۔ آرڈر کی تفصیل اکاؤنٹنٹ سے لے لو۔“ یہ کہہ کر انہوں نے مجھے جانے کا اشارہ کیا۔

☆......☆

میرا نام ناصر سعید ہے۔ آٹھ سال پہلے میری شادی ہوئی تھی۔ شادی کے تین سال بعد اللہ تعالیٰ نے جڑواں بیٹوں سے نوازا۔

چھ سال پہلے جب میں ملک ٹریڈرز میں آیا تھا تو میرے گھر کے حالات کافی خراب تھے۔ گریجویشن کرنے کے بعد مختلف جگہوں پہ کام کیا لیکن مختلف وجوہات کی بنیاد پر کہیں بھی ٹک کر کام نہیں کرسکا۔ ایک دوست کے توسط سے ملک ٹریڈرز پر اکاؤنٹنٹ کی جاب ملی تو کچھ سکون کا سانس ملا۔ ملک ٹریڈرز کے پاس لبریکینٹس کی مختلف ملٹی نیشنل کمپنیوں کی ڈسٹری بیوشنز ہیں۔ اس کے علاوہ موٹر سائیکل کے اسپیئر پارٹس کی ایک مشہور کمپنی کی ڈسٹری بیوشن بھی ان کے پاس ہے۔ ایک سال تو میں نے یہاں اکاؤنٹنٹ کے طور پر کام کیا۔ پھر اتفاقاً مارکیٹنگ کی فیلڈ میں آگیا۔ بنیادی طور پر میری فیلڈ مارکیٹنگ کی ہی تھی۔ تاہم یہاں میں اکاؤنٹنٹ کے کام کے لیے ہی آیا تھا۔

ملک ٹریڈرز کی چھوٹی بڑی آٹھ گاڑیاں سرگودھا ڈویژن کے مختلف اضلاع میں ہفتہ وار آئل اور پارٹس کی سپلائی کے لیے جاتی تھیں۔ جمعرات کو گاڑیوں کی لوڈنگ ہوتی تھی۔ اور ہفتے کو تمام گاڑیاں سپلائی کے لیے نکل جاتی تھیں۔ بدھ کی شام مرحلہ وار ان کی واپسی ہوتی تھی۔ ایک اضافی گاڑی ہمہ وقت گودام میں کھڑی رہتی تھی جو کسی غیر متوقع آرڈر کی صورت میں استعمال ہوتی تھی۔

میانوالی اور خوشاب کی گاڑی کا سیلز مین بغیر اطلاع نوکری چھوڑ کر گیا تو ہنگامی طور پر ایک ہفتے کے لیے مجھے گاڑی کے ساتھ بھیج دیا گیا۔ بدھ کی شام واپسی پہ جب میں نے کیشیر کو کیش جمع کرائی تو کچھ دیر بعد مجھے ملک بشیر صاحب کا بلاوا آگیا۔

اس سے پہلے ان سے ایک آدھ بار ہی ملنے کا اتفاق ہوا تھا۔ میں ان کے آفس میں داخل ہوا تو ان کے سامنے میری کیش انوائس پڑی تھی۔

میرے بیٹھتے ہی انہوں نے مجھ سے کہا۔ ”یہاں آنے سے پہلے کیا کام کرتے تھے؟“

میں نے ایک مشہور ڈسٹری بیوشن کا نام لیا اور کہا۔ ”میں وہاں سیلز مین تھا۔“

انہوں نے کیش انوائس اٹھائی اور ایک بل نکال کر کہا۔ ”ان دونوں پہ تم نے کیا جادو کیا ہے؟ یہ دونوں لگ بھگ پچھلے دو سال سے رقم دبائے بیٹھے تھے۔ اسٹاک بھی کہیں اور سے خرید رہے تھے۔ ایک نے تو مکمل ادائیگی کردی ہے جبکہ دوسرے نے بھی نصف سے زیادہ بل ادا کردیا ہے۔“

”سر جادو تو کوئی نہیں کیا۔ پچھلی ڈسٹری بیوشن کی طرف سے ان کے پاس جاتا تھا تو ان کے ساتھ اچھی سلام دعا تھی۔ آج کافی عرصے بعد ان کے پاس گیا تو انہیں کچھ حیرانگی ہوئی۔ آج وہی تعلق کام آیا اور آپ کی رقم بھی مل گئی اور انہوں نے یقین دلایا ہے کہ اگلی بار اسٹاک بھی ہم سے ہی خریدیں گے۔“

”گڈ، بہت خوب۔“ میری وضاحت کے جواب میں وہ ستائشی لہجے میں بولے۔

”اب تم مستقل گاڑی کے ساتھ جاؤ گے۔ آج سے تمہاری تنخواہ پچیس ہزار ماہوار ہوگی اور ساتھ میں ملٹی نیشنل آئل پر 0.25 فیصد جبکہ لوکل آئل پر ایک فیصد کمیشن بھی ملے گا۔ مجھے اُمید ہے تم اختر (سابقہ سیلز مین) سے بھی زیادہ لگن اور

محنت سے کام کروگے اور اس کا تمہیں صلہ بھی بہتر ملے گا۔“

اور اس طرح میں مارکیٹنگ کی فیلڈ میں آگیا۔ ملک اشرف ایک اچھی طبیعت کے کاروباری شخص ثابت ہوئے۔ ہر ممکن اپنے اسٹاف کا خیال رکھتے تھے۔ چھوٹی بڑی دونوں عیدوں پر ایک تنخواہ اضافی دیتے تھے۔ اس کے علاوہ بھی دکھ سکھ میں ہر کسی کی مدد کیا کرتے تھے۔

اس سے پہلے مجھے صرف اٹھارہ ہزار تنخواہ مل رہی تھی اور کام بھی کافی خشک اور بوریت والا تھا۔ گاڑی کے ساتھ جانے کی وجہ سے میں آرام سے پچاس ہزار ماہانہ کمانے لگا۔ یوں زندگی بڑے آرام سے گزرنے لگی تھی۔ بچے اچھے اسکولوں میں پڑھ رہے تھے۔ ایک سال پہلے میری وائف پھر اُمید سے ہوئی تو روٹین کے چیک اپ کے بعد ڈاکٹر نے وائف کو مکمل بیڈ ریسٹ کا حکم دیا۔ جہاں تک ممکن ہوسکا اس نے آرام بھی کیا۔ میں نے بھی ہر ممکن اس کا خیال رکھا۔ لیکن آٹھویں مہینے کچھ پیچیدگی ہوگئی۔ ڈاکٹر کو چیک کروایا تو اس نے کہا کہ آپریشن ہوگا۔ بچے کے چانس بہت کم ہیں اگر دیر کی تو آپ کی وائف کی جان کو بھی خطرہ ہوسکتا ہے۔ میں نے ہنگامی طور پر آفس سے ایک ہفتے کی چھٹی لی اور وائف کو اسپتال میں داخل کرادیا۔ ہفتے کی شام کو آپریشن ہوا اور اللہ نے بیٹی کی رحمت سے نوازا۔ پیدائش کے فوراً بعد ڈاکٹر نے بچے کو انکوبیٹر میں منتقل کردیا۔ اتوار کی شام آپریٹر نے مجھے کال کی اور آفس آنے کے لیے کہا۔ اسپتال سے آفس پانچ منٹ کی مسافت پر تھا۔ دس منٹ بعد میں آفس میں تھا۔ عملے سے سلام دعا کے بعد میں نے استقبالیہ کاؤنٹر پر موجود لڑکی کو اپنی آمد کے بارے میں بتایا۔ اس نے پہلے میری بیگم اور بیٹی کی خیریت دریافت کی اور میرے لیے چائے بھی منگوالی۔ چائے کے ساتھ ساتھ میں اسے بیٹی کی حالت کے بارے میں بھی بتاتا جارہا تھا۔ اسی دوران اس نے ملک صاحب کو میری آمد کے بارے میں بھی بتادیا۔ کچھ دیر بعد ملک صاحب نے انٹرکام پر مجھے اندر آنے کے لیے کہا۔

☆☆☆

ملک صاحب کے آفس سے میں سیدھا اکاؤنٹنٹ کے کمرے میں آگیا اور وہاں سے آرڈر کی تفصیلات وصول کی۔ کم و بیش نو لاکھ مالیت کے آرڈر پر پانچ ہزار سے زائد کمیشن بنتی تھی۔ اگر سب معاملات روٹین کے مطابق سرانجام پاتے تو دو گھنٹے میں ہماری واپسی ہوجاتی۔ اکاؤنٹنٹ کے پاس ہی میری ڈرائیور یونس سے بھی ملاقات ہوگئی۔ یونس کو ہی صبح میرے ساتھ جانا تھا۔ صبح نو بجے کا ٹائم یونس کے ساتھ طے کرکے میں واپس اسپتال آگیا۔ رات نو بجے ڈاکٹر سے ملاقات ہوئی تو اس نے خوشخبری سنائی کہ بچی کی طبیعت کافی بہتر ہے اور امید ہے اگلے دو سے تین دن میں اسپتال سے چھٹی مل جائے گی۔ بیگم کے بارے میں استفسار کرنے پر بتایا کہ کل دوپہر کے بعد چھٹی مل جائے گی۔ ڈاکٹر کے جانے کے بعد میں نے بیگم کو اپنے کل کے پروگرام کے بارے میں بتایا۔ اسپتال میں میرے علاوہ خالہ شمیم (ساس) اور باجی حمیرا (سالی) بھی تھیں۔ اس لیے مجھے کوئی خاص پریشانی نہیں ہوئی۔ گیارہ بجے میں نے چھوٹے بھائی کو اسپتال بلالیا اور میں گھر واپس آگیا۔

☆......☆

وہ اوائل دسمبر کی ایک سرد صبح تھی۔

یونس اور میں جھال چکیاں سے نکلے تو صبح کے نو بج رہے تھے۔ سبزے پر ابھی شبنم کے قطرے موجود تھے۔ گاڑی کے شیشے بند تھے۔ ہیٹر کی وجہ سے گاڑی کا ماحول کافی خوشگوار تھا۔ میں نے موبائل کو گاڑی کے ڈیک کے ساتھ منسلک کیا اور منی بیگم اپنی مدھر آواز میں سر بکھیرنے لگی۔

تم پوچھو اور میں نہ بتاؤں ایسے تو حالات نہیں
ایک ذرا سا دل ٹوٹا ہے اور تو کوئی بات نہیں

شاہ پور تک ہم درمیانی رفتار سے سفر کرتے رہے تاہم اس کے بعد دس منٹ میں خوشاب پہنچ گئے۔ کسٹمر سے فون پر رابطہ کیا اور دکان کے بارے میں دریافت کیا۔ یونس کو میں نے گاڑی راولپنڈی روڈ کی طرف موڑنے کا کہا۔ پی ایس او کے پمپ کے پاس ہماری مطلوبہ دکان تھی۔ مطلوبہ پتے پر پہنچے تو دکان میں دو کارپینٹر لکڑی کے ریکس بنانے میں مصروف تھے اور ایک آدمی ان کو ہدایات دے رہا تھا۔ جیسے ہی ہماری گاڑی دکان کے سامنے رکی وہ آدمی باہر نکل آیا اور کہا،

”آپ یقیناً ناصر صاحب ہیں؟“ میں نے اثبات میں سر ہلایا اور ہاتھ مصافحہ کے لیے بڑھادیا۔

”میرا نام ملک فرخ ہے اور یہ دکان میں ہی بنا رہا ہوں۔ اُمید ہے جمعرات تک ریکس اور الماریوں وغیرہ کا کام ختم ہوجائے گا اور جمعہ کو ہم باقاعدہ دکان کا افتتاح کریں گے۔“

اسی دوران ہم دکان میں داخل ہوگئے۔ ملک فرخ نے ہمیں بیٹھنے کے لیے کرسیاں پیش کیں اور ساتھ ہی فون پر کسی کو چائے کے لیے بھی کہہ دیا۔

”ملک صاحب آپ اسٹاک کہاں رکھیں گے؟ یہاں تو

ابھی کام ہو رہا ہے۔" میرے سوال پر ملک فرخ نے جواب دیا۔ "اسٹاک رکھنے کے لیے پچھلی گلی میں ہم نے ایک گودام کرائے پر لیا ہے۔ یہاں صرف ریکس میں ڈسپلے ہوگا یا پھر ضرورت کے مطابق ہر کمپنی کے دو دو کارٹن پڑے ہوں گے۔"

چائے پینے کے بعد یونس نے اسٹاک اتارنے کے بارے میں دریافت کیا۔ ملک فرخ نے مجھے اپنے پیچھے آنے کا اشارہ کیا۔ یونس اور میں اس کے ساتھ پیدل چلنے لگے۔ دو سو میٹر چلنے کے بعد ہم ایک نسبتاً تنگ گلی میں داخل ہوگئے۔ چند قدم مزید چلنے کے بعد ہم ایک دس مرلہ عمارت کے سامنے تھے۔ ملک فرخ نے جیب سے چابی نکالی اور عمارت کا مرکزی گیٹ کھول دیا۔

یہ ایک رہائشی مکان تھا۔ جس کو گودام کے لیے استعمال کیا جا رہا تھا۔ دائیں بائیں دو دو کمرے تھے۔ جن کے درمیان ایک ہال نما کمرا تھا۔ ہال کے سامنے ایک برآمدہ اور اس کے سامنے کھلا صحن تھا۔ کمروں میں قطار در قطار لکڑی کے پائلٹ (لکڑی کے بنے ہوئے 4 ضرب 4 فٹ کے تختے جن پر آئل کے کارٹن رکھتے ہیں) رکھے ہوئے تھے۔

بطور گودام استعمال کے لیے یہ ایک آئیڈیل مکان تھا۔

"یہاں اسٹاک اتارنا ہے۔ آپ گاڑی منگوا لیں میں لیبر کو کال کرتا ہوں۔" یہ کہہ کر ملک فرخ فون پر مصروف ہوگیا۔ میں نے یونس کو گاڑی لانے کے لیے کہا۔ یونس کے جانے کے بعد میں ایک بار پھر مکان کے معائنے میں مصروف ہوگیا۔ ہارن کی آواز پر میں اور یونس دونوں باہر آگئے۔ یونس نے کمال مہارت سے گاڑی کو ریورس کیا اور اندر لے آیا۔ گاڑی رکتے ہی لیبر کے تین بندے مزید وہاں آگئے۔ ملک فرخ نے انہیں ان لوڈنگ کے بارے میں ہدایات دیں۔ مزدوروں نے ان لوڈنگ شروع کر دی۔ ہم صحن میں ہی کرسیاں ڈال کر دھوپ سینکنے لگے۔ اسی دوران ملک فرخ مجھے اپنے مستقبل کے پروگرام کے بارے میں بتاتا جا رہا تھا۔ میں حسب توفیق اسے مشوروں سے بھی نوازرہا تھا۔ ملک فرخ نے مجھے بھی افتتاح کی دعوت دی جو میں نے قبول کر لی۔ لگ بھگ آدھے گھنٹے میں مزدوروں نے گاڑی خالی کر ڈالی۔ سارا سامان ترتیب سے رکھ دیا گیا۔ لیبر کو مزدوری ادا کرنے کے بعد ملک فرخ نے مجھ سے کہا۔ "آیئے! دکان پر چلتے ہیں۔ رقم آتی ہی ہوگی۔"

یونس گاڑی لے کر اور میں پیدل ملک کی ہمراہی میں دکان کی طرف چل پڑا۔ دکان پر پہنچتے ہی ملک نے ایک بار پھر چائے کے لیے فون کر دیا۔ چائے آتے ہی ملک نے کسی سے فون پر رقم کے بارے میں استفسار کیا۔ فون بند کرنے کے بعد ایک بار پھر ہم باتوں میں مشغول ہوگئے۔ بیس منٹ بعد میں نے ملک صاحب کو رقم کے بارے میں یاد دلایا۔ ملک نے ایک بار پھر کسی کا نمبر ملایا۔ کچھ دیر بات کرنے کے بعد ملک فرخ نے مجھ سے معذرت کی اور کہا کہ اسے بینک جانا ہوگا۔ چیک کے سائن میں کچھ فرق ہے۔ کیشیر اعتراض کر رہا ہے۔

ملک کے جانے کے بعد یونس اور میں واپسی کا پروگرام ڈسکس کرنے لگے۔ میں نے حمیرا باجی کا نمبر ملایا۔ ان سے بیگم اور بیٹی کے بارے میں دریافت کیا۔ ڈسچارج سلپ تیار تھی اور ڈاکٹر کے راؤنڈ کے بعد ڈسچارج کر دیں گے۔ بیگم سے بھی کچھ دیر بات کی۔ جیسے ہی میں نے فون بند کیا یونس نے مجھ سے کہا۔

"ملک کو گئے کافی دیر ہوگئی ہے۔ اس سے پوچھیں کہ وہ کب تک آئے گا؟"

میں نے ملک کا نمبر ملایا تو بند ملا۔ کچھ دیر بعد پھر ٹرائی کیا مگر نمبر بند جا رہا تھا۔ میں وقفے وقفے سے ٹرائی کرنے لگا۔ آدھے گھنٹے بعد میری بے چینی تشویش میں بدل گئی۔ خدانخواستہ ملک کے ساتھ کوئی حادثہ نہ پیش آگیا ہو۔ میں نے یونس کو وہیں رکنے کو کہا اور خود ملک فرخ کے گودام کی طرف چل پڑا۔ یونس کو میں نے ہدایت کی کہ اگر اس دوران ملک آجائے تو وہ مجھے کال کر دے۔ گودام کے دروازے پر پہنچا تو جن مزدوروں نے گاڑی خالی کی تھی ان میں سے ایک مزدور پلاسٹک کے بیگ میں چائے لے کر جا رہا تھا۔ اس نے مجھے دیکھا تو سلام کے بعد پوچھا۔ "سر جی کس نو لبھدے او (سر جی کس کو ڈھونڈ رہے ہیں)"

میں نے اسے ملک کے بارے میں بتایا۔

وہ تو آپ کے جانے کے فوراً بعد ایک دوسری گاڑی میں ایک اور آدمی کے ساتھ آئے تھے اور سارا سامان اس میں لوڈ کر کے آدھا گھنٹا پہلے یہاں سے چلے گئے ہیں۔ اس کی بات سن کر میرے پیروں سے زمین نکل گئی۔ میں واپس دکان کی طرف بھاگا۔ دکان پر پہنچ کر میں نے یونس کو ساری صورت حال بتائی۔ میری بات سن کر یونس بھی پریشان ہوگیا۔ ہم نے باہمی مشاورت سے آفس میں رابطہ کیا۔ ملک اشرف صاحب سے رابطہ ہوا تو میں نے انہیں سارا ماجرا سنا دیا۔ ملک صاحب نے مجھے وہیں رکنے کو کہا۔ آدھے گھنٹے

...ملک صاحب خوشاب میں تھے۔ میں نے ایک بار پھر ...یں سارا قصہ وضاحت سے بیان کیا۔ ملک صاحب نے ...یں بیٹھے بیٹھے اپنے کسی جاننے والے کو فون کیا جو پولیس ...یں کسی بااختیار پوسٹ پر فائز تھے۔ دس منٹ بعد متعلقہ ...انے کا ایس ایچ او ایک اے ایس آئی اور تین کانسٹیبلوں کے ہمراہ موقع پر موجود تھا۔ ایک بار پھر وہی قصہ مجھے سنانا ...ا۔ ایس ایچ او نے کارپینٹروں سے دکان اور ملک فرخ کے بارے میں پوچھا۔ کارپینٹر کو بھی معاملے کی نزاکت کا ...ساس ہو چکا تھا اور وہ کام چھوڑ کر بیٹھے تھے۔ ایک کاریگر ...نے بتایا کہ دکان کرائے کی ہے اور وہ مالک دکان کو جانتا ...ہے۔ ایس ایچ او نے اپنے کانسٹیبل کے ہمراہ کاریگر کو روانہ ...کیا کہ وہ مالک کو بلا کر لائے۔ پندرہ منٹ بعد مالک دکان ...ریشان حالت میں دکان میں آگیا۔ ایس ایچ او نے جاوید (مالک دکان) سے ملک فرخ کے بارے میں دریافت ...کیا۔ اس سے پہلے ایس ایچ او نے اسے معاملے کی نزاکت کے بارے میں بتا دیا۔

جاوید کے مطابق ایک ہفتہ قبل ملک فرخ ایک ...پراپرٹی ڈیلر کے توسط جاوید سے ملا۔ جاوید کی دکان چند دن ...پہلے خالی ہوئی تھی اور وہ اسے کرائے پر اٹھانے کا خواہاں ...تھا مگر مارکیٹ سے کرایہ زیادہ ہونے کی وجہ سے جو بھی آتا ...دوبارہ یہاں کا رخ نہ کرتا۔ ملک فرخ نے جاوید کی دکان منہ ...مانگے کرائے پر لینے پر رضامندی ظاہر کی مگر ساتھ میں شرط ...رکھی کہ وہ اپنا مکان بھی اسے کرائے پر دے۔ جاوید نے مکان ...کا کرایہ بھی تین ہزار زیادہ بتایا جسے فرخ نے بلاجھجک منظور ...کرلیا۔ طے شدہ معاملات کے مطابق جاوید جمعہ والے دن ...شام کو دکان و مکان کا قبضہ ملک فرخ کو دے دیتا اور منگل ...کے دن فرخ، جاوید کے ساتھ ایگریمنٹ سائن کر لیتا۔ ...ایگریمنٹ منگل کو سائن کرنے کی وجہ فرخ نے اپنے قومی ...شناختی کارڈ کی عدم دستیابی بیان کی۔ جو ایکسپائر ہو چکا تھا ...اور تجدید ہونے کے لیے نادرا کے پاس جمع تھا۔ تاہم کام پکا ...کرتے ہوئے جاوید نے فرخ سے بیس ہزار روپے بیعانے ...کی مد میں وصول کر لیے۔ اس شرط کے ساتھ کہ اگر کوئی ...فریق اپنے بیان سے مکر جائے تو فریق ثانی اس کا بیعانہ ...واپس کرنے کا پابند نہیں ہوگا۔ ایجنٹ کو بھی مطلوبہ کمیشن اسی ...دن ادا کی جائے گی۔ ان شرائط کے ساتھ جاوید نے فرخ کو ...دکان و مکان کا قبضہ دے دیا۔ اتوار کی شام فرخ نے ...کارپینٹر سے دکان کے لیے ریکس بنانے کا معاہدہ کیا۔

رقبے کے لحاظ سے برصغیر اتنا وسیع و عظیم ہے کہ کہنے کو یہ برصغیر یا بر کوچک ہے لیکن اس کا رقبہ پورے براعظم یورپ کے برابر ہے اور اس میں واقع تینوں آزاد ممالک (پاکستان، بھارت اور بنگلہ دیش) کی مجموعی آبادی براعظم ایشیا کو چھوڑ کر دوسرے چاروں براعظموں سے زیادہ ہے۔ اس کے ساحل ہی کی لمبائی تین ہزار میل، خشکی کی سرحد چھ ہزار میل اور پہاڑوں کی فصیل پندرہ سو میل لمبی ہے۔ اسی جغرافیائی وسعت اور کشادگی کی وجہ سے یہاں کی تہذیب میں ہم آہنگی اور یگانگت پیدا نہیں ہو سکی۔ زمانہ قدیم سے بیرونی ممالک سے شمال مغرب کی جانب سے مختلف قومیں اپنی اپنی مختلف تہذیبی روایات کے ساتھ آتی رہیں اور یہاں مختلف علاقوں میں آکر آباد ہوتی رہیں۔ ان مختلف اقوام کا طرز معاشرت، رکھ رکھاؤ، عقائد اور بود و باش مختلف رہا اس لیے یہاں کی تاریخ میں کبھی سیاسی و معاشرتی اتحاد قائم نہیں ہوا اور اگر کبھی ہوا بھی تو وہ سطحی اور عارضی رہا۔

مرسلہ: منعیم کاظمی۔ کوئٹہ

وادی سندھ کی تہذیب میں بڑے شہر بسانے کا رجحان 2500 ق م میں اپنے عروج کو پہنچ گیا جیسا کہ ہڑپہ اور موئن جو دڑو کی مثالوں سے ظاہر ہے۔ اس تہذیب کی زیادہ معروف اور نمایاں خصوصیات یہ ہیں: شاندار شہری منصوبہ بندی، بڑی بڑی سرکاری عمارتیں اور چھوٹے چھوٹے گھر، وسیع پیمانے پر اجتماعی پیداوار، ثقافتی چیزوں کی بناوٹ کا اعلیٰ معیار، مشابہت، مجسمے، مہریں، مٹی کے برتن، دور دراز فاصلوں تک بیرونی تجارت کا اہتمام، معاشرے کی طبقاتی تقسیم اور رسم الخط کی ترقی۔ آب نکاسی کا نظام موجودہ بہترین شہروں کے مقابلے پر تھا۔ چھوٹی چھوٹی نالیاں بڑی نالیوں میں آکر ملتی تھیں۔ ہر نالی پختہ اور اوپر سے اینٹوں سے ڈھکی ہوئی تھی۔ حفظان صحت کے اصولوں کا پورا خیال رکھا جاتا تھا۔ ان قدیم کھنڈروں میں موئن جو دڑو کا حمام اور ہڑپہ کا اناج گھر قابل ذکر ہیں۔ ہڑپہ اور موئن جو دڑو میں وادی دجلہ و فرات کے سومیری شہر، بابل و نینوا کے محلات کی طرز کے محلات نہیں ملتے۔ اس سے اندازہ ہوتا ہے کہ طرز حکومت جمہوری اور عوامی تھا لیکن ان لوگوں کی مذہبی زندگی پر کسی طرح کی روشنی نہیں پڑتی کیونکہ کوئی مندر وغیرہ نہیں ملتا اور نہ قدیم مصر کی طرح یہاں اہرام اور مقبرے تعمیر کیے گئے۔ یہاں گندم اور جو بکثرت ہوتا تھا۔ لوگ گھریلو یا پالتو جانوروں کے علاوہ دریائی جانور مگرمچھ، مچھلی، کچھوا اور جنگلوں کے درندے، چیتا، گھڑیال، ہاتھی، گینڈا، زیبرا وغیرہ سے واقف تھے کیونکہ مہروں پر یہ تمام جانور نہایت مہارت سے بنائے گئے ہیں۔

مرسلہ: انصار اللہ نظامی۔ حیدرآباد

سوموار کی صبح کارپینٹر نے سامان منگوا کر کام شروع کر دیا۔ اسی دوران وہاں ہماری آمد ہوئی۔ فرخ نے سارا سیٹ اپ اپنی مرضی سے ترتیب دیا اور سب کچھ اس کی منشا کے مطابق ہوا۔ ملک اشرف، ایس ایچ او، مالک دکان اور ہم سب فرخ کی پلاننگ سمجھ چکے تھے۔ ملک اشرف نے نامعلوم افراد کے خلاف پرچہ دے دیا۔ پراپرٹی ڈیلر اور مالک مکان کو بھی شامل تفتیش کر دیا۔ یونس سپلائی وین میں اور میں ملک صاحب کے ساتھ گاڑی میں واپس سرگودھا آ گیا۔ ملک صاحب نے مجھے اسپتال کے دروازے پر اتارا اور کہا۔ "پریشان ہونے کی ضرورت نہیں، میں نے کبھی کسی کا حق نہیں کھایا اور مجھے اُمید ہے کوئی میرا حق بھی نہیں کھا سکتا۔ تمہاری جگہ میں بھی ہوتا تو ان کے دھوکے میں آ جاتا کیونکہ ان کی پلاننگ ہی ایسی تھی۔" یہ کہہ کر وہ روانہ ہو گئے۔

اسپتال میں داخل ہوا تو چار بجنے والے تھے۔ باجی حمیرا نے دیر ہونے پر ڈانٹ پلائی۔ میں نے انہیں دیر ہونے کی وجہ بتائی تو وہ پریشان ہو گئیں۔ تاہم میرے تسلی دینے پر ان کی پریشانی کم ہو گئی۔ اسپتال سے چھٹی ہو چکی تھی۔ خالہ شمیم کے علاوہ ہم سب واپس آ گئے۔ خالہ شمیم بچی کی دیکھ بھال کے لیے اسپتال میں ہی تھیں۔ رات کو وہ واپس آ جاتیں اور باجی حمیرا اسپتال رک جاتیں۔

جمعرات کو ڈاکٹروں نے رامین (بچی) کو بھی ڈسچارج کر دیا۔ جمعے کو مقامی چھٹی ہوتی ہے اور ہفتے کو میں نے دوبارہ سے ڈیوٹی جوائن کر لی۔ آفس جاتے ہی میں نے سب سے پہلے ملک اشرف صاحب سے ملاقات کی۔ آدھے گھنٹے کی نشست میں انہوں نے کاروباری امور کی اونچ نیچ بیان کی۔ جاتے وقت میں نے ان سے چند ڈاکومنٹس طلب کیے جو انہوں نے تھوڑی پس و پیش کے بعد مجھے دے دیے۔ میں ان سے ہاتھ ملا کر باہر نکل آیا۔

☆......☆

اس واقعہ کو ایک سال ہونے والا تھا۔

پولیس نے اوپر سے دباؤ کی وجہ سے ایک دو ماہ تو خوب تفتیش کی تھی۔ جب بھی کوئی ڈکیت یا نوسرباز پکڑا جاتا، تھانے سے میرا بلاوا آ جاتا مگر آہستہ آہستہ اس میں کمی آتی گئی۔ پچھلے چھ ماہ سے پولیس کی طرف سے کوئی بلاوا نہیں آیا تھا۔ ملک اشرف بھی اس واقعہ کو فراموش کر چکے تھے مگر میرے ذہن پر یہ روز اوّل کی طرح روشن تھا۔ ایک خلش تھی جو دل ہی دل میں بے چین کیے رکھتی تھی۔

"گاڑی تیار ہے۔ کب تک روانگی ہے؟" یونس نے مجھے آواز دی تو میں خیالوں سے باہر آ گیا۔ آج ہمارا بھکر کا پروگرام تھا۔ پانچ دن پر مشتمل اس روٹ میں ہم خوشاب سے شروعات کرتے اور بھکر پہنچ جاتے۔ وہاں سے ہماری واپسی شروع ہو جاتی جو براستہ میانوالی سے سرگودھا ہوتی۔ گندم کی بوائی کی وجہ سے ان دنوں سیزن عروج پر تھا۔ پچھلے ٹور کی نسبت اس بار دوگنا سیل ہوئی تھی۔ میانوالی سے نکلے تو گاڑی تقریباً خالی تھی۔ گنتی کے چند کارٹن پڑے تھے۔ قائدآباد میں صرف ایک دکان باقی تھی۔

یونس نے کہا۔ "دیر ہو جائے گی۔ اسے اگلے ہفتے دیکھ لیں گے۔ ابھی اسٹاک بھی پورا نہیں ہے۔"

"پانچ منٹ کی تو بات ہے۔ تم گاڑی میں ہی بیٹھو۔ اگر کوئی آرڈر نکلا تو میں تمہیں مس کال کروں گا۔ تم آ جانا۔" یہ کہہ کر میں گاڑی سے اتر گیا۔

غوری ٹریڈرز نامی یہ دکان قائدآباد کی سب سے مشہور و معروف دکان تھی مگر لین دین کے معاملے میں ان کا وتیرہ اچھا نہیں تھا۔ دو سال پہلے تک انہیں کریڈٹ پر بھی اسٹاک دیا جاتا تھا مگر مسلسل تاخیر سے ادائیگیوں پر ان کا کریڈٹ بند کر دیا گیا ہے۔ دکان میں داخل ہوتے ہی میری نظر دکان کے مالک امجد غوری پر پڑی۔ جو اپنے بھاری بھرکم وجود کے ساتھ کرسی میں دھنسا ہوا تھا۔ سلام دعا کے بعد میں نے غوری سے آرڈر کے بارے میں پوچھا۔

"ابھی پیمنٹ نہیں ہے۔ اگلے ہفتے تک اگر ادھار کر سکتے ہو تو مال اتار دو۔" انہوں نے کہا۔

"معافی چاہتا ہوں۔ ملک صاحب کی طرف سے ادھار سختی سے بند ہے۔" میں نے کورا جواب دیا۔

امجد غوری کا منہ بن گیا۔ میں ہاتھ ملا کر باہر نکلنے لگا تو دروازے کے پاس پڑے چند کارٹنوں پر میری نظر پڑی۔ میں ذرا سا ٹھٹکا اور جیب سے موبائل نکالا۔ امجد غوری فون پر کسی کے ساتھ مصروف تھا۔ میں نے موبائل کا کیمرا آن کر کے جلدی جلدی تین چار تصاویر بنا ڈالیں۔ باہر نکلتے ہی میں نے تصویروں کو غور سے دیکھا۔ گو کہ ان کا رزلٹ کچھ اچھا نہ تھا مگر میرا مقصد پورا ہو گیا تھا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی یونس نے گاڑی اسٹارٹ کی۔ کچھ دور جا کر میں نے یونس کو گاڑی روکنے کا اشارہ کیا۔ گاڑی رکتے ہی میں نے ڈیش بورڈ میں پڑے کاغذات نکالے اور ان کا معائنہ شروع کر دیا۔ ایک ہاتھ میں

کاغذات اور دوسرے ہاتھ میں موبائل تھامے میرے دل کی دھڑکنیں بے ترتیب تھیں۔ کامیابی اور ناکامی کا خیال میرے دل کو بے چین کر رہا تھا۔

''وہ مارا۔'' میں نے جوش سے نعرہ لگایا۔ یونس حیران پریشان میرا منہ دیکھنے لگا۔

''ناصر بھائی کیا ہوا، خیریت تو ہے؟''

''ابھی بتاتا ہوں۔'' میں نے کہا اور فون پر نمبر ڈائل کرنے لگا۔ فون بند کر کے میں نے کیش یونس کے حوالے کی اور اسے ساری بات تفصیل سے بتائی۔ یونس کو خدا حافظ کہہ کر میں نزدیکی ہوٹل میں جا کر بیٹھ گیا۔ اگلا ڈیڑھ گھنٹا میرا بے چینی میں گزرا۔ اس دوران میرا رابطہ مسلسل ملک اشرف صاحب سے رہا۔ جیسے ہی گاڑی ہوٹل کے سامنے رکی میں جلدی سے باہر آ گیا۔ ملک صاحب کے ساتھ خوشاب تھانے کا ایس ایچ او بھی تھا۔ سلام دعا کے بعد میں گاڑی میں ہی بیٹھ گیا۔ گاڑی میں بیٹھتے ہی میں نے جیب سے کاغذات نکالے اور موبائل میں محفوظ تصویر دکھائی۔ تصویر اور کاغذات میں قدر مشترک دیکھ کر ملک صاحب نے معنی خیز نگاہوں سے ایس ایچ او کی طرف دیکھا۔ اگلے دس منٹ میں ایس ایچ او اور ملک صاحب کے درمیان بھرپور مشاورت ہوئی۔ آدھے گھنٹے بعد قائدآباد تھانے کی پولیس وین ہوٹل کے سامنے آ کر رکی۔ ایس ایچ او نے ملک صاحب کو اشارہ کیا اور جا کر وین میں بیٹھ گیا۔ ملک صاحب نے گاڑی کا رخ غوری ٹریڈرز کی جانب موڑ دیا۔ امجد غوری اور عملے کے تین افراد دکان بند کرنے کی تیاریوں میں مصروف تھے۔ ہمیں دیکھ کر امجد غوری ٹھٹکا۔ ہمارے پیچھے پولیس وین دیکھ کر امجد غوری کا رنگ اڑ گیا۔ پولیس والوں کے اندر داخل ہوتے ہی امجد غوری نے فون کی طرف ہاتھ بڑھایا مگر ایس ایچ او نے فون اس کے ہاتھ سے لے لیا۔

''تھانے جا کر جسے دل چاہے فون کرنا۔ میں تمہیں ملک ٹریڈرز کے ساتھ فراڈ اور دھوکا دہی کے الزام میں گرفتار کرتا ہوں۔''

☆......☆

اگلا دن بہت ہنگامہ خیز تھا۔

امجد غوری فراڈ کے کیس میں حوالات میں بند تھا۔ پولیس نے امجد غوری کی دکان اور گودام پر چھاپہ مار کر کارٹن بھی برآمد کر لیے۔ ظہر کی نماز کے بعد ہم واپس سرگودھا کے لئے روانہ ہوئے۔ آفس پہنچتے ہی ملک صاحب نے کھانا منگوالیا۔

کھانے کے بعد ملک صاحب نے تمام اسٹاف کو کانفر[illegible] میں بلالیا۔ اسٹاف کے آنے کے بعد ملک صاحب [illegible] مخاطب کرتے ہوئے کہا۔ ''ناصر! ان سب کو تفصیل [illegible] کہ تمہیں کیسے امجد غوری پر شک ہوا۔''

☆......☆

ایک سال پہلے جب یہ واقعہ ظہور پذیر ہوا تو [illegible] بعد میں نے ملک صاحب سے اس اسٹاک کی انوائس [illegible] کیں۔ کمپنی جس ضلع کے ڈسٹری بیوٹر کو اسٹاک بھیجتی [illegible] انوائسز میں ان کارٹن کے بیچ نمبرز اور مینوفیکچرنگ [illegible] بھی لکھتی ہے۔ اس کے علاوہ ہر ضلع کے ڈسٹری بیوٹر [illegible] کی اسٹیمپ بھی کارٹن پر لگی ہوتی ہے، جب میں [illegible] ٹریڈرز کی دکان سے نکلنے لگا تھا تو جیسے ہی میری [illegible] کارٹن پر پڑی ان کی مینوفیکچرنگ تاریخ دیکھ کر [illegible] تاریخ ایک سال پرانی تھی۔ شک کے تحت میں [illegible] کارٹن کی تصاویر بنا ڈالیں۔ گاڑی میں بیٹھ کر میں [illegible] سال پہلے کی انوائس نکالی جو ملک صاحب نے [illegible] تھیں۔ اس انوائس میں دو کارٹن کی مینوفیکچرنگ تار[illegible] کارٹنوں سے میچ کر گئی۔ میں نے ساری بات ملک صا[illegible] کو بتائی۔ میری کال کے بعد انہوں خوشاب میں [illegible] جاننے والے پولیس آفیسر کو کال کی اور ساری بات [illegible] یوں انہوں نے ایس ایچ او کو حکم دیا اور وہ ملک صا[illegible] ساتھ قائدآباد آ گیا۔ وہاں کی مقامی پولیس کی مدد [illegible] نے انہیں گرفتار کیا اور گودام پر چھاپہ مار کر تمام اسٹاک [illegible] کر لیا جنہیں انوائس کے ساتھ میچ کیا گیا تو تمام کارٹن [illegible] سال پرانے تھے اور ان کی تمام تفصیل انوائس کے سا[illegible] کر رہی تھی۔ یوں امجد غوری قانون کے شکنجے میں جکڑ [illegible]

☆......☆

امجد غوری کی نشاندہی پر ملک فرخ بھی گرفتار ہو [illegible] ملک اشرف صاحب کو تمام اسٹاک واپس مل گیا تھا۔ [illegible] صاحب نے مجرم پکڑوانے پر مجھے دو انعامات سے نوازا۔ [illegible] فیصد تنخواہ میں اضافہ اور پچاس ہزار روپے نقد۔

امجد غوری تاحال جیل میں بند ہے۔ اس کے بہا[illegible] والے ملک صاحب پر معافی کے لیے زور دے رہے ہیں [illegible] میں انہیں ہنوز کامیابی نہیں مل سکی۔

اسی لیے کہتے ہیں کہ آنکھیں کھلی رکھو، جرم کبھی چھپتا [illegible] مجرم کتنا ہی عیار کیوں نہ ہو، کہیں نہ کہیں نشان چھوڑ دیتا ہے۔



یادوں کا زہر

محترم ایڈیٹر سرگزشت

ایک سبق آموز روداد ارسال کر رہا ہوں۔ چھوٹے بچوں والے گھر میں کس قدر احتیاط کی ضرورت ہے یہی اس روداد کا اصل ہے۔ اگر آفرین کے گھر والے احتیاط کرتے تو ایسا غضب نہ ٹوٹتا۔

محسن کمال

وقت بڑی ہی ظالم شے ہے، ایک بار عذاب بن کر گزرتا ہے اور پھر ہر سال اس عذاب کو یاد دلاتا رہتا ہے، ہر انسان کے ماضی میں کچھ خوشگوار یادوں کے ساتھ ساتھ اذیت بھرے لمحے بھی ہوتے ہیں جنہیں چاہ کر بھی انسان بھول نہیں پاتا۔ اس کا ماضی بھی کچھ ایسی ہی یادوں سے بھرا ہوا تھا۔

اس کا نام شاہد عمران تھا۔ عمر لگ بھگ 25 سال، درمیانہ قد، سیاہ بال، کھردرا اور کرخت چہرہ، چہرے پر ایک عجیب سی مدھم سی کشش بھی تھی جو مدمقابل کو کچھ دیر کے لیے

مسحور کرنے کی صلاحیت رکھتی تھی۔ وہ تنہائی میں بیٹھا تھا اور ماضی کے تمام اوراق اس کے سامنے بکھرے پڑے تھے۔ وہ اپنے ماضی میں کھو گیا۔

☆......☆

گھر میں کہرام مچا ہوا تھا، کسی کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ کیا ہو گیا ہے، بس آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، دن میں تو سب کتنے خوش لگ رہے تھے کہ آج آفرین کی پہلی سالگرہ ہے پر شام ہوتے ہوتے ساری خوشی ماتم میں بدل گئی، کیوں؟ یہ ایسا سوال تھا کہ کوئی جواب نہیں دے پا رہا تھا۔

ہوا کچھ یوں تھا کہ جب شاہد اور اس کا بھائی عمیر اسکول سے گھر آ کر سو گئے تو امی نے انہیں نیند میں سے جگایا۔

''شاہد، عمیر جلدی اٹھو! آفرین نے مٹی کا تیل پی لیا ہے۔''

''کیا ہوا امی، مٹی کا ہی تیل پیا ہے نا، تو الٹی کروا دیں مجھے کیوں تنگ کر رہی ہیں۔'' عمیر نیند سے بوجھل آواز میں بولا۔

''بیٹا وہ الٹی بھی نہیں کر رہی، مجھے ڈر لگ رہا ہے۔'' امی نے روتے ہوئے کہا۔

''کیا کہا مٹی کا تیل پی لیا۔'' شاہد ایک دم کھڑے ہوتے ہوئے بولا۔''اسے اسپتال لے کر چلتے ہیں۔''

جب اسپتال پہنچے تو ڈاکٹر نے آفرین کو الٹی کی دوائی دی مگر اسے الٹی نہیں ہوئی۔

''باجی جی! بچی کو جلدی بڑے اسپتال لے کر جائیں اور کوشش کیجیے گا کہ بچی کو نیند نہ آئے اللہ خیر کرے گا۔'' ڈاکٹر کی آواز بہت دور سے آتی ہوئی محسوس ہوئی تھی اس وقت۔

شاہد نے جلدی سے رکشا والے کو روکا اور اسے اسپتال چلنے کے لیے کہا، اسپتال پہنچ کر امی نے دادی کو فون کر کے وہیں بلوا لیا۔ شاہد اور عمیر دوائی لینے کے لیے باہر گئے اور جب دوائی لے کر واپس آئے تو ان پر قیامت ٹوٹ گئی تھی۔

''تم نے مارا ہے میری بیٹی کو! تم قاتل ہو اس کی، کہتی تھی نا کہ میرے پاس آ کر رہ لو، مگر تمہیں تمہاری دوسری اولادیں زیادہ عزیز تھیں۔ آہ مار دیا میری بیٹی کو۔''

''شبانہ! ہوش کرو میں کیوں ماروں گی تمہاری بیٹی کو؟ تمہاری بیٹی کیا میری پوتی نہیں تھی۔ کیا تم جانتی نہیں ہو کہ میں خود بیمار رہتی ہوں۔ اللہ نے دی تھی آفرین اسی کی امانت تھی اس نے واپس لے لی، اب اس طرح مت رو ورنہ بچی کی روح کو تکلیف ہوگی۔'' دادی روتے ہوئے امی کو دلاسہ دیتے لگیں۔

''جاؤ بیٹا اپنے ابو کو خبر دو جا کر کہ ہم پر کیا سانحہ گزر گیا ہے! اس بیچارے کو تو پتا بھی نہیں ہوگا کہ اس کی بیٹی اب دنیا میں نہیں رہی۔'' شاہد کو دیکھ کر دادی روتے ہوئے بولیں۔

وہ دونوں وہاں سے ابو کو بلانے کے لیے اپنے دادا کے گھر کی طرف چل دیے۔ راستے میں انہیں ابو اپنی طرف آتے ہوئے نظر آئے۔

''ابو! ابو! آفرین ہمیں چھوڑ کر چلی گئی ابو!'' شاہد روتے ہوئے باپ کے گلے لگ گیا۔

''ابو! آپ کو کیسے پتا چلا کہ ہم اسپتال میں ہیں؟'' عمیر جو کافی حد تک خود کو سنبھال چکا تھا اپنے باپ سے پوچھنے لگا۔

''میں گاڑی کھڑی کر رہا تھا کہ عزیز نے بتایا کہ بھائی منی کی طبیعت خراب ہے! بھابی بچوں کے ساتھ اسے اسپتال لے کر گئیں ہیں'' ابو نے اشک بار لہجے میں جواب دیا۔

شاہد جب عمیر اور ابو کے ساتھ واپس اسپتال پہنچا تو وہاں ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہوا تھا۔ ڈاکٹر کہہ رہے تھے کہ آفرین کا پوسٹ مارٹم ہوگا۔

''ہمیں شک ہے کہ بچی کی موت حادثہ نہیں بلکہ سوچی سمجھی سازش ہے اور اس میں بچی کی ماں ملوث ہو سکتی ہے۔'' ڈاکٹر نے ابو کے پوچھنے پر بتایا۔

آہ! ایک قیامت کیا کم تھی جو نئی افتاد آ پڑی تھی، آفرین جسے منتوں مرادوں سے مانگا گیا تھا بھلا امی اس کی جان لے سکتی تھیں۔ اور امی ہی کیا وہ تو محلہ والوں کی بھی عزیز ترین ہستی تھی، کوئی بھی شخص اس معصوم کی جان کا دشمن نہیں ہو سکتا تھا۔ بہر طور آفرین کا پوسٹ مارٹم ہوا اور الزام امی پر لگا۔ چھ ماہ تک پولیس مختلف حیلے بہانے سے گھر کے چکر کاٹتی رہی۔

آفرین نے مٹی کا تیل پیا کیسے؟ اس سوال کا جواب امی ابو کے لیے آزمائش بن گیا تھا وہ کسی کو نہیں بتا سکتے تھے کہ اس دن ہوا کیا تھا، کیوں کہ اگر وہ اس سوال کا جواب دیتے تو ایک بیوہ عورت کی زندگی عذاب بن جاتی۔

ان کا نام سعیدہ تھا، سب ہی سعیدہ آپا کہتے تھے انہیں، وہ جگت آپا تھیں، امی کی بھی آپا، ابو کی بھی، شاہد اور عمیر کی بھی آپا تھیں تو آفرین بھی اپنی توتلی زبان میں انہیں آپا ہی کہتی تھی۔ سعیدہ آپا کو اپنے کپڑے دھوتے تھے اور کچھ کپڑے اتنے داغدار تھے کہ مٹی کے تیل سے دھونے پڑے تھے۔ غلطی ان سے یہ ہوئی کہ کپڑے دھونے کے بعد انہیں وہاں...

تاریخ کے جھروکے سے

سلطنت مغلیہ کے تاجدار ابوظفر سراج الدین ایک جوان رعنا ہیں۔ ہرفن مولا ہیں۔ بھاری اور سخت سے سخت کمان کا چلہ چڑھانا اور تیر چلانا ان کے بائیں ہاتھ کا کھیل ہے۔ ابوظفر سراج الدین محمد زن سے تیر چلاتے ہیں، نشانہ اڑاتے ہیں۔ کسرتی بدن ہے، بدن میں چستی اور پھرتی ہے۔ فن شناوری سے بھرپور آشنا ہیں۔ تیرتے ہیں تو بازو کی مچھلیاں تڑپتی ہیں اور جمنا کی مچھلیاں راستہ چھوڑ دیتی ہیں۔ دیکھنے والوں نے یہ تماشا بھی دیکھا کہ سر پر سے اڑتی ہوئی چڑیا گزری، بندوق اٹھائی، نشانہ باندھنے کا وقت کہاں۔ دھائیں سے جھونک دی۔ چڑیا لوٹ پوٹ ہو کر قدموں میں آگری۔ دریا میں سے اِدھر مگرمچھ نے منہ نکالا اور گولی پڑی نہیں۔ سواری جارہی ہے ابوظفر گھوڑے کی پشت پر یوں بیٹھے ہیں کہ جیسے ستون گڑا ہے۔ دیکھنے والے واری صدقے ہورہے ہیں۔ اللہ اللہ کیا شان تھی، کیا آن بان تھی مگر 1857ء میں اسی شہنشاہ ہند پر کیا گزری، اظہر من الشمس ہے۔

مرسلہ: ظفر ندیم وہرہ۔ حیدرآباد

کے تیل کا ڈونگا اٹھانا یاد نہیں رہا اور چلبلی آفرین اسے پانی سمجھ کر پی گئی اور پیتے ہی جوٹھکا لگا کہ سارا مٹی کا تیل اس کے دماغ پر چڑھ گیا اور موت کا سبب بن گیا۔

سعیدہ آپا کا تو رو رو کر برا حال تھا، ابو سے کہنے لگیں کہ "بیٹا میں نے جان بوجھ کر یہ نہیں کیا، آفرین تو مجھے اپنی نواسی کی طرح عزیز تھی۔"

ابو نے جواب دیا تھا "آپا! میں جانتا ہوں، میری آفرین کا وقت پورا ہو چکا تھا، بس اس نے اپنی پوری زندگی جی لی تھی شاید۔ آپ بے فکر رہیں، میں یا میرے گھر کے کسی فرد کی زبان پر آپ کا نام نہیں آئے گا، چاہے ہمیں اس کی کوئی بھی قیمت چکانی پڑے۔"

☆......☆

آفرین کی پیدائش 26 جون بروز پیر سن 2000ء میں ہوئی تھی۔ بہت ہی خوبصورت تھی اپنی پیدائش کے وقت سے ہی، جب آفرین 9 ماہ کی ہوئی تو بھاگنا تک سیکھ گئی تھی، جب امی کپڑے دھو رہی ہوتیں تو امی کے پاس آکر بیٹھ جاتی اور اس طرح کپڑے اٹھا کر پھینکتی جیسے کپڑے دھو رہی ہو۔ اسی طرح جب امی روٹی بنا رہی ہوتیں تو کچن میں آکر امی سے بیلن مانگتی کہ مجھے روٹی پکانی ہے، منع کرنے پر رونا شروع کر دیتی۔ شاہد یا عمیر یا ابو میں سے کوئی بھی اگر گھر میں نماز پڑھ رہا ہوتا اور جیسے ہی اللہ اکبر کہتا تو بس آفرین جہاں بھی ہوتی اللہ اکبر کی آواز سنتے ہی قریب آکر سیدھے سجدے میں گر جاتی، شاہد کو خاص طور پر پریشان کرتی تھی مگر شاہد کے بغیر رہتی بھی نہیں تھی، اکثر شاہد جب کھانا کھا رہا ہوتا تو پیچھے سے اس کی گردن پر لپٹ جاتی اور اسے پیچھے کھینچنا شروع کر دیتی۔

جس دن آفرین کا انتقال ہوا اس کے اگلے دن آفرین کی پہلی سالگرہ تھی، بہت کچھ سوچ کر رکھا تھا شاہد اور عمیر نے اپنی پیاری بہن کے لیے، اسکول سے آتے ہوئے پوری پلاننگ کی تھی تحفوں اور کیک وغیرہ کی۔ مگر انہیں بالکل بھی اندازہ نہیں تھا کہ قسمت نے بھی کچھ سوچ رکھا ہے اور قسمت کی پلاننگ کے سامنے ان کی پلاننگ کوئی معنی نہیں رکھتی۔

وہ بھی پیر کا ہی دن تھا جس دن آفرین کا انتقال ہوا تھا اور اتفاق ہی تھا کہ ڈاکٹرز نے آفرین کا پوسٹ مارٹم کا اٹھایا اور منگل والے دن آفرین کی لاش گھر والوں کے حوالے کی گئی، پورا خاندان آفرین کی ایک جھلک دیکھنے کو پہنچا ہوا تھا، شاہد عمیر کی آنکھوں سے آنسو تھے کہ رکنے کا نام ہی نہیں لے رہے تھے، ابو خاموش، امی کو سکتہ! پھوپھا، چاچا، چاچی وغیرہ نے سب انتظام سنبھال رکھا تھا مہمان داری کا۔

آہ! کیا حالت تھی سب گھر والوں کی کہ جس منتوں مرادوں سے مانگی ہوئی بیٹی کی پہلی سالگرہ تھی اور گھر والے اسے دفنا رہے تھے۔ پورا محلہ سوگوار تھا آفرین کی موت پر، ہر آنکھ اشک بار، ایسا لگتا تھا کہ آفرین نہ گئی ہو بلکہ خوشیاں ہی چلی گئی ہوں پورے شہر کی۔ کوئی کہہ رہا تھا کہ کانچ کی گڑیا تھی، ٹوٹ گئی۔ کسی نے کہا کہ اللہ کی امانت تھی اس نے واپس لے لی۔ آفرین تو چلی گئی پر اپنے ساتھ ساتھ اس گھر کی خوشیاں بھی لے گئی۔

آج آفرین کو بچھڑے ہوئے پورے تیرہ سال ہو گئے مگر اس کی یاد اک پل کے لیے بھی دل سے نہیں نکلتی۔ ہر سال 26 جون کو شاہد عمران سوچتا ہے کہ آفرین کی سالگرہ کی خوشی منائے یا آفرین کی برسی کا دکھ؟ بچوں والے گھر میں احتیاط بہت ضروری ہے، آفرین کی موت نے یہ سبق بخوبی دے دیا تھا۔

رات کے ساڑھے دس بجے کا وقت تھا، اندھیرا، گرمی اور حبس کا راج تھا۔ اس ویرانے میں ٹرین کو رکے پندرہ منٹ ہوگئے تھے۔ بہت سے مسافر گرمی سے گھبرا کر باہر نکل آئے تھے، بہت سی خواتین اپنے روتے ہوئے بچوں کے ساتھ ٹرین کے اندر ان کو ہوا دینے کی کوشش کر رہی تھیں۔ کسی کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ اچانک ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ سب کے چہرے پریشان اور نگاہیں انجن کی طرف تھیں۔

خلش

محترمہ عذرا رسول

سلامِ مسنون

یہ سچ بیانی راحیل کی ہے۔ نادانستگی میں یا پھر یہ کہیں کہ بے وقوفی میں وہ ایک ایسی غلطی کر بیٹھا جس نے ایک دوشیزہ کو تباہی کی گہری کھائی تک پہنچا دیا تھا لیکن بھول گیا تھا کہ قدرت کبھی معاف نہیں کرتی۔ ایک سبق بھری داستان ہے اسی لیے سرگزشت کو ارسال کررہا ہوں۔

محمد فاروق انجم

(فیصل آباد)



راحیل اپنی سیٹ پر بیٹھا کھڑکی سے سر نکالے باہر دیکھ رہا تھا۔ اس نے پاس کھڑے مسافروں سے دریافت کیا کہ ٹرین کیوں رک گئی ہے۔ مگر کسی مسافر کے پاس اس کا جواب نہیں تھا۔

راحیل اپنی جگہ سے اُٹھا اور ٹرین سے باہر آ گیا۔ باہر بھی ہوا بند تھی اور گرمی جسم سے پسینا نکال رہی تھی۔

راحیل انجن کی طرف چلنے لگا۔ انجن کے پاس بہت سے لوگ کھڑے تھے۔ ان لوگوں کے درمیان انجن کا ڈرائیور بھی کھڑا تھا۔ راحیل نے قریب پہنچ کر ایک مسافر سے سوال کیا۔ ”کیا ہوا......ٹرین کیوں رکی ہے؟“

”انجن فیل ہوگیا ہے۔“ مسافر نے برا سا منہ بنا کر جواب دیا۔

”اب کیا ہوگا؟“ راحیل کے منہ سے نکلا۔

”کہتے ہیں اطلاع کردی ہے۔ نیا انجن آئے گا، یہاں سے قریب ترین اسٹیشن چالیس کلومیٹر کے فاصلے پر ہے۔ اگر وہاں کوئی انجن ہوا تو آجائے گا ورنہ وہ آگے اطلاع کریں گے نیا انجن آگیا تو ہی یہ ٹرین یہاں سے چلے گی۔“ اسی مسافر نے بتایا۔

”اس کا مطلب ہے کہ تب تک ہم اسی جگہ......اس ویرانے میں کھڑے رہیں گے۔“ راحیل بولا۔

”اس کے علاوہ اور کر بھی کیا سکتے ہیں۔“ مسافر کہہ کر ایک طرف چلا گیا۔ راحیل ناچاری سے اپنی تھوڑی کھجانے لگا۔ وہ سوچنے لگا کہ وہ کیا کرے۔ اس کے لیے اس ویرانے میں کھڑے ہو کر انتظار کرنا بہت مشکل ہے۔

راحیل کراچی سے آرہا تھا۔ اس کا باپ ایک کاروباری شخص تھا۔ وہ جس کمپنی کے اپنے شہر میں ڈسٹری بیوٹر تھے، اس کمپنی کی طرف کچھ کلیم اور ضروری معاملات تھے، اس لیے اس کے باپ نے چار دن قبل راحیل کو کمپنی کے آفس میں بھیجا تھا۔ ساری کاغذی کارروائی اس کے باپ اور بھائیوں نے کردی تھی، راحیل کو جا کر محض ان سے بات کرنی تھی اور کلیم پیش کرنا تھا۔ واپسی پر راحیل کے والد کے ایک دیرینہ دوست کے بیٹے کی شادی میں شرکت بھی کرنی تھی۔

راحیل کاروباری امور میں ابھی اتنا سنجیدہ نہیں تھا مگر وہ کام ایسا تھا جو زیادہ مشکل نہیں تھا اسی لیے اسے بھیجا گیا تھا۔ راحیل کی ماں کا شوگر لیول بڑھ گیا تھا اس وجہ سے ان کا شادی میں جانا مشکل تھا اس لیے وہ دونوں کام راحیل کے ذمے لگا دیئے گئے تھے۔

کراچی میں سارا کام نمٹانے کے بعد راحیل دو دن ہوٹل میں گزارے، کراچی شہر کی سیر کی اور واپسی کے لیے ریلوے اسٹیشن چلا گیا کیونکہ اسے شادی میں شریک ہونا تھا۔

راحیل اپنے بھائیوں میں سب سے چھوٹا تھا۔ ماہ قبل اس کا باپ اسے بھی کاروبار میں کھینچ لایا تھا۔ راحیل کی غیر سنجیدہ طبیعت ابھی کاروبار کی طرف مائل نہیں تھی، اس کے باوجود اس کا باپ جو کام کہتا تھا، وہ من و عن کردیتا تھا۔

راحیل کم کم ہی سنجیدہ ہوتا تھا۔ اس کے دماغ میں ہر وقت ہنسی مذاق اور دوسروں کو بے وقوف بنانے کا بھوت سوار رہتا تھا اور ان حرکتوں سے وہ خوب لطف اندوز ہوتا تھا۔

راحیل مذاق میں جھوٹ بھی اس سنجیدگی کے ساتھ بولتا تھا کہ دوسرے کو یقین ہوجاتا تھا۔ راحیل کے ساتھ اس کے دو دوست ناصر اور امتیاز بھی شامل ہوتے تھے جو اس کے ساتھ مل کر پہلے کوئی شکار تلاش کرتے اور پھر اس کے ساتھ ڈراما رچا کر خوب قہقہے لگاتے تھے۔ انہوں نے اپنی زندگی کو ہنسی مذاق کے حصار میں بند کیا ہوا تھا۔

راحیل نے ایک نظر انجن پر ڈالی پھر اطراف کا جائزہ لیا۔ اس ویرانے میں دور اسے روشنیاں دکھائی دے رہی تھیں۔ ایسا لگتا تھا جیسے وہاں کوئی آبادی ہے۔ راحیل نے قریب کھڑے ایک بزرگ مسافر سے پوچھا۔ ”چچا جی، سامنے کوئی آبادی ہے؟“

”وہ گاؤں ہے۔ اس گاؤں کا نام نور پور ہے۔“ بزرگ مسافر نے جواب دیا۔

”وہ گاؤں اس جگہ سے کتنی دور ہوگا۔“ راحیل ایک دم سے چونکا، اسے اسی گاؤں میں تو جانا تھا۔

”یہ سامنے بیچوں بیچ چل پڑو تو بمشکل دو تین کلومیٹر دور ہوگا۔“ بزرگ نے بتایا۔

”وہاں تک کوئی تانگہ وغیرہ نہیں جاتا۔“

”یہاں سے پانچ کلومیٹر کے فاصلے پر پھاٹک ہے۔ وہاں سے ہی سواری اس گاؤں تک جانے کے لیے ملتی ہے۔“ بزرگ نے بتایا۔ ”یہ ٹرین گاؤں کا پھاٹک کراس کرتے ہوئے بہت آہستہ ہوجاتی ہے۔ اس پھاٹک پر جس کسی نے سوار ہونا ہوتا ہے وہ سوار ہوجاتا ہے اور جس کسی نے اترنا ہوتا ہے وہ اتر جاتا ہے لیکن اب یہ ٹرین وہاں پہنچنے سے پہلے ہی خراب ہوگئی۔“

”آپ اسی جگہ کہیں رہتے ہیں۔“ راحیل نے چلنے سے پہلے پوچھا۔ وہ تصدیق کرنا چاہتا تھا کہیں وہ بزرگ اسے غلط تو نہیں بتا رہے ہیں۔

”میں رہتا تو کہیں اور ہوں لیکن مجھے سب پتا ہے۔“ بزرگ نے بتایا۔

راحیل نے سوچا بزرگ ٹھیک کہہ رہے ہیں کیونکہ اسے معلوم تھا کہ نور پور کے پھاٹک کو عبور کرتے ہوئے ٹرین بہت ہی آہستہ ہوجاتی ہے اور اس دوران جسے اترنا ہوتا ہے اتر جاتا ہے۔ راحیل نے فیصلہ کیا کہ وہ یہاں کھڑا ہونے کی بجائے پیدل نور پور پہنچ جائے۔ اس طرح جانے میں اسے کوئی قباحت نہیں تھی۔ ویسے بھی اس کا اندازہ تھا کہ ٹرین شاید رات کے کسی پہر روانہ ہو، اور یہ بھی ممکن ہے کہ ٹرین صبح ہی یہاں سے نکلے کیونکہ ریلوے کے کام کچھوے کی چال چلتے ہیں۔ ایسی صورتِ حال میں مسافروں کا کیا حشر ہوتا ہے انہیں اس سے کوئی غرض نہیں ہوتی ہے۔ وہ تو ویسے ہی اپنی منزل کے قریب ہے اسے کیا ضرورت پڑی ہے کہ وہ اس بیابان میں کھڑا رہے۔

راحیل نے اپنا بیگ لے کر کندھے پر لٹکایا اور چل پڑا۔ سامنے اندھیرا اور ویرانی تھی۔ کچھ دور جاتے ہی راحیل نے سوچا کہ وہ واپس ہوجائے لیکن اس نے اپنے قدم نہیں روکے اور چلتا رہا۔ وہ کچھ اور دور گیا تو اسے خوف محسوس ہونے لگا۔ اس نے اپنے موبائل فون کی ٹارچ کو روشن کرلیا تھا جس کی مدد سے وہ آگے بڑھ رہا تھا۔

ٹرین پیچھے رہ گئی۔ وہ کبھی چلنے لگتا اور کبھی بھاگنا شروع کردیتا تھا۔ اس طرح اس نے بہت سا فاصلہ طے کرلیا تھا۔ اب اسے کئی ایسی نشانیاں بھی نظر آگئیں جو وہ گزشتہ بار دیکھ گیا تھا۔

اس کا سارا جسم پسینے سے شرابور ہوگیا تھا۔ خوف بھی بڑھ گیا تھا لیکن اب واپس جانا ممکن نہیں تھا۔

پھر ایک کچی سڑک آگئی اور اس کچی سڑک کے ساتھ ایک اور سڑک اندر کی طرف جاتی نظر آئی جس کے دائیں بائیں فصلیں تھیں اور ان فصلوں کے آگے اس گاؤں کے مکانات کی روشنیاں واضح دکھائی دے رہی تھیں۔ اب راحیل کا خوف بھی ختم ہوگیا تھا۔

فصلوں کو عبور کرنے کے بعد وہ گاؤں کی آبادی میں کھڑا تھا۔ اس نے رک کر اپنی سانس درست کی، رومال سے چہرے پر آیا پسینا خشک کیا اور اپنے آپ کو بہتر محسوس کرنے کے بعد آگے چل دیا۔

ابھی وہ کچھ دور ہی گیا ہوگا کہ ایک طرف سے چوکیدار نکل آیا۔ وہ راحیل کو دیکھ کر اسی جگہ رک گیا اور بارعب آواز میں بولا۔ ”کون ہے جوانا؟“

”میں راحیل ہوں۔ شہر سے آیا ہوں مجھے چاچا عنایت کے گھر جانا ہے۔“ راحیل نے بتایا۔

”عنایت ......جن کے گھر شادی ہے؟“ چوکیدار نے سوال کیا۔

”ہاں......وہی گھر ہے۔ میں اسی شادی میں شرکت کرنے شہر سے آیا ہوں۔“

”آجاؤ میرے ساتھ۔“ چوکیدار نے اپنی بیٹری کی روشنی سے پہلے اچھی طرح سے راحیل کو پیر سے سر تک دیکھا اور پھر کہا۔

راحیل اس کے پیچھے چل پڑا۔

تیسری گلی میں ایک گھر روشنیوں سے سجا ہوا تھا۔ گلی میں چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور اس پر مہمان بیٹھے خوش گپیوں میں مصروف تھے۔ اس سجے ہوئے گھر کو دیکھ کر ہی راحیل پہچان گیا کہ یہی چاچا عنایت کا گھر ہے۔ بڑا سا حویلی نما گھر اس گھر میں وہ پہلے بھی آچکا تھا۔

”ہاں یہی گھر ہے۔“ راحیل نے خود کلامی کی۔

چوکیدار اسے آگے تک لے گیا۔ گھر کے کھلے گیٹ کے پاس جا کر اس نے آواز دی۔ ”بھائی عنایت......“

تھوڑی دیر کے بعد ایک ساٹھ سال سے زیادہ عمر کا آدمی گیٹ کے پاس آتے ہی بولا۔ ”کیا بات ہے؟“

”آپ کا مہمان آیا ہے۔“ چوکیدار نے بتایا تو عنایت کی نگاہ راحیل کے چہرے پر گئی، اس نے خوشگوار حیرت سے دیکھا اور راحیل کو اپنے گلے سے لگا لیا۔

”میرا بھتیجا آیا ہے۔ تم نے تو آکر میرا دل خوش کردیا۔ تیرے باپ کو کارڈ ڈاک سے بھیجا تھا۔ آج فون کیا تو اس نے بتایا کہ کارڈ نہیں ملا......میں نے کہا، نہیں ملا تو میں آرہا ہوں تم لوگوں کو لینے۔ تیرے باپ نے کہا کہ میں نے راحیل کو بھیج دیا ہے۔“ عنایت خوشی میں بولتا جا رہا تھا۔

راحیل نے جواباً کہا۔ ”میں تو کراچی گیا ہوا تھا۔ آپ کے گاؤں کے پاس ٹرین کا انجن فیل ہوگیا۔ میں نے سوچا پیدل ہی گاؤں چلتا ہوں۔“

''تم مجھے فون کردیتے میں گاڑی میں لینے آجاتا۔''
عنایت بولا۔

''یہ مجھے خیال ہی نہیں رہا۔'' راحیل نے اپنے سر پر ہاتھ مارا۔

''چل اندر آجا۔'' عنایت کہہ کر اسے اندر لے گیا۔ اس نے سب گھر والوں کو جمع کرلیا اور سبھی راحیل کے سر پر ہاتھ پھیرنے لگے۔ سب ہی خوش تھے۔ اس کی آؤ بھگت کررہے تھے۔ ایک چہرہ ان میں ایسا بھی تھا جو ایک طرف کھڑا تھا اور اس کی نگاہیں راحیل کے چہرے پر مرکوز تھیں۔ وہ مسلسل اسے دیکھے جارہی تھی۔

اچانک راحیل کی نظر اٹھی اور اس چہرے کی طرف گئی، آنکھیں چار ہوئیں تو اس چہرے پر خود بخود مسکراہٹ آگئی اور وہ شرما کر وہاں سے چلی گئی۔ راحیل اسے دیکھ کر دل ہی دل میں بولا۔ ''جب میں پچھلی بار آیا تھا تو بھی اس سے ملاقات ہوئی تھی مگر اس طرح تو وہ شرمائی نہیں تھی۔''

☆......☆......☆

راحیل کو انہوں نے الگ تھلگ بڑا کمرا دیا تھا۔ اس کمرے میں ائرکنڈیشنڈ بھی لگا ہوا تھا اور کمرا ہوادار بھی تھا۔

راحیل اس شادی میں محض اپنے باپ کے کہنے پر آیا تھا لیکن اس لڑکی کو دیکھ کر اس نے سوچ لیا تھا کہ اب وہ جتنے دن بھی یہاں رہے گا، خوب لطف اُٹھائے گا۔ اسے کھانا بھی اسی کمرے میں کھلایا گیا تھا۔ عنایت کی اولادیں اور مہمان بھی اسی کمرے میں آکر بیٹھ گئے تھے اور اس سے باتیں کرنے لگے تھے۔ راحیل کو اس کے بعد وہ چہرہ دکھائی نہیں دیا تھا۔

باتوں کے دوران اچانک دروازہ کھلا تو دو لڑکیاں اندر آئیں۔ ان میں سے ایک نے دروازہ کھولا تھا اور دوسری کے ہاتھ میں بڑی سی ٹرے تھی جس پر کئی چائے کے کپ رکھے ہوئے تھے۔ جس نے وہ ٹرے پکڑی ہوئی تھی وہ وہی لڑکی تھی جو اس کی طرف دیکھ رہی تھی۔

اس لڑکی کا نام نازش تھا۔ اس کا رنگ سانولا تھا لیکن ایسی کشش اور خوبصورتی تھی کہ وہ کسی کو بھی اپنی طرف مائل کرسکتی تھی۔

نازش نے سب کو چائے دی۔ ٹرے راحیل کے سامنے بھی آگئی۔ ٹرے پر دو کپ رہ گئے تھے۔ ایک عام سا کپ تھا جبکہ دوسرا کپ پرچ کے اوپر رکھا ہوا تھا اور کپ بھی چینی کا تھا۔

راحیل نے جان بوجھ کر عام سے کپ کی طرف ہاتھ بڑھایا تو نازش نے جلدی سے کہا۔ ''آپ کا کپ یہ والا ہے۔''

راحیل نے مسکرا کر وہ کپ اُٹھا لیا۔ نازش کے چہرے پر بھی ایک خفیف سی مسکراہٹ آئی اور دوسرے ہی لمحے معدوم ہوگئی۔ نازش آخری کپ ایک اور مہمان کو دے کر واپس چلی گئی۔

رات دیر تک سب وہاں بیٹھے رہے۔

اگلے دن مایوں کی رسم تھی اور اس سے اگلے دن مہندی تھی۔ پھر برات اور ولیمہ تھا۔ کچھ دیر کے بعد آہستہ آہستہ اس کے کمرے سے مہمان سونے کے لیے جانے لگے۔ تھوڑی دیر کے بعد کمرا بالکل خالی ہوگیا۔

راحیل نے کمرے کی لائٹ بند کی اور بستر پر لیٹ گیا۔ وہ نازش کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ اس کے بارے میں سوچتے ہوئے وہ مسکرادیا اور خود اپنے آپ سے بولا۔ ''راحیل صاحب اس لڑکی کے ساتھ خوب دل لگی کیجیے گا۔ اپنا دیوانہ بنایئے گا۔ میٹھی میٹھی باتیں کیجیے گا۔ اسے خواب دکھایئے گا اس طرح آپ کا وقت اچھا گزر جائے گا آپ بوریت سے بچے رہیں گے اور پھر چپ چاپ اپنے شہر لوٹ جایئے گا، وہ آس کے جھولے میں جھولتی ہوئی آپ کو یاد کرتی رہے گی اور رفتہ رفتہ بھول جائے گی۔''

راحیل سوچتے ہوئے خود ہی مسکرادیا اور کمبل کھینچ کر اپنے اوپر لے لیا۔

☆......☆......☆

صبح ناشتے کی ٹرے بھی نازش اور اس کے ساتھ وہ لڑکی لے کر آئی تھی جو رات کو اس کے ساتھ چائے دینے آئی تھی۔

نازش نے ٹرے ایک طرف رکھ دی۔ راحیل نے پوچھا۔ ''لگتا ہے میری خدمت کے لیے آپ دونوں کی خاص ڈیوٹی لگائی گئی ہے۔''

''ایسی بات نہیں ہے۔ سب مہمانوں کی دیکھ بھال ہمارے ذمے ہے۔'' نازش نے جواب دیا۔

''اگر مجھے اچانک کسی چیز کی ضرورت پڑے تو میں کس کو آواز دوں؟'' راحیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''ہم دونوں میں سے کسی کو بھی آواز دے سکتے ہیں۔''

''تم دونوں کے تو مجھے نام ہی نہیں معلوم۔''

''میرا نام نازش ہے اور یہ شازیہ ہے۔'' اس نے تعارف کرایا۔

''آپ چچا عنایت کی کیا لگتی ہیں؟''

''میرے وہ ماموں ہیں۔ یہ ساتھ والا گھر ہمارا ہے۔'' نازش نے کہا۔

''مجھے اچانک کسی چیز کی ضرورت پڑ جائے تو میں چھت پر چڑھ کر آپ کو آواز دوں گا؟'' راحیل نے کہا تو دونوں ہنس دیں۔

''آپ کسی سے بھی کہہ دیں کہ نازش، یا شازیہ کو میرے کمرے میں بھیج دیں۔ یا ان سے کہہ دیں کہ مجھے فلاں چیز کی ضرورت ہے، نازش یا شازیہ سے کہہ دیں کہ وہ پہنچادیں۔'' پہلی بار شازیہ نے کہا۔

اسی اثنا میں دروازہ کھلا اور ایک عورت نے اندر جھانک کر دیکھا اور بولی۔ ''تم میں سے ایک میری بات سنو......''

شازیہ اس کے ساتھ کمرے سے چلی گئی تو راحیل نے پوچھا۔ ''آپ میری طرف دیکھ کر مسکرائی کیوں تھیں؟''

''آپ کی طرف دیکھ کر مسکرانا منع ہے کیا؟''

''ایسے ہی پوچھا ہے، تم جواب نہیں دینا چاہتیں تو نہ دو۔'' راحیل نے کہا۔

نازش دروازے کی طرف چلی گئی۔ دروازہ کھولنے سے قبل وہ رکی اور گھوم کر اس نے راحیل کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''یہ مجھے بھی نہیں پتا کہ میں آپ کی طرف دیکھ کر مسکرائی کیوں تھی۔ بس یہ پتا ہے کہ میں جب بھی آپ کو دیکھتی ہوں دل کی دھڑکن بڑھ سی جاتی ہے۔''

یہ کہتے ہی نازش کمرے سے چلی گئی۔ راحیل دم بخود کھڑا سوچتا رہ گیا کہ یہ گاؤں کی ہوکر بھی کس آسانی سے یہ بات کہہ پائے گی۔ پھر اس نے سوچا کہ یہ اس نے اچانک بات نہیں کہی۔ جب پچھلی بار وہ اپنے باپ اور ماں کے ساتھ اس گاؤں میں آیا تھا تو بھی یہ لڑکی اس کی طرف دیکھتی تھی، مسکراتی تھی اور چلی جاتی تھی۔

اس دن راحیل اور نازش کے درمیان خوب آنکھ مچولی رہی۔ دونوں نے اشاروں اور مسکراہٹوں میں ایک دوسرے سے خوب باتیں کیں۔ وہ جب بھی ایک دوسرے کے سامنے آتے ان کی اشاروں اشاروں میں باتیں شروع ہوجاتیں۔ نازش تو اس کے حصار میں ایسے آگئی تھی جیسے وہ اسی کے انتظار میں ہو۔ دراصل نازش کی بڑی خواہش تھی کہ اس کی شادی شہر کے کسی پڑھے لکھے لڑکے سے ہو۔ اس نے خود بھی میٹرک پاس کیا تھا۔ اگر اسے پڑھنے کی اجازت ملتی تو وہ اس سے بھی زیادہ پڑھتی۔ شہر اس کے اندر بسا ہوا تھا۔ وہ اکثر کہتی تھی کہ وہ گاؤں کی لڑکی نہیں ہے، جانے کیوں وہ گاؤں میں پیدا ہوگئی۔ وہ بہت کتابیں پڑھتی تھی۔ وہ کتابوں کے کرداروں میں کھو جاتی تھی۔

راحیل اسے پہلی نظر میں اچھا لگا تھا۔ اسے دیکھتے ہی نازش جیسے اس کی دیوانی سی ہوگئی تھی۔ یہی وجہ تھی کہ وہ جلد ہی راحیل کی طرف مائل ہوگئی۔

دوپہر کے بعد کچھ اور مہمانوں کی آمد ہوئی۔ وہ پانچ افراد تھے۔ ان میں ایک بڑی عمر کی عورت اور اس کا شوہر تھا۔ دو اٹھارہ اور سولہ سال کی لڑکیاں تھیں اور ایک نکلتے ہوئے قد کا نوجوان تھا۔

اس نوجوان نے بوسکی کی شلوار قمیص زیب تن کی ہوئی تھی۔ کندھے پر ایک لمبا سا رومال لٹک رہا تھا۔ سر کے بال سرسوں کے تیل سے چمک رہے تھے۔ مونچھوں کو تاؤ دے کر اس نے تلوار کی شکل دی ہوئی تھی۔ اس کے منہ میں پان تھا اور ہاتھ کی انگلیوں میں سگریٹ دبی ہوئی تھی جس کے وہ کش لے کر منہ اور ناک سے دھواں چھوڑ رہا تھا۔

اس نوجوان کی نگاہیں دائیں بائیں گھوم رہی تھیں جیسے وہ کسی کو تلاش کررہی ہوں۔ وہ سب صحن میں چارپائیوں پر براجمان تھے، لیکن اس نوجوان کی اکڑ اور نخرہ کچھ ایسا تھا جیسے وہ بہت اہمیت کا حامل ہو۔

عنایت نے راحیل کو آواز دے کر پاس بلالیا اور سب سے تعارف کراتے ہوئے بتایا۔ ''یہ میرا بھتیجا ہے راحیل......شہر سے آیا ہے۔''

بڑی عمر کے مرد نے اس کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

''عنایت، یہ کہیں اسرار احمد کا پتر تو نہیں ہے؟''

''اسرار احمد کا ہی پتر ہے۔'' عنایت مسکرایا۔

''وہ بھی آئے ہیں؟'' اس آدمی نے پوچھا۔

''وہ سارے اگلے ہفتے آئیں گے۔ راحیل کی امی کی طبیعت ٹھیک نہیں ہے۔'' عنایت نے اختصار سے بتایا۔

اس نوجوان نے اپنی ایک ٹانگ پر دوسری ٹانگ جماتے ہوئے مسکرا کر ایک ادا سے راحیل کی طرف دیکھا۔ پچھلی بار جب راحیل اپنے والدین کے ساتھ آیا تھا تو وہ نوجوان بھی گاؤں میں موجود تھا۔ ایک بات پر راحیل اور اس نوجوان کے مابین بحث ہوگئی تھی اور اس نوجوان نے

راحیل کو طنزیہ کچھ ایسی باتیں بھی کہہ دی تھیں کہ راحیل ان باتوں کا جواب اپنے ہاتھوں سے دینا چاہتا تھا کہ اچانک عنایت اور اس کے ابا اس طرف آگئے اور یوں راحیل اپنے غصے کو اپنے اندر دبا کر کھڑا رہ گیا تھا۔ اس کے بعد جب بھی موقعہ ملا تھا اس نوجوان نے کوئی نہ کوئی جملہ راحیل پر ضرور کسا تھا اور اس دوران راحیل اپنے والدین کے ساتھ واپس چلا گیا تھا اور وہ اس سے بدلہ لینے کی آرزو دل میں ہی دبائے شہر لوٹ گیا تھا۔ اس دن کے بعد اب ان کا سامنا ہوا تھا۔

''اسرار احمد بہت اچھا آدمی ہے۔'' اس آدمی نے تعریف کی۔

اس دوران شازیہ شربت لے کر آگئی۔ راحیل نے دیکھا کہ اس کے ساتھ نازش نہیں آئی تھی۔ جب شازیہ نے شربت کا گلاس اس نوجوان کی طرف بڑھایا تو اس نے بڑی ادا سے کہا۔ ''میں نے نہیں پینا شربت...... شربت کے لیے پان نکال کے پھینک نہیں سکتا۔''

''کوئی بات نہیں یہ بعد میں پی لے گا۔'' عنایت ہنسا۔ شازیہ چلی گئی اور وہ نوجوان پھر متلاشی نگاہوں سے دائیں بائیں دیکھتا رہا۔ راحیل کی سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ وہ کسے دیکھنے کی کوشش میں ہے۔

راحیل جانے لگا تو نوجوان نے ہنستے ہوئے کہا۔ ''یہ شہر والے بھی خوب ہیں ...... ابا کو ڈیڈی کہتے ہیں...... ڈیڈی......'' اس کے لہجے میں تمسخر تھا۔ راحیل رک کر جواب دینا چاہتا تھا لیکن عنایت نے بدمزگی سے بچنے کے لیے بات کا رخ کہیں اور موڑ دیا۔ راحیل وہاں سے جاتے ہوئے دل ہی دل میں کہہ رہا تھا۔ ''پچھلی بار تم بچ گئے تھے لیکن اب تجھ سے سارا حساب لے کر رہوں گا۔''

راحیل برآمدے سے ہوتا ہوا کمروں کی طرف بڑھا تو ایک طرف سے نازش نکل کر جانے لگی۔ راحیل نے اسے روک لیا۔ ''کدھر کی جلدی ہے؟''

''کام کرنے کی جلدی ہے۔ رات کو مہندی کی رسم ہے اور ابھی بہت سا کام پڑا ہوا ہے۔'' وہ بولی۔

''صبح سے تم اور شازیہ مہمانوں کی دیکھ بھال کر رہی ہو، اب جو مہمان آئے ہیں ان کی خدمت کے لیے کہاں چلی گئی تھیں؟''

نازش نے ایک نظر راحیل کی طرف دیکھا اور بولی۔ ''میں ان کے پاس نہیں جاسکتی۔''

''کیوں نہیں جاسکتی؟''

''چھوڑیں اس بات کو۔'' نازش کہہ کر تیزی سے چلی گئی۔ راحیل نے محسوس کیا کہ نازش کے چہرے پر متانت آگئی تھی اور اس کے چہرے کے تاثرات میں بھی تغیر آگیا تھا۔

وہ اس کے پیچھے چل پڑا۔ ایک کمرے میں کچھ لڑکیاں مہندی کی تیاری کر رہی تھیں۔ سب ہی مصروف تھیں کچھ نہ کچھ کر رہی تھیں۔ نازش ایک طرف کھڑی موم بتیاں نکال کر پلیٹ میں ڈال رہی تھی۔ راحیل اس کے قریب جاکر آہستہ سے بولا۔ ''تم نے بتایا نہیں کہ تم ان کے سامنے کیوں نہیں جاسکتی ہو؟''

''آپ یہاں سے چلے جائیں۔ کہیں ہم دونوں کے بارے میں کوئی بات نہ بن جائے۔'' نازش نے جلدی سے کہا۔

''ہم دونوں کے بارے میں بات بن جائے تو مجھے کیا پروا...... تمہیں اپنے ساتھ شہر لے جاؤں گا۔'' راحیل نے کہا اور نازش نے چمکتی ہوئی آنکھوں سے اس کی طرف دیکھتے ہی پوچھا۔

''اتنی ہمت ہے؟''

''آزمانا چاہتی ہو؟'' راحیل یہ کہتے ہوئے دل ہی دل میں مسکرا رہا تھا۔ وہ اپنی دانست میں ایک فلم کا مکالمہ بول رہا تھا اور نازش اسے سچ مان رہی تھی۔

''وقت آیا تو آزما بھی لوں گی۔'' نازش کہہ کر کمرے سے نکل گئی۔ راحیل پھر اس کے پیچھے چل پڑا۔

''کہو تو آج ہی چلیں شہر......'' نازش کے عقب سے راحیل نے کہا تو نازش کے چلتے قدم رک گئے۔ اس کے دل کی دھڑکن تیز ہوگئی تھی۔ وہ پھر راحیل کی طرف مڑی۔

نازش نے دیکھا کہ راحیل کے عقب میں ایک عورت کمرے سے نکل آئی تھی۔ نازش نے جلدی سے بات بنائی۔ ''میں ابھی آپ کے لیے چائے بنا دیتی ہوں۔ آپ اپنے کمرے میں جائیں۔''

راحیل ابھی سوچ ہی رہا تھا کہ نازش سے اس نے چائے کب مانگی ہے۔ اس دوران وہ عورت گزرتی ہوئی راحیل کے پاس آگئی تھی اور اس نے چلتے ہوئے کہا۔ ''شہر کے لوگ تو چائے پر ہی جیتے ہیں۔''

راحیل سمجھ گیا کہ نازش نے اسے ایسا کیوں کہا ہے۔ راحیل اپنے کمرے میں چلا گیا۔ اس نے جاتے ہی

اپنا موبائل فون نکالا اور اپنے دوست ناصر کا نمبر ملایا۔ دوسری طرف سے ناصر کی چہکتی ہوئی آواز آئی۔ ''کیسے ہو جگر...... کیسی گزر رہی ہے؟''

''کمال کی گزر رہی ہے۔ ایک ہی دن میں گاؤں کی ایک بیوٹی مجھ پر فدا ہوگئی ہے۔''

دوسری طرف سے ناصر کا قہقہہ گونجا۔ ''کیا کہتی ہے وہ؟''

''یہ پہلی لڑکی ہے جو مجھ پر ایسے فدا ہوئی ہے جیسے تیز آندھی میں بوسیدہ چھت نہیں گرجاتی۔'' راحیل نے کہا تو دونوں ایک ساتھ ہنسے۔ وہ مزید بولا۔ ''ویسے ایک بات ہے، اس لڑکی میں کشش بہت ہے۔''

''دیر کس بات کی ہے کشش چرا لے میرے دوست۔'' ناصر نے معنی خیز انداز میں خوش ہوتے ہوئے کہا۔

''ابھی تو اسے بساط پر رکھے مہرے کی طرح چلاؤں گا، اس کے دل میں گھس جاؤں گا اور پھر ایسے گاؤں سے غائب ہوکر شہر آجاؤں گا کہ بے چاری دیکھتی ہی رہ جائے گی اور یہ گانا گاتی رہ جائے گی۔ بردیسیوں سے کوئی دل نہ لگائے۔'' راحیل گنگنایا تو ناصر زور سے ہنسا۔

''کاش میں بھی وہاں ہوتا۔''

''تم وہیں رہو۔ میں کون سا اس سے شادی کر رہا ہوں۔ اچھا بعد میں فون کروں گا۔ ابھی مجھے اس کے سامنے کسی رومانٹک ہیرو کی اداکاری کرنی ہے۔'' راحیل نے کہہ کر فون بند کر دیا۔ اسی وقت دروازے میں آہٹ ہوئی۔ اس نے دیکھا تو نازش کھڑی تھی۔ راحیل کو لگا جیسے اس نے اس کی باتیں سن لی ہیں لیکن نازش ابھی آئی تھی۔

''کیا کہہ رہے تھے آپ؟''

''کیا کہہ رہا تھا؟'' راحیل نے اس کی طرف دیکھا۔

''یہ کہ میں ان کے سامنے کیوں نہیں گئی۔''

''ہاں...... کیوں نہیں گئیں؟''

''کیونکہ وہ لڑکا میرا منگیتر ہے۔'' نازش نے ایک دم سے انکشاف کیا۔ یہ سن کر راحیل کا دل چاہا کہ وہ ایک قہقہہ لگائے۔ یہ سنتے ہی راحیل کو اپنا انتقام یاد آگیا تھا۔ اس کی باتوں اور طنز کا انتقام...... وہ حساب جو ابھی پچھلا بھی باقی تھا...... وہ نازش کا منگیتر تھا اور راحیل اب اسے خوب اچھی طرح سے تڑپا سکتا تھا۔

''وہ کارٹون تمہارا منگیتر ہے؟'' راحیل کے منہ سے نکل گیا اور احساس ہوتے ہی اس نے جلدی سے کہا۔ ''میرا مطلب ہے کہ وہ لڑکا تمہارا منگیتر ہے۔''

''تم نے ٹھیک کہا کہ وہ ایک کارٹون ہے۔ مجھے ایک نظر بھی پسند نہیں آیا۔ ان پڑھ جاہل...... نہ بیٹھنے کی تمیز اور نہ بات کرنے کی۔''

''منگنی کیوں کی تھی؟''

''منگنی میں نے نہیں کی، میرے بڑوں نے کی تھی۔ لڑکی سے پسند ناپسند پوچھنے کا رواج نہیں ہوتا۔ بڑوں کے فیصلے بعض اوقات لڑکی کے لیے وہ زنجیر ہوتی ہے جس سے وہ ساری زندگی اسے باندھ کر ہلنے کے قابل بھی نہیں چھوڑتے۔''

راحیل نے اس کے اترے ہوئے چہرے کی طرف دیکھ کر کہا۔ ''تمہاری منگنی ہوچکی ہے، باہر تمہارا منگیتر بیٹھا ہوا ہے۔ تم اسے پسند نہیں کرتی ہو، تم چاہتی کیا ہو؟''

''اس شادی کے بعد ہماری بھی شادی ہوجائے گی۔ میں کیا چاہ سکتی ہوں۔'' نازش کے چہرے پر بے بسی اتر آئی۔

راحیل نے آنکھیں گھمائیں، زیرلب مسکرایا اور بولا۔ ''تم چاہتی کیا ہو، اپنے دل کی بات مجھ سے کرو۔''

''پھر آپ کیا کریں گے؟''

''میں کچھ بھی کرسکتا ہوں۔''

''مثلاً؟'' نازش نے سوالیہ نگاہوں سے دیکھا۔

''تمہیں یہاں سے لے کر اڑن چھو ہوسکتا ہوں۔ شہر لے جاسکتا ہوں۔'' راحیل نے ایسے کہا جیسے وہ واقعی یہ کر دے گا۔

نازش کچھ سوچنے لگی۔ پھر بولی۔ ''میں آپ کے اتنے قریب کیوں آئی، آپ جانتے ہیں؟ اس لیے کہ مجھے پڑھے لکھے اور تمیزدار لوگ اچھے لگتے ہیں۔ آپ کے قریب آنے کی وجہ شاید یہ بھی ہوسکتی ہے کہ میں فرار چاہتی ہوں...... اپنے ان پڑھ اور جاہل منگیتر سے فرار چاہتی ہوں۔''

''تم فکر چھوڑ دو۔ سمجھ لو کہ تم اپنے منگیتر سے فرار ہوگئی ہو۔ سمجھ لو کہ تم میرے ساتھ شہر چلی گئی ہو، وہاں ہم زندگی گزار رہے ہیں۔ شادی کے یہ تین چار دن نکال لو، ادھر میں شہر گیا اور ادھر تم اس گاؤں سے غائب ہوئیں۔''

''سوچ لیں میں سب کچھ چھوڑ دوں گی۔'' نازش نے مصمم ارادے سے اس کی آنکھوں میں جھانکا۔

"تم سب کچھ چھوڑنے کو تیار ہو اور میں سب کچھ اپنانے کو۔" راحیل نے کہتے ہوئے نازش کا ہاتھ پکڑ لیا۔ اچانک باہر کچھ شور سا سنائی دیا۔ راحیل نے اس کا ہاتھ چھوڑ دیا اور دروازے کے پاس جا کر باہر جھانکا۔ باہر نازش کا منگیتر کچھ دوسرے مہمان لڑکوں کے ساتھ کھڑا تھا اور وہ ایک دوسرے سے ایسے مذاق کر رہے تھے جیسے آپس میں لڑ رہے ہوں۔ نازش سچ کہہ رہی تھی کہ اس کا منگیتر جاہل ہے۔ اس کے بولنے کا انداز بھی عجیب سا تھا۔ ہنستا ایسے تھا جیسے وہ اپنے گلے سے دہشت ناک آوازیں نکال رہا ہو۔

نازش کے منگیتر نے جب راحیل کو دروازے میں کھڑا دیکھا تو وہ اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔ نازش کے منگیتر کا نام اصغر تھا۔ جب وہ پہلے اس گھر سے متعلق اپنے سسرال آتا تھا جو اس کے پھوپھا کا بھی گھر تھا تو اس گھر میں ہی نہیں اس گھر میں بھی اس کو خوب اہمیت دی جاتی تھی۔ آج اسے محسوس ہوا کہ شہر سے آنے والا لڑکا جیسے اس گھر میں مہمان خصوصی ہو اور اسی وجہ سے اسے اہمیت نہیں دی جا رہی ہے۔ ویسے بھی اصغر کو اس سے جلن تھی۔ اس جلن کا دھواں اس کے منہ سے کڑوے الفاظ بن کے نکلتا رہتا تھا۔ راحیل بھی اب اس سے بدلہ لینے کا سوچ چکا تھا۔

"شہری بابو کیا دیکھ رہے ہو؟ ہم تو کھل کے مزاق کرتے ہیں اور کھل کے ہنستے ہیں۔ تم جیسے شہریوں کی طرح نہیں کہ نہ ہنسنے کا پتا چلے اور نہ بات کرنے کا۔" اصغر نے کہا تو اس کے ساتھیوں نے دانت نکال کر اس کا ساتھ دیا۔

"مجھے ذرا یہ بھی بتادو کہ تم گاؤں کے لوگ روتے کیسے ہو؟" راحیل نے پوچھا۔

"ہم گاؤں کے لوگ روتے نہیں رلاتے ہیں۔" اصغر نے اس کی بات سن کر اسے گھورا۔

"چلو کوئی بات نہیں، تم مجھے مت بتاؤ کہ تم لوگ روتے کیسے ہو۔ میں نہیں تو کوئی اور سن اور دیکھ بھی لے گا کہ تم لوگ روتے کیسے ہو۔" راحیل کا لہجہ معنی خیز تھا۔ اصغر اس کی بات کا مطلب سمجھ نہیں سکا تھا۔ وہ محض اسے گھورتا رہا جبکہ راحیل فیصلہ کر چکا تھا کہ وہ اصغر کو اس کی باتوں کا مزہ چکھائے گا۔

"اچھا ان باتوں کو چھوڑ شہری بابو، یہ بتا کہ ڈیڈی کیا ہوتا ہے؟" اصغر نے تمسخرانہ لہجے میں کہا اور اپنے ساتھیوں کے ساتھ مل کر ہنسنے لگا۔

راحیل اس کی طرف دیکھتا رہا اور جب ان کے دانت نظر آنا بند ہوئے تو وہ بولا۔ "جب چور... کھڑے ہو کر بے بسی سے اپنے ابا کو پکارو گے تو پتا... ڈیڈی کیا ہوتا ہے۔" راحیل نے کہہ کر دروازہ... کر لیا۔ اصغر بند دروازے کو گھورتا رہا۔ وہ درواز... طرف بڑھا اور چاہا کہ وہ دروازے کو توڑ کے راحیل... گریبان سے پکڑ کر باہر کھینچ لائے مگر وہ خود ہی... گیا۔ اس نے سوچا کہ وہ آج رات اس وقت راحیل کو... عزت کرے گا جب خاندان کے سارے لوگ مو... ہوں گے۔

وہ وہاں سے چلا گیا۔ دروازے کے ساتھ لگی کھڑی نازش نے جب دیکھا کہ وہ چلا گیا ہے تو وہ کمرے سے با... نکل کر ایک طرف چلی گئی۔

☆......☆......☆

راحیل سوچ چکا تھا کہ وہ اصغر سے اگلا پچھلا سارا حساب چکتا کرے گا۔ اصغر کو زیر کرنے کے لیے وہ سب کچھ اپنے دماغ میں منصوبہ بندی کر چکا تھا۔ راحیل کو اس سے کوئی سروکار نہیں تھا کہ اس کے بدلہ لینے میں کون بھینٹ چڑھے گا، بس وہ بدلہ لینا چاہتا تھا، چاہیے کچھ بھی ہو۔

رات کو مہندی کی رسم تھی اور مہمانوں کی خوب گہما گہمی تھی۔ اصغر اور اس کے گھر والے نازش کے گھر میں ڈیرا جمائے ہوئے تھے اور نازش نے عنایت کے گھر سے باہر قدم نہیں رکھا تھا۔

مہندی کی رسم میں شرکت کرنے کے لیے اصغر نے خصوصی اہتمام کیا تھا تاکہ وہ سب کی نگاہوں کا مرکز بن سکے۔ اپنے آپ کو اس گھر کا جوائی ہونے کے ناطے وہ پہلے ہی ناز نخرے میں رہتا تھا۔

اس نے سفید شلوار قمیص کے ساتھ واسکٹ پہنی تھی اور سر پر سفید پگڑی باندھی تھی۔ پیروں میں تلے والا کھسا تھا۔ مونچھوں کو بھی خوب تاؤ دیا ہوا تھا اور منہ میں پان ایسے رکھا تھا جیسے اس سے اس کی شان کو چار چاند لگ رہے ہوں۔

وہ خوب اچھی طرح سے تیار ہو کر گھر سے باہر نکلا اور سیدھا عنایت کے گھر میں چلا گیا۔ سامنے ہی راحیل سے سامنا ہوگیا۔ اس نے جینز کے ساتھ ٹی شرٹ پہنی ہوئی تھی۔ راحیل اسے دیکھتے ہی ایسے مسکرایا جیسے وہ آنکھوں ہی آنکھوں میں اس کا مذاق اڑا رہا ہو۔ اصغر کو اس کے اس طرح دیکھنے سے غصہ آگیا تھا۔ دونوں کے درمیان کوئی

بات نہیں ہوئی اور دونوں ہی ایک دوسرے کو دیکھتے، گھورتے پاس سے گزر گئے تھے۔

اس وقت عنایت کے گھر میں ہر کوئی اپنی اپنی تیاری میں مصروف تھا۔ اصغر سیڑھیاں چڑھ کر اوپر چلا گیا اور ایک کمرے کا دروازہ ایک جھٹکے سے کھول کر اندر جھانکا، سامنے نازش کھڑی بالوں میں کنگھی کر رہی تھی۔ اس کے پاس ہی شازیہ بھی کھڑی اپنے کپڑوں کا جائزہ لے رہی تھی۔ اصغر کو یوں اچانک بغیر دروازہ کھٹکھٹائے کھڑا دیکھ کر نازش کو غصہ تو آیا کہ وہ کچھ کہہ دے لیکن وہ چپ رہی۔

اصغر نے اپنا منہ ہلاتے ہوئے اس کی طرف مسکرا کر دیکھا اور بولا۔ "ذرا دیکھ کے بتا کیسا لگ رہا ہوں؟"

جواب دینے کی بجائے نازش نے منہ دوسری طرف کر لیا۔ اس کے چہرے پر غصہ عیاں تھا۔ شازیہ کو بھی اس کا اس طرح سے اچانک کمرے میں آنا اچھا نہیں لگا تھا۔ وہ بھی ایک طرف ہوگئی تھی۔ اصغر ڈھٹائی سے آگے بڑھا اور نازش کے پاس جا کر بولا۔ "تجھ سے پوچھ رہا ہوں، کیسا لگ رہا ہوں؟ تیار ہونے کے بعد سب سے پہلے تیرے پاس آیا ہوں۔"

"شازیہ میں دوپٹا استری کر کے آئی۔" نازش نے اس بار بھی جواب دینے کی بجائے اپنا دوپٹا اُٹھایا اور باہر جانے لگی تو ایک دم اصغر اس کے سامنے آگیا اور اپنے چہرے پر مسکراہٹ لا کر اسے گھورتے ہوئے بولا۔

"میں کسی اور زبان میں بات کر رہا ہوں جو تجھے سمجھ نہیں آ رہی۔"

"مجھے ایک کپ چائے کا مل سکتا ہے؟" اچانک پیچھے سے راحیل نے آ کر کہا تو نازش کے ساتھ ساتھ اصغر بھی اس کی طرف متوجہ ہوگیا۔

"مہندی کی رسم شروع ہونے والی ہے اس وقت چائے بنانا مشکل ہے۔" نازش نے جواب دیا۔

"کوئی بات نہیں، میں چائے پیے بغیر ہی گزارا کر لیتا ہوں۔" راحیل مسکرایا اور دروازے میں کھڑے اصغر کو دیکھتا رہا۔ اصغر کو یہ بات خار کی طرح لگی تھی کہ نازش نے راحیل کی بات کا فوراً جواب دیا تھا۔ اصغر کھڑا راحیل کو گھور رہا تھا اور اس دوران نازش تیزی سے کمرے سے چلی گئی تھی۔ راحیل بھی کھسک گیا۔ اصغر کے لیے یہ روایت برداشت کرنا مشکل تھا۔ اسے حیرت تھی کہ نازش نے اس کی کسی بات کا جواب نہیں دیا تھا اور راحیل نے ایک بار چائے کا کہا تھا تو اس نے فوراً اسے جواب دیا تھا۔

اصغر کے دل میں شک کا بیج ابھرا۔ اس نے سوچا ان دونوں کے بیچ کوئی چکر تو نہیں ہے؟ کہیں نازش اس شہری کے لیے اسے نظر انداز تو نہیں کر رہی ہے؟ اس نے اپنا ہاتھ غصے سے جھٹکا اور ان دونوں پر نظر رکھنے کے ساتھ ساتھ راحیل کو سب کے سامنے ذلیل کرنے کے بارے میں بھی سوچنے لگا۔

☆......☆......☆

رات کا اندھیرا چھا گیا تھا لیکن عنایت کا گھر روشنیوں میں نہایا ہوا تھا۔ اس کے گھر کے بڑے سے صحن میں سارے مہمان جمع تھے اور مہندی کی رسم شروع ہونے والی تھی۔ دولہا کمرے سے نکل آیا تھا۔

اصغر ایک طرف کھڑا تھا۔ اس کی نگاہیں راحیل اور نازش پر مرکوز تھیں۔ اس نے ایک بار دونوں کو ایک دوسرے کی طرف دیکھتے اور مسکراتے ہوئے بھی دیکھ لیا تھا۔ اس کا شک اب یقین میں بدل گیا تھا کہ دونوں کے بیچ کچھ ہے۔ اصغر کے اندر آگ سی جلنے لگی تھی۔

مہندی کی رسم کے دوران عنایت نے جو اہمیت راحیل کو دی تھی وہ اصغر کو نہیں ملی تھی۔ اصغر پھٹنے کو بالکل تیار تھا۔ وہ کوئی بہانہ ڈھونڈ رہا تھا کہ وہ کسی طرح سے راحیل کو ذلیل کرنے کے لیے اپنے اندر کا غبار اس پر نکال دے، لیکن اس کو کوئی بہانہ نہیں ملا اور مہندی کی ساری رسم ہوگئی اور وہ راحیل کو کچھ نہیں کہہ سکا۔

رسم مہندی سے فارغ ہو کر جب سب کھانا کھانے لگے تو ایک طرف ایک میز اور اس کے گرد تین کرسیاں رکھ دی گئیں۔ پھر اس پر کھانا چن دیا۔ ایک کرسی پر راحیل کو بیٹھا دیا اور دوسری کرسی پر جلدی سے اصغر آ کر بیٹھ گیا۔ وہ بیٹھتے ہی بولا۔ "ضروری نہیں ہے کہ ڈیڈی کا بچہ ہی کرسی پر بیٹھ کر کھانا کھائے، ہم بھی کسی سے کم نہیں ہیں۔"

راحیل اس کی بات سن کر مسکرا دیا اور کھانا کھانے لگا۔ اصغر کھانا کھانے کے دوران کوئی نہ کوئی ایسی بات کرتا رہا تھا کہ راحیل کو غصہ آ جائے۔ راحیل اس کی ہر بات چپ چاپ سنتا رہا۔ جب اصغر ذرا چپ ہوا تو راحیل نے اس سے پوچھا۔ "تم نے ایک محاورہ سنا ہے؟ مگر تجھے کیا پتا کہ محاورہ کیا ہوتا ہے۔ تمہاری آسانی کے لیے بتاتا ہوں کہ تم نے وہ بات سنی ہے، جو بڑی مشہور ہے؟"

"کونسی بات؟" اصغر نے اسے گھورا۔

''سوسنار کی ایک لوہار کی۔'' راحیل بولا۔

''یہ کیا بات ہے۔'' اصغر عجیب سے انداز میں ہنسا اور سالن میں سے مرغی کی ٹانگ پکڑ کر سیدھا اپنے منہ کی طرف لے گیا۔

''بس اس بات کو یاد رکھنا۔ جلدی اس بات کا مطلب سمجھ میں آجائے گا۔'' راحیل کہہ کر اُٹھ گیا۔ اصغر سوچتا رہا کہ یہ اسے کیا بین سنا کر گیا ہے۔ لیکن اس کی سمجھ میں بات نہیں آئی۔

☆......☆......☆

راحیل اور اصغر کی لفظی جنگ بڑھتی جارہی تھی۔ اصغر کے طنزیہ جملے جو وہ راحیل کی طرف اچھالتا تھا اب دوسروں کے کانوں تک بھی جانے لگے تھے۔ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہ راحیل کو دوسروں کے آگے ذلیل کرے۔ راحیل اس کی ہر بات کو برداشت کرتے ہوئے شادی کے ختم ہونے کا انتظار کررہا تھا۔

اسی طرح برات اور ولیمہ بھی اپنے اختتام کو پہنچ گیا تو راحیل نے موقع دیکھتے ہی نازش کو روک لیا۔

''میں آج رات واپس جارہا ہوں۔''

''اتنی جلدی......'' نازش چونکی۔

''بہت دن گزار لیے ہیں۔ ویسے میرا جانے کا تو صبح کا ارادہ تھا۔ رات کو جانے کا اس لیے سوچا تھا......'' راحیل کہتے کہتے رک گیا اور معنی خیز انداز میں اس کی طرف دیکھنے لگا۔

''رات کو جانے کا کیوں سوچا؟'' نازش نے جلدی سے پوچھا۔

راحیل کچھ توقف کے بعد بولا۔ ''میں چاہتا ہوں کہ تم میرے ساتھ چلو......ہم شہر چلتے ہیں۔''

راحیل کی بات سن کر نازش کی آنکھوں میں حیرت تیرنے لگی۔ ''میں بھی ساتھ چلوں؟ مگر کیسے؟''

''میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔ تمہیں اپنانا چاہتا ہوں۔ تمہارے گھر والوں سے بات کروں گا تو وہ نہیں مانیں گے، کیونکہ تمہاری منگنی ہوچکی ہے اور میں تمہارے بغیر رہ نہیں سکتا۔'' راحیل نے کچھ جذباتی ہوتے ہوئے کہا۔

نازش بھی راحیل کو پسند کرنے لگی تھی۔ وہ اصغر کو ویسے ہی پسند نہیں کرتی تھی اور یہ بھی جانتی تھی کہ کچھ دنوں کے بعد اس کی شادی کے دن بھی رکھ دیے جائیں گے اور وہ ساری زندگی اس جاہل کے ساتھ باندھ دی جائے گی جسے نہ تو بات کرنے کی تمیز ہے اور نہ ہی اُٹھنے بیٹھنے کی۔

''تم کیا سوچ رہی ہو؟'' گم صم نازش کو دیکھ کر راحیل نے پوچھا۔

''کیا آپ واقعی میرے بغیر رہ نہیں سکتے؟''

''میں سچ کہہ رہا ہوں۔''

''اب آپ چاہتے ہیں کہ میں اپنے گھر والوں کو بتائے بغیر آپ کے ساتھ شہر چلوں؟'' نازش نے کہا۔

''میں یہی چاہتا ہوں۔ شہر جا کر ہم نکاح کرلیں گے۔''

''یہ مناسب نہیں ہے کہ میں اس طرح سے آپ کے ساتھ چلی جاؤں۔'' نازش نے انکار کردیا۔

''اگر ہم بات کریں گے تو تمہارے گھر والے ہی کیا......تمہارا منگیتر تجھے جان سے مار دے گا۔''

''جب میں رات کے اندھیرے میں گھر کی دہلیز پار کر جاؤں گی تو پھر یہ لوگ مجھے زندہ چھوڑیں گے کیا؟''

''پھر ان کی ہمت نہیں ہوگی کہ یہ تمہیں چھو بھی سکیں۔ کیونکہ تم میری بیوی بن چکی ہوگی۔ تمہارا پورا تحفظ کرنا میری ذمہ داری ہوگی۔'' راحیل نے کہا۔

نازش پھر سوچنے لگی اور بولی۔ ''آپ کے گھر والے مجھے قبول کرلیں گے؟''

''میں اپنے گھر والوں سے بات کرچکا ہوں۔ ان کو کوئی اعتراض نہیں ہے اور پھر ہمارے خاندان میں کسی کی پسند اور ناپسند پر کوئی اعتراض نہیں کرتا۔'' راحیل نے کہا۔

''اگر آپ کے گھر والے راضی ہیں تو ان کو ہمارے گھر بھیج دیں۔ وہ میرا رشتہ مانگیں۔''

''اصغر اس بات کو برداشت کرے گا؟ تمہارا بھائی اصغر کے ساتھ ہر وقت رہتا ہے۔ دونوں میں دوستی بھی ہے۔ دونوں ہنگامہ کھڑا کردیں گے اور جب میرے گھر والوں کی بے عزتی ہوگی تو پھر ہم دونوں پوری زندگی کبھی نہیں مل سکیں گے۔'' راحیل بولا۔ نازش پھر سوچ میں پڑ گئی، وہ ٹھیک کہہ رہا تھا۔

نازش کے پاس اصغر سے جان چھڑانے کا راستہ تھا۔ جب وہ راحیل کی بیوی بن جائے گی تو راحیل اور اس کے گھر والے اسے تحفظ دیں گے۔ اصغر کی جرأت نہیں ہوگی کہ وہ کچھ کرسکے۔ رفتہ رفتہ سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس کے گھر والوں کو اصغر سے ہزار درجے اچھا داماد مل جائے گا، کھاتے پیتے لوگ مل جائیں گے، انہیں کیا مسئلہ ہوگا......سب ٹھیک ہوجائے گا۔

نازش خود ہی کڑی سے کڑی ملانے لگی۔ راحیل نے اسے کہا۔ ''تم میرا یقین کرو اور میرے ساتھ چلو۔ میرا دوست گاڑی لے کر آرہا ہے۔ وہ ہمیں ریلوے اسٹیشن تک چھوڑ دے گا۔ ہم ٹرین سے شہر پہنچ جائیں گے۔ اس کے بعد چچا عنایت کو میرے ڈیڈی سمجھا دیں گے اور وہ سب کچھ سنبھالنے پر مجبور ہوجائیں گے۔''

''ہم پہلے ہی کیوں نہ ماموں عنایت کو بیچ میں ڈال لیں۔'' نازش اس خیال سے چونکی۔

''جب تک ہم دونوں کا نکاح نہیں ہوگا۔ اصغر اور تمہارا بھائی کچھ نہیں ہونے دے گا۔'' راحیل نے کہا۔ ''بس میں اور کچھ نہیں جانتا۔ تم ایک، دو جوڑے کپڑوں کے لے لو اور جیسے ہی گاڑی آئے گی میں تم کو اشارہ کردوں گا۔ تم اس جگہ پہنچ جانا، گاڑی میں بیٹھ کر ریلوے اسٹیشن جائیں گے اور پھر شہر......'' راحیل دوٹوک کہہ کر چلا گیا۔

نازش سوچوں کے گرداب میں پھنس چکی تھی۔ اس کی سوچیں کہیں اور وجود کہیں تھا......اس گرداب میں اس نے فیصلہ کرلیا کہ جاہل اصغر سے جان چھڑانے کا یہی ایک طریقہ ہے۔ جب وہ راحیل کے نکاح میں آجائے گی تو پھر اسے کیسا ڈر؟

نازش نے اپنے دو سوٹ ایک چھوٹے بیگ میں ڈال لیے۔ شادی کے تین دن کے ہنگاموں نے سب کو تھکا دیا تھا اس لیے وہ سو گئے تھے، بہت سے چارپائی پر بیٹھے ابھی بھی گپیں مار رہے تھے۔ راحیل بہت پہلے سب سے اجازت لے کر جاچکا تھا اور جانے سے پہلے اس نے نازش سے کہہ دیا تھا کہ وہ رات دس بجے ٹیوب ویل کے پاس آجائے وہاں گاڑی کھڑی ہوگی۔

اصغر نے دیکھ لیا تھا کہ راحیل اجازت لے کر چلا گیا ہے۔ وہ اسی انتظار میں تھا۔ وہ جانتا تھا کہ سب جلدی سو جائیں گے اور وہ آج رات کو نازش کے پاس جا کر اس سے پوچھے گا کہ راحیل کے ساتھ اس کا کیا تعلق ہے۔

اصغر اس انتظار میں تھا اور سب اپنی اپنی چارپائیوں پر تھے۔ عنایت کا صحن مہمانوں کی چارپائیوں سے بھرا ہوا تھا۔ اصغر نے اپنی چارپائی عنایت کے گھر میں لگوائی تھی تاکہ وہ نازش سے مل سکے۔ وہ جانتا تھا کہ نازش اسی گھر میں رکی ہوئی ہے۔ نازش نے بھی اصغر کو پتا نہیں چلنے دیا تھا اور وہ خاموشی سے اپنے گھر میں چلی گئی تھی۔

نازش کے گھر میں صرف اصغر کے گھر والے سوئے ہوئے تھے۔ اس لیے وہ آسانی سے گھر سے باہر نکلی اور گلی سے ہوتی ہوئی ٹیوب ویل کے پاس پہنچ گئی۔ وہاں کار کھڑی تھی۔ اندر بیٹھے راحیل نے دیکھ لیا تھا اس نے جلدی سے دروازہ کھولا، نازش اندر بیٹھ گئی اور کار اس جگہ سے نکل گئی۔

☆......☆......☆

اصغر کی نیت میں فتور تھا۔ وہ نازش کو راحیل کی باتوں میں لا کر دباؤ ڈال کر اپنا مقصد بھی پورا کرنا چاہتا تھا۔ جب اصغر کو یقین ہوگیا کہ سب سوگئے ہیں تو وہ بغیر آواز نکالے چارپائی سے اُٹھا اور اندر چلا گیا۔

اس کا رخ اس کمرے کی طرف تھا جہاں نازش اور شازیہ ہوتی تھیں۔ کمرے کے پاس جا کر اس نے پہلے کان لگا کر کچھ سننے کی کوشش کی اور پھر آہستہ سے دروازہ کھول دیا۔ کمرے میں اندھیرا تھا۔ وہ کچھ دیر اسی جگہ رک گیا۔ جب اس کی نگاہیں اس اندھیرے کی عادی ہوگئیں تو اسے کچھ دھندلا دھندلا سا دکھائی بھی دینے لگا۔ اصغر نے چاروں طرف نظر پھیری...... جتنا وہ دیکھ سکا اس کے مطابق اس کمرے میں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس نے دیوار پر ہاتھ رکھا اور ٹٹولتا ہوا سوئچ بورڈ سے اس کا ہاتھ ٹکرایا تو اس نے ایک ایک کرکے سارے بٹن گرا دیے ایک بٹن کے گرنے سے کمرا روشن ہوگیا۔ کمرا خالی تھا۔

اصغر نے لائٹ بند کردی اور باہر جانے کے لیے جونہی اس نے دروازہ کھولا سامنے شازیہ کھڑی تھی جو نیچے جانے کے لیے کمرے سے باہر نکلی تھی اور اصغر کو دیکھ کر اسی جگہ رک گئی تھی۔ اصغر اسے دیکھتے ہی ٹھٹک گیا۔

''کیا ڈھونڈ رہے ہیں آپ؟'' شازیہ نے پوچھا۔

''نازش کہاں ہے؟'' اصغر نے سوال کیا۔

''آج وہ اپنے گھر سوئی ہے۔'' شازیہ نے بتایا تو اصغر کا منہ بن گیا۔ پھر بولا۔ ''میں یہاں کمرے میں ہوں۔ تم اسے بلا کر لاؤ۔''

''میں کیسے بلا کر لاؤں، ان کا دروازہ بند ہوگا اور وہ سب سو چکے ہوں گے۔'' شازیہ نے جواب دیا۔

''دیوار پھلانگ کے چلی جاؤ۔''

''یہ کام میں اس وقت نہیں کرسکتی۔''

''مجھے اس سے ضروری کام ہے۔''

''خود اس کے گھر چلے جائیں۔'' شازیہ کہہ کر چلی گئی اور اصغر پیچ وتاب کھاتا رہا۔ اصغر نے جو سوچا تھا اس کے

برعکس ہوا تھا۔ وہ کچھ دیر کھڑا رہا اور پھر اپنی چارپائی کی طرف چلا گیا۔

اپنی چارپائی پر بیٹھتے ہی اس نے سوچا کہ وہ خود دیوار پھلانگ کر نازش کے گھر جا سکتا ہے۔ اوپر چھت کی دیواریں اونچی نہیں تھیں۔ وہ اس گھر میں جا کر اگر نازش سے بات کرنے میں کامیاب ہوگیا تو ٹھیک اور اگر کسی نے دیکھ لیا تو وہ صاف کہہ دے گا کہ اس گھر میں اسے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے وہ دیوار پھلانگ کر ادھر آگیا۔ دروازہ اس لیے نہیں کھٹکھٹایا تاکہ کسی کی نیند خراب نہ ہو۔

اصغر کے پاس بہانہ معقول تھا۔ چنانچہ وہ اٹھا اور اوپر چلا گیا۔ آسانی سے دیوار پھلانگ کر دوسری طرف گیا اور سیڑھیاں اتر گیا۔ کشادہ صحن میں سب کی چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور سبھی تھک کر سوئے ہوئے تھے۔

اصغر برآمدے سے ہو کر ابھی ایک کمرے میں گیا اور وہاں سے نکل کر وہ دوسرے کمرے میں جانے لگا تو اسے ایسا لگا جیسے ابھی کوئی دروازے سے باہر نکلا ہے۔ ایک لمحے کے لیے وہ اسی جگہ رک کر دروازے کو دیکھتا رہا۔ اندھیرے میں وہ یہ نہیں دیکھ سکا تھا کہ دروازہ اندر سے بند ہے کہ کھلا ہوا ہے۔

اصغر سوچنے کے بعد پھر دوسرے کمرے میں چلا گیا۔ وہ کمرا بھی خالی تھا۔ کمرے سے باہر نکلا تو اس کا دھیان پھر دروازے کی طرف چلا گیا۔ اپنا شک نکالنے کے لیے وہ دروازے کے پاس چلا گیا۔ دروازے کو کنڈا نہیں لگا ہوا تھا۔ اس نے دروازہ کھول کر سنسان گلی میں جھانکا۔

ابھی وہ دروازے میں ہی کھڑا تھا کہ نازش کی ماں کی آواز آئی۔ ”کون ہے دروازے میں ؟“

اصغر ایک دم سے گھبرا گیا۔ وہ بولا۔ ”میں ہوں اصغر...... مجھے نیند نہیں آرہی تھی اس لیے میں ادھر آگیا۔ رات کو دروازہ کھلا چھوڑ کر سوتے ہیں آپ لوگ؟“

”دروازہ تو میں نے خود اندر سے بند کیا تھا۔“

”دروازہ کھلا تھا۔“

”یہ کیسے ہوسکتا ہے۔“ نازش کی ماں بھی تشویش سے اُٹھ کر دروازے کے پاس چلی گئی۔ نازش کا باپ اور بھائی بھی جاگ گئے۔ سب سوچنے لگے کہ دروازہ کیسے کھلا رہ گیا جبکہ نازش کی ماں کو اچھی طرح سے یاد بھی تھا اور نازش کے باپ نے چارپائی پر لیٹنے سے پہلے اپنی عادت کے مطابق پوچھا بھی تھا کہ ”دروازے کا کنڈا لگا دیا ہے؟“

بہرحال سب پھر لیٹ گئے۔ اصغر کے لیے چارپائی بھی بچھا دی۔ نازش کی ماں کو جانے کیوں بے چینی ہو رہی تھی۔ وہ اُٹھی اور پچھلے کمرے میں چلی گئی۔ اس وقت وہ دنگ رہ گئی جب کمرے میں نازش نہیں تھی۔

☆......☆......☆

گاڑی راحیل کا دوست ناصر چلا رہا تھا۔ راحیل اس کے برابر والی سیٹ پر براجمان تھا۔ نازش پچھلی سیٹ پر بیٹھی ہوئی تھی۔ وہ سہمی اور ڈری ہوئی تھی۔ اس نے یہ قدم اُٹھا تو لیا تھا لیکن اب اس کے دل پر کچھ پچھتاوا سا بن کے ڈس بھی رہا تھا۔ اس وقت اسے قرار آجاتا تھا جب وہ یہ سوچتی تھی کہ راحیل سے نکاح کے بعد سب کچھ ٹھیک ہوجائے گا۔ اس جاہل اور ان پڑھ سے جان چھوٹ جائے گی۔ اس کے گھر والے بھی رضامند ہوجائیں گے۔

اس گاؤں سے کچھ فاصلے پر ایک چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن تھا۔ گاڑی اس جگہ پہنچ گئی تھی۔ راحیل اور ناصر گاڑی سے باہر نکلے اور نازش کو لے کر راحیل وہاں سے چلا گیا۔ اندر کچھ مسافر بیٹھے ہوئے تھے، ایک ٹرین آرہی تھی اسے پانچ منٹ کے لیے اس جگہ رکنا تھا اور مسافر اتار اور چڑھا کر چلے جانا تھا۔

”تم اس جگہ بیٹھو میں ٹکٹ لے کر آیا۔“ راحیل نے نازش کو ایک بینچ پر بیٹھنے کے لیے کہا۔ نازش اس بینچ پر بیٹھ گئی۔ راحیل ایک طرف چلا گیا۔

نازش اس جگہ ڈری سہمی اور اس بیچ میں حوصلہ پکڑتی لڑکی کی طرح براجمان تھی۔ راحیل کو گئے بیس منٹ ہوگئے تھے۔ اب تو نازش کی متلاشی نگاہیں بھی اس طرف دیکھنے لگی تھیں جس طرف راحیل گیا تھا۔ مزید وقت گزر گیا تھا اور راحیل کی واپسی نہیں ہوئی تھی۔ اس دوران ٹرین آئی، اس جگہ رکی، مسافر اترے اور سوار ہونے والے سوار ہوگئے...... ٹرین بھی چلی گئی۔ تھوڑی دیر کے بعد وہ چھوٹا سا ریلوے اسٹیشن سنسان ہوگیا۔ چاروں طرف گہرا سکوت چھا گیا۔ اب نازش کے اندر بے چینی دوڑنے لگی۔ وہ بار بار اس طرف دیکھ رہی تھی جس طرف راحیل گیا تھا۔ اسے ڈر بھی لگنے لگا تھا۔

کچھ انتظار کے بعد نازش اس طرف چل دی جدھر راحیل گیا تھا۔ کچھ ہی فاصلے پر ٹکٹ والی کھڑکی تھی جو بند تھی اور اس جگہ کوئی بھی نہیں تھا۔ اردگرد بھی کوئی نہیں تھا۔ وہ گھبرا کر واپس ہوئی تو ایک اسٹور میں ایک آدمی اونگھ رہا تھا۔

نازش نے دیکھا اور مضطرب واپس اسی جگہ آگئی۔ راحیل کا دور تک کوئی نام و نشان نہیں تھا۔ نازش کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھنے لگ جاتی، اس کی بے چینی، خوف اور اندیشے دوچند ہوتے جا رہے تھے۔

☆......☆......☆

ناصر دونوں کو گاڑی سے اتار کر کہیں نہیں گیا تھا۔ اس نے کار اس جگہ سے کچھ فاصلے پر کھڑی کر دی تھی۔ تھوڑی دیر کے بعد ہی راحیل بھاگتا ہوا آیا اور اپنی سیٹ پر بیٹھتے ہی مسکراتے ہوئے بولا۔ ”چلو...... نکلو......“

ناصر نے کار اسٹارٹ کی اور اس جگہ سے گاڑی آگے لے گیا۔ راحیل عجیب سے انداز میں ہنسا۔ ناصر بھی اس کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ راحیل بولا۔ ”اب پتا چلے گا اس اصغر کے بچے کو، جب نازش نہیں ملے گی تو ڈھونڈتا پھرے گا...... اس کا شک مجھ پر جائے گا کہ میں نازش کو لے گیا ہوں لیکن میں تو اکیلا تمہارے ساتھ شہر جا رہا ہوں...... کیوں ناصر؟“

”ہاں...... میں اس بات کا گواہ ہوں اور ابھی راستے میں سے میں نے اپنے ماما جی کو بھی لینا ہے، وہ بھی اس بات کے گواہ ہوں گے کہ صرف ہم دونوں گاڑی میں تھے۔“ ناصر بولا۔

”یہ بھی بڑا خوبصورت اتفاق ہے کہ تمہارے ماما جی کو شہر جانا تھا اور تم نے ان سے کہہ دیا کہ واپسی پر انہیں ساتھ لیتے جائیں گے۔“

”جب تمہارا فون آیا اور تم نے مجھے کہا کہ گاؤں سے آکر مجھے لے جاؤ تو میں نے امی کو بتایا کہ میں راحیل کو لینے جا رہا ہوں۔ اسی وقت ماما جی کی بات امی سے ہو رہی تھی۔ انہوں نے رات کو نکلنا تھا۔ امی نے انہیں روک دیا کہ ناصر نے آنا ہے وہ راستے سے لے لے گا، میں نے بھی ہامی بھر لی......“

”یہ بات ہمارے حق میں بہت اچھی جائے گی۔“ راحیل ایک بار پھر مسکرایا۔ ”بہت باتیں کرتا تھا وہ...... طنز کے گولے برساتا تھا۔ میں نے بھی سوچ لیا تھا ایسا ڈراما کروں گا کہ اصغر کی چیخیں پورا گاؤں سنے گا۔“

راحیل کو اس بات کی کوئی پروا نہیں تھی کہ اصغر کی باتوں اور اس کے طنز کا بدلہ لینے کے لیے جو طریقہ اس نے اختیار کیا تھا، اس میں بے قصور نازش کو قربانی کے بھینٹ چڑھا دیا تھا۔ اسے اپنے بدلے سے سروکار تھا، اس بدلے میں کون قربانی کے بکرے کی طرح کٹ رہا ہے، اس کی اسے کوئی پرواہ نہیں تھی۔ اصغر سے نفرت اور خلش کا نتیجہ نازش کو ایسے بھگتنا پڑے گا یہ نازش کے گمان میں بھی نہیں تھا۔

راحیل اپنا بدلہ لے کر بہت خوش تھا۔ ان کی کار تیزی سے آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ راستے میں ایک علاقہ آتا تھا وہاں سے انہوں نے ناصر کے ماموں کو گاڑی میں بیٹھایا اور وہ گاڑی پھر شہر کے سفر پر رواں دواں ہوگئی۔

☆......☆......☆

ماں کی بے چینی اور پریشانی اس وقت اور بھی زیادہ بڑھ گئی جب اس نے پورا گھر دیکھ لیا اور نازش نہیں ملی۔ اس کے بعد وہ عنایت کے گھر چلی گئی، شازیہ سے پوچھا، اس کا سر جب نفی میں ہلا تو اس کی ماں کو جیسے یقین سا ہوگیا کہ نازش گھر سے چلی گئی ہے۔ کیوں گئی ہے؟ اس سوال نے اس کے دماغ میں جنم نہیں لیا تھا۔

اس کے بعد نازش کی ماں نے نازش کے باپ سے بات کی، وہ سیدھا عنایت کے پاس گیا اور اسے بات سے آگاہ کیا، انہوں نے مل کر دونوں گھروں کی تلاشی لی لیکن نازش کا سراغ نہیں ملا۔

اصغر جو پہلے ہی نہیں سویا تھا اور لیٹا ہوا سب دیکھ رہا تھا، پھر وہ ایک دم سے اُٹھا اور اس نے نازش کی ماں سے پوچھا۔ ”بات کیا ہے؟“

”کچھ نہیں...... تم سو جاؤ۔“ نازش کی ماں نے پریشانی کے عالم میں کہا۔

”کوئی بات ہے ضرور۔ آپ کا پریشان چہرہ بتا رہا ہے کہ کوئی بات ہے۔“ اصغر سامنے کھڑا ہوگیا تھا۔ اصغر کی آواز سے سبھی سوئے ہوئے اُٹھ کے بیٹھ گئے تھے۔ عنایت بھی اس طرف آگیا تھا۔ یوں ان کو بتانا ہی پڑا کہ نازش غائب ہے۔ یہ سنتے ہی اصغر پھٹ پڑا۔

”مجھے پہلے ہی شک تھا۔ وہ شہری اس کے کبھی دائیں ہوتا تھا اور کبھی بائیں...... دونوں کے بیچ باتیں بھی چلتی تھیں۔ وہ اسی کے ساتھ بھاگی ہے۔“

”پتر...... سوچ سمجھ کے بولو۔“ عنایت نے جلدی سے کہا۔

”اب بھی سوچ سمجھ کے بولوں؟ اب تو خون کی نہریں بہہ جائیں گی۔“ اصغر گلا پھاڑ کر بول رہا تھا۔

”آہستہ بولو۔ سارے گاؤں والوں کو سنا کر ہماری

عزت کا جنازہ نکالنا چاہتے ہو۔'' نازش کا باپ بولا۔
''ابھی جنازہ نکلنا ہے کیا؟ جنازہ تو نکل چکا ہے، اب صرف دفنانا ہے۔'' اصغر نے کہا۔
''راحیل ایسا نہیں کرسکتا۔وہ خاندانی لوگ ہیں۔'' عنایت بولا۔
''اس کا مطلب ہے کہ نازش خاندانی نہیں تھی جو چلی گئی۔'' اصغر کو بات کا بتنگڑ بنانے کا موقع مل رہا تھا۔
''میں نے یہ بھی نہیں کہا۔وہ ہماری عزت ہے۔'' عنایت جلدی سے بولا۔ اصغر اس وقت پاگل ہورہا تھا۔اسے نازش کے جانے سے زیادہ اس بات کا دکھ تھا کہ جس سے اس کی خلش تھی وہ اس کی منگیتر کو لے گیا۔اس نے اس کے منہ پر ایسا طمانچہ مارا ہے جس کی گونج اس وقت سبھی سن رہے تھے۔ اب اسے نازش سے زیادہ راحیل کو سبق سکھانے کا زیادہ بھوت سوار تھا۔
''میرے ساتھ ابھی شہر چلیں۔نازش کو راحیل ہی لے کر گیا ہے۔'' اصغر نے زور دے کر کہا۔
عنایت نے اس کی بات سن کر نازش کے والدین کو مخاطب کیا۔'' آپ لوگ اچھی طرح سے تسلی کرلو کہ نازش کہاں ہے۔تین، چار دن شادی کے کاموں میں وہ اس طرح سے مصروف رہی ہے کہ تھک کر کہیں سوئی ہوگی۔میں اپنے گھر کا ایک ایک کمرا دیکھتا ہوں۔''
''یہ سب دل کو تسلی دینے والی باتیں ہیں۔آپ لوگ وقت ضائع مت کریں میرے ساتھ ابھی شہر چلیں۔'' اصغر پھر غصے سے بولا۔
''تم ابھی اطمینان رکھو۔'' عنایت کو اس کا بولنا ناگوار گزر رہا تھا۔وہ سب نازش کی تلاش کے لیے گھر کا ایک ایک کمرا دیکھنے لگے۔اس دوران اصغر غصے کو منہ پر سجائے ٹہلتا رہا۔
جب سب نے اطمینان سے ایک ایک کمرا دیکھ لیا اور نازش نہیں ملی تو سب کو یقین ہونے لگا کہ اصغر صحیح کہہ رہا ہے۔سب کے چہرے اتر گئے تھے۔عنایت کو بھی تاسف ہونے لگا تھا اور وہ سوچنے لگا کہ راحیل پر اسے یقین تھا اور اس نے اس کا یقین توڑ دیا ہے۔
ایک بار پھر سب نازش کے گھر کے صحن میں جمع تھے۔سب کے چہرے اترے ہوئے تھے اور اصغر سب کی طرف دیکھ رہا تھا۔
''میں نے کہا تھا وہ نہیں ملے گی۔وہ اس کے ساتھ چلی گئی۔ابھی میرے ساتھ اس کے گھر شہر چلو تاکہ دن ہوتے ہی ہم ان کے گھر جا کر دونوں کو پکڑ سکیں۔'' اصغر بولا۔
اصغر کی باتوں اور غصے کا کسی کے پاس کوئی جواب نہیں تھا۔ سبھی سر جھکائے بیٹھے تھے۔سارے شکوک راحیل کی طرف ہی جاتے تھے۔اصغر بار بار ان کو مجبور کررہا تھا کہ وہ اس کے ساتھ شہر جائیں ورنہ وہ اکیلا جا کر ان سب کو ختم کردے گا۔مجبوراً عنایت کو اس کے ساتھ چلنے کی حامی بھرنی ہی پڑی۔

☆......☆......☆

صبح کا سورج طلوع ہونے سے پہلے راحیل اپنے گھر پہنچ گیا تھا۔وہ سیدھا اپنے کمرے میں جا کر لیٹ گیا۔
دوپہر کے وقت عنایت، اصغر، نازش کا بھائی اور اصغر کے دو کزن ان کے گھر پہنچ گئے۔سارے راستے عنایت یہی بات اصغر کو سمجھاتا رہا کہ وہ چپ رہے گا، بات صرف وہی کرے گا۔اصغر چپ چاپ سنتا رہا اور اثبات میں سر ہلاتا رہا۔
راحیل کی ماں نے ان سب کو خوشگوار حیرت کے ساتھ ڈرائنگ روم میں بیٹھایا،ان کے اترے ہوئے چہروں کو دیکھتے ہوئے وہ سوچتی رہی کہ پریشانی والی بات لگتی ہے لیکن پوچھنے کی بجائے وہ اس انتظار میں رہی کہ وہ خود ہی اپنے اندر کی بات اسے بتائیں۔
راحیل کی ماں نے پینے کے لیے جوس منگوایا اور جونہی ملازم نے گلاس اصغر کی طرف بڑھایا وہ پھٹ پڑا۔
''ہم یہاں جوس پینے نہیں آئے......راحیل کہاں ہے،اسے بلاؤ۔''
اصغر کا رویہ اور لہجہ سن کر راحیل کی ماں پریشان ہوگئی اور عنایت بھی اصغر کی طرف دیکھنے لگا کیونکہ وہ سارے راستے اسے سمجھاتا رہا تھا کہ وہ کوئی بات نہیں کرے گا۔
''کیا کیا ہے راحیل نے؟'' راحیل کی ماں نے سوالیہ نگاہوں اور پریشان لہجے میں پوچھا۔
''ہماری عزت کو اپنے ساتھ لے آیا ہے وہ بھی رات کے اندھیرے میں۔'' اصغر بولا تو راحیل کی ماں اور بھی پریشان ہوگئی۔راحیل بھی جاگ رہا تھا اور اس نے ان سب کو دیکھ لیا تھا اس لیے وہ دروازے کے ساتھ آ کر کھڑا ہوگیا تھا۔
عنایت نے اصغر کا ہاتھ دبایا اور بولا۔'' مجھے بات

کرنے دو......''
''آپ کیوں بات کریں گے؟وہ میری منگیتر ہے۔میری عزت تھی۔جسے ان کا آوارہ بیٹا راحیل لے کر بھاگ گیا۔'' اصغر کا لہجہ اور بھی تیز ہوگیا تھا۔
''زبان سنبھال کے بات کرو۔راحیل گھر میں ہے اور وہ اکیلا ہی آیا تھا۔'' راحیل کی ماں کو بھی غصہ آ گیا۔وہ اُٹھی اور باہر جانے لگی تو راحیل فوراً دروازے سے ہٹ کر اپنے کمرے میں چلا گیا۔
راحیل کو اس کی ماں سب کے سامنے لے آئی۔راحیل کو دیکھتے ہی اصغر اپنی جگہ سے ایسے اُٹھا جیسے وہ ابھی اس کا گلا دبا کر ہی دم لے گا۔عنایت نے اسے پکڑ لیا۔
''یہ کہہ رہے ہیں کہ تم اس کی منگیتر کو ساتھ لے آئے ہو۔'' راحیل کی ماں نے پوچھا۔
''میں ایسا کرسکتا ہوں؟ میں ناصر کے ساتھ اس کی گاڑی میں واپس آیا ہوں۔راستے سے ہم نے ناصر کے ماموں کو بھی ساتھ لیا تھا۔آپ چاہیں تو ان کو بھی بلا لیں۔''
''تم سیدھی طرح سے نہیں مانو گے۔'' اصغر آگے بڑھا تو نازش کا بھائی بھی اُٹھ کھڑا ہوگیا۔
عنایت نے ان کو روکا اور راحیل کی ماں نے کرخت لہجے میں کہا۔
''اگر یہاں کسی نے کوئی ایسی ویسی حرکت کرنے کی کوشش کی تو مجھے اپنے گارڈ کو بلا کر تم سب کو روکنا پڑے گا۔میں بات کررہی ہوں اس لیے کوئی بیچ میں نہیں بولے گا۔'' راحیل کی ماں کی بات کا ایسا اثر ہوا کہ وہ سب چپ ہوگئے۔
عنایت نے دھیمے لہجے میں کہا۔''بہن جی ...... مجھے راحیل پر شک نہیں ہے،لیکن اصغر کا اصرار تھا کہ یہ کام راحیل نے کیا ہے۔اس کی تسلی کے لیے مجھے یہاں آنا پڑا......میں آپ سے آرام سے بات کرنا چاہتا تھا،لیکن یہ جذباتی ہوگیا ہے۔''
''بھائی صاحب آپ تشریف رکھیں۔'' راحیل کی ماں نے کہہ کر راحیل کے باپ کو فون کیا اور کچھ دیر میں وہ بھی پہنچ گئے۔ساری بات سننے کے بعد ناصر اس کے ماموں کو بھی بلا لایا ناصر کے ماموں نے بتایا کہ گاڑی میں یہ دونوں ہی تھے ان کے ساتھ کوئی لڑکی نہیں تھی۔
''نازش کو انہوں نے کہیں اور چھوڑا ہے۔'' اصغر سنتے ہی بولا۔
''چچا عنایت کے گاؤں اور اس شہر کے بیچ میں میرا کوئی جاننے والا نہیں ہے کہ میں نازش کو کہیں اور چھوڑ دوں......میں نے ایسی کوئی حرکت نہیں کی ہے اور مجھے شک ہے کہ نازش خود کہیں چلی گئی ہے کیونکہ وہ اس سے شادی کرنا نہیں چاہتی تھی۔''
''تجھے کیسے پتا ہے؟'' اصغر نے جلدی سے سوال کیا۔
''تین چار دن جس جگہ کوئی رہے تو کچھ باتیں ہو ہی جاتی ہیں۔یہ بات مجھے خود نازش نے بتائی تھی۔اس نے کہا تھا کہ اصغر ایک جاہل انسان ہے،ان پڑھ ہے،اسے بات کرنے کی تمیز نہیں ہے۔اس شادی کے بعد دونوں کی شادی ہونے والی تھی اور وہ شاید اس لیے کہیں چلی گئی ہے۔''
راحیل نے سب کے سامنے ایک طرح سے اصغر کی بے عزتی بھی کردی تھی اور اپنے بچاؤ کے لیے یہ سب بھی کہہ دیا تھا۔اصغر مزید سیخ پا ہوگیا۔'' اس کا مطلب ہے دونوں میں باتیں بھی ہوتی رہی تھیں۔''
''اصغر اب تم چپ رہو گے۔'' عنایت نے اسے سختی سے روک دیا۔پھر وہ راحیل سے مخاطب ہوا۔'' راحیل پتر...... جو تم نے ابھی کہا کیا یہ سب سچ ہے؟''
''میں سچ کہہ رہا ہوں۔نازش کو میں اپنے ساتھ نہیں لے کر آیا اور میں ایسا بالکل بھی نہیں کرسکتا۔وہ اگر کہیں گئی ہے تو اس کی وجہ سے گئی ہے،اس کی جاہلیت کی وجہ سے گئی ہے۔'' راحیل نے ایک بار پھر اس کے منہ پر لفظوں کا طمانچہ مارا کہ اصغر تلملا کر رہ گیا۔
اس کے بعد کچھ باتیں بڑوں کے درمیان ہوتی رہیں اور عنایت ان سب کو لے کر اُٹھ کھڑا ہوا۔ساری بات اب اصغر کے سر پر آ گئی تھی۔وہ اس کی وجہ سے کہیں چلی گئی ہے کیونکہ ایک دو دن میں ان کی شادی کے دن طے ہونے تھے اور عنایت یہ بھی جانتا تھا کہ اصغر کتنی عقل اور سمجھ کا مالک ہے۔
جب سب جانے لگے تو راحیل کے ہونٹوں پر مسکراہٹ تھی اور اصغر اس کو دیکھتے ہی خار کھانے کے سوا کچھ نہیں کر پایا تھا۔جونہی وہ راحیل کے پاس سے گزرنے لگا تو راحیل نے دھیمی آواز میں کہا۔''میں نے تمہارا ہنسنا تو دیکھ لیا تھا اب رونا اور تڑپنا بھی دیکھ رہا ہوں۔''
اصغر سنتے ہی ایک دم رک گیا۔اس سے قبل کہ وہ کچھ کہتا،عنایت نے مڑ کر دیکھا اور اس ڈر سے اس کا بازو پکڑ کر لے گیا کہ کہیں دونوں الجھ نہ پڑیں۔

☆......☆......☆

اصغر نے گاؤں واپس آ کر بھی ایک ہی شور برپا کیا ہوا

تھا کہ نازش اسی کے پاس ہے، اس نے کہیں چھپائی ہوئی ہے۔ ناصر کے ماموں کی گواہی معتبر تھی اس لیے کوئی بھی نتیجہ اخذ کرنے میں ناکام تھا۔

ایک بات تھی جس پر سبھی اپنے دل ہی دل میں اتفاق کیے ہوئے تھے کہ نازش دس جماعت پڑھی تھی۔ وہ اس رشتے سے خوش نہیں تھی۔ اس کے گھر سے جانے کی وجہ اصغر کی جہالت ہی تھی۔ اس بات کا جب نازش کے ماں باپ کو علم ہوا تو وہ بھی یہی سوچنے پر مجبور تھے۔ نازش کا بھائی جو اصغر کا دوست بھی تھا اور اس کی ہر بات میں اس کے ساتھ ہوتا تھا وہ بھی سوچنے پر مجبور ہو گیا تھا۔

اصغر چپ ہی نہیں کر رہا تھا۔ وہ واپس آکر بولے جا رہا تھا اور اس نے سارا گھر اپنے سر پر اُٹھایا ہوا تھا۔ اس کی ایک ہی رٹ تھی کہ نازش، راحیل کے ساتھ بھاگی ہے، راحیل اس کا ذمہ دار ہے۔ اصغر کو سبھی چپ کرانے کی کوشش کر رہے تھے لیکن وہ چپ نہیں ہو رہا تھا۔ اصغر کا غصہ بڑھتا ہی جا رہا تھا۔ اس نے غصے میں کہہ دیا۔

"مجھے معلوم نہیں تھا کہ نازش ایسی بدکردار ہے......"

اصغر کا اتنا ہی کہنا تھا کہ نازش کا بھائی سنتے ہی اُٹھا اور اس نے پاس پڑے برف توڑنے والا سوا اُٹھایا اور اصغر کے پیٹ میں مار دیا۔ اصغر کی چیخ نکلی اور وہ اپنے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر اسی جگہ بیٹھ گیا۔ ایک نیا ہنگامہ کھڑا ہو گیا۔ اصغر زخمی ہو گیا تھا۔ وہاں بھاگ دوڑ شروع ہو گئی تھی۔

☆......☆......☆

اس دن راحیل کے دماغ میں ایک لمحے کے لیے بھی یہ خیال نہیں آیا کہ اس نے نازش کے ساتھ زیادتی کی ہے۔ وہ بے حس انسان کی طرح نازش کو اپنے دل و دماغ سے نکال کر اپنے کام میں مصروف رہا۔ انجانے میں اصغر سے بدلہ لینے کے لیے وہ نازش کے ساتھ کتنی بڑی زیادتی کر چکا تھا یہ احساس اس کے دل میں بالکل بھی نہیں جاگا۔ وہ اصغر کو تڑپتا ہوا دیکھنا چاہتا تھا وہ اس نے دیکھ لیا تھا اور یہی بات اس کے دل کے اطمینان کو کافی تھی۔

اسی شام ٹیلی وژن پر خبریں سنتے ہوئے ایک خبر اس کی سماعت میں پڑی کہ نامعلوم افراد نے لڑکی کو زیادتی کے بعد قتل کر کے لاش نہر میں میں پھینک دی۔ جس وقت راحیل نے وہ خبر سنی تھی وہ اس وقت نیوز کاسٹر خبر کا آخری حصہ بتا رہی تھی۔ جس نہر میں لڑکی کو پھینکا گیا تھا وہ نہر اسی علاقے میں تھی جہاں نازش کا گاؤں تھا۔

ایک دم سے راحیل کا دل زور سے دھڑکا۔ پہلی بار اسے خیال آیا کہ اس نے نازش کو ریلوے اسٹیشن پر چھوڑ کر بہت بڑی بھول کر دی تھی۔ وہ بھول گیا تھا کہ اس کی نفرت اصغر کے ساتھ تھی، اس نفرت کے اظہار کے لیے اس نے نازش کو استعمال کر کے بہت بڑی غلطی کر دی ہے۔

نازش شاید اوباش لوگوں کے ہتھے چڑھ گئی اور انہوں نے نازش کو مار دیا۔

راحیل مضطرب ہو گیا، اس کے دل کی دھڑکن منتشر ہو گئی، اس کے پیر ایک جگہ ٹک نہیں رہے تھے۔ اس کا دل چاہ رہا تھا وہ اسی وقت متعلقہ تھانے پہنچ جائے اور دیکھے کہ مرنے والی نازش تھی، یا کوئی اور......

راحیل بے چین اور کرب میں مبتلا ہو گیا تھا۔ احساس جو اس کام کے کرنے سے پہلے جاگنا چاہیے تھا وہ اب جاگ رہا تھا۔ اس کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا وہ کیا کرے۔ اس نے اسی وقت ناصر کو فون کر کے ساری بات بتائی اور اسے کہا کہ وہ ابھی کار لے کر آجائے اسے اسی وقت اس جگہ جانا ہے۔

جب ناصر آیا تو راحیل اس کا اپنے گھر کے گیراج میں انتظار کر رہا تھا۔ ناصر نے کہا۔ "کیا ہو گیا......؟ کیوں ایسی بے چینی ہے؟"

"خبر آئی ہے کہ ایک لڑکی کو قتل کر کے نہر میں پھینک دیا ہے۔ لڑکی کو اسی علاقے میں قتل کیا ہے جہاں ہم نے نازش کو چھوڑا تھا۔"

"تو پھر کیا ہوا؟" ناصر نے بے پروائی سے پوچھا۔

"یہ سب میری وجہ سے ہوا۔ مجھے جا کر دیکھنا ہے کہ کیا وہ نازش ہی ہے۔ اگر ایسا نہیں ہے تو مجھے نازش کو تلاش کرنا ہے۔ مجھ سے بہت بڑی بھول ہو گئی ہے۔"

"جانے دو یار......" ناصر نے ابھی اتنا ہی کہا تھا کہ اس کی نگاہ راحیل کے عقب میں کھڑی اس کی ماں پر پڑی تو وہ اسی جگہ چپ ہو گیا۔ اس کی ماں نے ان کی باتیں سن لی تھیں۔ ناصر نے بھی گردن گھما کر دیکھ لیا تھا۔

☆......☆......☆......

اب کچھ چھپانا مشکل تھا اس لیے راحیل نے سب کچھ سچ بتا دیا۔ راحیل کے پاس اس کے والدین چپ اور پریشان کھڑے تھے۔ انہیں یقین نہیں آ رہا تھا کہ یہ سب راحیل نے کیا ہے؟

"مجھے بہت دکھ ہوا ہے کہ تم نے اتنی گری ہوئی حرکت کی ہے۔ اُس کے منگیتر کو نیچا دکھانے کے لیے تم نے ایک

معصوم اور بے گناہ لڑکی کو دھوکا دے کر اس کی ہی نہیں بلکہ اس کے گھر والوں کی بھی زندگی برباد کر دی ہے۔" راحیل کے باپ کو شدید غصہ اور تاسف تھا۔

"مجھ سے بڑی غلطی ہو گئی ہے۔" راحیل نادم تھا۔

"اب احساس ہوا تو کیا فائدہ...... خدا نہ کرے کہ نہر سے ملنے والی لاش نازش کی ہو۔"

"میں اس کے گھر جانا چاہتا ہوں۔ میں جاننا چاہتا ہوں کہ وہ نازش ہی تو نہیں ہے۔ میں وہاں جا کر بہانہ کروں گا کہ آپ نے مجھے بھیجا ہے۔ تاکہ میں پتا کروں کہ نازش ملی ہے کہ نہیں...... اور میں تب تک اس کو تلاش کروں گا جب تک وہ مل نہیں جائے گی۔" راحیل کی آنکھوں میں ریت اتر آئی تھی۔

"دفع ہو جاؤ...... جو کرنا ہے کرو...... تم نے مجھے مایوس کر دیا ہے۔" راحیل کا باپ سر پکڑ کر ایک طرف بیٹھ گیا۔

راحیل اور ناصر وہاں سے چلے گئے۔ وہ سیدھے اس کے گاؤں گئے۔ عنایت سے ملے اور اسے بتایا کہ ڈیڈی نے نازش کے بارے میں پوچھنے کے لیے بھیجا ہے۔

عنایت نے بتایا کہ نازش کا ابھی کوئی سراغ نہیں ملا ہے۔ اصغر کو شدید زخمی کرنے کے جرم میں اس کے بھائی کو پولیس گرفتار کر کے لے جا چکی ہے۔ گھر میں شدید دکھ کی کیفیت ہے۔

راحیل کو یہ اطمینان تو ہو گیا کہ وہ لاش نازش کی نہیں تھی کیونکہ خبر میں بتایا گیا تھا کہ لڑکی کو ورثا کے حوالے کر دیا گیا ہے۔

دونوں وہاں سے ریلوے اسٹیشن چلے گئے۔ وہاں سے وہ قریبی گاؤں میں پھرتے رہے۔ ان کی سمجھ میں نہیں آ رہا تھا کہ وہ اسے کیسے تلاش کریں۔ اس کے بارے میں کس سے پوچھیں۔ ان علاقوں میں جو دربار تھے وہاں بھی انہوں نے نازش کو تلاش کیا۔ ایک دربار میں دونوں رات گزارنے کے لیے رک بھی گئے۔

دوسرے دن ناصر کو گھر سے فون آ گیا اور اس نے جانے کی اجازت مانگی تو راحیل نے اسے جانے کا کہہ دیا اور خود اسی جگہ رک گیا۔

راحیل تین دن تک مختلف جگہوں پر بسوں اور تانگوں میں گھومتا رہا۔ بالکل ایسے جیسے وہ پاگل سا ہو گیا ہو۔ وہ گلیوں میں ایسے متلاشی نگاہوں سے پھرتا رہا جیسے اس کے حواس کھو چکے ہوں۔ اسے خود بھی معلوم نہیں تھا کہ وہ کس گاؤں، کس علاقے میں ہے۔ وہ خالی نظروں اور بغیر کسی منصوبہ بندی کے نازش کو تلاش کر رہا تھا۔ اسے لگ رہا تھا جیسے نازش کو دھوکا دینے کی سزا شروع ہو چکی ہے۔

اس کے موبائل فون کی بیٹری ختم ہو چکی تھی اور اس کا رابطہ ہر ایک سے کٹ چکا تھا۔

راحیل ایک گاؤں کی ایک گلی سے دھیمی چال کے ساتھ گزر رہا تھا کہ اچانک ایک طرف سے ایک بے قابو گدھا گاڑی تیزی سے نکلی، اس پر سریا لادا ہوا تھا۔ اچانک راحیل اس کے آگے آ گیا اور ریڑھی والے کی بچانے کی کوشش کے باوجود راحیل بچ نہ سکا اور ایک سریا راحیل کی ٹانگ میں جا گھسا۔ راحیل کی چیخ نکل گئی۔ بمشکل گدھا گاڑی کو روکا گیا۔ لوگ جمع ہو گئے۔

جس گھر کے سامنے حادثہ ہوا تھا، اس گھر سے ایک نوجوان باہر نکلا۔ وہ تیزی سے راحیل کی طرف بھاگا۔ سب کی کوشش تھی کہ کسی طرح سے سریا اس کی ران سے باہر نکل آئے لیکن سریا نکلنا مشکل تھا اور راحیل کی چیخیں نکل رہی تھیں۔ اس نوجوان نے شور مچا کر قریبی ویلڈر کی دکان سے سریا کاٹنے والی آری منگوائی اور کوشش سے سریا کاٹ دیا۔ اب راحیل کی ران میں چار فٹ لمبا سریا تھا جس کا ایک سرا اس کی ران میں اور دوسرا باہر نکلا ہوا تھا۔

وہ نوجوان دوسرے لوگوں کی مدد سے اسے اپنے گھر لے جانا چاہتا تھا مگر حادثے کی نوعیت کے پیش نظر اس نے مریض کو اسپتال لے جانا بہتر سمجھا۔ اس نے زخمی کے جیبوں کی تلاشی لی اور پرس و موبائل نکال کر اس کی بیوی سے کہا۔ موبائل بند ہے چارج پر لگا دو جب تک میں اسپتال سے ہو آتا ہوں۔

نوجوان کی بیوی نے اپنے شوہر کو فون کر کے دریافت کیا کہ وہ اسے کس اسپتال میں لے کر گئے ہیں تاکہ اس کے گھر والوں کو وہ اطلاع کر دے کیونکہ اس کا موبائل فون چارج ہو گیا ہے۔

اس اسپتال میں راحیل کو ابتدائی طبی امداد دے دی گئی تھی۔ اسپتال والوں نے کہا کہ اس کا علاج شہر کے اسپتال میں ہوگا۔ نوجوان کی بیوی نے بتایا کہ اس کے گھر والوں سے رابطہ ہو گیا ہے اور وہ آ رہے ہیں۔ نوجوان نے کہا کہ وہ انہیں فون کر کے روک دے کیونکہ ہم اسے شہر لے جا رہے ہیں۔

☆......☆......☆

اس خدا ترس نوجوان کی کوشش سے راحیل کو شہر کے اسپتال میں پہنچا دیا گیا۔ وہاں اس کے گھر والے بھی پہنچ گئے تھے۔ راحیل کی ٹانگ سے سریا تو نکال لیا گیا لیکن بہت زیادہ دیر ہونے کی وجہ سے اس کی ٹانگ مفلوج ہو گئی تھی۔ اب راحیل زندگی بھر کے لیے اپاہج ہو گیا تھا۔

راحیل اسپتال میں ایک ہفتہ تک رہا۔ اس دوران وہ نوجوان دوبارہ بھی آیا اور اس نے اس کا موبائل فون اور پرس اس کے حوالے کر دیا۔ وہ نوجوان واپس چلا گیا اور راحیل کو بھی اسپتال سے چھٹی مل گئی اور وہ جب گھر گیا تو وہیل چیئر اب اس کے ہمراہ تھی۔ اس کی ایک ٹانگ مفلوج اور بے جان تھی۔ اس کے دل میں اس کا شدید دکھ تھا لیکن اس سے بڑھ کر اسے دکھ اس بات کا تھا کہ نازش کا کہیں سراغ نہیں ملا تھا۔

راحیل اب گھر کی دیواروں میں قید ہو کر رہ گیا تھا۔ وہیل چیئر اس کا مقدر بن گئی تھی۔ ایک صبح اس کے کہنے پر ملازم اسے ٹیرس پر چھوڑ گیا۔ وہ وہیل چیئر پر بیٹھا کبھی دائیں اور کبھی بائیں دیکھ رہا تھا۔

اس نے اپنا موبائل فون نکالا تا کہ وہ اپنے دوستوں کو فون کر کے... گھر بلا لے اور ان سے گپ شپ کرے۔ موبائل کے ساتھ اس کا پرس بھی جیب سے نکل آیا تھا۔ اس نے دیکھا کہ پرس کے اندر ایک تہہ کیا ہوا کاغذ ہے۔ اس نے متحیر نگاہوں سے کاغذ نکالا اور اسے کھولا اس پر ایک تحریر لکھی ہوئی تھی۔ راحیل نے وہ تحریر پڑھنی شروع کی۔ لکھا تھا

''میں نازش یہ تحریر لکھ رہی ہوں۔ تم حیران ہو گے کہ نازش کی تحریر میرے پرس میں کیسے آ گئی۔ حیران تو میں بھی بہت تھی جب تم مجھے ریلوے اسٹیشن چھوڑ کر چلے گئے تھے۔ ایک اکیلی لڑکی کو تم بے سہارا چھوڑ کر چلے گئے۔ بعد میں مجھے پتا چلا کہ تم اصغر کی باتوں اور اس کے طنز کا بدلہ لینا چاہتے تھے اور قربانی کا بکرا مجھے بنایا تا کہ اصغر کو جب پتا چلے کہ اس کی منگیتر بھاگ گئی ہے تو وہ خوب تڑپے...... اور اس تڑپ میں تم اپنی تسکین چاہتے تھے، تم نے یہ نہیں سوچا کہ تم مجھے برباد کر رہے ہو۔ مجھے ان باتوں کا کیسے پتا چلا، یہ تمہارے لیے جاننا ضروری نہیں ہے، ہاں جب میں واپس گھر گئی تو کچھ باتوں کا مجھے علم ہوا اور باقی باتوں کا میں نے خود تانا بانا بن لیا تھا۔ میں ریلوے اسٹیشن اکیلی بیٹھی تھی۔ رات کے ساڑھے بارہ بج گئے تھے اور اس وقت دور تک سناٹا تھا۔ تب ایک نوجوان میرے پاس آیا اس نے اپنا نام بتایا۔ وہ ریلوے میں کام کرتا ہے۔ اس نے مجھ سے بیٹھنے کی وجہ پوچھی۔ میرے پاس کوئی وجہ نہیں تھی اور اس نے مجھے پوری تسلی دی اور اپنے ساتھ اپنے گھر لے گیا۔ جہاں اس کی ماں اور باپ بھی تھے۔ میں نے دوسرے دن اس نوجوان کو ساری حقیقت بتا دی۔ اس نے کہا کہ اس حقیقت کو مجھ تک ہی محدود رکھنا اور کسی سے بیان مت کرنا۔ پھر وہ میرے گھر والوں کے پاس گیا۔ میرے بارے میں بتایا، میرے گھر والے مجھے مار دینا چاہتے تھے لیکن پھوپا عنایت نے ان کو سمجھایا اور وہ میرے پاس آئے۔ میں نے ان کو بھی حقیقت بتا دی۔ انہیں بہت دکھ ہوا۔ پھوپا عنایت نے میرے گھر والوں کو سمجھایا اور مختصر یہ کہ اس نوجوان کی خواہش پر میرا نکاح اس سے کر دیا گیا اور میں اس کی عزت بن گئی۔ میں اس کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ وہ بہت نرم مزاج اور خدا ترس آدمی ہے۔ کسی کا دکھ دیکھ نہیں سکتا۔ اسی لیے جب تم زخمی ہوئے تو اسی نے سب سے زیادہ بھاگ دوڑ کی اور تمہیں اسپتال تک لے کر گیا...... وہ نوجوان میرا شوہر ہے۔

میں نے تم کو زخمی حالت میں دیکھا تو میرے زخم تازہ ہو گئے۔ میں نے اپنے شوہر کی موٹر سائیکل کی چابی چھپا دی تا کہ تم کو بروقت ڈاکٹر کے پاس نہ لے جایا جا سکے۔ جب تک کو اسپتال لے کر گئے اور میرے شوہر نے بتایا کہ تمہاری ٹانگ مفلوج ہو گئی ہے، تم زندگی بھر چل پھر نہیں سکتے۔ مجھے دکھ تو ہوا لیکن میں نے کہا کہ برا کرنے والوں کو کچھ سزا بھی ملنی چاہیے۔ میں یہ تحریر لکھ کر تمہارے پرس میں رکھ دوں گی اور میرا شوہر تمہارا سامان تمہیں واپس کر دے گا۔ تم اس تحریر کو کبھی پڑھ ہی لو گے اور حقیقت بھی جان لو گے۔

تم کو ایسا نہیں کرنا چاہیے تھا۔ تم کو میری زندگی برباد کرنے کا کوئی حق نہیں تھا۔ تمہاری باتیں اصغر کے ساتھ تھیں، تم جانتے اور اصغر جانتا۔ مجھے اور میرے گھر والوں کو ذلیل نہ کرتے۔ تم نے جو زیادتی میرے ساتھ کی اس کا نتیجہ اب ساری زندگی اس کرسی پر بیٹھ کر بھگتو گے۔ ہاں میں اپنے گھر اپنے شوہر کے ساتھ بہت خوش ہوں۔ میرے گھر والے بھی راضی ہیں۔''

راحیل نے تحریر پڑھی اور اس کی آنکھوں سے آنسو جاری ہو گئے۔ اتنے آنسو کہ اس کے سامنے ہر چیز دھندلا گئی تھی۔



زہریلا مسیحا

محترمہ عذرا رسول
السلام علیکم
جب سے میں نے یہ کتھا سنی ہے اسے سرگزشت کے قارئین تک پہنچانے کے لیے بے چین ہوں۔ یہ داستان کچھ الگ سی لگی تھی اس لیے اُمید ہے آپ کو پسند آئے گی۔

محمد سلیم کرد
(گڈانی، لسبیلہ)

یہ آج سے تقریباً پچاس سال قبل کی بات ہے۔ میں اگور میں تھا۔ اگور ضلع لسبیلہ بلوچستان کا ایک چھوٹا سا دیہات ہے۔ یہ ساحلی پٹی پر واقع ہے اور گوادر براستہ کراچی کوسٹل ہائی وے پر بزی ٹاپ کے اختتام پر ہنگول کے قریب راستے میں آتا ہے۔ وہیں میری ملاقات عبدالرحمن نامی اس شخص سے ہوئی تھی۔ وہ بیساکھیوں کے سہارے چلتا ہوا کمرے میں داخل ہوا تھا۔

اس کی عمر لگ بھگ پینتالیس کے قریب تھی۔ اس کی باتوں سے اندازہ ہو رہا تھا کہ وہ ایک خوش مزاج اور جلد گھل مل جانے والا آدمی ہے۔ باتوں باتوں میں، میں نے اس کے معذور پاؤں کے بارے میں استفسار کیا تو وہ بولا۔

''اونٹ وہ پالتو جانور ہے جو اپنے مالک پر بھی حملہ کرنے سے دریغ نہیں کرتا۔''

''اچھا تو آپ کی معذوری کی وجہ اونٹ کا حملہ ہے؟''

میں نے بے تابی سے استفسار کیا۔
''بنیادی وجہ اونٹ کا حملہ ہے۔ میرا اونٹ میری جان کا درپے تھا لیکن قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔''
''میرے پلے کچھ نہیں پڑ رہا ہے؟'' میں نے استفسار کیا۔
''میں تفصیل کے ساتھ واقعہ بیان کروں گا تو آپ سمجھ جاؤ گے۔'' عبدالرحمٰن نے کہا۔ ''نومبر کا پہلا عشرہ ختم ہو چکا تھا۔ سردیوں کی آمد آمد تھی۔ سردیوں کی آمد کے ساتھ اونٹ کے افزائش نسل کا وقت بھی شروع ہو جاتا ہے اور اونٹ مستی میں آجاتے ہیں اور منہ سے جھاگ اڑا کر ایک سرخ غبارہ نما پھولا ہوا چھچھڑا باہر نکال لیتے ہیں۔ پانچ سال قبل بھی وہ نومبر کی ایک خوشگوار دوپہر تھی، میں نزدیکی بازار سے سودا سلف خرید کر اگور کی طرف اونٹ پر رواں دواں تھا۔ بازار کیا تھا بس ایک آدھ دکانوں پر مشتمل برائے نام بازار تھا جو اگور سے بذریعہ اونٹ تین چار گھنٹے کے سفر پر محیط تھا اور یہ سفر میرے لیے ایک عام سا اور معمولی نوعیت کا تھا جو میں ہر دس پندرہ دن کے بعد ضرور طے کرتا تھا۔

اس دن مجھ سے وہ غلطی سرزد ہوگئی جس نے مجھے معذور بنا دیا۔ مجھ سے غلطی یہ ہوئی تھی کہ افزائش نسل کے اس سیزن میں، میں نے اپنے اونٹ کے منہ پر جالی نہیں چڑھائی تھی جو سردیوں کے سیزن میں اونٹ بان اپنے اونٹوں کے منہ پر اس خدشے کے تحت چڑھا لیتے ہیں کہ کہیں اونٹ حملہ کر کے کاٹ نہ لے۔ اس احتیاطی تدابیر کے باعث اونٹ کا منہ ٹوپی نما جالی کے شکنجے میں آجاتا ہے۔ اس دن موسم خوشگوار تھا اور میں ایڑ لگا کر اونٹ کو تیزی سے بھگا رہا تھا۔ میری خواہش تھی کہ میں جلد از جلد اپنے گھر پہنچ جاؤں۔ راہیں میرے اور اونٹ دونوں کے لیے شناسا تھیں۔ میں نے آدھا سفر طے کیا تھا اور آدھا باقی تھا۔ ہر سو ہو کا عالم تھا۔ آدم نہ آدم زاد۔ کبھی کبھار کسی دور درخت پر بیٹھا ہوا کوئی پرندہ چہچہاتا تھا پھر چہچہاہٹ معدوم ہوتی چلی جاتی تھی۔

اچانک اونٹ کی رفتار میں حیران کن کمی آگئی۔ میں نے بھگانے کے لیے ایڑ لگائی لیکن اونٹ کی طرف سے خاطر خواہ ردعمل سامنے نہیں آیا۔ یہ بلاوجہ کی سرد مہری مجھے کچھ کھٹکنے لگی پھر وجہ بھی سمجھ آگئی۔ دور بہت دور ایک اونٹنی سوار نظر آگیا اسی لیے اونٹ کے تیور بگڑ گئے تھے۔ میں نے جوں ہی مار لگائی اس نے ایک زوردار بلبلاہٹ کے ساتھ اپنی لمبی گردن میری طرف گھمائی۔ وہ مجھے جبڑوں سے دبوچنے کی کوشش کرنے لگا مگر ناکام رہا۔ اس کی آنکھوں میں غیض و غضب کا تاثر جھلک رہا تھا۔ وہ مجھے دبوچنے کی جہد میں گول دائرے میں گھومنے لگا تھا۔ مہار میرے ہاتھ میں تھی۔ اونٹ مجھ پر دائیں سمت سے حملہ کرنے کی کوشش میں تھا۔ میں نے مہار کو بائیں طرف سے کھینچا تو اونٹ ناک میں اٹھنے والے درد سے بلبلا اٹھا۔ یقیناً اونٹ کا ناک زخمی ہو چکا تھا۔ اس کی لمبی گردن سیدھی ہوگئی پھر وہ زور زور سے اچھلنے لگا۔ وہ مجھے زمین پر گرانا چاہتا تھا۔ اس افتاد کی وجہ سے میرا دل بے تحاشا دھڑک رہا تھا لیکن میرے اوسان بحال تھے۔ اونٹ اور میرے درمیان ایک جنگ چھڑ گئی تھی۔ میں اپنی بقاء کی جنگ لڑ رہا تھا اور میرا برگشتہ اونٹ ایڑی چوٹی کا زور لگا کر مجھے نیچے گرا کر ختم کرنے پر تلا ہوا تھا۔ میری یہ کوشش تھی کہ میں کسی بھی طرح اونٹ کی پیٹھ پر موجود رہوں۔ نیچے گرنے کی صورت میں میرا پاگل اونٹ مجھے آناً فاناً ختم کرسکتا تھا۔

مہار ہاتھوں میں موجود تھا اور میرے پیر اونٹ کے پیٹ پر بڑی مضبوطی کے ساتھ گرفت رکھے ہوئے تھے۔ میں نے ایک دفعہ پھر بڑی بے رحمی کے ساتھ مہار کھینچی، نکیل نے اونٹ کی ناک کا حال پوچھا اور وہ بلبلانے لگا۔ اس کا سر اوپر اٹھ گیا تھا۔ میں نے پھر مہار کھینچی اور اس دفعہ مہار کے تناؤ کو برقرار رکھا۔ اس نے پھر اچھل کود شروع کر دی۔ حالات میرے ہاتھ سے نکلتے جا رہے تھے۔ اس دیوہیکل جانور کے سامنے مجھے اپنی کوشش ہیچ محسوس ہو رہی تھی۔ ایک لمحے کے لیے میرے ذہن میں یہ خیال کوندا کہ کیوں نہ نیچے چھلانگ لگاؤں اور بھاگ کر کہیں چھپ جاؤں مگر دور دور تک ایسی کوئی جگہ بھی نظر نہیں آرہی تھی جہاں میں چھپ سکتا تھا پہاڑی سلسلہ کافی فاصلے پر تھا اور یہ اندیشہ بھی تھا کہ اگر میں نیچے کودا تو اونٹ فوراً مجھے جا لے گا۔ اونٹ اور میرے درمیان کشمکش کی وجہ سے سارے سامان نیچے گر گئے تھے۔ پھر اچانک اونٹ کے حرکات و سکنات میں تبدیلی آگئی۔ اب وہ میری طرف منہ مارنے کی بجائے اپنی گردن نیچے زمین کی طرف لمبی کرنے کی کوشش کر رہا تھا مگر کامیاب نہیں ہو سکا تھا کیونکہ مہار میں نے مضبوطی سے کھینچ رکھی تھی۔ پھر اونٹ نے بلبلانا شروع کر دیا۔ اس نے دونوں پیر بڑی تیزی کے ساتھ چلانا شروع کر دیے تھے جیسے سائیکلنگ کر رہا ہو۔ مجھے محسوس ہوا کہ اونٹ کی توجہ مجھ پر نہیں ہے تبھی میری نظر نیچے پڑی۔ وہ ایک سرخ رنگت والا لمبا سا ریگستانی سانپ تھا جو اونٹ کو ڈسنے کی سرتوڑ کوششیں کر رہا تھا مگر اونٹ اسے موقع نہیں دے رہا تھا اور اسے پیروں تلے روندنے کی جہد کر رہا تھا۔ سرخ رنگت کا یہ زہریلا سانپ مرنے اور مارنے کی ضد پر قائم رہنے والا ہوتا ہے۔

اونٹ اور سانپ کے درمیان کشمکش جاری تھی۔ یہ موزوں موقع تھا۔ پاگل اونٹ سے اپنی جان بچانے کا۔ میں فوراً اونٹ سے نیچے کودا اور ایک طرف سرپٹ دوڑنے لگا۔ میں جن راستوں سے اونٹ پر سوار ہو کر آیا تھا دوبارہ انہی راہوں پر دوڑ رہا تھا۔ پیچھے مڑ کر دیکھا کہ کہیں اونٹ تو میرے پیچھے نہیں آرہا لیکن یہ دیکھ کر مجھے قدرے سکون کا احساس ہوا کہ وہ بدستور سانپ کے ساتھ الجھا ہوا تھا۔ میری نگاہیں چھپنے کے لیے کسی محفوظ جگہ کو ڈھونڈ رہی تھیں مگر ایسی کوئی جگہ نظر نہیں آرہی تھی جہاں میں اونٹ سے محفوظ رہتا۔'' یہ کہہ کر عبدالرحمٰن خاموش ہو گیا۔ کمرے میں ہم دونوں کے علاوہ اور کوئی نہیں تھا۔ چند ثانیے فضا میں خاموشی چھائی رہی اس کے بعد وہ ایک دفعہ پھر گویا ہوا۔

کافی فاصلے پر پہاڑی سلسلہ تھا۔ اونٹ کے ممکنہ حملے سے محفوظ رہنے کے لیے۔ اس سے بہتر جگہ نہیں تھی۔

سرپٹ بھاگتے بھاگتے نہ جانے کتنا وقت بیت گیا تھا۔ ہم دیہات کے لوگوں کو اونٹ کی فطرت کا علم ہے اگر یہ معصوم مزاج کا حامل دیوہیکل جانور کسی پر غصہ کر بیٹھے تو اس وقت تک اس کا غصہ ٹھنڈا نہیں پڑتا جب تک یہ اسے موت کی نیند نہ سلا دے۔ وہ میرا آخری لمحوں تک پیچھا کر سکتا تھا اور اس ویرانے میں میری کوئی مدد کرنے والا نہ تھا اور نہ ہی میرے پاس اپنے دفاع کے لیے کسی قسم کا ہتھیار تھا۔

اگر سانپ اونٹ کو ڈسنے میں کامیاب ہوا تو یہ خوش نصیبی کی بات ہوگی کیونکہ سرخ سانپ کا زہر سریع الاثر ہوتا ہے لیکن دوسری صورت میں یعنی سانپ سے جنگ جیتنے کی صورت میں اونٹ کا میرے تعاقب میں آنا یقینی بات ہوگی۔ میں وادی میں دوڑتے ہوئے وقفے وقفے کے ساتھ پیچھے بھی دیکھتا چلا جا رہا تھا۔ پہاڑی کا فاصلہ لحمہ بہ لحمہ گھٹتا جا رہا تھا۔ میرا ارادہ یہ تھا کہ پہلی فرصت میں پہاڑی پر چڑھ دوڑوں گا کیونکہ اونٹ جیسا قوی الجثہ جانور کا پہاڑی پر چڑھنا انتہائی مشکل ہے۔

دفعتاً میری سماعت سے اونٹ کی آواز ٹکرائی۔ میں نے پلٹ کر پیچھے دیکھا تو خوف کے مارے میری آنکھیں پھٹی کی پھٹی رہ گئیں۔ اونٹ آندھی طوفان کی طرح دھول اڑاتا ہوا میرے پیچھے آرہا تھا۔ اس کا واضح مطلب تھا کہ وہ سرخ سانپ سے جنگ جیت چکا ہے۔ یقینی موت کو اپنے پیچھے لپکتا دیکھ کر میری رہی سہی امیدیں بھی دم توڑ گئیں۔ اب صرف اوپر والا ہی میری مدد کر سکتا تھا یہ خیال دل میں آتے ہی میرے مختل ہوتے ہوئے اعصاب تیزی کے ساتھ بحال ہونا شروع ہو گئے اور دل میں امید کی ایک ہلکی سی کرن پھوٹنے لگی کہ شاید کوشش سے کوئی وسیلہ پیدا ہو جائے۔ میں نے اپنی رفتار تیز کر دی۔ ایک دفعہ پھر ہمارے درمیان محاذ آرائی شروع ہوگئی۔ میں اپنی بقاء کی جنگ جیت پاتا یا میرا پاگل اونٹ میرے لہو سے اپنے غصے کی تسکین کر پاتا۔ دونوں میں سے ایک بات سامنے آنے والی تھی لیکن فی الحال تو مجھے کچھ نظر نہیں آ رہا تھا۔ عقلی طور پر حالات کسی بھی طرح مجھے اپنے حق میں بہتر محسوس نہیں ہو رہے تھے۔ میری رفتار میں بجلی کی تیزی آگئی تھی۔ سورج عین سر پر چمک رہا تھا۔ میں سرتاپا پسینے سے نہایا ہوا تھا۔ میری ہر ممکن یہ کوشش تھی کہ جلد از جلد پہاڑی تک پہنچ جاؤں۔ یہ میری آخری دیوانہ وار کوشش تھی... کیونکہ پہاڑی تک پہنچنے کے بعد سارا دارو مدار صرف اور صرف میری قسمت پر تھا۔

وادی میں ہم دونوں کے درمیان دوڑ لگی ہوئی تھی۔ اچانک میرے بائیں چپل کی بند ٹوٹ گئی۔ میں نے دوڑنے کے دوران ناکارہ چپل سے پیر کو آزاد کیا۔ میرا بایاں پیر ننگا ہو گیا۔ پہاڑی بھی قریب پہنچ چکی تھی۔ میرا ارادہ تو پہاڑی پر چڑھنے کا تھا لیکن یہ دیکھ کر مایوسی ہوئی کہ ایسی کوئی جگہ نہیں تھی جہاں سے پہاڑی پر چڑھنا ممکن ہوتا۔ میرے پاس وقت کم تھا۔ مجھے فوری طور پر کسی محفوظ پناہ گاہ کی ضرورت تھی۔ میں خود کو پھندے میں پھنستے ہوئے ایک بے بس چوہے کی طرح محسوس کرنے لگا تھا۔

دفعتاً میری نگاہ ایک کھوہ پر پڑی جو پہاڑی کے ایک گوشے میں چند فٹ کی دوری پر واقع تھا۔ میں فوراً کھوہ کی طرف لپکا، اونٹ بھی سر پر پہنچ چکا تھا۔ کھوہ کا دہانہ بس اتنا سا تھا کہ ایک وقت میں ایک آدمی داخل ہو سکتا تھا لیکن اونٹ جیسے دیوہیکل جانور کا داخل ہونا ناممکن تھا۔ دہانے کے آس پاس سبز گھاس اگی ہوئی تھی۔ میں اس کھوہ میں گھستا چلا گیا۔ کھوہ کے اندر تاریکی تھی اور سطح کسی قدر ڈھلوانی تھی۔ جہاں تک جا سکتا تھا۔ تبھی اونٹ کی فلک شگاف آواز گونجی۔ میں نے دہانے کی طرف دیکھا اونٹ نے اپنا سر اندر داخل کر لیا تھا۔ وہ مجھے اپنے منہ سے دبوچنے کے لیے

گردن لمبی کررہا تھا۔ خوف و دہشت سے میں کانپنے لگا اور مزید پیچھے سرک گیا۔ اونٹ پر بدستور جنون سوار تھا اور وہ مجھے اپنے جبڑوں سے دبوچ لینے کی سرتوڑ کوشش کررہا تھا۔ ساتھ ہی ساتھ اپنے بھاری بھرکم پیر دہانے کے باہر غصے سے زمین پر ماررہا تھا۔ پیروں کی دھمک اور تیز دہاڑ سے کھوہ کی اندرونی اور بیرونی فضا میں ایک ارتعاش برپا تھا۔ باہر دوپہر کی دھوپ چمک رہی تھی اور روشنی کی کرنیں دہانے تک پھیلی ہوئی تھیں جس کی وجہ سے کھوہ کے اندر ملگجی تاریکی تھی۔ میری آنکھیں تاریکی سے مانوس ہورہی تھیں۔

پھر اچانک مجھے کھوہ کے اندر کسی کی موجودگی کا احساس ہوا۔ میری نگاہیں اس سمت اٹھ گئیں۔ ملگجے اجالے میں سیاہ رنگ کا ایک چمکتا ہوا ناگ پھن پھیلائے کھوہ کے دہانے پر بیٹھا نظر آیا۔ اس کا رخ باہر کی طرف تھا۔ میں نے اتنا بڑا سانپ پہلے نہیں دیکھا تھا۔ میں دو عفریتوں کے درمیان پھنس چکا تھا۔

دھوپ کی تمازت سے چمکتے ہوئے دہانے سے اونٹ اپنی گردن لمبی کرکے مجھے پکڑنا چاہ رہا تھا۔

کھوہ کا اندرونی سطح ڈھلوانی ہونے کی وجہ سے دہانہ کسی قدر بلند تھا۔ اونٹ کا جھاگ اڑاتا دانتوں سے بھرا ہوا کھلا منہ ہیبت طاری کررہا تھا۔

میں اونٹ کی طرف متوجہ تھا کہ کہیں یہ مجھے پکڑ نہ لے، سانپ کی طرف بھی دھیان تھا لیکن خوف ضرور لاحق تھا۔ کھوہ کا تنگی چھت وسط میں کافی نیچے تھا جہاں میں موجود تھا۔ اونٹ مجھ تک رسائی حاصل کرنے کے لیے کھوہ میں داخل ہونے کی کوشش کررہا تھا جو مشکل نہیں بلکہ ناممکن تھا۔ دفعتاً مجھے سانپ کے رینگنے کا احساس ہوا۔

اونٹ اور سانپ کے درمیان فاصلہ نہ ہونے کے برابر رہ گیا۔ دونوں عفریتوں کے چہرے آمنے سامنے ہوگئے تھے۔

اونٹ کا دھڑ اور پیر کھوہ سے باہر تھے۔ اس سے قبل کہ اونٹ سنبھلتا سانپ نے ایک تیز پھنکار کے ساتھ اونٹ کی ناک پر ڈس لیا اور پھر بڑی سرعت کے ساتھ باہر نکل گیا۔ اونٹ درد سے بلبلا اٹھا اور اپنا سر فوراً باہر نکال لیا۔ یہ سب چند لمحوں میں وقوع پذیر ہوا تھا۔

اونٹ کی آواز کھوہ سے باہر گونج رہی تھیں۔ میری سانسیں رکی ہوئی تھیں۔ فوراً میں باہر نہیں نکل سکتا تھا کہ کہیں گھائل اونٹ مجھ پر حملہ نہ کردے۔

اب اونٹ کی آواز سنائی دے رہی تھیں نہ اس کے پیروں کی دھمک، ہر سو گہری خاموشی چھائی ہوئی تھی صرف ہوا چلنے کی سرسراہٹ سماعتوں سے ٹکرا رہی تھی۔ میں سرکتا ہوا کھوہ سے باہر کھلی فضا میں آگیا۔

اونٹ ایک طرف پڑا ہوا تھا۔ اس کی آنکھیں ساکت وجامد تھیں۔ ناک سے خون بہہ رہا تھا۔ اونٹ مرچکا تھا۔ مجھے بے ساختہ اونٹ پر طیش آگیا اور میں نے آگے بڑھ کر مرے ہوئے اونٹ کے منہ پر ایک بھرپور لات رسید کی اور پھر اپنا راستہ پکڑلیا۔

عبدالرحمٰن خاموش ہوگیا۔ وہ اپنے اوپر بیتنے والے واقعات کو مکمل طور پر بیان کرچکا تھا مگر میرا تجسس برقرار تھا کیونکہ میرے سوال کا جواب ابھی باقی تھا جو واقعہ کا اختتامی جز بھی تھا۔

میری سوالیہ نگاہوں کو محسوس کرتے ہوئے عبدالرحمٰن نے ایک لمبی سانس خارج کرنے کے بعد کہا۔

”وہ کھوہ یقیناً اس سانپ کا مسکن تھا اور میں اس کی پناہ میں آگیا تھا۔ اس نے میری خاطر جنونی اونٹ کو ڈس کر موت کی نیند سلا دیا تھا۔ مجھے کوئی گزند نہیں پہنچائی مگر اس واقعے کے تقریباً دس بارہ دن بعد میرے بائیں پاؤں میں سوجن و سوزش ہونے لگی۔ ایک زخم سا بن گیا تھا۔ دیسی جڑی بوٹیوں سے علاج کیا مگر ذرہ برابر افاقہ نہیں ہوا پھر کراچی علاج کے لیے چلا گیا۔ ٹیسٹ وغیرہ لینے کے بعد ڈاکٹر نے بتایا کہ آپ کے پاؤں میں کسی انتہائی زہریلے سانپ کا زہر ہے کیونکہ پیپ اور خون میں سانپ کے زہر کی آمیزش پائی گئی ہے۔ اب علاج وغیرہ کی اور کوئی بہتر صورت باقی نہیں رہ گئی ہے سوائے پیر کاٹنے کے۔ بصورت دیگر پیر کا زخم پورے جسم پر پھیل کر جان لیوا ثابت ہوگا۔

ڈاکٹر کی باتوں میں وزن تھا۔ یہ سب سن کر میں فوراً سمجھ گیا کہ زخم کیسے لگا۔ اصل وجہ میں نے ڈاکٹر کو بتائی اور اپنی جان کی سلامتی کی خاطر دل پر پتھر رکھ کر ایک پاؤں سے معذور ہونے کا فیصلہ کیا۔ اس دن کھوہ سے نکلنے کے بعد میں نے طیش میں آکر مردہ اونٹ کے منہ پر ایک لات رسید کی تھی۔ اونٹ کے منہ سے سبز مائل زہریلا مادہ نکل رہا تھا اور میرا پیر ننگا تھا۔ ننگے پیر سے ٹھوکر ماری تو پیر اس کے دانتوں سے ٹکرا گیا۔ دانت پیر میں چبھ گیا اور زخم بن گیا۔“

عبدالرحمٰن خاموش ہوگیا مجھے اپنے سوال کا جواب مل گیا تھا۔

تبدیلی

جناب ایڈیٹر سرگزشت

سلام تہنیت

یہ میرے دوست آصف علی کی سرگزشت ہے جو سبق آموز ہے۔ انسان دنیاوی مسائل میں گھر کر نہ چاہتے ہوئے بھی ایمان کو بیچنے پر آمادہ ہو جاتا ہے۔ وہ بھی بھٹک گیا تھا کہ اس کے ایک دوست حامد نے اسے سنبھال لیا اور پھر اس میں ایک ایسی تبدیلی رونما ہوئی جس نے اس کی زندگی بدل دی۔ اُمید ہے یہ سچی داستان آپ کو بھی پسند آئے گی۔

ناصر علی

(فیصل آباد)



”یار تم یقین کرو، تمہارے مزے آجائیں گے۔“ امجد نے مجھ سے کہا۔

”کیا ضروری ہے کہ گاؤں والے مجھ پر بھروسا کر ہی لیں۔“

”کرلیں گے، کیونکہ تمہاری صورت ہی ایسی ہے۔ معصوم، بھولی بھالی، لمبا قد، خوب صورت جسم اگر تم داڑھی بھی رکھ لو تو ایسی نورانی صورت نکل آئے کہ لوگ دیکھتے ہی رہ جائیں۔“

”لیکن بھائی میں اس لائن سے دور رہا ہوں۔“ میں نے

کہا۔ ”مجھے کیا معلوم کہ تعویذ کیسے لکھتے ہیں۔ جھاڑ پھونک کیا ہوتی ہے۔“

”میری جان، تمہاری چرب زبانی کس دن کام آئے گی۔“ امجد میری بات کاٹ کر بولا۔ ”تم یقین کرو، تمہاری باتوں میں جادو ہے۔ تم عام گفتگو اس انداز میں کرتے ہو کہ بندہ متاثر ہو جائے تو خاص گفتگو میں تو کمال دکھا دو گے۔“

”یار میں تو ایک وقت کی نماز بھی نہیں پڑھتا۔“ میں نے کہا۔ ”میں کہاں سے اللہ والا ہو جاؤں گا۔“

”دیکھو جان اگر پیسا کمانا ہے تو اس قسم کی باتیں کرنی ہوں گی۔ نمازی ہو گئے، ہاتھ میں تسبیح لے لی۔ ہو حق کرتے رہے، آخر جب دفتر میں کام کرتے ہو تو وہاں کے اصول بھی اپنانے ہی پڑتے ہیں اس طرح اس کو بھی سمجھ لو۔ جو میں کرواؤں ... ڈیوٹی سمجھ کر کر جاؤ۔“

امجد میرے لیے اسی قسم کے منصوبے لے کر آیا کرتا تھا۔ اس کے کچھ مشورے تو واقعی بہت اچھے تھے لیکن میری بدقسمتی کہ مجھے کبھی کوئی فائدہ نہیں ہوا اور میرے حالات بد سے بدتر ہوتے چلے گئے۔

کہیں کوئی نوکری بھی نہیں تھی۔

بے چارہ ہی میرا خیال کیا کرتا تھا۔ حالانکہ خود اس کے اپنے حالات بھی کوئی خاص نہیں تھے لیکن اس کا باپ زندہ تھا اور وہ ایک دکاندار تھا گھر میں پیسے آتے رہتے تھے۔ اس لیے اس کی حالت مجھ سے بہتر تھی لیکن وہ بھی کہاں تک میرا خیال کرتا اس لیے وہ میرے۔ لیے الٹے سیدھے منصوبے بناتا رہتا تھا۔ اب یہ منصوبہ لے کر آیا تھا کہ میں عامل بابا بن جاؤں۔

وہ ایک قصبہ بھی دیکھ آیا تھا وجاہت نگر۔ یہ مین ریلوے لائن سے بہت ہٹ کر تھا۔ یہاں جانے کے لیے صرف ایک بس سروس تھی۔

امجد کا کہنا تھا کہ وجاہت نگر کے رہنے والوں کو کسی ایسے اللہ والے کا انتظار تھا جو آ کر ان کی قسمتیں بدل دے۔ ویسے وہ کسان تھے۔ دکاندار تھے۔ ہنرمند اور کاریگر وغیرہ ہی تھے لیکن کچھ اور بھی چاہتے تھے۔ ان کے بھی بے شمار مسائل تھے۔

مفلسی، شادی نہیں ہو پا رہی، لڑکی زیادہ عمر کی ہوتی جا رہی ہے۔ کوئی رشتہ نہیں آتا یا کسی کے یہاں اولاد نہیں ہوتی یا کوئی ساس اپنی بہو سے تنگ ہے یا کسی بہو کو اپنی ساس اچھی نہیں لگتی یا کسی کے ساتھ دشمنی ہے۔ کسی پر مقدمہ چل رہا ہے۔ وغیرہ وغیرہ۔

بس اس قسم کے مسائل تھے اور حامد کا خیال تھا کہ میری باتوں سے وہ مطمئن ہو جائیں گے۔

”بے وقوف انسان اگر کام نہیں بنا اور ظاہر ہے کہ کام نہیں بنے گا تو سب مل کر ماریں گے۔“ میں نے کہا۔

”کوئی نہیں مارے گا۔ اندھا اعتقاد بھی کوئی چیز ہوتا ہے اور ایک جملہ ہے۔ جو ایسے موقعوں پر باباؤں کے بہت کام آتا ہے۔“

”اور وہ جملہ کیا ہے؟“

”وہ یہ ہے کہ سب خدا کی مرضی سے ہوتا ہے اور کوئی بھی اس کے خلاف نہیں جا سکتا۔“

”لگتا ہے تم پورا ہوم ورک کر کے آئے ہو۔“

”ایسا ویسا یار پی ایچ ڈی سمجھ لو۔ میں وہاں تمہارے لیے گراؤنڈ بھی بنا کر آیا ہوں اور سچی بات یہ ہے کہ تمہاری وجہ سے خود میرا بھی کام بن جائے گا۔ میں بھی پریشانیوں سے تنگ آ چکا ہوں۔“

”لیکن اس میں تمہارا کیا فائدہ ہوگا۔“

”تم یہ کام اکیلے تو نہیں کر سکتے نا۔ تمہیں ایک مددگار کی ضرورت ہوگی اور وہ مددگار سوائے میرے اور کون ہو سکتا ہے۔“

”ہاں یہ بات تو ہے۔“

”اس طرح ہم دونوں کے روزگار شروع ہو جائیں گے۔“ اس نے کہا۔

”میں سوچ کر بتاؤں گا۔ کیونکہ اس میں رسک ہے۔“

”کوئی رسک نہیں ہے۔ تم ٹیکنیکل غلطی مت کرنا۔ باقی میں سنبھال لوں گا۔“

”اور وہ ٹیکنیکل غلطی کیا ہے؟“ میں نے پوچھا۔

”بہت سامنے کی غلطی ہے۔ یہ بابا لوگ اس لیے لوگوں سے مار کھاتے ہیں اور اندر ہو جاتے ہیں کہ ان سے یہ غلطی سرزد ہو جاتی ہے۔“ اس نے کہا۔ ”پہلی غلطی تو عورت ہے۔ عورت کو اپنی کمزوری بنا لیتے ہیں۔ جس کی وجہ سے ان کی ٹھکائی ہو جاتی ہے۔ سب ضرورت مند عورت پر ڈورے ڈالنے کی کوشش کرنے لگتے ہیں۔“

”ہاں یہ تو ہے۔“ میں نے اعتراف کیا۔

”اس لیے عورت سے پرہیز کرنا ہے۔ چاہے لاکھ خوب صورت عورت سامنے آ جائے۔ وہ چاہے لاکھ ترغیب دے، تم بے نیاز بنے رہو گے۔“

”ہاں یار مجھے بھی عورت کے چکر میں مار کھانے کا شوق نہیں ہے اور دوسری غلطی کیا ہوتی ہے؟“

”دوسری غلطی یہ ہوتی ہے کہ جو بھی آئے اس کو کاٹ ڈالنے کا منصوبہ بنا لیا۔ فرض کرو تمہارے پاس ایک ضرورت مند آ گیا اور تم نے اس سے بیس ہزار روپے لے لیے اب اس کا کام تو ہونا نہیں ہے۔ لہٰذا وہ بیس ہزار کے نقصان پر ہنگامہ کھڑا کر دے گا اور اگر اس جگہ تم نے اس سے صرف پانچ ہزار لیے تو وہ مڑ کر پوچھے گا بھی نہیں کہ کام کیوں نہیں ہوا کیونکہ اس کا نقصان بہت معمولی ہوگا۔“

”ہاں یار یہ تم نے کام کی بات بتائی ہے۔“ میں نے کہا۔

”تم آرام آرام سے اپنا کام کرتے رہو۔ دو چیزیں سامنے رکھو۔ عورت اور دولت کے لالچ سے پرہیز۔ پھر تم برسوں نکال لے جاؤ گے اور مرنے کے بعد بھی قصبے والے تمہارے مزار پر چادریں چڑھاتے رہیں گے امر ہو جاؤ گے۔“

”یار تمہارا شیطانی ذہن واقعی اس پروجیکٹ پر پی ایچ ڈی کر آیا ہے۔“

”شیطانی نہیں یار، مجبوری کا ذہن۔“ اس نے کہا۔ ”خود سوچو تمہارے سامنے کیسے کیسے بے تکے لوگ گاڑیوں والے ہو گئے۔ بینک بیلنس ہے ان کے پاس، اپنے گھر ہیں اور تمہارے پاس کیا ہے جب کہ تم بہت سوں سے زیادہ ذہین ہو، تم میں بدلنے کی صلاحیت ہے تو اب ان سب خوبیوں کا استعمال کیوں نہ کرو۔“

”یار! کیا یہی طریقے رہ گئے ہیں۔“

”تو اور کون سا طریقہ رہ گیا ہے۔ سب کچھ تو کر کے دیکھ چکے ہو۔“

”ایک بات اور بتاؤ۔ میں تو دین اور مذہب وغیرہ سے بہت دور رہا ہوں۔“ میں نے کہا۔ ”تھوڑی بہت چیزیں تو آنی چاہئیں ناں۔“

”یار مسلمان گھرانے میں پیدا ہوئے ہو، نماز تو پڑھ ہی سکتے ہو۔ اس کے علاوہ چھوٹی موٹی سورتیں تو یاد ہوں گی ان سے کام چلا لینا۔“

”ان کے علاوہ بھی کچھ اور چاہیے یار کیونکہ یہ ایک خاصا دشوار کام ہے۔“

”او ہو یہ جو ہزاروں بابا پورے ملک میں بکھرے ہوئے ہیں ان کو کیا آتا ہے۔ چلو تمہاری تسلی کے لیے کسی کو تلاش کرتا ہوں۔ جن کی صحبت میں تم کچھ دن رہ کر کچھ سیکھ جاؤ۔“

امجد ایک شوشا چھوڑ کر چلا گیا تھا۔ ویسے اس کی بات دل کو لگی بھی تھی۔ اب تک کیا تھا میرے پاس، کچھ بھی نہیں۔ مجھے اپنے آپ پر بھروسا تھا۔ میں باتیں کرنے کا فن جانتا تھا اور اس

بابا نظام الدین

شیخ محمد عرب سہروردی کے بھائی تھے۔ علمائے عصر اور فضلاء وقت سے استفادہ کیا اور بہت تھوڑے عرصے میں تمام علوم میں کمال حاصل کر لیا۔ مدت العمر موضع ککلن پرگنہ لعل میں رہے، 1234ہجری میں وفات پائی۔ نعش ان کی شہر میں لائے اور مقبرہ اسلاف میں دفن کیے گئے۔

میں اس کے علاوہ اور ہوتا ہی کیا ہے۔ تھوڑی سی اداکاری اور باتیں کرنے کا ہنر، پھر لوگ خود بخود آتے چلے جاتے ہیں۔

لیکن الجھن یہی تھی کہ میں اپنی پوری زندگی میں کبھی نماز روزے کے قریب نہیں گیا تھا۔ قرآن شریف پڑھنا تو بہت دور کی بات ہے عام سی سورہ بھی یاد نہیں تھی۔

اس کا ذکر میں نے دوسرے دوست حامد سے کیا تو وہ حیران رہ گیا پھر بولا۔ ”ایمان کا سودا نہ کرو۔“

”پھر کیا کروں کہ آمدنی کا راستہ کھلے۔“

”ٹھیک ہے کسی بزرگ کو ڈھونڈتا ہوں ٹریننگ کے لیے۔“

یعنی میں ذہنی طور پر اس ایڈونچر کے لیے تیار ہو گیا تھا۔

دو چار دنوں کے بعد حامد پھر میرے پاس آ گیا۔ ”چل بھائی تیرا دوسرا کام بھی ہو گیا۔“ اس نے کہا۔

”کون سا دوسرا کام؟“

”وہی روحانی ٹریننگ کا۔“ اس نے کہا۔ ”ایک بزرگ مل گئے ہیں ان کا اپنا آستانہ ہے۔ تمہیں دس پندرہ دن ان کے یہاں گزارنے ہوں گے۔ وہ کیا کرتے ہیں۔ کس طرح آنے والوں کو ہینڈل کرتے ہیں۔ تعویذ وغیرہ لکھنے کے کیا طریقے ہوتے ہیں یہ سب ان کے ساتھ رہ کر تمہیں معلوم ہو جائے گا۔“

”اور رہنا کہاں ہوگا؟“

”ان کے ساتھ ہی مسجد میں۔ ان کا آستانہ مسجد ہی میں ہے۔ ایک کوٹھڑی بنی ہوئی ہے۔ وہ اسی میں رہتے ہیں تم بھی ان کے عقیدت مند بن کر ان کے ساتھ رہنا۔“

”یار وہ مجھے اللہ کے نیک بندے معلوم ہوتے ہیں۔“ میں نے کہا۔ ”ان کو دھوکا دینا اچھا نہیں لگے گا۔“

”یہ دھوکا نہیں میری جان! مجبوری ہے۔ تیرے اور تمہارے نوچ کا سوال ہے۔“ حامد نے کہا۔

”چلو ٹھیک ہے میں تو اب سب کچھ کرنے کو تیار ہوں۔“

”تو پھر کل شام میں آؤں گا۔ تم اپنے دو چار جوڑے تیار رکھنا۔“

”وہ کیوں؟“

"ارے بھائی ان کے ساتھ جو رہنا ہے کپڑے تو ہونے چاہئیں نا تمہارے پاس اور ایک بات اور۔ اب شیو بنانے مت بیٹھ جانا۔ تمہاری داڑھی بھی ہونی چاہیے۔ زیادہ لمبی نہ ہو لیکن داڑھی ہو۔ اس کے بغیر تمہاری بزرگی نہیں چلے گی۔"

"یار! تم نے تو پورا پورا پھنسوانے کا بندوبست کر رکھا ہے۔"

"کچھ نہیں ہوتا۔ یا تو بھوکے مر جاؤ یا پھر دریا میں چھلانگ لگادو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔"

دوسری شام میں حامد کے ساتھ چل پڑا۔ میرے پاس دو چار جوڑے تھے۔ وہی میں نے بیگ میں رکھ لیے تھے۔ یہ ایک نئے انداز کا سفر تھا کئی گھنٹوں کے بس کے سفر کے بعد ایک چھوٹی سی بستی میں اتر گئے۔ بس بڑی سڑک پر آگے روانہ ہو گئی تھی۔

"یار یہ تم کہاں لے آئے۔" میں نے کہا۔

"میری جان! وہ بزرگ اس چھوٹی سی بستی کی مسجد میں رہتے ہیں۔" اس نے بتایا۔ "تم پریشان نہ ہو۔ میں نے ان سے تمہارے لیے بات کر رکھی ہے وہ خود تمہارا انتظار کر رہے ہوں گے۔"

"اور تم کہاں رہو گے؟"

"میں دو چار دنوں کے لیے شہر جاؤں گا۔" اس نے بتایا۔

"اس کا مطلب یہ ہوا کہ تم مجھے چھوڑ کر نکل لو گے۔"

"ابے وہ ایک بے ضرر سے انسان ہیں۔ کوئی شیر نہیں ہیں جو تم کو کھا جائیں گے۔" اس نے کہا۔ "اور ویسے بھی تم کوئی بچے تو ہو نہیں جو اپنی حفاظت نہ کر سکو۔"

"اچھا چلو، جب اوکھلی میں سر دے ہی دیا ہے تو پھر کیا ڈرنا۔"

ہم کو وہاں سے پیدل ہی مسجد کی طرف جانا تھا۔ وہ ایک چھوٹی سی آبادی تھی۔ ایک چھوٹا سا بازار بھی تھا۔ جہاں ضرورت کی چیزیں مل جاتی ہوں گی۔ لوگ ہم کو بہت حیرت اور دلچسپی سے دیکھ رہے تھے کیونکہ ہم تو انہیں مسافر ہی معلوم ہو رہے تھے۔

کئی گلیوں سے گزرنے کے بعد ہم ایک مسجد کے پاس آگئے۔

"یہی ہے وہ مسجد۔" حامد نے بتایا۔ "اب چپ چاپ میرے ساتھ چلے آؤ۔"

اس بزرگ کو دیکھتے ہی میری حالت کچھ اور ہونے لگی تھی۔ بہت ہی نورانی چہرہ تھا اور ہونٹوں پر شفقت بھری مسکراہٹ۔ آنکھوں میں کشش کے ساتھ ساتھ ایسا تاثر جیسے وہ سیدھی روح کی گہرائیوں تک جھانک رہی ہوں۔

"آؤ آؤ۔" بزرگ نے مصافحہ کے لیے اپنا ہاتھ آگے بڑھا دیا۔

ان ہاتھوں کا لمس بھی کچھ اور تھا۔ ایک کرنٹ سا دوڑ گیا تھا۔

"حضرت یہ وہی ہیں میرے دوست آصف علی۔" حامد نے میرا تعارف کروایا۔ "میں نے جن کا ذکر کیا تھا۔"

"ماشاء اللہ۔" بزرگ نے اپنی گردن ہلائی۔ پھر میری طرف دیکھا۔ "میاں یہ بہت کٹھن راستہ ہے۔ کیا ان پر چلنے کی ہمت ہے؟"

"اس لیے تو حاضر ہوا ہوں سرکار۔ آپ کی خدمت کرنے۔" میں نے کہا۔

"نہیں بیٹا میری خدمت نہیں، اپنی تربیت کرنے۔" بزرگ مسکرا دیے۔ "چلو جب تم نے اپنے دل میں ٹھان ہی لی ہے تو بسم اللہ۔ یہ مسجد میرا گھر بھی ہے۔ تمہاری خوش قسمتی سے قصبہ والوں نے یہاں ایک کمرا اور بنوا دیا ہے مہمانوں کے لیے۔ اب تم آگئے ہو، تم سے بڑا مہمان اور کون ہو سکتا ہے۔"

"جی جناب میں تو یہی سوچ کر آیا ہوں کہ ہر قسم کے حالات میں گزارا کروں گا۔"

"جزاک اللہ۔ اب تم میرے نہیں بلکہ اللہ کے مہمان ہو۔"

حامد اسی دن شہر واپس ہو گیا تھا جب کہ میں وہیں اس مسجد میں رہ گیا تھا۔ مجھے جو کمرا دیا گیا تھا وہ چھوٹا لیکن صاف ستھرا تھا۔ ایک چارپائی بھی تھی۔

میں اس چارپائی پر لیٹ کر یہی سوچتا رہا کہ میں یہ کیسی حماقت کر رہا ہوں۔ میرا ان باتوں سے کیا تعلق ہے۔ یہ ماحول میرے لیے تو نہیں ہے۔ میں تو شہر کا رہنے والا نوجوان ہوں۔ میں کن چکروں میں اس دور دراز علاقے میں آکر پھنس گیا ہوں۔

لیکن کیا کرتا۔ اب تو آ ہی گیا تھا۔

اس صبح فجر کی نماز بھی پڑھنی پڑی تھی۔

نماز شروع ہونے سے پہلے میں نے جھجکتے ہوئے ان بزرگ سے کہا۔ "جناب! میں تو بالکل نابلد قسم کا انسان ہوں، مجھے تو کچھ بھی نہیں آتا۔ میں تو یہ بھی نہیں جانتا کہ وضو کیسے ہوتا ہے۔"

میرا خیال تھا کہ میری بات سن کر وہ بھڑک اٹھیں گے۔

لیکن اس کی بجائے انہوں نے بہت شفقت سے کہا۔ "کوئی بات نہیں۔ سب آجائے گا۔ یہی بہت ہے کہ تم اللہ کے گھر تک آچکے ہو۔"

پتا نہیں یہ بات انہوں نے کس پیرائے میں کہی تھی کہ میں کانپ کر رہ گیا تھا۔

"آؤ تم دیکھتے رہو میں کس طرح وضو کرتا ہوں۔"

قصبے کے کچھ اور لوگ بھی آگئے تھے۔ اذان بھی فدا حسین صاحب نے خود ہی دی تھی۔ اس کے بعد مجھے اٹھایا تھا۔ ان بزرگ کا نام فدا حسین تھا۔ یہ پہلا موقع تھا کہ فجر کی نماز کے لیے مجھے اٹھنا پڑا تھا۔ اس سے پہلے اذان کی آواز آتی تھی لیکن میں کروٹ بدل کر پھر سے سو جاتا تھا۔ آج مجبوراً اٹھنا پڑا تھا۔

پتا نہیں زندہ رہنے کے لیے کیسے کیسے کام کرنے پڑتے ہیں۔

بستی کے لوگ حیرت سے میری طرف دیکھ رہے تھے۔ فدا صاحب نے میرا تعارف کرواتے ہوئے بتایا۔ "اب یہاں آصف علی آپ لوگوں کے ساتھ ہی اس مسجد میں رہیں گے۔"

"جزاک اللہ، جزاک اللہ۔" لوگوں نے کہنا شروع کیا۔

بہرحال نماز شروع ہونے سے پہلے فدا صاحب نے میرے قریب آکر کہا۔ "بیٹا! اگر میرا اندازہ درست ہے تو شاید تم کو نماز بھی نہیں آتی ہو گی۔"

"جی قبلہ۔" میں نے شرمندگی سے گردن جھکالی۔

"چلو کوئی بات نہیں۔ اب تم اس طرح کرنا جس طرح دوسرے کرتے ہیں چپکے چپکے دیکھتے رہنا اور جہاں تک سورۃ وغیرہ کا تعلق ہے وہ میں تمہیں بعد میں تعلیم دے دوں گا۔"

بہرحال میں نے اس طرح نماز ادا کی کہ اوروں کی نقل کرتا چلا گیا لیکن سچ تو یہ ہے کہ اس میں بھی مجھے اتنا لطف آیا تھا کہ جس کا تجربہ پہلے کبھی نہیں ہوا ہو گا۔

نماز سے فارغ ہوا تو محلے کے ایک گھر سے پُرتکلف ناشتا آگیا۔

"لو بیٹا یہ ناشتا تمہارے لیے ہے۔" فدا صاحب نے کہا۔ "کیونکہ تم کو ان لوگوں نے پہلی بار دیکھا ہے اور یہاں تمہارا پہلا دن ہے۔"

"لیکن حضرت میں اکیلا۔"

"نہیں بیٹا میں اپنا ناشتا خود تیار کر لیتا ہوں۔ ابھی دیکھ لینا۔"

ان کی کوٹھڑی میں لکڑی کا ایک چولہا تھا۔ انہوں نے آگ جلائی اور چائے کا پانی رکھ دیا۔ "بس بیٹا! میں دن میں صرف دو بار چائے پیتا ہوں۔ ایک اس وقت ایک شام کے وقت اگر تم کو چائے کی عادت ہے تو بلا تکلف مجھ سے کہہ دینا میں بنا دیا کروں گا۔"

"ارے نہیں حضرت۔ میں آپ کو زحمت نہیں دے سکتا۔"

چائے تیار کر لینے کے بعد انہوں نے ایک مرتبان سے بھنے ہوئے چنے نکالے۔ "بس بیٹا یہ ہے میرا ناشتا۔"

"حضرت میرے سامنے ناشتے کی یہ ٹرے رکھی ہے جس میں بہت سی چیزیں ہیں اور آپ ایسا ناشتا کر رہے ہیں۔ میں یہ کیسے دیکھ سکتا ہوں۔"

"نہیں بیٹا! وہ تمہارے مقدر کا ہے۔ تم کھا لو، تم جوان آدمی ہو۔ تم کو توانائی کی زیادہ ضرورت ہے۔"

وہ بزرگ ایک کمال کے آدمی ثابت ہو رہے تھے۔ میرے تجربے میں بیش بہا اضافہ ہوتا جا رہا تھا۔ میں تو یہ سمجھ کر ان سے تربیت لینے آیا تھا کہ وہ عام سے ہوں گے۔ جس طرح اس ملک میں ہزاروں لاکھوں نام نہاد اللہ والے تھے۔ اسی طرح وہ بھی ہوں گے لیکن وہ تو ایک مختلف انسان تھے۔

انہوں نے بتایا کہ وہ بستی والوں سے کبھی کچھ نہیں لیتے اگر عید بقر عید کو کھانے کی دعوت کر دی تو قبول کر لی ورنہ نہیں۔

"بیٹا میرے دو بیٹے ہیں۔ دونوں دبئی میں ہیں۔ دونوں کی بہت اچھی ملازمتیں ہیں لیکن میں ان سے بھی کچھ نہیں لیتا۔ میں نے کسی زمانے میں لاہور میں اپنا ایک گھر بنوا لیا تھا۔ بہت چھوٹا سا ہے۔ اس کا دس ہزار ماہانہ کرایہ آتا ہے۔ کرائے دار شریف لوگ ہیں۔ وہ ہر ماہ پابندی اور باقاعدگی کے ساتھ کرایہ دیتے ہیں۔ میں اس سے سارا مہینا گزارا کرتا ہوں اور میرا خرچ ہی کیا ہے۔ رہائش اسی مسجد میں ہے، راشن قصبے کے بازار سے جا کر لے آتا ہوں۔ خود اپنا کھانا بنا لیتا ہوں، زندگی گزارنے کے لیے اور کیا چاہیے۔ بس آرام سے گزر جاتی ہے۔ خدا سے میری بس ایک دعا رہی ہے۔ جیون چاہے جیسے گزرے موت مگر آسان ہو مولا۔"

ان کی باتیں دل پر ایک عجب اثر کر رہی تھیں۔ وہ کمال کے آدمی تھے۔

دو چار دنوں کے بعد مجھے احساس ہونے لگا کہ میں جس مقصد سے یہاں آیا تھا وہ تو کہیں اور رہ گیا ہے۔ یہ درست ہے کہ میں نے بہت کچھ سیکھ لیا تھا۔

مجھ جیسے آدمی کو وضو کے مسائل معلوم ہو گئے تھے۔ نماز کی

کچھ سورتیں بھی یاد ہوگئی تھیں۔ ان کے علاوہ جو سب سے بڑی تبدیلی آئی وہ یہ کہ قناعت پسندی کا جذبہ بیدار ہونے لگا تھا۔

دل چاہ رہا تھا کہ چھوڑو، میں بھی کن چکروں میں پھنس گیا ہوں۔ زندگی تو بس یہی ہے جو یہ بزرگ گزار رہے ہیں۔ اس کے علاوہ جو کچھ ہے وہ واہم وگمان ہے دھوکا ہے۔

پندرہ دنوں کے بعد حامد شہر سے آگیا۔

اس کے آنے کی بہت خوشی ہوئی تھی۔ اس وقت ہم عصر کی نماز سے فارغ ہو چکے تھے۔ حامد مجھے اپنے ساتھ ایک طرف لے آیا۔

''ہاں بھائی کیا پروگریس ہے، کیا کچھ سیکھ لیا؟''

''یار! بہت کچھ سیکھ چکا ہوں۔'' میں نے بتایا۔ ''ورنہ پہلے تو کچھ نہیں آتا تھا۔''

''تو پھر کیا ارادے ہیں؟ اپنا بزنس الگ سے شروع کردیں۔''

''یار نہ جانے کیوں اب میرا دل نہیں چاہتا۔'' میں نے کہا۔

''کیا مطلب؟'' اس نے چونک کر میری طرف دیکھا۔

''پتا نہیں کیوں، ایسا لگتا ہے کہ میں دھوکے کا کاروبار کرنے نکلا تھا لیکن خود دھوکا کھا گیا ہوں۔ منزل میری کچھ اور تھی لیکن......!''

''یہ بات ہوئی نا۔'' حامد مسکرا دیا۔ ''اب تم آئے ہو لائن پر۔''

''کیا مطلب؟''

''میری جان میں تمہیں یوں ہی یہاں نہیں لایا تھا۔'' اس نے بتایا۔ ''پوری پلاننگ کے ساتھ لایا تھا کیونکہ میں تمہارا سچا دوست ہوں۔ تمہاری بے راہ روی نے مجھے پریشان کردیا تھا۔ پھر میں نے اپنے نانا ابو سے تمہارا ذکر کیا۔''

''کون نانا ابو۔''

''یہی فدا حسین صاحب۔ یہ میرے سگے نانا ہیں۔'' اس نے انکشاف کیا۔

''کیا!'' مجھے حیرت پر حیرت ہو رہی تھی۔

''ہاں بھائی، سگے نانا، خود دیکھ لو کیسے آدمی ہیں۔ تم کو یہاں لانے کا مقصد ہی یہی تھا کہ تمہاری تربیت ہو جائے۔ تم سیدھے راستے پر آجاؤ۔ ویسے میرے کہنے پر تو کبھی نہیں آتے۔ اس لیے میں نے بابا بن جانے کا لالچ دیا۔ ساری ٹیکنیکل باتیں کیں۔ اپنے اور تمہارے فیوچر کا رونا رویا اور تم میرے ساتھ یہاں تک چلے آئے اور مجھے خوشی ہے کہ میں تمہارے اندر کی دنیا کو بدلا ہوا دیکھ رہا ہوں۔''

''میرے دوست تم نے مجھ پر بہت بڑا احسان کیا ہے۔'' میں نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ ''تم نے مجھے مزید بھٹکنے سے بچا لیا ہے لیکن یار ابھی بھی شاید ایک آنچ کی کسر رہ گئی ہے۔''

''وہ کیا ہے؟''

''میں زبان سے تو اللہ اللہ کرتا رہتا ہوں لیکن دل سے ایسا کر نہیں پاتا۔''

''چلو اس کا بھی مشورہ نانا ابو سے لے لیتے ہیں۔''

''یار! مجھے ان کے سامنے یہ کہتے ہوئے شرمندگی ہو گی۔''

''کس بات کی شرمندگی۔ چلو تم نہیں لیکن میں کہہ دوں گا۔''

وہ مجھے اپنے ساتھ فدا صاحب کے حجرے میں لے آیا۔

''نانا ابو۔''

''اوہ۔'' فدا صاحب نے مسکرا کر پوچھا۔ ''تو تم نے اپنے دوست کو بتا دیا۔''

''ہاں نانا ابو، بتا دیا ہے اور اب ان کے ساتھ ایک پرابلم ہے۔''

''وہ کیا؟''

''یہ کہتے ہیں کہ ان کی زبان تو اللہ اللہ کرتی رہتی ہے، لیکن دل نہیں کرتا۔''

''تو اس میں کیا پریشانی ہے۔'' فدا حسین صاحب نے میری طرف دیکھا۔ ''بیٹا! جب تم یہاں آئے تھے تو کیا تمہاری زبان اللہ اللہ کرتی تھی۔''

''نہیں حضرت۔'' میں نے اپنی گردن جھکا لی۔ ''ایسا نہیں ہوتا تھا۔''

''تو پھر مبارک ہو بیٹا کہ تمہارے جسم کا ایک عضو تو راہ راست پر آگیا ہے۔ کچھ دنوں کے بعد دل بھی آجائے گا۔ بس اس طرح اپنا سفر طے کرتے رہو۔ سب ٹھیک ہو جائے گا۔''

برسوں ہو چکے ہیں۔ میں اپنا سفر طے کر رہا ہوں، معرفت کی راہیں تو بہت طویل ہوتی ہیں۔ اللہ مجھے ثابت قدم رکھے۔

فدا صاحب کا انتقال ہو چکا ہے اور میں اسی مسجد میں رہتا ہوں۔ آپ بھی اگر کبھی ضرورت محسوس کریں اور کوئی راہ نہیں مل رہی ہو تو پہلے اپنی زبان کو اللہ اللہ کرنا سکھائیں۔ اس کے بعد دل بھی وہی کرے گا جو آپ چاہیں گے۔



خواہشوں کے سراب

محترمہ عذرا رسول

تسلیم

یہ سچ بیانی ایک ایسی لڑکی کی ہے جو خوابوں اور خواہشوں کے سراب کے پیچھے بھاگتی رہی تھی جس کا خمیازہ اسے بھگتنا پڑا۔ اس میں ہر ایک کے لیے سبق ہے، اُمید ہے قارئین کو بھی پسند آئے گی۔

ثمینہ طاہر بٹ

(شاد باغ، لاہور)

جولائی کی اس حبس زدہ دوپہر میں وہ سیاہ چادر میں خود کو سرتاپا چھپائے، ایک چھوٹی سی گٹھڑی بغل میں دبائے، تیز تیز قدموں سے چلتی ہوئی اپنی منزل کی جانب رواں تھی۔ سورج اپنی تیز چبھتی نگاہوں سے اس کی تیزی اور رفتار کو دیکھ رہا تھا۔ ہوا بالکل ساکن تھی اور اس دم گھونٹتی کیفیت میں ارد گرد پھیلی جھاڑیاں بھی سانس روکے اس کی جرأت کو آنکھیں پھاڑ پھاڑ کر دیکھ رہی تھیں مگر وہ ہر جانب سے بے پروا آگے ہی آگے بڑھتی جا رہی تھی۔ پھر وہ ایک خوبصورت، پھولوں اور

سبزے سے ڈھکی سفید کوٹھی کے سامنے جا پہنچی۔ ایک پل کو رک کر اس نے اپنی تیز ہوتی سانسوں پر قابو پانے کی کوشش کی اور پھر اِدھر اُدھر دیکھتے ہوئے کوٹھی کے ادھ کھلے دروازے کی سمت بڑھ گئی۔

”آ گئی تو شنو! اتنی دیر کیوں لگا دی تو نے؟ میں کب سے تیری راہ دیکھ رہی تھی؟“ اس نے جیسے ہی دروازے سے اندر قدم رکھا، گیٹ کے ساتھ لگ کر کھڑی اس کی ہی ہم عمر لڑکی نے تیزی سے اس کا ہاتھ پکڑ کر اندر کھینچتے ہوئے جیسے سوالوں کی بوچھاڑ کر ڈالی تھی اس پر۔ وہ پہلے سے ہی گھبرائی ہوئی تھی، اس افتاد پر اور بھی بوکھلا گئی۔

”ہاں...... ہاں...... آ گئی ہوں۔ اور دیر کہاں ہوئی؟ یہی وقت تو طے ہوا تھا ہمارے بیچ۔ ہے ناں؟“ شنو نے اپنے حواسوں کو سنبھالتے ہوئے اپنے تیکھے انداز میں الٹا اس سے سوال کر دیا تو وہ ہنس دی۔

”ٹھیک کہہ رہی ہو تم۔ واقعی وقت تو یہی طے ہوا تھا لیکن سچ کہوں شنو، میری جان پر ایک ایک پل قیامت بن کر گزرا ہے۔ بلکہ ابھی بھی گھبراہٹ ہو رہی ہے۔“ تیزی سے گیٹ بند کر کے اس کے ساتھ اندر کی طرف چلتے ہوئے مسرت پر ایک بار پھر گھبراہٹ کا دورہ سا پڑا تھا۔

”پاگل ہے تو بھی مسرت! ارے، یہ تو خوشی کا وقت ہے۔ میری آزادی کی گھڑی ہے یہ اور تو...... تو کیسی سہیلی ہے میری؟ بجائے میری خوشی میں خوش ہونے مجھے ڈرا رہی ہے؟“ شنو نے ایک دم رکتے ہوئے کہا تو مسرت پھیکی سی ہنسی ہنس کر رہ گئی۔

”نہیں شنو! میں تمہیں ڈرا نہیں رہی۔ تمہاری خوشی سے بڑھ کر تو میرے لیے کچھ بھی نہیں۔ اسی لیے تو تمہارے اس انتہائی اقدام میں بھی میں ساتھ دینے کو تیار ہو گئی ہوں لیکن......!“

”لیکن کیا؟ جب تم نے میرا ساتھ دینے کا فیصلہ کر ہی لیا ہے تو اب مجھے سوچوں میں مت الجھاؤ مسرت۔ میں اب کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی کیونکہ میں جو فیصلہ کر چکی ہوں، اب اس پر عمل بھی کر کے دکھاؤں گی...... اور تم جانتی ہو کہ میں بار بار اپنے فیصلے بدلنے کی عادی نہیں ہوں۔“ شنو نے مسرت کا متذبذب سا انداز دیکھا تو اس کا ماتھا ٹھنکا۔ اس نے ایک لمحہ کی تاخیر کیے بغیر اپنی عزیز از جان سہیلی کو اپنا آخری فیصلہ ایک بار پھر سنایا اور اسے اسی حالت میں کھڑا چھوڑ کر آگے بڑھ گئی۔

”جانتی ہوں یار! لیکن اس کے باوجود میں چاہتی ہوں کہ تم ایک بار پھر سوچ لو، آخری بار۔ پھر اس کے بعد تمہیں یہ موقع نہیں ملے گا اور نہ ہی زندگی تمہیں دوبارہ اتنا موقع دے گی کہ تم اپنے ماضی میں جھانک بھی سکو!“ مسرت اس کی بچپن کی دوست تھی۔ اور بہت اچھی طرح سے اسے جانتی تھی لیکن اپنی فطرت کے ہاتھوں مجبور ہوتے ہوئے اسے ایک اچھی اور مخلص دوست ہونے کے ناطے اس کے سود و زیاں کے بارے میں ایک بار پھر سوچنے کا مشورہ دے رہی تھی۔

”مسرت! تم جانتی ہو ناں، میں شہناز ہوں، شہناز رشید عرف شنو۔ اور جو بات ایک بار ٹھان لوں پھر اس سے پیچھے نہیں ہٹتی۔ تم بار بار اصرار کر کے اپنی توانائیاں کیوں ضائع کر رہی ہو؟“ تن کے کھڑے ہوتے ہوئے وہ سیدھا اس کی آنکھوں میں دیکھتے ہوئے بولی تو مسرت نے بے بسی سے سر جھکا لیا تھا۔ کیونکہ اب اسے سمجھانے کا کوئی فائدہ نہیں تھا۔ وہ شاید سمجھنے، سمجھانے کی حد پار کر چکی تھی اور مسرت کو یہی بات تکلیف دے رہی تھی۔

”مسرت! سچ سچ بتا مجھے۔ باجی نے کہیں اپنا ارادہ بدل تو نہیں دیا؟“ کسی انہونی کے احساس کے تحت وہ اس کی طرف پلٹی تو مسرت ایک بار پھر آہ بھر کے رہ گئی۔

”نہیں بی! بھا۔ بی اندر تمہارے انتظار میں ہی بیٹھی ہیں۔ تم بے فکر رہو۔ بھابی بھی زبان کی پکی ہیں۔ تم سے وعدہ کیا ہے تو جان پر کھیل کر نبھائیں گی وہ۔“ مسرت نے اس کے ساتھ قدم بڑھاتے ہوئے اداس لہجے میں کہا تو شنو نے اطمینان کی سانس بھری۔

”شکر ہے۔ تم نے تو مجھے ڈرا ہی دیا تھا۔ چلو، اب جلدی کرو، کہیں کوئی اور مصیبت نہ گلے پڑ جائے۔“ شکر کا کلمہ پڑھتی شنو اس کا ہاتھ تھامے تیزی سے اندرونی عمارت کی طرف بڑھی تھی اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ اس کے ساتھ گھسٹتی چلی گئی تھی۔

☆......☆

شہناز کا تعلق خانہ بدوشوں کی برادری سے تھا۔ ان کے اپنے ہی قاعدے، قانون تھے۔ ان کی برادری کے اصولوں اور ضابطوں سے انحراف کسی کے لیے بھی ممکن نہ تھا۔ چاہے کچھ بھی ہو جائے۔ ان اصولوں اور قوانین پر ان سب کو چلنا ہی پڑتا تھا۔ وہ اپنے والدین اور بھائیوں، بھابی کے ساتھ جو ہر ٹاؤن کے مضافات میں واقع جھگیوں میں رہائش پذیر تھی۔ وہ لوگ اپنی برادری کے ساتھ جانے کہاں کہاں کی خاک چھانتے ہوئے اس علاقے تک پہنچے تھے، اور اب پچھلے کئی

سالوں سے یہیں ڈیرے ڈالے بیٹھے تھے۔ شنو کے بڑے بھائی اور بہن کی شادیاں بھی یہیں ہوئی تھیں، اسی بستی میں ایک طرف ان کی نئی جھگیاں بسا دی گئی تھیں۔ وہ لوگ جب یہاں آ کر آباد ہوئے تھے تو اس وقت شنو مشکل سے پانچ، چھ سال کی ہی تھی۔ اس نے یہیں ہوش سنبھالا تھا۔ اور ہوش میں آتے ہی اپنے اردگرد کے ماحول نے اس کی حسیات کو طرح طرح سے متاثر کیا تھا۔ اس کی بستی کے سارے مرد سارا سارا دن یا تو بستی میں ہی پڑے کھاٹ توڑتے رہتے یا پھر بستی کے چوپال میں بوری بچھائے تاش اور سٹہ بازی میں مصروف رہتے۔ بہت ہوا تو کبھی کہیں بھیک مانگنے نکل گئے۔ ہاں چند لوگ ایسے بھی تھے جو ریڑھی لگاتے، یا سائیکل پر کچھ سامان رکھے پھیری لگا لیا کرتے لیکن ان مردوں کی تعداد آٹے میں نمک کے برابر تھی۔ خود شنو کا بابا اور بھائی سارا سارا دن بستی میں ہی بیٹھے اٹھکیلیاں کرتے اور نشہ میں دن گزار دیا کرتے تھے۔ ایسے میں بستی کی عورتوں کے شانوں پر خود بخود ہی دہرا بوجھ آن پڑتا اور وہ اپنے بال بچوں کی پرورش کے لیے کبھی بھیک کے لیے ہاتھ پھیلائیں تو کبھی مزدوری کر کے اپنا اور اپنے خاندان کا پیٹ پالتیں نظر آتیں۔ شنو کی ماں، بھابیاں اور بہن بھی دوسری قسم کی عورتوں میں شمار ہوتی تھیں۔ وہ بہت عرصے سے جوہر ٹاؤن کی کوٹھیوں میں گھریلو... ملازماؤں کی حیثیت سے اچھی جگہ بنا چکی تھیں۔ شنو بھی اماں اور دوسری عورتوں کے ساتھ جانے لگی کیونکہ ان کی بستی میں لڑکیوں کو پڑھانے کا رواج نہیں تھا تو اسے کون کسی اسکول میں داخل کرواتا۔ اسی لیے وہ بھی ہوش سنبھالنے سے پہلے ہی ماں اور بہن کا ہاتھ بٹانے لگی تھی مگر ان سجی سجائی کوٹھیوں میں آ کر وہ جیسے کہیں کھوسی جاتی تھی۔ اپنی گندی سندی جھگیوں کا مقابلہ ان سجی سجائی، لش پش کرتی کوٹھیوں سے کرنے لگتی تو کبھی اپنی ہی ہم عمر لڑکیوں، لڑکوں کو بہترین ملبوسات زیب تن کیے، زندگی کی بہترین سہولیات سے مستفید ہوتے دیکھتی اور ایک بے نام سی بے چینی اس کے اندر بھی ہلکورے لینے لگتی۔ ان حسین اور مغرور بیگمات اور ان کی نازک اندام نخریلی بیٹیوں، بہوؤں کی اترن پہننے کے باوجود ان میں اور اس کی اماں، بہن اور بھابیوں میں ایک واضح فرق دکھائی دیتا تھا۔ شنو کی جاگتی آنکھوں نے خواب دیکھنے شروع کر دیے تھے۔ وہ اپنی حیثیت بھلائے، خود کو کسی ایسے ہی پکے گھر کی مالکن تصور کر بیٹھتی اور پھر اسی مالکانہ حق کے ساتھ کام کرتے ہوئے اس سے کچھ نہ کچھ نقصان ہو جاتا اور پھر وہ مالکن کے زیر عتاب آ جاتی۔ اس موقع

پر اس کی ماں یا باجی ہمیشہ بیگم صاحبہ کی ہزار باتیں سنتے ہوئے اس عاجزی سے ہاتھ جوڑے اسے بچانے کی کوشش کرتیں کہ اس کے ٹوٹے خوابوں کی کرچیاں اس کے دل کے ساتھ ساتھ اس کی آنکھوں کو بھی لہو رلاتی تھی۔

”دیکھ لینا تم۔ ایک نہ ایک دن میں بھی ایسے ہی گھر کی مالکن بن کر رہوں گی۔ اور اس وقت کوئی مجھے نہیں روک پائے گا۔ کوئی بھی نہیں۔ حتیٰ کہ تم بھی نہیں۔“ وہ آسمان کو دیکھتے ہوئے خود سے عہد باندھتی اور اس جوش سے باندھتی کہ ہوش ہی کھو بیٹھتی اور جانے کس کس کو اپنے عہد کا گواہ بنا لیتی۔ اسے خود کچھ پتا نہیں چلتا تھا۔

شہناز عرف شنو کا وقت ایسے ہی گزر رہا تھا۔ اسے اپنی اماں اور باجی کے ساتھ ان کوٹھیوں میں کام کرتے چھ سال بیت چکے تھے، مگر وہ ابھی تک خود کو اس ماحول کا عادی نہیں بنا پائی تھی۔ آج بھی بستی واپسی کا سفر اسے ویسے ہی کٹھن لگتا تھا جیسے کہ چھ سال پہلے لگا کرتا تھا۔ اب وہ بارہ سال کی سمجھدار لڑکی تھی۔ پھرتیلی بھی بہت تھی اور کوٹھی میں زیادہ سے زیادہ وقت گزارنے کی خواہش میں بلاوجہ پھرتیاں دکھانے کی عادی تھی۔ اسی لیے جلد ہی بیگمات کی نگاہوں میں سما جاتی تھی۔

”سوچ لے بشیراں! اگر تیرا دل مانتا ہے تو ٹھیک ہے، ورنہ ہمیں کام والیاں بہت اور تمہیں کام ہزار۔“ بڑی بیگم صاحبہ نے شنو کو دیکھتے ہوئے دو ٹوک انداز میں اس کی اماں سے کہا تو اس نے بے چینی سے اماں کو دیکھا تھا، جو تذبذب کا شکار دکھائی دے رہی تھی۔

”سوچنا کیا ہے بیگم جی! آپ پر اور آپ کے گھر والوں پر تو ہم آنکھ بند کر کے اعتبار کر سکتے ہیں جی۔ پر، وہ نوری کا ابا اسے منانا ذرا مشکل ہو گا جی۔“ اماں نے کچھ سوچتے ہوئے آہستگی سے کہا تو شنو کا جیسے سانس ہی رک گیا۔

”اماں! ابا کو منانا کون سا مشکل ہے۔ اسے تو ہرے نیلے نوٹوں سے مطلب ہے اور بس۔ تو اس کی فکر نہ کر ہم خود اس سے بات کر لیں گے۔“ بھا۔ بی نے اماں کے گھٹنے پر ہاتھ رکھتے ہوئے نرمی سے کہا تو نوری نے بھی تیزی سے بھا۔ بی کی ہاں میں ملائی تھی۔

”ہاں اماں! بھابی ٹھیک کہہ رہی ہے۔ تو بیگم صاحبہ کی بات مان لے۔ اور پھر ہم کون سا کہیں دور جا رہے ہیں۔ روزانہ تو ہمیں کام کرنے کے لیے یہاں آنا ہی ہے ناں، اس کی خیر خبر بھی لے لیا کریں گے۔“ نوری نے پیار سے شنو کو دیکھتے ہوئے کہا تو بڑی بیگم صاحبہ اور ان کی دونوں بہوؤں نے

آنکھوں ہی آنکھوں میں ایک دوسرے کو کچھ اشارے کیے تھے۔

"ٹھیک ہے بیگم صاحبہ! میں بات کرتی ہوں ان کے ابے سے۔ کل آپ کو بتاتی ہوں آکر۔" اماں نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ہی وہ تینوں کھڑی ہوگئیں۔

"ٹھیک ہے بشیراں! ہم کل تک انتظار کرلیتے ہیں لیکن یاد رکھنا۔ خالدہ بھی اپنی لڑکی کے لیے بات کرچکی ہے۔ تم ہمارے یہاں کئی سالوں سے ملازمت کررہی ہو تو ہمیں لگا کہ پہلا حق تمہارا ہے۔ اب اگر تمہارے گھر والے کی مرضی نہیں تو کوئی بات نہیں۔ میں خالدہ کی بیٹی کو......"

"نہیں نہیں بیگم صاحبہ! آپ خالدہ کی باتوں میں مت آئیے گا۔ کل میں خود اسے لے آؤں گی ساتھ اس کا سامان بھی۔ آپ بس کل تک انتظار کرلیں!" بڑی بیگم صاحبہ کی بات سنتے ہی اماں الرٹ ہوگئی تھیں۔ گھر آتی لکشمی کو وہ اپنی ازلی بیرن خالدہ کی جھولی میں جاتے کیسے دیکھ سکتی تھیں، سو جھٹ سے ہامی بھر لی۔ بیگم صاحبہ نے اثبات میں سر ہلاتے ہوئے ہزار کا کڑکڑاتا ہوا نوٹ اماں کی طرف بڑھایا تو اس کی آنکھوں کی چمک میں ہزار والٹ کے بلب جیسا اضافہ ہوا تھا۔

پھر بعد کے مرحلے بہت آسانی سے طے ہوئے اور شہناز کو اس کوٹھی میں کل وقتی ملازمت مل گئی۔ اس کی تنخواہ اماں اور نوری سے زیادہ تھی۔ اور کام بے حد ہلکا۔ اسے بس بڑی بھابی اور چھوٹی بھابی کے بچوں کا سنبھالنا ہوتا یا آنٹی جی (بڑی بیگم صاحبہ) کے کام کرنے ہوتے۔ باقی کے سارے کام ابھی بھی اس کی ماں، باجی اور بھابی کے ذمے ہی تھے۔ آنٹی جی بہت نرم دل، مہربان قسم کی خاتون تھیں۔ انہوں نے شنو کو بہت کچھ سکھایا تھا۔ بڑے گھروں میں رہنے کے طور طریقوں سے لے کر قرآن پاک کی تعلیم تک۔ بلکہ انہوں نے اسے تھوڑا بہت پڑھنا لکھنا بھی سکھا دیا تھا۔ چار سال وہ آنٹی جی کے ساتھ رہی۔ ان کے کمرے میں ہی میٹرس ڈال کر سویا کرتی۔ ان کے ساتھ نماز پڑھتی اور ان کی خوب خدمت کرتی پھر تیکھی تو وہ شروع سے ہی تھی، اب آنٹی جی کی تربیت نے اسے جیسے نکھار دیا تھا۔ وہ جب بھی اپنی بستی آتی، اپنی بستی والیوں سے الگ تھلگ ہی لگتی۔ آہستہ آہستہ وہ اپنے ماضی کو بھولنے لگی تھی۔ اپنے اصل کو فراموش کرتی جارہی تھی۔ وہ لاشعوری طور پر خود کو اس گھر کا ہی حصہ سمجھنے لگی تھی اور اس میں اس گھر والوں کی سادگی اور نرم دلی کا بہت بڑا ہاتھ تھا۔ آنٹی جی، ان کے دونوں بیٹے اور بہوئیں اعلیٰ انسانی اخلاق کا منہ بولتا ثبوت تھے اسی لیے تو شنو کے ساتھ ساتھ اس کے گھر والے بھی بے نیاز سے ہوتے جارہے تھے۔ لیکن کب تک؟

کہتے ہیں انسان چاہے کتنا بھی خود کو بدل لے۔ کتنا ہی اپنے ماضی سے پیچھا چھڑانے کی شعوری اور لاشعوری کوشش کرلے۔ اسے ایک نہ ایک دن اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہی پڑتا ہے۔ کسی کو جلد اور کسی کو تاخیر سے۔ اور شہناز کو بھی چار سال اس خوبصورت کوٹھی میں گزارنے کے بعد بالآخر واپس اپنے اصل کی طرف لوٹنا ہی پڑا۔ اور اس میں بھی اس کے اکھڑ اور بیزار رویے کا ہاتھ تھا۔ اول تو وہ اپنی بستی میں جانے کا نام ہی نہیں لیتی تھی، اور اگر کبھی مارے باندھے کسی خوشی غمی میں شمولیت کے لیے جانا بھی پڑ جاتا تو اس کی جان پر بن آتی تھی۔ نہ وہ کسی کو اپنے ساتھ فری ہونے دیتی اور نہ خود کسی کے ساتھ اپنائیت بھرا انداز اپنا پاتی۔ اس کی یہی ادائیں اس کی کھاگ ماں کو کھٹکا گئیں۔ اور اماں کی یہ کھٹک شنو کو بہت مہنگی پڑی۔ انہوں نے جانے کیا چکر چلایا کہ بہت جلد اس کی جگہ اس کی دس سالہ بھتیجی کو کوٹھی میں رکھ لیا گیا اور اسے ہمیشہ کے لیے وہاں سے فارغ کردیا گیا۔

"آنٹی جی! مجھ سے کوئی غلطی ہوگئی ہے جو آپ نے میری جگہ شبنم کو رکھ لیا؟" وقت رخصت اس سے برداشت نہیں ہوا تو ماں کی نگاہ بچا کر آنٹی کے سامنے رو پڑی تھی۔ آنٹی بھی اس سے مانوس ہوچکی تھیں اور اب انہیں نئے سرے سے شبنم پر محنت کرنے کا سوچ کر ہی اختلاج ہورہا تھا مگر وہ کیا کرسکتی تھیں۔ بشیراں بی بی کا مؤقف بھی اپنی جگہ درست تھا۔ اور پھر وہ شنو کی ماں تھی، اس کا حق تو بنتا تھا۔

"نہیں شہناز! تم سے تو کوئی غلطی نہیں ہوئی بیٹا۔ بس تمہارے والدین کو اب تمہارا رات گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں لگتا۔ اب تم بڑی ہوچکی ہو۔ اور جوان بیٹیاں اپنے والدین کے ساتھ ہی رہیں تو اچھی بات ہے۔ تم آرام سے گھر جاؤ۔ تمہاری صرف رات کی نوکری ہی ختم ہوئی ہے۔ دن میں تو تم اپنی اماں کے ساتھ آہی جایا کروگی۔" آنٹی نے اسے سہولت سے سمجھانا چاہا تھا لیکن اس کے دماغ کی سوئی ایک ہی جگہ پر اٹک چکی تھی۔ "تمہارے والدین کو تمہارا رات گھر سے باہر رہنا اچھا نہیں لگتا۔" اس کی سمجھ میں یہ بات نہیں آرہی تھی کہ اچانک اماں، ابا کو یہ خیال آ کیسے گیا؟

"اماں! تو نے آنٹی جی سے جھوٹ کیوں بولا؟ یہ کیوں کہا کہ ہماری برادری کی جوان لڑکیاں دن بھر چاہے کہیں بھی کام کریں لیکن رات انہیں اپنی جھگی میں ہی گزارنی ہوتی

ہے۔ ارے، وہ مسرت بھی تو ہے؟ میرے ہی جتنی ہے ناں اور میرے ساتھ ہی وہ سفید کوٹھی والی باجی کے ہاں ملازم ہوئی تھی اور ابھی تک دن رات وہیں رہتی ہے۔ پھر وہ گلابی، شبو، سیماں کتنی ہی لڑکیاں ہیں جو شہر کے دوسرے علاقوں میں کوٹھیوں میں رہتی ہیں۔ مہینے دو مہینے بعد آتی ہیں اور......!"

"اور تیری طرح بیزار نہیں رہتیں وہ اپنی بستی، اپنے لوگوں میں آکر خوش ہوتی ہیں۔ اپنے گھر والوں سے مل کر پیار محبت سے رہتی ہیں اور تو...... تیرا تو کبھی منہ ہی سیدھا نہیں ہوا کوٹھی سے واپس آکر۔" اماں نے اس کی بات کاٹتے ہوئے تلخی سے کہا تو اسے مزید آگ لگ گئی۔

"ہاں ہاں تو رکھا کیا ہے یہاں خوش ہونے کو۔ یہ گندی سندی بستی۔ یہ ٹوٹی پھوٹی جھونپڑیاں۔ یہ ننگ دھڑنگ لور لور پھرتے ہوئے منحوس بچے اور وہ بستی کے چوپال میں بیٹھے آوارہ آتی جاتی لڑکیوں اور عورتوں کو گھورتے انہیں چھیڑتے نکمے اور نشئی مرد؟ اونہہ۔ دم گھٹتا ہے میرا یہاں اماں۔ میں نہیں رہ سکتی اس غلاظت کے ڈھیر میں، سنا تو نے؟" وہ ایک دم جیسے پھٹ پڑی تھی۔

"سن لیا اور اب تو بھی کان کھول کر سن لے میری بات۔ میں اسی لیے تجھے وہاں سے نکال لائی کیونکہ تیرا اصل یہی ہے۔ یہ ہی گندی بستی، یہ ہی گندی سندی جھگی اور یہ ہی گندے سندے جھگیوں والے۔ اس پرائی جگہ رہ رہ کر تیرا دماغ ساتویں آسمان کو جا لگا تھا، اب اسے نیچے کیسے اتارنا ہے میں اچھی طرح جانتی ہوں۔ ماں ہوں تیری، کوئی دشمن نہیں کہ تو کھیلنے کو چاند مانگے اور میں تجھے خوش کرنے کے لیے چاند کے ساتھ ساتھ تارے بھی توڑنے چل دوں۔ یاد رکھ شنو، ہماری برادری میں لڑکی کے لیے بغاوت موت ہے موت۔ تجھے اپنی پھوپی شکورن اور اس کی بیٹی نازو یاد نہیں کیا؟ تیری ہی طرح سنہرے خواب دیکھے تھے ناں اس کی آنکھوں نے تو پھر کیا ہوا؟ پھوڑ دی ناں اس کی آنکھیں برادری والوں نے؟ تیری ہی طرح باغی ہوکر جھگیاں چھوڑ پکے مکان کی چاہ میں سرپٹ دوڑی تھی ناں نازو، تو پھر کیا ہوا؟ توڑ ڈالیں ناں اس کی ٹانگیں اس کے باپ بھائیوں نے؟ یاد ہے کہ نہیں تجھے انجام اس کا؟ چلی ہے محلوں کے خواب دیکھنے۔ اپنی اوقات پہچان شنو۔ اور تیری اوقات یہی ہے۔" اماں کے الفاظ گرم لاوے کی طرح اس کی سماعتوں میں اترتے جارہے تھے اور اس کے انداز نے ریڑھ کی ہڈی میں سرد لہریں دوڑا دیں تھیں۔ وہ پھٹی پھٹی بے یقین نگاہوں سے ماں کو دیکھے جارہی تھی۔

"سن! تیرے انداز بھی مجھے نازو جیسے ہی لگے تھے۔ شکورن تو پاگل تھی۔ بیٹی کی محبت میں اپنا بڑھاپا بھی خراب کروایا اور اپنے بیٹوں کے ہاتھوں ذلت بھی اٹھائی مگر میرا ایسا کوئی ارادہ نہیں۔ اسی لیے اس سے پہلے کہ تیرے باپ، بھائیوں کو شک ہوتا کہ تو بھی نازو کی راہ پر چلنے کا ارادہ رکھتی ہے۔ میں تجھے نکال لائی۔ اب اپنی آنکھیں کھول اور اپنے دل کو اچھی طرح سے سمجھا لے کہ یہ بستی اور یہ جھگیاں ہی تیرا نصیب ہیں......اور......بس!" اپنی بات پوری کرکے اماں ایک جھٹکے سے اٹھی اور تیز نگاہوں سے گھورتی ہوئی باہر نکل گئی اور وہ حق دق وہیں بیٹھی کی بیٹھی رہ گئی۔

☆......☆

چند دن بعد اماں اسے ساتھ لیے اسی سفید کوٹھی میں داخل ہوئی جہاں اس کی بچپن کی دوست مسرت کام کرتی تھی۔ یاسر ڈار بینک منیجر تھے۔ ان کے دو ہی بچے تھے۔ ایک بیٹا اور ایک بیٹی۔ بیٹی کی وہ شادی کرچکے تھے اور وہ اپنے شوہر کے ساتھ بیرون ملک رہتی تھی۔ بیٹا بھی اعلیٰ تعلیم کے لیے امریکا میں مقیم تھا۔ اسی لیے ان کی بیگم فرناز نے وقت گزاری کے لیے اپنی کوٹھی کو ہنر کدہ میں بدل دیا تھا۔ شوہر تو دن بھر آفس ہوتے اور بچے بیرون ملک، سو انہوں نے علاقے کی بچیوں کو ہنرمند بنانے کا ادارہ کھول لیا۔ یہاں مختلف قسم کے کورسز کروائے جاتے تھے۔ مسرت بچپن سے ہی ان کے ساتھ تھی۔ وہ فرناز کو بھابی کہتی تھی اور یاسر کو بھائی جان۔ وہ دونوں بھی اس کا اور اس کی فیملی کا بہت خیال رکھتے تھے۔ فرناز نے مسرت کا شوق دیکھتے ہوئے اسے کئی طرح کے کورسز مفت کروائے تھے اور اب مسرت فرناز اور ہنر کدہ کے لیے لازم و ملزوم ہوچکی تھی۔

"بیگم صاحبہ! یہ میری بیٹی شہناز ہے مسرت کی پکی سہیلی۔ آپ تو جانتی ہی ہوں گی؟ آپ اسے بھی مسرت کی طرح کھانے پکانے اور سلائی کڑھائی کا کام سکھا دیں۔ آپ کی بڑی مہربانی ہوگی جی۔" اماں مسرت کے ہاتھ سے شربت کا گلاس لیتے ہوئے عاجزی کی تصویر بنی ہوئی تھیں اور شنو انہیں حیرت سے دیکھ رہی تھی۔

"ہاں جانتی ہوں لیکن یہ تو کیلوں کے گھر نہیں ہوتی تھی پہلے؟" فرناز نے شنو کو دیکھتے ہوئے نرمی سے کہا۔

"جی بیگم صاحبہ! بڑی بیگم صاحبہ کے پاس رہی ہے یہ پچھلے چار سال۔ انہوں نے اسے کافی کچھ سکھا بھی دیا ہے،

لیکن یہ ابھی دعوتی کھانے نہیں بنا سکتی اور میں چاہتی ہوں کہ آپ اسے سب کچھ سکھا دیں تاکہ یہ کسی بڑے گھر میں کھانا پکانے کے صاف ستھرے کام سے لگ جائے۔'' شہناز کے لیے تو اماں کی باتیں جھٹکے سے کم تھیں ہی نہیں، مسرت بھی منہ کھولے بس انہیں دیکھے جا رہی تھی۔

''ہاں ہاں، کیوں نہیں۔ ہم اسے سب کچھ سکھا دیں گے آپ بے فکر ہو جائیں۔'' فرناز نے مسرت کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر کہا تو وہ بھی مسکرانے لگی۔ ظاہر ہے اپنی بچپن کی دوست کا ہمہ وقت ساتھ کسے اچھا نہیں لگتا، سو وہ بھی اس احساس سے خوشی محسوس کر رہی تھی اور فرناز اس کی نبض شناس، اس کا چہرہ پڑھ کر اس کے دل کی بات جان چکی تھی۔

''آپ کی بڑی مہربانی بیگم صاحبہ! لیکن میں نے سنا ہے کہ آپ کی فیس بہت زیادہ ہے اور میں گھر گھر کام کرنے والی غریب عورت۔ آپ کی بھاری فیس نہیں دے سکتی جی!''
اب اماں نے پینترا بدلتے ہوئے قدرے اداس اور مجبور لہجے میں کہا تو شہناز پر ایک بار پھر حیرت کا دورہ پڑا تھا کیونکہ اماں کے لہجے کی یہ عاجزی بالکل نئی تھی۔ ورنہ وہ تو بڑھک مار کر بڑے بڑوں کا دل دہلا دیا کرتی تھی۔

''ارے اماں! آپ سے فیس مانگ کون رہا ہے؟ آپ کی تو دعائیں ہی ہمارے لیے بھاری فیس کی طرح ہیں۔ آپ فیس کی بالکل پروا مت کریں۔ بس، آج سے آپ کی بیٹی ہماری ذمہ داری ہوگی۔ ہم اسے اپنی بیٹی کی طرح ہی سب کچھ سکھا دیں گے۔ اور پھر یہ بھی مسرت کی طرح ہر فن مولیٰ ہو جائے گی انشاءاللہ!'' فرناز نے دلکشی سے مسکراتے ہوئے کہا تو اماں جھولیاں اٹھا اٹھا کر اسے دعائیں دیتی باہر نکل گئیں۔

''ہاں بھئی شہناز! اب کھل کر بتاؤ۔ کیا کیا بنانا آتا ہے تمہیں اور آنٹی ناہید نے کیا کچھ سکھایا ہے تمہیں اب تک؟''
فرناز نے اماں کے جانے کے بعد اسے اور مسرت کو دیکھتے ہوئے مسکرا کر پوچھا تو وہ انہیں تفصیل سے اپنی ہنرمندیوں کی داستان سنانے لگی۔ مسرت اور فرناز دلچسپی سے اس کی باتیں سن رہی تھیں اور تھوڑی دیر بعد ہی وہ تینوں اس طرح گھل مل چکی تھیں جیسے شنو نے پچھلے چار سال ناہید بیگم کے زیرسایہ نہیں بلکہ ان کے ساتھ گزارے ہوں۔

☆......☆

شہناز کا ذہن بہت اچھا تھا اور اسے کچھ نیا سیکھنے کی لگن بھی بہت تھی۔ سو وہ بہت تیزی سے سب کچھ سیکھتی چلی گئی۔ اب تک وہ گھریلو کاموں میں ہی طاق ہو سکی تھی، لیکن اب اس کے ہاتھوں میں ہنر آتا جا رہا تھا۔ قدرت کے ہر کام میں کوئی نہ کوئی مصلحت ضرور ہوتی ہے۔ بس، انسان ہی اسے سمجھ نہیں پاتا۔ قدرت نے اسے جہاں بہت عام سی شکل و صورت اور گہرے سانولے رنگ سے نوازا تھا، وہیں اس کے ہاتھ میں بلا کا ذائقہ بھی اتار دیا تھا اور پھر اس پر فرناز کی تربیت۔ وہ اب ہر طرح کے کھانے بنانے کی مہارت حاصل کر چکی تھی۔ بڑی سے بڑی دعوت اور زیادہ سے زیادہ ڈشز بھی اسے پریشان نہیں کرتی تھی۔ اس کے ساتھ ساتھ فرناز نے اسے سلائی کڑھائی اور بیوٹیشن کا کورس بھی کروایا تھا لیکن اس کی ذاتی دلچسپی کوکنگ سے تھی۔ اس لیے وہ اس کام میں پرفیکٹ ہو چکی تھی اور پھر جیسے ہی فرناز کے انسٹیٹیوٹ کی طرف سے اسے اعزازی سند اور شیلڈ سے نوازا گیا، اماں نے اگلے روز ہی اسے کام پر لگوا دیا تھا۔

اب کی بار وہ جہاں ملازم ہوئی، وہ بہت بڑا کنبہ تھا۔ دو کنال پر بنی اس محل نما کوٹھی میں رہنے والے افراد خانہ بیشمار تھے۔ نواب صاحب اور ان کی بیگم اپنے چھ عدد بیٹوں، بہوؤں اور پھر ان کے بیشمار بچوں پر مشتمل اس فوج کے علاوہ بہت سے ملازم بھی تھے۔ نواب صاحب کی فیملی کھانے پینے بلکہ اچھا کھانے کی بے حد شوقین تھی۔ ایک سے بڑھ کر ایک چٹورا اور چٹورا بھرا ہوا تھا اس خاندان میں۔ پہلے دن اس کو ٹرائل پر رکھا گیا۔ شہناز پر اس گھر کی خوبصورتی نے تو سحر طاری کیا ہی تھا، وہ یہاں کے جہازی سائز صاف ستھرے اور خوبصورت سے کچن کو دیکھ کر ہی دنگ رہ گئی تھی۔ کھانے بنانے کی شوقین تو پہلے سے ہی تھی پھر فرناز کے ہاتھوں تراشی گئی تھی، سو اس نے جی جان سے سب کی پسند کے کھانے بنائے اور سب کو ٹیسٹ کروائے۔ اگر اسے اس گھر کی خوبصورتی نے مار ڈالا تھا تو اس کے ہاتھ کے بنے لذیذ پکوانوں نے دادا، دادی اور ان کے چٹورے پوتوں، پوتیوں کو بھی اس کے ہاتھ کے ذائقے کا گرویدہ بنا ڈالا۔ سو، بلی کے بھاگوں چھینکا ٹوٹا اور اماں کی ڈیمانڈ اسے اچھی خاصی معقول تنخواہ پر شہناز کو کھانا پکانے کی ملازمت مل گئی۔

یہاں اس کے علاوہ دو ملازمائیں اور بھی تھیں جن کا کام صرف کچن تک ہی محدود تھا۔ باقی کے ملازمین کی فوج محل کے دوسرے کاموں میں مشغول رہتی تھی۔ وہ ہر روز صبح سات بجے نواب محل پہنچ جاتی اور پھر جو باری باری سب کے لیے ناشتے بننے شروع ہوتے تو دس گیارہ اسی میں بج جاتے۔ یہ ہی حال دوپہر کے کھانے کا تھا۔ سب اپنے اپنے وقت پر اسکول

کالجز اور آفس سے آتے اور شہناز ان کی خدمت میں ان کی پسند کے گرم گرم پکوان پیش کرتی جاتی۔ ہاں، البتہ ڈنر وہ سب ایک ساتھ کیا کرتے تھے۔ نواب صاحب کے حکم کے عین مطابق رات نو بجے ڈنر سرو کر دیا جاتا تھا۔ سو، اس وقت اسے تھوڑی سی سہولت ہو جاتی مگر پھر بھی سب کے لیے علیحدہ علیحدہ فرمائشی پکوان بناتے بناتے وہ تھک سی جاتی تھی۔ اور اس پر جب نواب صاحب کی تینوں بیاہی بیٹیاں بھی اپنی آل اولاد کے ساتھ میکے آ جاتیں تو اس کا کام کہیں زیادہ بڑھ جاتا لیکن دادی اماں ایسے موقعوں پر دو ملازمائیں اس کی مدد کے خیال سے خاص طور پر لگا دیا کرتیں تھیں جنکی وجہ سے اسے مہمانوں کی آمد پر کوئی خاص دشواری نہیں ہوتی تھی۔

اسے اس طرح دن رات مصروف دیکھ کر اماں بشیراں کو لگنے لگا تھا کہ اس کے اندر کی باغی شنو دم توڑ چکی ہے۔ وہ اپنی بیٹی کو اپنے ماحول اور حالات کے مطابق ڈھالنے میں کامیاب ہو چکی ہے۔ لیکن یہ اس کی بھول تھی، بہت بڑی بھول۔ وہ شہناز تھی۔ شہناز رشید عرف شنو جس نے نہ تو جھکنا سیکھا تھا اور نہ ہی دبنا۔ اس کے لیے سب سے اہم اس کی اپنی ذات، اس کے اپنے خواب، اپنے ہی ارمان تھے۔ اسے نواب محل میں کام کرتے ہوئے دو سال ہونے کو آئے تھے اور اس عرصے میں اس کی اماں کے ایماء پر اس کی تنخواہ میں دو بار خاطر خواہ اضافہ کیا جا چکا تھا۔ اسے اور گھر کے سب ملازموں کو عیدین پر اچھی خاصی عیدی بھی دی جاتی اور نئے لباس بھی بنوا کر دیئے جاتے تھے۔ پھر گھر میں ہونے والی چھوٹی موٹی تقریبات پر بھی ملازمین کا خاص خیال رکھا جاتا ہے اور اسے تو گھر کے افراد کے علاوہ مہمانوں کی طرف سے بھی اسپیشل آئٹمز بنانے پر خاص انعامات سے نوازا جاتا تھا۔ اور وہ اپنے اس خزانے کو اماں سے چھپا کر رکھتی تھی کیونکہ اماں بھی تو اس کی پوری تنخواہ پر اکیلی ہی قابض ہوتی آئی تھی تو پھر وہ کیوں نہ اپنی بچتیں اس سے چھپا چھپا کر رکھتی۔

بہت زیادہ کام اور اس سے بھی زیادہ محنت کے باوجود بھی اگر اس کا دل نواب محل میں لگا ہوا تھا تو اس کی بڑی وجہ یہی اوپر کی آمدن ہی تو تھی۔ اور پھر اس پر یہ جانفزا احساس ہی اس کے لیے سب سے بڑی آکسیجن کا کام کرتا تھا کہ اسے سارا دن اپنی گندی سندی بستی میں گذارنا نہیں پڑتا تھا۔ وہ دن بھر اس بڑے اور خوبصورت محل میں رہتی تھی۔ یہ جگہ بالکل اس کے خوابوں جیسے تھی۔ اور وہ کسی بھی حالت میں اپنے خوابوں سے دستبردار ہونے کو تیار نہیں تھی۔ بس، اس نے ان پر مصلحت

شیخ محمد یحییٰ

شوپیاں ضلع اسلام آباد میں رہتے تھے۔ تحصیل کمالات علمی کے بعد شیخ اشرف کی خدمت میں زانوئے ادب تہہ کیا۔ ریاضت و مجاہدہ میں کمال حاصل کر کے خلق اللہ کو فائدہ عظیم پہنچایا۔ دیر تک مرشد کی خدمت میں رہے۔ پھر وطن کو مراجعت کی۔ جہاں تھوڑے عرصے کے بعد رحلت فرمائی۔
مرسلہ: اختر احمد۔ ملتان

کا دبیز پردہ تان رکھا تھا تاکہ اس کی ڈیکٹیٹر ماں اور سخت گیر باپ کو ان کی جھلک بھی نظر نہ آنے پائے۔

☆......☆

''شنو! اب تیرے بھی دن پھرنے والے ہیں۔ یہ جو تو سارا سارا دن ان نوابوں کے چولہوں کے سامنے خود کو جھلساتی رہتی ہے ناں، تو بس، سمجھ لے کہ تیری مشقتوں کے دن ختم ہو ہی گئے!'' وہ تھوڑی دیر پہلے ہی نواب محل سے واپس آئی تھی۔ اس کا سارا دن بہت مصروف گزرا تھا۔ نواب صاحب کے سب سے چھوٹے پوتے کی سالگرہ کا چھوٹا سا فنکشن تھا اور سب گھر والوں کے ساتھ ساتھ بیاہی بیٹیاں بھی موجود تھیں۔ اس نے بڑی محنت سے چھوٹے نواب کی پسندیدہ ڈشز تیار کی تھیں اور بدلے میں سب سے داد کے ساتھ ساتھ انعام بھی وصول کیا تھا اور اس وقت وہ اپنے دکھتے وجود کو آرام دینے کی غرض سے لیٹی ہی تھی کہ جھگی کا پردہ اٹھاتی نوری اندر آ گئی اور اسے نیند میں جاتے دیکھ کر تیزی سے اس کی طرف بڑھی اور بڑے جوش اور سنسنی بھرے انداز سے اسے اپنی تئیں خوشخبری سنانے لگی۔ شنو نے اپنی بند ہوتی آنکھوں کو بمشکل کھولا اور اپنے پاس بیٹھی بہن کے چہرے پر پھیلے سسپنس اور خوشی کی وجوہات کو جاننے کی کوشش کی۔ لیکن اس کے پلے واقعی کچھ نہیں پڑا تو جھلا کر اس پر ہی الٹ پڑی۔

''تو کیا کہہ رہی ہے نوری؟ میری سمجھ میں تیری ایک بات بھی نہیں آئی۔ کھل کر بتا۔ کیا کہنا چاہ رہی ہے تو؟''

''اماں، ابا نے تیرا رشتہ طے کر دیا ہے ناں۔ اس چاند کی چودہ کو تیرا نکاح ہے۔ بس، یہ چند روز ہی تو رہ گئے ہیں تیری شادی میں۔ اماں کہہ رہی تھی کہ ایک دو روز میں جا کر بتا آئے گی بڑے نواب صاحب کو۔ بس یہ مہینا پورا ہوتے ہی تیری نوکری بھی ختم ہو جائے گی!'' اس کے تاثرات دیکھتے

ہوئے نوری کا سارا جوش وخروش ماند پڑ گیا تھا اسی لیے کمزور سے لہجے میں اسے بتا رہی تھی لیکن اس کی بات پوری ہونے سے پہلے ہی شنو ایک جھٹکے سے اٹھ بیٹھی تھی۔

''کیا؟ میری شادی؟ لیکن کس سے؟ اور یوں اچانک؟''

''وہ...... اپنا گلفام ہے ناں؟ اسی سے بات پکی ہوئی ہے تیری۔ خوش ہوجا تو بس۔ اب تجھے نہ تو نوابوں کی چاکری کرنی پڑے گی اور نہ ہی کسی اور کوٹھی میں اپنی ہڈیاں گھسنی پڑیں گی کیونکہ گلفام خیر سے اچھا خاصا کمالیتا ہے۔ جی جان سے محنت مزدوری کرتا ہے وہ اور تجھ پر تو جان دیتا ہے۔ پتا ہے تجھے، تیرے لیے تو اس نے قریب ہی بڑی سی جھگی بھی ڈال لی ہے اور تجھے پڑھنے کا بندوبست بھی کرلیا ہے۔ اس نے تو اماں کو بھی صاف صاف کہہ دیا ہے کہ بس، بہت کرلیا کام شنو نے۔ اب میں اس سے کوئی کام نہیں کرواؤں گا۔ رانی بنا کر رکھوں گا اسے۔ اس کی ہر ضرورت، ہر خواہش خود پوری کروں گا۔ چاہے اس کے لیے مجھے دہری محنت ہی کیوں نہ کرنی پڑے۔ سچی شنو، تو کتنی خوش نصیب ہے ناں۔ تجھے اس قدر چاہنے والا شوہر......''

''کیا؟ کیا کہہ رہی ہو تم نوری؟ میری شادی وہ بھی اس گلفام سے؟ وہ بڈھا گلفام، جس کے نہ منہ میں دانت ہے اور نہ ہی پیٹ میں آنت۔ وہ کمینہ ہی رہ گیا تھا میرے لیے نوری؟ اور وہ کیا کما کر کھلائے گا مجھے؟ اور کیا پوری کرے گا میری خواہشیں۔ ارے اس سے کہیں زیادہ تو میں خود کما لیتی ہوں۔ اونہہ رانی بنا کر رکھے گا وہ مجھے؟ مجھے، شہناز رشید عرف شنو کو۔ دفع دور۔ جوتی کی نوک پر رکھتی ہوں میں اس کے بنائے تاج محل کو جو اس شہزادے گلفام نے تعمیر کیا ہے۔ لعنت بھیجتی ہوں میں اس چھابڑی فروش اور اس کی محبت پر۔ جا کر کہہ دے اماں سے، نہیں کرنی مجھے کسی بھنگی چرسی، گندے سندے حلیے والے غلیظ چھابڑی فروش سے شادی۔ سنا تو نے۔'' نوری کی بات ابھی مکمل بھی نہیں ہوئی تھی کہ شنو آگ اگلنے لگی۔ اس کے لہجے سے جھلکتی نفرت، حقارت اور غرور نے نوری کو گنگ کر دیا۔ وہ تو بس منہ کھولے، آنکھیں پھاڑے اسے آگ اگلتا دیکھ رہی تھی۔

''نی! کی بکواس کر رہی ہے تو؟ بڑی زبان چلنے لگی ہے تیری؟ تو ہے کن ہواؤں میں؟ کون سے راجے مہاراجے کی اولاد ہے تو؟ اور کون سا تیرا حسن ڈل ڈل پڑ رہا ہے جو تجھ سے سنبھالا نہیں جا رہا؟ نی۔!! تجھے غرور ہے کس بات کا؟ کون سے لاکھوں کروڑوں کما کر لا رہی ہے تو نوابوں کے گھر سے جو تیرے دماغ کو گرمی چڑھ رہی ہے؟ دو ہاتھ دوں گی جما کے تو تیرے سارے نخرے دھرے کے دھرے رہ جائیں گے۔ برادری کے بڑوں میں ساری بات طے ہوئی ہے۔ اور اب، ہم پیچھے ہٹنے والے نہیں اور نہ ہی اسے پیچھے ہٹنے کی اجازت دیں گے۔ شادی تو اس کی گلفام سے ہی ہوگی اور بھی طے شدہ تاریخ پر ہی، اور رہنا بھی اسے اسی گندی غلیظ بستی اور اسی گندی سندی جھگی میں پڑے گا کیونکہ یہی اس کا نصیب ہے اور نصیبوں سے بھاگ کر بھی کسی کو کہیں بھی پناہ نہیں ملا کرتی۔ سمجھا دے اسے یہ بات اچھی طرح سے!'' اماں ایک دم جھگی کا پردہ اٹھاتی ہوئی آندھی طوفان کی طرح اندر آئی اور آتے ہی اس پر چڑھائی کردی تھی۔ شاید وہ باہر کھڑی کان لگائے ان دونوں کی باتیں سن رہی تھی۔ اس نے جیسے ہی شنو کے باغیانہ خیالات سنے تو فوراً اس کی سرکوبی کے لیے اندر آ گئی تھی۔ اس کے یہی باغی خیالات ہی اماں، ابا کو ڈرائے ہوئے تھے، اسی لیے انہوں نے پہلے سے اسے کچھ بھی نہیں بتایا تھا۔ ورنہ اس کا رشتہ تو بہت پہلے سے طے ہو چکا تھا۔ اور اب اماں اپنے تئیں اس کا غرور توڑ کر جیسے آئی تھی ویسے ہی واپس بھی جا چکی تھی لیکن وہ ابھی تک سن ہوتے حواسوں کے ساتھ ہلتے پردے کو گھورے جا رہی تھی۔ نوری بھی دم سادھے بیٹھی تھی۔ اس سے بہن کی حالت دیکھی نہ گئی تو اپنی جگہ سے کھسکتی ہوئی اس کے پاس چلی آئی۔

''دیکھ شنو! تو غلط سمجھ رہی ہے میری بہن۔ گلفام اچھا آدمی ہے۔ بہت محنتی اور ایماندار ہے وہ۔ ہماری برادری کے عام مردوں سے بالکل مختلف۔ اور یہ چھابڑی والا تو جس حقارت سے اسے کہہ رہی ہے ناں، ڈر اللہ سے۔ کہیں تیرے یہ بڑے بول تیرے سامنے ہی نہ آ جائیں۔ دیکھ میری بہن۔ وہ چھابڑی لگاتا ہے یا محنت مزدوری کرتا ہے تو یہ تو اچھی بات ہے ناں؟ اپنی ہمت اور محنت سے حق حلال کی کھاتا ہے۔ کسی سے بھیک تو نہیں مانگتا۔ نہ ہی چوری چکاری کرتا ہے۔ محنت اس کے ہڈیوں میں پڑی ہے شنو۔ میں نے آج تک اسے ہڈحرامی سے بستی میں پڑے نہیں دیکھا۔ میری بات مان، وہ بہت اچھا انسان ہے۔ میرا یقین کرلے میری بہن، وہ تجھے بہت خوش رکھے گا۔ اور ہاں۔ تجھے شاید کسی نے اس کے بارے میں غلط اطلاع دی ہے۔ گلفام کسی قسم کا بھی نشہ نہیں کرتا۔ لباس بھی اس کا ہمیشہ صاف ستھرا ہی دیکھا ہے میں نے اور تو اور نماز روزے کا بھی بہت پابند ہے وہ۔ اور تو اپنی غرور

اور تکبر میں اس پر جانے کیسے کیسے الزام لگائے جا رہی ہے؟ کس طرح سے اس کے نام بگاڑ رہی ہے تو؟'' وہ سانس لے کر پھر بولی۔ ''ذرا سوچ شنو۔ ہمارے ماں باپ بھلا ہمارا برا کیوں چاہیں گے؟ وہ ہمارے حق میں کوئی غلط فیصلہ کیسے کر سکتے ہیں بھلا؟ اور اب تو تو یہ بات مان ہی لے کہ یہ جھگیاں ہی ہمارا نصیب ہیں اور یہ جھگیوں والے ہی ہمارا مقدر۔ ورنہ نازو اور رانی بھی تو تھیں ناں۔ چلی تھیں بیچاریاں اپنے مقدر بدلنے، مگر بدلے میں کیا ملا انہیں۔ معذوری اور ذلت بھری موت!'' نوری اس کے قریب بیٹھی دلسوزی سے اسے سمجھانے کی کوشش کر رہی تھی مگر وہ بے تاثر چہرہ لیے اس کی باتیں خاموشی سے سنے جا رہی تھی۔ کافی دیر تک خود ہی بول بول کے نوری تھک گئی تو اسے تاسف بھری نگاہوں سے دیکھتی ہوئی اٹھی اور خاموشی سے اپنی جھگی کی طرف چلی گئی۔ اس کے باہر نکلتے ہی شہناز نے سر تک چادر تانی اور آئندہ کا لائحہ عمل سوچنے لگی کیونکہ یہ تو طے تھا کہ وہ نہ تو رانی تھی کہ اماں ابا کے حکم پر چپ چاپ اسی بستی میں ایک اور جھگی آباد کر لیتی اور نہ ہی رانی اور نازو جیسی تھی کہ اپنی پرواز اتنی نیچی اور رفتار اتنی کم رکھتی کہ کسی کے ہاتھ آجاتی۔

☆......☆

''سوچ لو شہناز! ایک بار پھر سوچ لو۔ ایک بار اگر تم یہاں سے نکل گئیں تو پھر دوبارہ ادھر کا رخ کرنا تمہارے لیے ناممکن ہو جائے گا۔ ایسا نہ ہو کہ گزرتا وقت تمہیں اپنے فیصلے پر پچھتانے پر مجبور کر دے!'' فرناز نے بھی اسے مسرت کی طرح آخری بار سوچنے کا مشورہ دیا تھا۔ لیکن وہ تو اپنی ساری کشتیاں جلا کر آئی تھی، اس لیے اب کچھ بھی سوچنے سمجھنے کو تیار نہیں تھی۔

اس رات نوری اور اماں کی باتیں آخری کیل ثابت ہوئی تھیں۔ یہ اس کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ اگلے روز ہی موقع پا کر نواب محل سے کچھ دیر کی چھٹی لے کر فرناز کی طرف بھاگی تھی۔ اس نے وہاں جاتے ہی رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا تھا۔ اس کی حالت نے فرناز اور مسرت کے ہاتھ پاؤں پھلا دیے تھے۔ مسرت کی ہمدردیاں تو پہلے ہی اس کے ساتھ تھیں، اس کی باتوں اور دگرگوں حالت نے فرناز کے دل پر بھی بہت اثر کیا تھا۔ اب تو اس کا روز کا معمول بن چکا تھا۔ جیسے ہی موقع ملتا، اپنے نادیدہ دکھوں کی گٹھڑی اٹھائے سفید کوٹھی پہنچ جاتی۔ اور آخر کار اس کے روز روز کے رونے دھونے اور واویلے کا ہی نتیجہ تھا کہ وہ دونوں اس کی مدد کے لیے تیار ہو گئی تھیں۔ اور یہ اس کا ہی نتیجہ تھا کہ اس حبس بھری سنسان دوپہر میں شہناز رشید عرف شنو اپنی بستی، اپنی برادری، اپنے لوگ ہمیشہ ہمیشہ کے لیے چھوڑ، نئے جہاں دریافت کرنے چل دی تھی۔ اس نے تو فرناز سے کہا تھا کہ وہ اسے کسی دارالامان میں پہنچا دے۔ آگے سب کچھ وہ خود ہی سنبھال لے گی۔ کیونکہ وہ اب تک کی گئی اپنی بچتوں کے علاوہ، اپنی اماں کے صندوق سے وہ ساری رقم بھی اڑا لائی تھی جو اس کے خیال میں اس کی محنت مشقت کی کمائی تھی۔ اور اس کے خیال میں اتنا ''زادِ راہ'' اس کی ضرورتوں کو خواہشات کو پورا کرنے کے لیے بہت عرصے تک کافی ہو سکتا تھا۔

فرناز کو البتہ اس جوان جہان لڑکی کو کسی اجنبی جگہ اور اجنبی لوگوں کے حوالے کرنے میں تامل تھا، سو بہت سوچنے اور مسرت سے مشورہ کرنے کے بعد اس نے اپنی تئیں ایک بہتر حل نکالا تھا۔ پھر جیسے ہی شہناز اپنا سامان سمیٹے اس کے پاس آئی، اس نے ان دونوں کو گاڑی میں بٹھایا اور شہر کے دوسرے کنارے آباد اپنے میکے کا رخ کیا تھا۔ اس نے اور مسرت نے اس ساری کارروائی کا علم یاسر ڈار کو بھی نہیں ہونے دیا تھا۔ اور دو گھنٹے کے اندر اندر وہ شہناز کو اپنی امی کے حوالے کر کے واپس بھی آ چکی تھی۔

فرناز ڈار کی اس ہمدردی کے پیچھے اس کی بے حد حساس طبیعت، نرم دلی اور جذباتی پن کا بڑا ہاتھ تھا۔ اس کے اس طرح سے جھٹ پٹ فیصلے کرنے اور پھر بغیر سوچے سمجھے ان پر ڈٹ جانے سے یاسر ڈار کے ساتھ اس کے والدین اور بھائی بھی بے حد عاجز تھے، مگر کیا کرتے۔ وہ ان کی اکلوتی لاڈلی بیٹی اور بہن تھی۔ اسی لیے وہ اس کی جذباتیت کے ہاتھوں اکثر نقصان اٹھاتے اور پھر اسے پریشان ہوتے دیکھ کر خود بھی پریشان ہو جایا کرتے تھے مگر کر کچھ نہیں سکتے تھے کہ وہ شروع سے ایسی ہی تھی۔ لیکن اب کی بار جو کارنامہ اس نے سرانجام دیا

شمارہ مئی 2018ء کی منتخب سچ بیانیاں

ہماری پیش کش...... آپ کا انتخاب

☆ اول: زبان کا زہر...... کرن صدیقی (کراچی)

☆ دوم: مداوا...... ڈاکٹر ظفر احمد (کراچی)

☆ سوم: بنیاد...... اعجاز احمد راحیل (ساہیوال)

پہلے دوسرے اور تیسرے انعام کے لیے آپ بھی منتخب کیجیے ہم آپ کی رائے کا احترام کریں گے

تھا،اس نے توسب کے ہوش ہی اڑا دیے تھے۔ وہ تو شہناز کی ذمہ داری ان کے شانوں پر ڈال کر چلتی بنی اور وہ سب پیچھے سے ہولتے ہی رہ گئے۔

”امی! آپ کم از کم ایک فون تو کر ہی سکتی تھیں ناں ہمیں۔ ہم وقت پر پہنچ جاتے تو شاید......!“

”تو؟ کیا کر لیتے تم وقت پر پہنچ کے بھی؟ ارے، اس لڑکی نے پہلے بھی ہماری سنی ہے جو آج سنتی؟ وہ تو بس ہوا کے گھوڑے پر سوار آئی اور اتنی بڑی ذمہ داری ہمارے سر تھوپ کر الٹے پاؤں لوٹ بھی گئی۔ اور میں ہمیشہ کی طرح نہ اسے کچھ کہہ سکی نہ ہی اس سے کچھ پوچھ پائی!“

سعد فرناز کا چھوٹا بھائی تھا اور اس کا بے حد لاڈلا بھی اسی لیے وہ اس کی بات سن بھی لیتی اور اکثر مان بھی لیا کرتی تھی۔ اس نے امی ماں کے پیش نظر امی سے گلہ کیا تھا لیکن جواب میں امی نے اس کی ہی کلاس لے ڈالی تھی کیونکہ وہ خود بھی ابھی تک فرناز کی اس حرکت کو ہضم نہیں کر پائی تھیں۔

”ارے بھئی چھوڑو ان سب باتوں کو۔ جو ہونا تھا وہ تو ہو ہی چکا ہے۔ اب آگے کی سوچو کہ آگے کیا کرنا ہے۔ مجھے بہت پریشانی ہو رہی ہے۔ یہ لڑکی خود تو پھنسے گی ہی، ہمیں بھی اپنے ساتھ خوار کر کے چھوڑے گی۔“ ابو بھی کم پریشان نہیں تھے۔ اس پر جب امی نے بتایا کہ اس سارے معاملے کو شہناز سمیت یاسر سے بھی فی الحال چھپانے کا آرڈر ملا ہے تو اور بھی پریشان ہو گئے تھے۔

دوسری طرف جیسے ہی رات کے دس بجے اماں بشیراں روزانہ کے معمول کے مطابق شہناز کو لینے نواب محل پہنچی تو یہ جان کر اس کے پیروں تلے سے زمین ہی نکل گئی کہ شنو تو دوپہر کی ہی وہاں سے آدھی چھٹی لے کر جا چکی تھی۔

”آدھی چھٹی؟ پر کیوں نواب صاحب؟ آپ نے اسے جانے کیوں دیا۔ جب میں خود اسے لینے اور چھوڑنے آتی ہوں تو پھر آپ نے اسے اکیلے جانے کی اجازت دی کیسے؟“ بہت ضبط کے باوجود بھی اماں کی آواز بلند ہوتی جا رہی تھی اور اس کی بلند ہوتی آواز کے ساتھ ساتھ نواب صاحب کے ماتھے کے بل بھی بڑھتے جا رہے تھے۔

”دیکھو بی بی! تمہاری بیٹی ہماری ملازمہ ہے، ہم اس کے ملازم نہیں کہ اس کے آنے جانے کے اوقات پر نگاہ رکھیں۔ اور جب تمہیں پتا تھا کہ تمہاری بیٹی کے پیروں میں چکر ہے تو پھر اسے ہمارے ہاں ملازم کروایا ہی کیوں تھا تم نے؟“ دادا ابا کے منجھلے بیٹے غصے کے بہت تیز تھے، ان سے برداشت نہیں ہوا تو ایک دم سارا لحاظ ایک طرف رکھتے ہوئے اماں پر چڑھ دوڑے تھے۔

”لیکن صاب جی! میں اب کیا کروں؟ میری دھی کہاں ہے؟ میں گھر واپس جا کر کیا جواب دوں گی سب کو۔ اور پھر...... پھر اس کی تو شادی بھی ہونے والی ہے۔ اب ہم برادری والوں کو کیا منہ دکھائیں گے جی؟“ اماں کا ایک رنگ آرہا تھا تو دوسرا جا رہا تھا۔ اس کی حالت لحظہ بہ لحظہ بگڑتی جا رہی تھی۔ دادا ابا اور دادی اماں نے غور سے اسے دیکھا اور پھر تاسف سے گہرا سانس بھرتے ہوئے سر جھکا لیا۔

”دیکھو بی بی! ہمیں تمہارے ساتھ پوری ہمدردی ہے۔ ہم تمہارے دکھ کا اندازہ لگا سکتے ہیں۔ تم ابھی گھر جاؤ، اپنے رشتے داروں کے گھر دیکھو ہو سکتا ہے وہ کسی کے گھر چلی گئی ہو۔ اور ویسے بھی ہم سے تو اس نے یہی کہا تھا کہ وہ اپنی کسی جاننے والی کے ساتھ ڈاکٹر کے پاس جا رہی ہے کیونکہ اس کی طبیعت کچھ دنوں سے خراب تھی۔“ بڑی بیگم صاحبہ نے اماں کو گہرے طنزیہ انداز سے گھورتے ہوئے سرد انداز سے کہا تو دادا جان اور دادی جان نے بھی ان کی تائید میں سر ہلا کر جیسے بات ختم کر دی۔

”پر...... صاب جی...... میری دھی......!!“

”او بی بی! اب یہاں وقت ضائع کرنے کی بجائے بہتر ہے کہ تم اپنے گھر جاؤ اور اپنے رشتے داروں کے گھروں میں پتا کرو جا کر۔ وہ وہیں کہیں ہوگی۔ تم یہاں بیٹھ کر واویلا مت مچاؤ۔ جاؤ یہاں سے سیدھی طرح ورنہ ابھی چوکیدار کو بلا کر باہر کرواتا ہوں تمہیں۔“ چھوٹے نواب صاحب مزاج کے بہت تیز تھے ان سے اماں کی چیخ چیخ زیادہ دیر برداشت نہیں ہوئی تو وہ اسے کاٹ کھانے کو دوڑے تھے، اور یہی نہیں انہوں نے اشارہ کر کے واقعی چوکیدار کو بھی بلا لیا تھا۔ اب اماں کے پاس اس کے سوا اور کوئی چارہ نہیں رہ گیا تھا کہ وہ چپ چاپ وہاں سے اٹھ آتی۔ سو اس نے یہی کیا۔ لیکن اپنی بستی میں واپس پہنچتے ہی اس نے طوفان کھڑا کر دیا۔ چیخ چیخ کر جیسے سارا آسمان سر پر اٹھا لیا۔ اس کے رونے پیٹنے کی آوازیں سن کر ساری بستی باہر نکل آئی۔ اور پھر جیسے ہی انہیں شنو کی گمشدگی کا علم ہوا، ہر طرف غصے کی لہر دوڑ گئی۔ دیکھتے ہی دیکھتے لاٹھیاں باہر نکل آئیں۔ بستی کے سارے مرد اور لڑکے اس کی تلاش میں پورے علاقے میں پھیل گئے۔ رات بھر اس کی تلاش بڑی سرگرمی سے جاری رہی مگر اس کا کہیں نشان نہ ملا۔ اماں کے ٹرنک سے چوری ہونے والے مال نے انہیں اور زیادہ بھڑکا

دیا تھا۔ اگلے دن سب کے باہمی مشورے سے انہوں نے مقامی تھانے میں شنو کے مبینہ اغوا کی رپورٹ درج کروا دی۔ یہاں کا تھانیدار بستی کے سردار کا بہت اچھا دوست تھا۔ اس پر انہوں نے اپنی انا اور اصولوں کے پرچم کی سربلندی کے لیے اس تھانیدار کو مال بھی خوب کھلایا تھا جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ پولیس والوں نے پوچھ تاچھ کے نام پر جگہ جگہ چھاپے مارنے شروع کر دیے۔ وہ ہر اس کوٹھی میں گئے جہاں جہاں شہناز بی بی کام کرتی رہی تھی لیکن وہ سب لوگ بہت با اثر اور طاقتور تھے، اس لیے جلد ہی معاملہ رفع دفع ہو گیا لیکن شنو کے گھر والے اس معاملے کو اس طرح رفع دفع کروانے کے موڈ میں ہرگز نہ تھے اس لیے انہوں نے اپنے شک کی سوئی ایک دم سے مسرت کی طرف موڑ دی اور پھر جیسے ہی مسرت شک کے دائرے میں آئی، فرناز خود بخود ہی اس کی لپیٹ میں آتی چلی گئی۔

اب شہناز کے گھر والوں کے ساتھ ساتھ بستی والوں کی بھی پوری کوشش تھی کہ کسی نہ کسی طرح مسرت اور اس کے گھر والوں کے گرد شکنجہ کس دیا جائے تاکہ وہ اس کے ذریعے سے یا تو شنو کو بازیاب کروالیں اور پھر اسے نازو کی طرح نشان عبرت بنا کر رکھ دیں یا اس کے بدلے مسرت اور اس کی بہن کو پنچائیت کے ذریعے ونی کروا لیا جائے مگر ان کی یہ خواہش بھی پوری نہ ہو سکی کیونکہ مسرت اور اس کے گھر والوں کے سامنے فرناز اور یاسر ڈار ڈھال بن کر کھڑے تھے۔ یاسر ڈار کے کانٹیکٹ کافی اوپر تک تھے۔ جیسے ہی اوپر سے گھنٹیاں بجنی شروع ہوئیں، پولیس والوں نے بھی اس معاملے سے ہاتھ اٹھا لیے۔ شہناز کے باپ اور بھائی کو یہ بات ہضم نہیں ہو رہی تھی اس لیے وہ بار بار سردار کو کچھ کرنے کا کہتے اور سردار مجبوراً اپنے تھانیدار دوست پر پریشر ڈالنے کی کوشش کرتا۔ تھانیدار صاحب بھی اصل پولیس والے تھے جن کی نہ دوستی اچھی اور نہ ہی دشمنی۔ تنگ آکر انہیں اپنا اصل روپ ان سب کو دکھانا ہی پڑا اور ان کا یہ روپ دیکھ کر سب کی بولتیاں ہی بند ہو گئیں۔

”اوئے رشیدے! ایک بات سن لے کان کھول کر اور اسے پلے سے باندھ لے۔ تمہاری لڑکی کو کسی نے اغوا نہیں کیا۔ وہ خود اپنی مرضی سے گھر چھوڑ کر بھاگی ہے۔ اور یہ بات ہم بھی جانتے ہیں اور تو بھی اچھی طرح سے جانتا ہے اور اب یہ بھی جان لے کہ جو لڑکیاں خود اپنی مرضی سے اپنا گھر بار چھوڑ کر بھاگ جاتی ہیں ان کے پیچھے بھاگنے یا ان کا کھرا ناپنے کی بجائے انہیں مرا ہوا ہی سمجھ لینا چاہیے کیونکہ جو لڑکی اپنے زندہ باپ بھائیوں کو بھلا کر کسی دوسرے کی چاہ میں دہلیز پار جائے وہ سمجھو اپنے گھر والوں کے لیے مر ہی جاتی ہے۔ اب تم لوگ بھی شہناز بی بی پر مٹی ڈالو اور آگے بڑھو۔ کسی ایک انسان کے مر جانے سے نہ زندگی ٹھہرتی ہے اور نہ ہی وقت رکتا ہے۔ سمجھے میری بات کہ ابھی بھی نہیں؟“ تھانیدار نے اپنی اسٹک گھماتے ہوئے سرد انداز سے کہا تو ان سب کے سر جھک گئے۔

”ٹھیک ہے تھانیدار صاحب! آپ بالکل ٹھیک کہہ رہے ہیں۔ آپ کی ساری باتیں سچ ہیں اور ہماری سمجھ میں بھی آگئی ہیں۔ آپ فکر نہ کریں۔ اب ہم آپ کو تنگ نہیں کریں گے ... بلکہ کسی کو بھی تنگ نہیں کریں گے۔ چلیں سردار، واپس بستی چلتے ہیں۔ ابھی ہمیں شنو کا جنازہ بھی اٹھانا ہے اور اسے دفنانا بھی تو ہے۔“ اس کے بڑے بھائی نے اپنی جگہ سے اٹھتے ہوئے کہا تو اس کے ساتھ ساتھ سب کھڑے ہو گئے۔ انہوں نے تھانیدار کے حرف حرف پر ایمان لاتے ہوئے اس طرح عمل کیا کہ تھانیدار بھی اپنی جگہ دنگ رہ گیا۔ اسی شام شہناز رشید عرف شنو کے زیر استعمال رہنے والی ساری چیزیں، اس کے کپڑے، جوتے حتیٰ کہ اس کے بستر کی چادر، گدے تک کو ایک جگہ جمع کیا گیا۔ ان سب چیزوں کو اس کی چارپائی پر ڈال کر جنازے کی شکل دی گئی اور پھر اس جنازے پر خوب بین ڈالے گئے۔ خوب رونا پیٹنا ہوا اور پھر اسی بستی کے ایک کونے میں گہرا گڑھا کھود کر شنو کے ارمانوں کے جنازے کو اس میں دفنا دیا گیا۔ یہ تھی شہناز رشید عرف شنو کے ارمانوں کی وہ قبر جس پر اس کی بستی والوں نے مٹھیاں بھر بھر مٹی ڈال دی تھی جس کے بعد سے اس بستی میں شنو کا باب ہمیشہ کے لیے بند ہو گیا۔

☆......☆

اب تک شہناز نے جس گھر میں بھی قیام کیا تھا، وہاں اسے صرف ایک ملازمہ کی حیثیت سے ہی دیکھا جاتا تھا۔ مگر یہاں وہ امانت تھی۔ فرناز کی سونپی گئی امانت۔ سو، یہاں اس کی خوب حفاظت کی جا رہی تھی۔ فی الحال اسے ایک کمرے تک ہی محدود رکھا گیا تھا۔ جس طرح سے اس کے گھر والے اس کی تلاش میں بھاگتے پھر رہے تھے، یہ حفاظت اس کے لیے بہت ضروری تھی کہ اسے کچھ عرصے کے لیے ”انڈر گراؤنڈ“ کر دیا جائے۔ یہ گیسٹ روم تھا اور مہمانوں کے لیے ہی کھولا جاتا تھا۔ ضروریات زندگی کی ہر چیز اسے یہاں بیٹھے بٹھائے مل رہی تھی۔ گھر میں جز وقتی دو ملازمائیں تھیں اور وہ

اسے مہمان سمجھتے ہوئے اس کے ساتھ اسی عزت اور ادب سے پیش آتیں جیسے دوسرے مہمانوں کے ساتھ رویّہ رکھتی تھیں۔ شہناز بی بی کے لیے یہ پروٹوکول بالکل نیا نیا اور پہلا پہلا تجربہ تھا۔ وہ خود کو ہواؤں میں اڑتا ہوا محسوس کر رہی تھی۔ اس سارے عرصے میں اسے ایک بار بھی اپنی ماں کی یاد نہیں آئی تھی۔ نہ ہی بہن بھائی اور باپ کی شکلیں اس کی نگاہوں کے سامنے گھومی تھیں۔ اور پھر جیسے ہی اس کی موت کی جھوٹی خبر اخباروں کی زینت بنی، اس کے لیے اپنے ماضی اور ماضی سے جڑے حوالوں پر مٹی ڈالنا آسان ہو گیا۔ اس کے اپنوں نے تو اسے مار ہی دیا تھا، خود اس نے بھی شہناز رشید کو مار ڈالا۔ اپنے ہاتھوں کھودی قبر میں اپنا حسب، نسب، پہچان سب دفنا دیا۔ اپنے ماضی اور ماضی سے جڑے حوالوں سمیت۔

مریم یہ نیا نام اسے فرناز نے دیا تھا۔ اور نئی پہچان اسے فرناز کے ابو جان نے دے دی۔ انہوں نے اسے لیگلی اڈاپٹ کر لیا تھا۔ حالانکہ اس سلسلے میں انہیں کافی دوڑ دھوپ بھی کرنی پڑی تھی لیکن اپنی بیٹی کی خوشی کی خاطر وہ کڑوا گھونٹ بھی میٹھا شربت سمجھ کر پی گئے تھے۔ حالات کے سازگار ہوتے ہی مریم بھی اپنے حجرے سے باہر آ گئی۔ اسے گھر کے ایک فرد کی سی حیثیت حاصل ہو چکی تھی۔ اسے ایک الگ کمرا مل چکا تھا۔ نہ کوئی ذمہ داری تھی اور نہ ہی کسی قسم کا کوئی بوجھ اس کے شانوں پر تھا۔ فرناز کے خاندان میں یتیم بچوں، بچیوں اور بیواؤں کے حقوق کے لیے بہت کچھ کیا جاتا تھا۔ خوف خدا اور راہ خدا میں یہ لوگ اپنا بڑے سے بڑا نقصان بھی ہنسی خوشی برداشت کر جایا کرتے تھے۔ مریم سے پہلے بھی ایک بچی اور بچے کو فرناز کے ابو گود لے چکے تھے۔ انہیں پال پوس کر بیاہ بھی چکے تھے اور... ان دونوں کا ابھی بھی اس گھر سے ویسا ہی تعلق تھا، جیسا کہ شادی شدہ بیٹے اور بیٹی کا ہوتا ہے۔ ان کے علاوہ خاندان کے دوسرے گھرانوں میں بھی یہی ریت چلی آ رہی تھی، سو ان کا اب مریم کو گود لینا بھی سارے خاندان کے لیے ایک مستحسن عمل ٹھہرا تھا۔ ہاں، البتہ اس کی اصلیت کسی کو نہیں بتائی گئی تھی۔ سب کو ایک فرضی کہانی سنا دی گئی تھی جس کی رو سے مریم کا تعلق آمنہ (فرناز کی بڑی بھابی) کے میکے سے تھا۔

فرناز اور مسرت اس کے حق میں تھیں اور انہوں نے اس کی تعریفیں کر کر کے سارے گھر والوں کے دلوں میں اس کے لیے ایک خاص مقام بنا دیا تھا۔ امی جان تو پہلے ہی نرم دل اور مہربان قسم کی خاتون تھیں۔ وہ اسے اس وقت سے جانتی تھیں، جب سے وہ فرناز سے کھانا پکانا سیکھ رہی تھی۔ وہ اپنے اوپر اپنے گھر والوں کے ڈھائے جانے والے نادیدہ مظالم کی داستانیں اس دکھ بھرے انداز سے سب کو سناتی کہ سننے والوں کے رونگٹے ہی کھڑے ہو جاتے۔ اس کی ایسی باتیں سن کر بعض اوقات امی جان اسے ٹوک بھی بیٹھتیں، مگر وہ اپنے بیان سے ایک انچ بھی پیچھے ہٹنے کو تیار نہیں ہوتی تھی۔

”نہیں امی جان! آپ کو نہیں پتا، ہماری برادری کے رواجوں کا۔ وہاں تو حق بات کہنے کو بغاوت سمجھا جاتا ہے اور ان کی پنچایت میں بغاوت کی سزا صرف موت ہے موت۔ میں تو ان سب کی نگاہوں میں شروع سے ہی باغی تھی، اسی لیے وہ لوگ میرے ساتھ زیادہ سختیاں کرتے تھے۔ پورے خاندان میں سب سے زیادہ برا سلوک میرے ساتھ کیا جاتا تھا۔ آپ تو خود گواہ ہیں ناں امی جان۔ آپ نے دیکھا نہیں تھا اماں کا وہ تفتیشی انداز جب وہ فرناز باجی کے گھر آئی تھیں تو کیسے آپ سے الٹے سیدھے سوال کر رہی تھیں۔ آپ کو تو یاد ہے ناں سب کچھ۔!!“ امی جان کی کسی بات کے جواب میں اس نے انہیں ماضی کی باتیں یاد کرواتے ہوئے ڈرامائی انداز سے کہا تو امی بھی سوچ میں ڈوب گئیں۔

”بھابی! آپ خود بتائیں بھلا۔ کیا اچھی زندگی گزارنے کی خواہش کرنا بغاوت ہے یا اس خواہش کو پورا کرنے کے لیے کوشش کرنا ناجائز ہے۔ یہ تو اللہ بھلا کرے فرناز باجی کا جو وہ عین وقت پر مجھے اس جہنم سے نکال لائیں ورنہ تو میرے باپ نے اس نشہ باز چھابڑی فروش سے میرے دام کھرے کر ہی لیے تھے۔ جانے کتنے پیسے بٹورے ہوں گے انہوں نے اس سے جو میری تلاش میں اس طرح بھاگتے پھرے اتنا عرصہ امی جان، اب بھی اگر میں غلطی سے بھی ان کے ہتھے چڑھ گئی ناں تو انہوں نے سیدھے سیدھے مجھے قتل کر ڈالنا ہے نازو کی طرح۔ اس غریب کو تو پھر بھی قبر نصیب ہو گئی تھی لیکن مجھے...... مجھے تو قبر کی مٹی بھی نہیں ملنے والی ان کے ہاتھوں۔ ایسے ہی مار وار کر پھینک دیں گے کہیں۔ ایسے ہی ظالم اور بے حس ہیں میرے باپ اور بھائی!“ اس کی شعلہ بیانی نے جہاں امی کی زبان بند کی تھی، وہیں بھابیوں کے ہوش بھی اڑا دیے تھے۔ وہ لوگ صوم صلوٰۃ کے پابند ملنسار اور محبت کرنے والے لوگ تھے۔ لڑائی جھگڑوں اور دنگا فساد کا ان کے گھرانے میں دور دور تک کوئی نشان نہیں ملتا تھا۔ دونوں بھابیاں اور امی جوائنٹ فیملی سسٹم کے تحت پیار و محبت سے رہ رہی تھیں۔ نہ کسی کی لگائی بجھائی اور نہ ہی کوئی گھریلو سیاست پائی جاتی تھی یہاں۔ لیکن اب مریم بی بی کے آنے سے لگتا تھا جیسے سب کچھ بدلنے والا ہو۔ اسے اپنے خوابوں، اپنی خواہشوں میں رنگ بھرنے کے لیے کسی ایسے ہی گھرانے کی تلاش تھی۔ اور اس کی تلاش اس وقت مکمل ہوئی جب اس نے فرناز کے گھر اس کے والدین اور بھائی بھابیوں کو دیکھا تھا۔ اس کے جیسی گھاٹ گھاٹ کا پانی پیتے ہوئے گھاگ لڑکی کے لیے اس سیدھے سادے گھرانے کو اپنا ہتھیار اور فرناز جیسی جذباتی عورت کو اپنا مہرہ بنانا بہت آسان لگا تھا۔ اس نے اسی وقت سوچ لیا تھا کہ کبھی نہ کبھی وہ اس گھرانے کو اپنے مقاصد کے حصول کے لیے استعمال ضرور کرے گی۔ اب یہ اس کی قسمت کہ اسے جلد ہی اس کا موقع بھی مل گیا۔ رشید اور بشیراں نے جیسے ہی اپنی باغی بیٹی کو ٹھکانے لگانے کا منصوبہ بنایا، ان کی بیٹی انہیں ہی چونا لگا گئی۔ اس نے اپنے مقصد کے حصول کے لیے اپنی بچپن کی دوستی کو بھی داؤ پر لگا دیا تھا۔ اس کے اس طرح دن دیہاڑے غائب ہو جانے کے بعد جس طرح اس کے گھر والوں اور پولیس نے مسرت اور اس کے گھر والوں کو شک کی بنا پر ہراساں کرنا چاہا، اگر فرناز اور یاسر ڈار ان کا ساتھ نہ دیتے تو شاید مسرت اور اس کے گھر والوں پر قیامت ڈھے چکی ہوتی مگر مریم کو اس کی چنداں پرواہ نہ تھی۔ اپنے مفاد کے سامنے تو اس نے اپنے سگے خونی رشتوں کو کچھ نہیں سمجھا تھا تو یہ تو پھر دوستی کا ہی ناطہ تھا۔ وہ اسے سمجھتی ہی کیا تھی۔ اسی لیے تو اتنا کچھ ہو جانے کے بعد بھی اس نے ایک بار بھی مسرت اور اس کی بہن کے ساتھ ہمدردی نہیں دکھائی تھی۔

فرناز کے ابو جان کے گھر آ کر اسے لگنے لگا تھا کہ جیسے وہ اپنے خوابوں اور خواہشوں کے جزیرے کے بہت نزدیک آ گئی ہو۔ اس کی اونچی اڑان کے لیے مضبوط پر تو اس گھر والوں نے ہی اسے فراہم کیے تھے۔ وہ فی الحال ان سب کو ہاتھوں میں رکھنے کے لیے خوب محنت کر رہی تھی۔ امی جی اور ابو جی کی ”گڈ بکس“ میں آنے کے لیے پانچ وقت کی نماز پڑھتی۔ امی کے ساتھ قرآن پاک کی تلاوت کرتی، نفلی روزے رکھتی اور کبھی کبھار تہجد کے لیے بھی اٹھ جاتی۔ امی اور ابو جان اس کی عبادت گزاری سے بہت متاثر ہو رہے تھے۔ دونوں بھابیوں کے ساتھ بھی اس کا رویّہ بہت خوشامدانہ تھا۔ ان کے کام بھاگ بھاگ کر کرتی۔ ان کے بچوں کے ساتھ خوب کھیلتی، انہیں پیار کرتی آہستہ آہستہ سب کے دلوں میں گھر کرتی جا رہی تھی۔ دونوں بھائی تو ویسے ہی سیدھے سادے تھے۔ فرناز ان کی ایک ہی بہن تھی۔ اب انہیں مریم کی صورت دوسری بہن مل گئی تو اس کے لاڈ بھی بھائیوں کی طرح ہی اٹھا رہے تھے۔ ابو جان گھر میں داخل ہوتے ہی پہلے اسے آواز لگاتے، بالکل اسی طرح جیسے فرناز کی شادی سے پہلے اسے پکارا کرتے تھے۔ جو کچھ بھی گھر لاتے، گھر کی بیٹی سمجھتے ہوئے اس کے ہاتھ میں دیتے کہ یہ ہمارے پیارے نبی صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلم کی پیاری سنت ہے کہ گھر میں داخل ہوتے ہی کھانے کی چیز پہلے بیٹی کو دی جائے۔ ابو جان بھی اسے بیٹی ہی سمجھتے تھے، اس لیے اس کے ساتھ سگی بیٹی کی طرح ہی پیش آ رہے تھے۔

☆......☆

کچھ لوگوں کی فطرت ہی اضطرابی ہوتی ہے اور جن کی فطرت ہی اضطراب ہو، وہ نہ تو خود سکون سے رہتے ہیں اور نہ ہی دوسروں کو سکون سے رہنے دیتے ہیں اور پھر جب اضطرابی فطرت کے ساتھ ذہن بھی سازشی، اور مفاد پرست ہو تو ایسے لوگ نہ صرف خود کے لیے بلکہ اپنے ارد گرد رہنے والوں کے لیے بھی جب چاہیں مسائل کا انبار لگا سکتے ہیں۔ بنیادی طور پر مریم کی فطرت بھی ایسی ہی تھی۔ وہ کسی حال میں خوش رہنے والے بندوں میں سے نہیں تھی۔ اسے ہمیشہ اپنی ہی تھڑی سب سے بھاری دکھائی دیتی تھی۔ دوسروں کا بوجھ اس کے نزدیک تو کوئی بوجھ تھا ہی نہیں۔ اس کے لیے شروع سے ہی صرف ”میں اور میری ذات“ ہی سب سے اہم رہی تھی۔ تو پھر وہ اتنا عرصہ بھلا کیسے سکون سے رہ سکتی تھی۔

جیسے ہی اس کے پاؤں اس گھر میں مضبوط ہوئے، اس کی اضطرابی فطرت اپنا رنگ دکھانے لگی۔ گھر والوں کا مکمل اعتماد وہ جیت چکی تھی۔ فرناز کی مکمل حمایت اسے حاصل تھی۔ ہاں مسرت اس سے کچھ ناراض تھی، تو اسے اس کی کوئی پرواہ بھی نہیں تھی۔ جب اسے چاروں طرف سے اطمینان حاصل ہو گیا کہ اب اس کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا تو اس کے سازشی ذہن نے نئی نئی چالیں چلنا شروع کر دیں۔ وہ سب کو اپنی میٹھی میٹھی باتوں اور خدمتوں کے جال میں پھنسا کر ان کی جڑیں کاٹنے لگی۔ برسوں سے ایک ہی چھت تلے پیار و محبت سے رہنے والے افراد کے دلوں میں ایک دوسرے کے خلاف نفرتوں کے بیج بونے لگی۔ امی جان کے دل میں بھابیوں کے حوالے سے عجیب عجیب شکوک و شبہات پیدا کرنے لگی کہ وہ الجھ کر رہ گئیں۔ دوسری طرف دونوں بھابیوں کے کان ایک دوسری کے خلاف اس ہوشیاری سے بھرے کہ وہ دونوں ایک دوسرے سے دور ہوتی چلی گئیں۔ یہی نہیں، اس نے تو امی اور

فرناز کے خلاف بھی بھابیوں کی خوب برین واشنگ کی تھی کہ وہ انہیں بھی اپنا دشمن سمجھنے لگیں۔ اس کی اس پلیم گیم کی وجہ سے گھر میں ایک ان دیکھا سا انتشار پھیلتا چلا گیا۔ ایک بے نام سی بے سکونی نے اس گھر کے در و دیوار پر ڈیرے ڈال لیے تھے۔ امی سب سے الگ تھلگ، خفا خفا سی تھیں تو بھابیاں ایک دوسری سے کھنچی کھنچی، بیزار سی۔ اور رہے بچے، تو سب کے سب بے قابو۔ پورے گھر میں اگر کوئی مطمئن اور شاد دکھائی دیتا تو وہ مریم ہی تھی۔ سب کی ہمدرد، سب کی خیر خواہ۔ اور اندر سے سب کی جڑیں کاٹتی دو دھاری تلوار۔

☆......☆

”باجی! اب آپ خود آ کر سارا معاملہ سلجھائیں گی یا پھر ہمیں ہی کوئی ایکشن لینا پڑے گا۔ آپ نے ہی ہمیں اس چکر میں الجھایا ہے۔ اب آپ ہی آ کر اس کا کوئی مناسب حل نکالیں۔ ہم سب بہت پریشان ہیں۔ امی بیچاری تو بیمار پڑ گئی ہیں ان حالات کی وجہ سے۔ روز کوئی نئی بک بک، روز کوئی نئی چخ چخ۔!!“ عادل کے منہ سے ساری بات سن کر فرناز کا منہ کھلے کا کھلا ہی رہ گیا۔ وہ فوراً سب کچھ چھوڑ چھاڑ بھائی کے ساتھ بھاگی چلی آئی۔

”طیبہ! تم نے آمنہ بھابی کے لیے ایسے غلط الفاظ استعمال کیے؟ میں تو کبھی سوچ بھی نہیں سکتی تھی کہ تم...... تم اس حد تک بھی جا سکتی ہو۔“ فرناز نے گھر آتے ہی امی جان اور دونوں بھابیوں سے علیحدہ علیحدہ بات کی اور وہ فوراً ہی معاملے کی تہہ تک جا پہنچی تھی لیکن اس نے اپنے آپ پر قابو رکھا اور دن بھر گہری نگاہ سے حالات کا جائزہ لیتی رہی۔ یہ شاید پہلی بار ہی ہوا تھا کہ فرناز جذبات میں آئے بغیر ٹھنڈے دل سے حالات و واقعات پر غور کر رہی تھی۔ رات کو ابو جان اور بھائیوں کی آمد پر بھی سب کچھ معمول کے مطابق ہوا تھا۔ پھر جیسے ہی وہ لوگ رات کے کھانے سے فارغ ہوئے، مریم سب کے لیے قہوہ بنا لائی تھی اور اسی وقت باتوں باتوں کے درمیان فرناز نے ایکدم طیبہ سے استفسار کیا تو اس کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔

”نہیں تو باجی! توبہ کریں۔ میں کیوں کرنے لگی بھلا بھابی کے لیے ایسی فضول باتیں۔ بلکہ، میں تو خود بہت پریشان ہوں کہ بھابی کو آخر ہو کیا گیا ہے؟ پہلے تو وہ مجھ سے بالکل اپنی چھوٹی بہنوں کی طرح ہی ٹریٹ کرتی تھیں، مگر اب ان کا رویہ میرے ساتھ بہت بدل گیا ہے۔ مجھے یوں محسوس ہونے لگا ہے جیسے اس گھر میں میری کوئی حیثیت ہی نہیں رہی۔ میں مانتی ہوں، بھابی مجھ سے بڑی ہیں۔ اس گھر کی بڑی بہو ہیں لیکن میں بھی اسی گھر کی بہو ہوں۔ پھر میرے ساتھ یہ امتیازی سلوک کیوں؟ ہمارے درمیان تو کبھی بھی تیرا میرا والی بات نہیں ہوئی تھی۔ لیکن اب، کچھ عرصے سے ایسا ہی ہو رہا ہے۔“ فرناز کے پوچھنے کی دیر تھی کہ طیبہ تو جیسے پھٹ ہی پڑی تھی اور اس کے گلے شکوے سن کر سب ہی حیرتوں کے سمندر میں ڈوبتے جا رہے تھے۔

”کیوں؟ تمہیں ایسا کیوں لگنے لگا ہے کہ تم اس گھر میں غیر اہم ہو۔ یا تمہاری حیثیت اس گھر میں کم ہے۔ ہمیں تو ایسا کبھی بھی نہیں لگا۔ ہاں، آمنہ بھابی پہلے سے زیادہ خاموش اور سنجیدہ ہو گئی ہیں۔ وہ تو پہلے بھی زیادہ نہیں بولتی تھیں، تو پھر تم کیسے کہہ سکتی ہو کہ بھابی بدل گئی ہیں۔ ہو سکتا ہے کہ تبدیلی تمہارے اندر آئی ہو۔ ہو سکتا ہے پہل تمہاری طرف سے ہوئی ہو۔ ہو سکتا ہے کہ......!“

”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ باجی۔ میں نے تو ہمیشہ بھابی کو اپنی بڑی بہن ہی سمجھا ہے۔ انہوں نے ہی پہل کی تھی۔ میں نے نہیں۔ میں نے تو بہت برداشت کیا۔ ان کی ساری باتیں، ساری الزام تراشیاں سن کر بھی کسی سے کچھ نہیں کہا۔ نہ امی سے کوئی شکوہ کیا اور نہ ہی ان سے گلہ کیا۔ اس پر بھی بری میں ہی بن رہی ہوں تو پھر اس کا صاف صاف مطلب تو یہی ہے ناں کہ اس گھر میں واقعی میری کوئی حیثیت نہیں رہی۔“ فرناز کی بات تیزی سے کاٹتے ہوئے طیبہ روتے ہوئے بولی تو سب ایک دم بے چین سے ہو گئے۔ فرناز نے انہیں اشارے سے کچھ بھی کہنے سے روکتے ہوئے خود پر پہلے سے بھی زیادہ سنجیدگی طاری کر لی تھی۔

”اچھا! تو آمنہ بھابی نے تمہارے سامنے تمہیں باتیں سنائیں؟ تم پر جو الزام لگائے گئے، وہ تمہارے منہ پر لگائے تھے کیا؟ اور اپنے بچوں اور تمہارے بچوں میں کیا فرق کیا بھابی نے؟ کیا اپنے بچوں کو اچھا پہنایا اور تمہارے بچوں کے لیے سستی چیزیں لائیں؟“ فرناز کے اشارے پر سب خاموش ہو چکے تھے لیکن تذبذب سب کے چہروں پر پھیل چکا تھا۔

”نہیں...... نہیں آمنے سامنے تو کبھی منہ ماری ہوئی ہی نہیں ہماری اور میرے سامنے یا سب کے سامنے تو بھابی سب بچوں کے ساتھ یکساں سلوک ہی کرتی ہیں۔ سب بچوں کو ایک جیسا پیار، ایک جیسی ہی توجہ دیتی ہیں مگر مجھے پتا ہے، اب ان کے دل میں ہمارے لیے گرہ پڑ چکی ہے۔ اور یہ سب باتیں تو مجھے کسی اور نے بتائی ہیں۔ مگر باجی، میں اس کا نام نہیں بتاؤں

گی کیونکہ میں نے اس سے وعدہ کر رکھا ہے کہ میں اس کا نام راز میں رکھوں گی۔ کسی کو نہیں بتاؤں گی!“

”اچھا! اور کیا تمہیں اس بات کا علم ہے کہ ایسا ہی وعدہ اس نے امی جان اور بھابی سے بھی لے رکھا ہے؟“ فرناز نے کونے میں دم سادھے بیٹھی مریم کو گھورتے ہوئے طنزیہ انداز سے کہا تو اس کے چہرے پر ایک سایہ سا لہرا گیا۔

”کیا مطلب؟ کہنا کیا چاہتی ہیں آپ باجی؟“ طیبہ رونا دھونا بھول چکی تھی، اب حیرت سے فرناز کو دیکھ رہی تھی۔

”یہی کہ ہم سب بیوقوف ہیں تو نہیں۔ مگر اس بالشت بھر کی لڑکی نے اچھا خاصا بیوقوف بنا ڈالا ہمیں۔ مجھے شک تو پہلے بھی ہوا تھا۔ امی جان جب بھی مجھ سے ملتیں، گھر کے بدلتے ماحول کی وجہ سے افسردہ اور پریشان دکھائی دیتیں۔ آمنہ بھابی کی تو مسکراہٹ ہی جیسے بجھ کر رہ گئی تھی اور تمہارا منہ الگ ہر وقت سوجا رہتا تھا۔ وہ تو ابو جان اور عاقل بھائی نے ٹھنڈے دل و دماغ سے تجزیہ کیا تو آستین کے سانپ تک بالآخر پہنچ ہی گئے۔ مگر پھر بھی میرے شریف اور عزت دار باپ بھائی اپنے اندر حوصلہ پیدا نہیں کر پائے کہ اس فساد کی جڑ کو جڑ سے ہی اکھاڑ پھینکیں۔“ بے حد غصے سے کہتی وہ ایک دم اٹھ کر اس کے سر پر جا پہنچی جو پھٹی پھٹی آنکھوں سے اپنا بھانڈا بیچ چوراہے میں پھوٹتا دیکھ رہی تھی۔

”بولو مریم، کیوں کیا تم نے ایسا؟ کیا بگاڑا تھا میرے گھر والوں نے تمہارا جو تم نے ان بے لوث، مخلص لوگوں میں پھوٹ ڈلوانے کی کوشش کی؟ کیوں؟ آخر کیوں؟“ فرناز کا پارہ لحظہ بہ لحظہ چڑھتا ہی جا رہا تھا۔

”میں نے کچھ نہیں کیا باجی، آپ کو ضرور کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ بھلا مجھے کیا ضرورت ہے کسی میں پھوٹ ڈلوانے کی۔ میں نے کچھ نہیں کیا۔ یہ سب الزام ہے مجھ پر۔“ مریم نے جو رونا شروع کیا تو حسب سابق رو رو کر دریا بہا دیے مگر اب اس کے اس مکر و فریب میں آنے کا کسی کا بھی موڈ نہیں تھا سو جیسے ہی اس کا یہ ڈراما شروع ہوا ایک ایک کر کے سب لاؤنج سے نکلتے چلے گئے اور پیچھے رہ گئی صرف فرناز اس کا رونا پیٹنا دیکھنے کے لیے۔

”باجی میں سچ کہہ رہی ہوں۔ بھابیوں نے آپ سے میری جھوٹی شکایتیں لگائی ہیں۔ میں نے نہیں بھرے کسی کے بھی کان۔ ان کے تو اپنے دلوں میں ایک دوسرے کے لیے نفرت اور بغض پل رہا ہے۔ ایک دوسرے کی شکل دیکھنے کی بھی روادار نہیں ہیں وہ تو میں بھلا کیسے......“

”بس چپ ہو جاؤ تم۔ اب ایک لفظ بھی نہ نکلے تمہارے منہ سے، ورنہ انجام اچھا نہیں ہوگا تمہارا۔ یاد رکھنا میری بات، جس طرح کاٹھ کی ہنڈیا بار بار نہیں چڑھائی جا سکتی، اسی طرح بار بار مگرمچھ کے آنسو بہا کر تم مجھے بیوقوف نہیں بنا سکتی۔ پتا نہیں، پہلے بھی میں کیسے تمہارے جھانسے میں آ گئی۔ لاکھ ابو جان اور بھائیوں نے مجھے سمجھانے کی کوشش کی کہ پرائے پھڈے میں ٹانگ مت اڑاؤ مگر میں ہی نہیں سمجھی۔ آ گئی تمہاری باتوں میں۔ تمہاری چالاکی اور مکاری کو سمجھ ہی نہیں سکی۔ مجھے تو پہلے ہی سمجھ جانا چاہیے تھا کہ جو لڑکی اپنے پیدا کرنے والے ماں باپ، اپنے سگے بہن بھائیوں کی سگی نہ ہو سکی تو وہ اپنے منہ بولے رشتوں سے کیسے نبھا کر پائے گی؟ مجھ سے بہت بڑی غلطی ہو گئی جو میں نے اپنے شریف النفس اور سیدھے سادہ گھر والوں کو اس مصیبت میں ڈال دیا۔ تم تو اس قابل تھی ہی نہیں۔ بالکل بھی نہیں۔ موری کی اینٹ موری میں ہی لگتی ہے، چوبارے میں نہیں۔ تمہیں تو واقعی کسی دارالامان میں ہی پھینک آنا چاہیے تھا۔ پھر تمہارے ساتھ جو بھی ہوتا، ہماری بلا سے۔ مگر نہیں دارالامان کیوں؟ تم تو انہی جھگیوں میں ہی ٹھیک تھیں۔ وہ ہی تمہاری اوقات تھی اور وہ ہی تمہارا اصل۔ مور کے پر لگا لینے سے کوا کبھی بھی مور نہیں بن سکتا۔ تم اندر سے کل بھی شنو تھیں اور آج بھی شنو ہی ہو۔ وہی جھگی والے رشید کی نافرمان بیٹی شہناز رشید عرف شنو۔ دور ہو جاؤ میری نگاہوں کے سامنے سے اور جب تک ہم تمہارے بارے میں کوئی فیصلہ نہیں کر لیتے، اپنے آپ کو ایک بار پھر ایک کمرے تک ہی محدود سمجھنا۔ سمجھی تم۔ اور خبردار...... خبردار اگر اب تم نے میرے گھر والوں کو استعمال کرنے کے بارے میں سوچا بھی تو مجھ سے برا کوئی نہ ہوگا۔“ شدید غصے کے عالم میں فرناز کے منہ میں جو آ رہا تھا، وہ بولے چلی جا رہی تھی۔ مریم رونا دھونا بھول، بس دم سادھے آنکھیں پھاڑے اسے گرجتا برستا دیکھ رہی تھی۔ اس کے تو وہم و گمان ہی میں نہ تھا کہ اتنی جلدی اس کی بچھائی بساط لپیٹ دی جائے گی۔ اور وہ بھی اس کے سب سے بڑے مہرے، سب سے بڑی ہمدرد کے ہاتھوں۔

☆......☆

فروری کی ایک خوبصورت شام مریم کا نکاح ممتاز کے ساتھ کر کے اسے باعزت اور اچھے انداز سے رخصت کر دیا گیا۔ فرناز ابھی تک اس سے ناراض تھی اور اس کا اس کی شادی میں بھی شامل ہونے کا کوئی ارادہ نہ تھا مگر پھر سب کے سمجھانے

بجھانے پر مان ہی گئی۔ اس دن کے ہنگامے کے بعد فوری طور پر یہی فیصلہ کیا گیا کہ جلد از جلد کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر اس فرض، اس ذمہ داری سے بطریق احسن بہرہ ور ہولیا جائے۔ قبل اس کے کہ یہ فتنہ کوئی اور فساد کھڑا کرتا، فوری طور پر رشتہ کروانے والی خالہ کی خدمات حاصل کی گئیں۔ اسی کی توا سط سے ممتاز خان کا رشتہ اس کے لیے آیا۔ گورا چٹا، بھورے بال، بھوری آنکھیں، مناسب قد کاٹھ کا ممتاز خان رکشا ڈرائیور تھا۔ اس کی اچھی خاصی بڑی فیملی تھی۔ چار بھائیوں اور تین بہنوں میں اس کا نمبر پانچواں تھا۔ اس کے سب بھائی بہنیں شادی شدہ اور بال بچے دار تھے۔ حتیٰ کہ اس سے چھوٹے بھائی بھی شادی شدہ تھے۔ اگر مریم نے اپنی افتادِ طبع سے سب کو اس قدر پریشان نہ کیا ہوتا تو یقیناً حالات قدرے مختلف ہوتے۔ وہ لوگ ممتاز سے بھی کسی بہتر آپشن کے بارے میں سوچ سکتے تھے لیکن مریم بی بی نے اپنی گھٹیا چالیں چلتے ہوئے اپنے پیروں پر خود ہی کلہاڑی دے ماری تھی۔ اب تو انہیں ہر وقت یہی دھڑکا لگا رہتا کہ موقع ملتے ہی کہیں وہ انہیں بھی چکما دے کر فرار نہ ہوجائے۔ اگر ایسا ہوجاتا تو ان کی عزت واقعی مٹی میں مل جاتی۔ وہ اپنے خاندان والوں اور آس پڑوس والوں کو کیا جواب دیتے کہ یوں اچانک کہاں چلی گئی ان کی لے پالک بیٹی؟ کیونکہ وہ تو بڑی عزت کے ساتھ لے پالک بیٹیوں کو رخصت کرنے والا خاندان تھا اور صد شکر کہ انہیں بھی ہمیشہ اللہ رب العزت نے انہیں اس معاملے میں باعزت ہی رکھا تھا۔ لیکن لگتا تھا کہ اس بار ان سے بھول ہو ہی گئی۔

وہ کل بھی شہناز رشید تھی، وہ آج بھی شہناز رشید ہی تھی۔ ناشکری، خودغرض اور بے فیض۔ لہٰذا اس کے اصل رنگ کو دیکھتے ہوئے انہوں نے اسے فوری طور پر رخصت کرنے کی ٹھانی تھی۔

”مریم بیٹا! یہ ہے تمہارا گھر۔ تمہارا اپنا گھر۔ جہاں تم اپنی مرضی سے جو چاہو کرسکتی ہو۔ اسے جیسے چاہو سنوارو، سجاؤ۔ یہاں تمہیں کوئی کچھ نہیں کہے گا۔ ہم سب تمہارے اپنے ہیں۔ اب تم خود کو کبھی اکیلا مت سمجھنا۔ ممتاز سمیت ہم سب تمہارے ساتھ ہیں۔“ سسرال میں اس کا بہت پرتپاک استقبال کیا گیا تھا۔ بیشمار تھکا دینے والی رسومات کے بعد اس کی ساس نے اسے منہ دکھائی کا تحفہ دیتے ہوئے یہ مان اور اعتماد بھی سونپا تھا۔ پورے گھر کے مالکانہ حقوق بڑے آرام سے اسے تفویض کردیے گئے اور اندھا کیا چاہے، دو آنکھیں۔ مریم کو اور کیا چاہیے تھا بھلا۔ خوبصورت، اسمارٹ، ہینڈسم، ویل ڈریسڈ، خوشبوؤں میں بسا خوابوں کے شہزادوں جیسا ہمسفر۔ واری صدقے جاتی ساس، ناز نخرے اٹھاتی نندیں اور جیٹھانیاں اور دیورانیاں اور بے شمار پیار لٹاتے بے پناہ خوشی کا اظہار کرتے چھوٹے بڑے ہر سائز کے بیشمار بچے اور ان سب پر بھاری ایک خوبصورت، سجا سجایا مالکانہ حقوق سمیت پکا گھر۔ وہ تو واقعی خود کو راجکماری ہی سمجھنے لگی تھی۔ جانے کہاں سے غرور، ناز و ادا، نزاکت اور نخرے اس کی اداؤں میں جھلکنے لگے تھے۔ اس کا بھرم رکھنے کو اس کی دعوت ولیمہ میں بھی وہ سب شریک ہوئے تھے۔

یوں تو شادی سے پہلے ہی اسے اچھی طرح سے سمجھا دیا گیا تھا کہ اب ممتاز خان کا گھر ہی اس کا آخری ٹھکانا تھا۔ اس کے بعد، اس کے لیے کوئی جائے پناہ نہیں۔ کیونکہ وہ ایک بہت ہی مقدس اور شرعی رشتے میں بندھ کر اس گھر کی چوکھٹ پار کرنے جارہی تھی اور اگر وہاں وہ کسی کو دھوکا دے گی، کسی کی جڑیں کاٹنے کی کوشش کرے گی تو لامحالہ نقصان اس کا اپنا ہی ہوگا۔ کیونکہ وہ لوگ تو اس کا فرض ادا کرکے فارغ ہوجانے والے تھے۔ اس امانت سے، جو فرناز کے ذریعے تقدیر نے ان کے حوالے کی تھی۔ اس امانت کو صحیح امانتدار تک پہنچانا ہی ان کا فرض تھا مگر وہ تو شنو تھی۔ کیسے بھلا اتنی آسانی سے ہاتھ آئی حکومت جانے دیتی۔ سو، منگنی اور شادی کے دوران جو چند ہفتے کا وقفہ آیا، اس وقفے کے دوران خاندانی رسموں کے نام پر جو اس کے سسرال والوں نے اپنی خدمتیں کروائی تھیں ان لوگوں سے، یہ اس کا ہی تو نتیجہ تھا کہ اس نے موقع ملتے ہی جانے کیسی چال چلی، کیا اپنی ساس نندوں کے کان میں ڈالا تھا کہ آج وہ سب اسے سب سے زیادہ اکیلی مظلوم اور معصوم سمجھ کر اس کے واری صدقے جارہے تھے۔

☆......☆

”امی جان۔!! مجھے معاف کردیں۔ مجھے لگتا ہے کہ میری ماں کی بددعا مجھے لگ گئی ہے۔ میرا غرور، میری انا، میرا ہنر، میرا فخر سب کے سب مجھ پر ہنس رہے ہیں۔ مجھے سزا مل رہی ہے اماں۔ بہت کڑی سزا۔ مجھے معاف کردو اماں۔ میں نے اپنوں کو دھوکا دیا۔ اپنے ماں باپ کو اپنے بہن بھائیوں کو بھری برادری میں ذلیل و رسوا کرکے رکھ دیا۔ اپنے خوابوں، اپنی خواہشوں کے پیچھے لگ کر اندھا دھند بھاگی اور وہ خواب، وہ خواہش، سراب بن کر میرے آگے ہی آگے دوڑتی چلی جارہی ہیں۔ یہ ان کا ہی عذاب ہے جو میری روح کو دن رات جھیلنا پڑ رہا ہے۔ امی جان، میں تھکنے لگی ہوں اب۔ تھک

گئی ہے میری روح۔ آپ میرے لیے دعا کریں کہ اللہ مجھے معاف کردے۔ وہ میری نہیں سنتا امی۔ وہ ناراض ہے مجھ سے۔ کیونکہ میری ماں ناراض ہے مجھ سے۔ میں رو رو کر معافیاں مانگتی ہوں، مگر مجھے معافی نہیں ملتی۔ مجھے قرار نہیں ملتا امی۔ سکون نہیں ملتا۔“ شادی کے آٹھ سال بعد وہ ایک بار پھر امی کے سامنے بیٹھی ویسے ہی گریہ وزاری کررہی تھی جیسے دس سال قبل ان کے گھر پہلی بار آنے پر کی تھی اس نے لیکن اب میں اور تب میں بہت فرق تھا۔ اب وہ اکیلی نہیں تھی۔ اس کے ساتھ دو ننھی جانیں بھی جڑ چکی تھیں جو اسے روتا دیکھ کر اس سے بھی زیادہ زور و شور سے رو رہی تھیں۔

”مریم۔! یہ کیا کہہ رہی ہو بیٹی۔ میں تم سے ناراض تو نہیں، بس تمہاری حرکتوں کی وجہ سے دل دکھا تھا میرا اور......“

”اور آپ کا دل دکھا کر ہی تو میں اس حال میں پہنچی ہوں امی جان۔ باجی ٹھیک ہی کہتی تھیں۔ مخمل میں ٹاٹ کا پیوند نہیں لگایا جاسکتا۔ میں موری کی اینٹ تھی امی، مجھے چوبارہ راس نہیں آیا۔ ٹھیک ہی کہتی تھیں باجی، کوا ہنس کی چال چلنے کی کوشش کرے تو اپنی بھی بھول جاتا ہے۔ میں بھی ہنس کی چال چلنے نکلی تھی، اپنی چال ڈھال، اوقات سب بھول گئی۔ مگر وقت سب سے بڑا استاد ہے۔ وہ سب کو سب کچھ سکھا دیتا ہے اور اس گزرتے وقت نے مجھے بھی سکھا دیا ہے کہ میری اوقات کیا ہے؟ میری حیثیت کیا ہے؟ سب کھل کر سامنے آگیا میرے۔ امی جان، آپ مجھے معاف کردیں۔ میں سمجھوں گی میری ماں نے بھی مجھے معاف کردیا۔ شاید میرے دل کو سکون آجائے۔!!“ وہ اس وقت اپنے حواسوں میں نہیں لگ رہی تھی۔ حواس تو وہ اپنے اسی وقت کھو بیٹھی تھی جب شادی کے سال بھر بعد ہی اس کی گود میں مہوش آگئی تھی۔ ہو بہو اس کی شکل و صورت، گہرا سانولا رنگ، ویسے ہی نین نقش، جیسے چھوٹی سی شہناز اس کی گود میں آگئی ہو۔ ایک لمحے کو تو وہ تھرا کر ہی رہ گئی۔ اسے ایسے لگا جیسے قدرت نے مہوش کو آئینہ بنا کر اس کی گود میں ڈال دیا ہو۔

اس کے خوابوں کا تاج محل زیادہ عرصہ تک قائم نہیں رہا تھا۔ ظاہر ہے جس عمارت کی بنیاد ہی جھوٹ پر قائم کی گئی ہو، وہ بھلا کتنی دیر تک مضبوطی سے اپنی جگہ پر کھڑی رہ سکتی تھی اور جھوٹ تو دونوں فریقین نے بولا تھا۔ خاندانی لوگوں کے ساتھ رہ کر، ان کی ملازمت کرکے اور بظاہر ان سے اعلیٰ تربیت بھی پانے کے باوجود وہ خاندانی نہیں ہوسکی تھی۔ خون تو اس کی رگوں میں اسی رشید خانہ بدوش کا ہی گردش کررہا تھا جسے اولاد سے زیادہ پیسے سے پیار تھا، اور رہی بنیادی تربیت۔ تو وہ اماں بشیراں کی ہی تھی۔ وہی بنیادی تربیت جو سب سے زیادہ مضبوط اور حقیقی وجود رکھتی ہے۔

دوسری طرف ممتاز اور اس کے گھر والے بھی نون سا دودھ کے دھلے تھے۔ انہوں نے بھی اپنی غرض، اپنے مفاد کی خاطر پیتل پر سونے کا ملمع چڑھا کر پیش کیا تھا۔ یہ تو شادی کے چند ماہ بعد ہی عقدہ کھل گیا تھا کہ ممتاز خان ایک نمبر کا ہڈ حرام اور نکما انسان تھا۔ مزاج میں بگاڑ بھی حد سے زیادہ پایا جاتا تھا۔ ایک نمبر کا ضدی اور ہٹ دھرم تھا اور غصہ تو ہمیشہ ناک کی نوک پر رہتا تھا۔ کبوتر بازی کا شوق بھی پال رکھا تھا اس نے اور

شرطیں لگا کر ریس لگانے، لوڈو، کیرم اور تاش کا بھی شوقین تھا۔ کبھی کبھار شرط جیت بھی جاتا، اور جب جیتتا تو چرس اور افیم کے سوٹے لگا کر خوشی مناتا تھا۔ اس کے جوہر آہستہ آہستہ کھلتے جا رہے تھے۔ ایک کے بعد ایک ہونے والے جان لیوا انکشافات نے مریم کو ادھ موا کر کے رکھ دیا تھا۔ کیونکہ اب وہ واقعی پیچھے مڑ کر نہیں دیکھ سکتی تھی۔ اس کے لیے آگے کنواں، پیچھے کھائی والی سچویشن ہو چکی تھی اور اب اسے ہر طرح کے حالات کے لیے خود کو تیار کرنا ہی تھا کہ پیچھے رہ جانے والوں کو وہ خود بہت پیچھے چھوڑ آئی تھی اور جن ہاتھوں نے اسے سہارا دینے کی کوشش کی تھی، اپنے غرور اور اکڑ میں ان ہاتھوں کو وہ خود ہی جھٹک چکی تھی۔ لہٰذا اب وہ کسی سے کچھ بھی نہیں کہہ سکتی تھی۔ نہ گلہ، نہ شکوہ۔ کیونکہ اس نے اپنے پیروں پر کلہاڑی خود ہی ماری تھی۔

"آپ لوگوں نے میرے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ میرے گھر والوں کے ساتھ دھوکا کیا ہے۔ آپ کا بیٹا ایک نمبر کا آوارہ، ہڈحرام اور نشئی ہے۔ جانتے تھے ناں آپ سب؟ لیکن پھر بھی آپ نے میری زندگی برباد کر دی؟ کیا مل گیا آپ کو میری زندگی تباہ کر کے۔ بتائیں امی، میرا قصور تو بتائیں مجھے۔ کیوں کیا آپ لوگوں نے میرے ساتھ یہ سب؟ کیوں؟"

"دھوکا ہم نے کیا؟ یا دھوکا تم نے اور تمہارے ان منہ بولے ماں باپ نے کیا ہمارے ساتھ۔ ارے، بڑا کہتے تھے، جہیز میں خیار کشا دیں گے۔ بیٹی بنا کر پالا ہے۔ بیٹی کی ہی طرح خیال رکھیں گے۔ لیکن کیا کیا انہوں نے؟ تمہاری بچی کی پیدائش پر کیا دیا انہوں نے؟ نانکی چھک کے نام پر کچھ لیریں، اور پالنا؟ بس، یہ ہی اوقات تھی تمہاری ان کی نگاہوں میں ۔ورنہ اپنی بیٹی کا تو سنا ہے انہوں نے گھر بھر دیا تھا اس کے پہلے بچے پر۔" ممتاز کی بے پروائیوں اور بری عادتوں سے سمجھوتا کرتے کرتے وہ تھک گئی تو اپنی ساس سے گلہ کر بیٹھی۔ ساس کو بیٹے کی حرکتوں کا علم تھا، دیندار بھی تھیں اور بیٹیوں کی ماں بھی۔ اس لیے ممتاز کی شادی کی سرے سے قائل ہی نہ تھیں ۔لیکن یہ تو ممتاز ہی کو شادی کا شوق چڑھا تھا۔ اس نے بھائیوں اور بہنوں کو آگے لگایا، دل لگا کر کام کرنے کی قسمیں، وعدے اور بھرپور یقین دہانیاں کروائیں تو انہیں بھی یقین آ ہی گیا ۔اور یوں ممتاز خان کی شادی کی کوششیں شروع ہوئیں جس کے نتیجے میں مریم ان کے گھر کی بہو بنی تھی۔ وہ دل سے مریم کے ساتھ تھیں۔ اسے سپورٹ بھی کرتی تھیں اور ان کی وجہ سے ہی وہ اب تک سروائیو کر رہی تھی۔ اس کا گلہ سن کر انہوں نے تو سر جھکا لیا، مگر پاس بیٹھی نند اور جیٹھانی کو آگ لگ گئی۔ ان کی طرف سے فوراً جوابی حملہ ہوا تھا۔ مریم کون سا کسی سے دبنے والی تھی۔ اس نے بھی اینٹ کا جواب پتھر سے دیا اور دیکھتے ہی دیکھتے دونوں طرف سے گولہ باری کا آغاز ہو گیا۔ ساس بچاری کبھی اسے چپ کرواتیں، تو کبھی بیٹی کو خاموش رہنے کی تلقین کرتیں لیکن اس وقت دونوں پارٹیاں سخت غصے میں تھیں۔ اس لیے خوب ایک دوسرے کی بخیے ادھیڑے گئے۔ بہت دیر تک یہ معرکہ چلتا رہا، لیکن آخر کار مریم کو ہی میدان چھوڑ کر بھاگنا پڑا ۔لیکن رات کو جب گھر کے مردوں کے سامنے یہ معاملہ رکھا گیا تو ان تینوں کی ایک ساتھ گوشمالی ہوئی۔ انہیں ایک دوسرے سے معافی بھی مانگنا پڑی اور ایک دوسرے کو گلے بھی لگانا پڑا۔ اس کی بیٹی کے پیدا ہونے کی خبر سن کر امی ابو سے رہا نہیں گیا تو وہ اس سے ملنے چلے آئے تھے، اور اس کی بیٹی کو ڈھیروں دعاؤں کے ساتھ بہت سے تحائف بھی دے گئے تھے۔ امی جان نے اسے ایک بڑی رقم اپنی پسند کی شاپنگ کرنے کے لیے بھی دی تھی جسے وہ اپنی عادت کے مطابق سب سے چھپا گئی تھی۔ اس رقم کا اس کے علاوہ صرف اس کی ساس کو علم تھا کیونکہ انہوں نے امی کو اسے پیسے دیتے دیکھ لیا تھا۔ مریم نے بڑی چالاکی سے ممتاز کی عادتوں کا رونا روتے ہوئے ساس سے وعدہ لے لیا تھا کہ وہ اس راز کو راز ہی رکھیں گی اور آیندہ بھی اس کے پاس اگر اسی قسم کی کوئی مالی امداد آئی تو وہ بھی ممتاز سے چھپالی جائے گی۔ ساس بھی بیٹے کی بری عادتوں سے واقف تھیں، اور ان سے تنگ بھی تھیں اس لیے انہوں نے رازداری کا پکا وعدہ کرتے ہوئے اسے ہر طرح سے مطمئن کر دیا تھا۔ ممتاز کا وہی حال تھا، دل کیا تو رکشا چلا لیا، دل نہیں کیا تو اپنے کبوتروں کے ساتھ سارا وقت بتا دیا۔ ان حالات میں ساس صاحبہ کو مریم کی بات میں وزن محسوس ہوا تھا، اسی لیے انہوں اس کی ہر طرح سے مدد کرنے کا فیصلہ کر لیا تھا۔

وقت اس طرح گذرتا گیا اور مہوش دو سال کی ہو گئی۔ مریم نے ممتاز کی عادتیں چھڑوانے کی بہت کوشش کی ۔لیکن ناکام رہی۔ اب اس کی ساس بھی بیمار رہنے لگی تھیں اور اسے اب یہی فکر ستائی رہتی کہ اگر ساس کو کچھ ہو گیا تو اس کا اور اس کی بیٹی کا انجام کیا ہوگا کیونکہ ممتاز سے تو اسے اب کسی قسم کی بھی توقع نہیں رہ گئی تھی۔ اس کی ساری چالاکی، ہوشیاری دم توڑتی دکھائی دے رہی تھی۔ گھر میں اس کا مقام ایسی ہی بہو اور بھابی کا سا تھا، جس کا شوہر ناکارہ اور آوارہ ہو، اور اسے اپنا

اور اپنے بچوں کا پیٹ پالنے کے لیے گھر بھر کی چاکری کرنا پڑے۔ وہ بھی سب کی خدمتیں کرنے پر مجبور تھی۔ نہ چاہتے ہوئے بھی اسے جٹھانیوں، دیورانیوں کے اضافی کام کرنے پڑ جاتے تھے۔ فرناز کے سینٹر میں سیکھے جانے والے ہنر اب اس کے کام آرہے تھے۔ نندوں کے گھروں میں کوئی دعوت ہوتی تو اسے خاص طور پر پہلے ہی بلا لیا جاتا اور اس کے ہاتھوں بنے دعوتی کھانے کھا کر سب واقعی انگلیاں چاٹتے ہی رہ جاتے۔ اسے کبھی کبھار غصہ بھی آجاتا، لیکن پھر ساس کے سمجھانے پر سمجھ جاتی۔

کہتے ہیں کہ مصیبت کبھی اکیلے نہیں آتی۔ ایک بار یہ آپ کے گھر کی راہ دیکھ لے تو پھر ایک کے بعد ایک مصیبتیں آگے پیچھے بھاگی ہی چلی آتی ہیں۔ اس کے ساتھ بھی ایسا ہی ہوا تھا۔ اس گھر میں اس سب سے بڑی ہمدرد اس کی ساس چند روز بیمار رہنے کے بعد انتقال کر گئیں۔ ساس کی میت سامنے دیکھ کر اس کے پیروں تلے سے حقیقتاً زمین کھسکی تھی۔ اسے زور کا چکر آیا اور وہ بیہوش ہو کر زمین پر آ رہی۔ ہوش میں آئی تو ایسا بلک بلک کر روئی کہ وہاں موجود سب لوگوں کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ اس کی نندیں اور جٹھانیاں اس کی حالت کو سمجھ رہی تھیں لیکن کیا کر سکتی تھیں۔ اس کا نصیب اس کے ساتھ۔ اور اس کا نصیب تو ممتاز خان تھا۔ خاندان کا سب سے ناکارہ اور ناکام انسان۔

☆......☆

"دھوکا کیا آپ لوگوں نے میرے ساتھ۔ اتنا بڑا دھوکا۔ آپ بھی تو بیٹیوں والے ہیں بھائی جان۔ کیا آپ اپنی بیٹی کا ہاتھ ایسے آدمی کے ہاتھ میں دینا پسند کریں گے، جسے نہ اپنا کوئی ہوش ہے اور نہ ہی اپنے سے وابستہ رشتوں کا؟"

ساس کے انتقال کے بعد کچھ عرصہ تو سکون سے گزرا تھا ۔لیکن کب تک؟ ممتاز جیسے انسان اپنے آپ کو بدل نہیں سکتے، ان کی عادتیں ان کی فطرت بن جاتی ہیں ۔اور انسان کوشش کر کے عادتوں کو تو بدل سکتا ہے، لیکن فطرت کا بدلنا ناممکن بات ہے۔ اب سب اسے اس کے حال پر چھوڑ چکے تھے، لیکن مریم کیا کرتی؟ کیسے چھوڑ دیتی اسے اس کے حال پر جبکہ وہ تخلیق کے عمل سے دوسری بار گذر رہی تھی۔ اس کے لاکھ نہ چاہنے کے باوجود جس روح نے آنا تھا، وہ آ رہی تھی۔ اس کا مزید امتحان بننے کے لیے۔ اس کی طبیعت ان دنوں بہت خراب تھی، اس پر ممتاز کا کچھ پتا نہیں تھا کہ کہاں غائب ہو چکا تھا۔ وہ پچھلے آٹھ دنوں سے اس کی راہ دیکھ رہی تھی۔ اس کی منت سماجت پر اس کے دیور اور نند کے بیٹے بھی اسے کئی بار ان جگہوں پر دیکھنے جا چکے تھے جہاں وہ اپنے جیسے دوستوں کے ساتھ بیٹھ کر نشہ کیا کرتا تھا ۔لیکن اس کا کہیں کوئی پتا نہیں چل رہا تھا ۔اور جب پتا چلا تو اس کے سر پر جیسے آسمان ہی ٹوٹ پڑا تھا۔ اس کا دیور کاشف اور نند کا بیٹا زبیر نویں دن ممتاز کو کہیں سے پکڑ لائے تھے اور وہ جس حال میں تھا، اس کی حالت دیکھ کر اس کا دماغ ہی الٹ گیا۔

"برباد کر دی میری زندگی آپ لوگوں نے۔ کیا مل گیا، مجھے برباد کر کے آپ لوگوں کو۔ اور کیا مل گیا مجھے بھلا اس بڈھے سے شادی کر کے۔ کیا اسی دن کے لیے چھوڑا تھا میں نے اپنا گھر بار۔ لعنت ہے مجھ پر جو میں آپ لوگوں کے دھوکے میں آ گئی اور لعنت ہے آپ لوگوں پر جنہوں نے مجھ معصوم کو دھوکا دیا۔ اپنے ناکارہ اور کھوٹے سکے کو چلانے کے لیے میرے ارمانوں کا خون کر دیا آپ لوگوں نے۔ کبھی معاف نہیں کروں گی میں آپ سب کو۔ کبھی بھی نہیں!" ممتاز کی حالت نے خود اس کی حالت خراب کر دی تھی۔ بیحد غلیظ، کئی جگہ سے پھٹا ہوا لباس، مٹی اور گرد سے اٹے کھچڑی بال۔ بے ہنگم انداز میں بڑھی، میلی کچیلی داڑھی، پھٹی ہوئی ایڑیاں اور جگہ جگہ سے زخمی ہو رہے گرد آلود ننگے پاؤں۔ نشے کی زیادتی کی وجہ سے سرخ انگارہ بنی آنکھیں اور لڑکھڑاتا ہوا وجود۔ وہ جو پہلے سے ہی بہت پریشان تھی۔ ممتاز کو اس طرح بھائی اور بھانجے کے سہارے جھولتا، اول فول بکتا دیکھ کر اپنے آپ پر سے قابو کھو بیٹھی اور بری طرح سے روتے ہوئے سب کو لعن طعن کرنے لگی۔ اس نے رو رو کر آسمان سر پر اٹھا لیا۔ مگر وہاں پرواہ کسے تھی۔ یہ تو ان سب کے لیے معمول کی بات تھی۔ سو، اسے اس کے حال پر چھوڑ، ممتاز کے بھائیوں نے اسے اچھی طرح نہلا دھلا کر صاف ستھرا کیا اور نیند کی دوا دے کر سلا دیا ۔اور مریم اپنی بے قدری پر اسی طرح روتی دھوتی رہ گئی۔

اس روز اس نے سارا دن خوب ماتم منایا۔ اپنے ارمانوں کے لٹ جانے کا ماتم۔ اپنے خوابوں کے اجڑ جانے کا ماتم۔ اپنی خواہشوں کے رائیگاں جانے کا ماتم۔ اسے رہ رہ کر گلفام یاد آ رہا تھا۔ وہ ممتاز سے تو قدرے بہتر اور جوان تھا۔ خوبصورت نہیں تھا تو کیا، خوب سیرت تو تھا اور پھر وہ کون سا حور پری تھی۔ مگر بات تو ساری نیتوں کی ہی ہوتی ہے ناں اور جیسی اس کی نیت تھی، اسے مراد بھی ویسی ہی ملی۔ نوری کی باتیں اسے علیحدہ خون رلا رہی تھیں۔ اس کا غرور، اس کا طنطنہ، اس کی انا اور خود پسندی دور کھڑی اس کی حالت پر ٹھٹھہ

لگا رہی تھی۔ یہ قدرت کی بے آواز لاٹھی تھی۔ جو اسے اس مقام پر اس طرح آ کر لگی تھی کہ وہ منہ کے بل زمین پر جا گری تھی۔ وہ مٹی کا ڈھیر ہوئی جا رہی تھی۔ اس کا مٹی میں مل جانے کو دل چاہ رہا تھا۔ مگر مجبور تھی۔ اس کی اولاد مجبوری کی بیڑیاں بن کر اس کے پیروں سے بندھ چکی تھی۔ اور یہی بات اس کے سسرال والے بھی بہت اچھی طرح سے جانتے تھے کہ عورت صرف تب تک ہی عورت رہتی ہے جب تک وہ ماں نہیں بن جاتی۔ ماں بنتے ہی عورت ختم ہو جاتی ہے اور اس کی جگہ ماں لے لیتی ہے، صرف ماں۔ اور مریم بھی اب ماں تھی۔ صرف ماں۔ اور اپنی اولاد کے بہتر مستقبل کے لیے اسے یہ سمجھوتے کی کڑوی گولی نگلنا ہی پڑی تھی۔

☆......☆

زندگی جہد مسلسل کا ہی نام ہے اور اس جدو جہد میں بہت سے اتار چڑھاؤ بھی آتے ہیں اور بہت سے اندھے موڑ بھی۔ کہتے ہیں ماضی راکھ کا ڈھیر ہوتا ہے اور مستقبل ان دیکھا اندھیرا۔ صرف حال ہی روشن اور واضح ہوتا ہے۔ جن کا حال اچھا ہو، ان کا ماضی اور مستقبل خود بخود ہی اچھا ہو جاتا ہے اور جو لوگ ماضی کی راکھ کریدتے رہتے ہیں، مستقبل کے اندھے اندھیروں میں خود کو ہولاتے رہتے ہیں، وہ اپنے موجودہ حال سے کبھی بھی انصاف نہیں کر پاتے۔ اور مریم بھی یہی کر رہی تھی۔ ماضی کی راکھ میں بجھتی چنگاریوں سے اپنا جگر جلاتی تو کبھی ان دیکھے مستقبل کے کچے پکے رنگوں سے اپنی بچیوں کے روشن مستقبل کی تابناک تصویر بنانے کی کوشش کرتی مگر وہ اپنے حال کو بدحال ہونے روکنے کے لیے عملاً کچھ بھی نہیں کر پا رہی تھی اور جب حد سے زیادہ پریشان اور مایوس ہو گئی تو بے اختیار امی کے پاس چلی آئی تھی۔

"دیکھو مریم! جو کچھ ہوا، اسے بھول جاؤ۔ تمہاری ماں جہاں کہیں بھی ہوں گی، یقیناً تمہارے لیے ضرور دعاگو ہوں گی۔ سب کے سامنے چاہے تمہیں بھی کتنا بُرا بھلا کہہ لیں، مگر تنہائی میں ضرور تمہیں یاد کرتی ہوں گی۔ جب بھی دعا کے لیے ہاتھ اٹھاتی ہوں گی، ان کا دل ضرور تمہاری خیر و عافیت کے لیے دعائیں کرتا ہوگا۔ تم خود بھی تو ماں ہو، کیا تم اپنی بیٹیوں کو بددعا دے سکتی ہو؟ کیا تم ان کے لیے برا سوچ سکتی ہو؟ نہیں ناں۔ تو پھر یقین رکھو بیٹی۔ تمہاری ماں نے بھی تمہارے لیے کبھی برا نہیں چاہا ہوگا۔ نہ تب، اور نہ ہی اب۔ اس لیے اپنے دل سے ماضی کا ملال جانے دو اور اب آگے کی سوچو۔ اپنی بچیوں کے اچھے مستقبل کے لیے، ان کی تعلیم و تربیت کے لیے اب تمہیں ہی ہمت کرنی ہے۔ کسی اور سے توقع رکھنا چھوڑ دو کیونکہ توقع کا پیالہ ہمیشہ ٹھوکروں میں ہی رہتا ہے بیٹی۔ قسمت سے گلہ مت کرو۔ جو کچھ ہوا، اسے اب بدلا تو نہیں جا سکتا مگر اب جو رہا ہے اسے تم خود بدل سکتی ہو۔" امی اپنی ازلی نرمی اور محبت سے اس کے ٹوٹے دل پر محبت کے پھاہے رکھ رہی تھیں۔

"اب اپنے دل و دماغ میں کسی منفی خیال کو نہ آنے دینا۔ اور بیٹی، تم نے یہ کیسے کہہ دیا کہ اللہ تمہاری نہیں سنتا۔ اللہ تو ہماری شہ رگ سے بھی زیادہ قریب ہے۔ وہ سب کی سنتا ہے بیٹی۔ اس کے گھر دیر ضرور ہو سکتی ہے، اندھیر نہیں۔ تم بھی اللہ سے اچھی امید رکھو۔ اسی سے مدد مانگو۔ تم سچے دل سے توبہ کرو گی تو وہ تمہاری توبہ ضرور قبول کرے گا۔ وہ ضرور تمہیں معاف کر دے گا۔ پورے خلوص اور دل کی سچائی کے ساتھ اس کی درگاہ پر سر جھکا کر تو دیکھو بیٹی۔ تم اچھی نیت کے ساتھ اس کی مدد مانگو، وہ تمہاری جھولی نہ بھر دے تو پھر کہنا۔ جاؤ بیٹی، اللہ سے راستہ اور راہنمائی طلب کرو۔ میرا ایمان ہے کہ وہ تمہیں ہرگز مایوس نہیں کرے گا انشاءاللہ۔" امی جان نے اس کے بہتے اشک صاف کر کے اس کے خالی ہاتھوں میں امید کے نئے جگنو تھما دیے تھے جن سے نکلنے والی روشنی میں مریم کو اب اپنی زندگی کا باقی ماندہ سفر طے کرنا تھا کیونکہ اس کا زادِ راہ، اب صرف اس کی بیٹیاں ہی تو تھیں، جنہیں اس نے دوسری شہناز اور شہناز سے مریم بننے سے روکنا تھا۔ کس طرح؟ فی الحال یہ اسے نہیں پتا تھا۔ مگر اب اسے اللہ رب العزت کی ذات سے پوری امید ہو چلی تھی کہ وہ اس کی غلطیوں، اس کے گناہوں کی سزا اس کی معصوم بچیوں کو نہیں دے گا اور اس کے لیے اس نے اپنے ہنر کو آزماتے ہوئے محنت کا سہارا لینے کا ارادہ کیا تھا۔ امی جان اور ابو جان ایک بار پھر اس کے ساتھ تھے۔ ان کی کوششوں کی وجہ سے مریم نے گھر میں ہی چھوٹے پیمانے پر کیٹرنگ کا کام شروع کر دیا تھا۔ عاقل بھائی اور عادل بھائی نے اسے کئی کسٹمرز لگوا دیے تھے جن کے لفن تیار کر کے وہ لنچ ٹائم میں آفسز اور شاپس پر بھیجنے لگی تھی اور اس کے لیے عاقل بھائی نے ہی سارا بندوبست کروایا تھا۔

مریم نے اب اللہ کی رسی کو مضبوطی سے تھام لیا تھا۔ وہ جان چکی تھی کہ خوابوں اور خواہشوں کے سراب کے پیچھے بھاگنے سے کچھ حاصل نہیں ہوتا۔ اس نے حقیقت کو تسلیم کر لیا تھا اور اب اسے یہی حقیقت اپنی بچیوں کو بھی سمجھانی تھی۔

چاروں طرف گھپ اندھیرے اور سناٹے کا راج تھا۔ پورا گھر سنسان پڑا تھا پتا نہیں تمام گھر والے کہاں چلے گئے تھے؟ اس نے چھپنے کے لیے جگہ تلاشی مگر کہیں نہ مل پائی۔ اب اسے آہٹیں اور آوازیں بھی سنائی دینے لگی تھیں۔ وہ لوگ اسی کو تلاش کر رہے تھے۔ اللہ میں کہاں جائے پناہ تلاش کروں؟ اس نے خود کلامی کی اسے اپنی جان و عزت بچانے کی فکر تھی۔ وہ بغیر کچھ سوچے سمجھے اپنے ہی ویران و سنسان اندھیرے میں ڈوبے گھر سے خود کو بچانے کے لیے بھاگی .... کتنی ناسمجھ تھی وہ، جسے اپنے گھر میں پناہ نہ ملی اسے بھلا اور کہاں پناہ ملنی تھی!

اندھا دھند بھاگنے کی کوشش میں وہ حال سے بے حال ہو گئی تھی۔ پتا نہیں ہر سو اتنا اندھیرا اور یاسیت کیوں چھائی ہوئی تھی۔ کچھ گھروں میں پناہ حاصل کرنے کے لیے اس نے دروازوں کو دھکیلا مگر وہ بند تھے۔ اس نے پیچھے مڑ کے دیکھا۔ وہ چار پانچ دہشت ناک قسم کے مرد تھے جو اس کا پیچھا کر رہے تھے، پتا نہیں کیوں؟ ہانپتے ہوئے وہ اندھی گلی

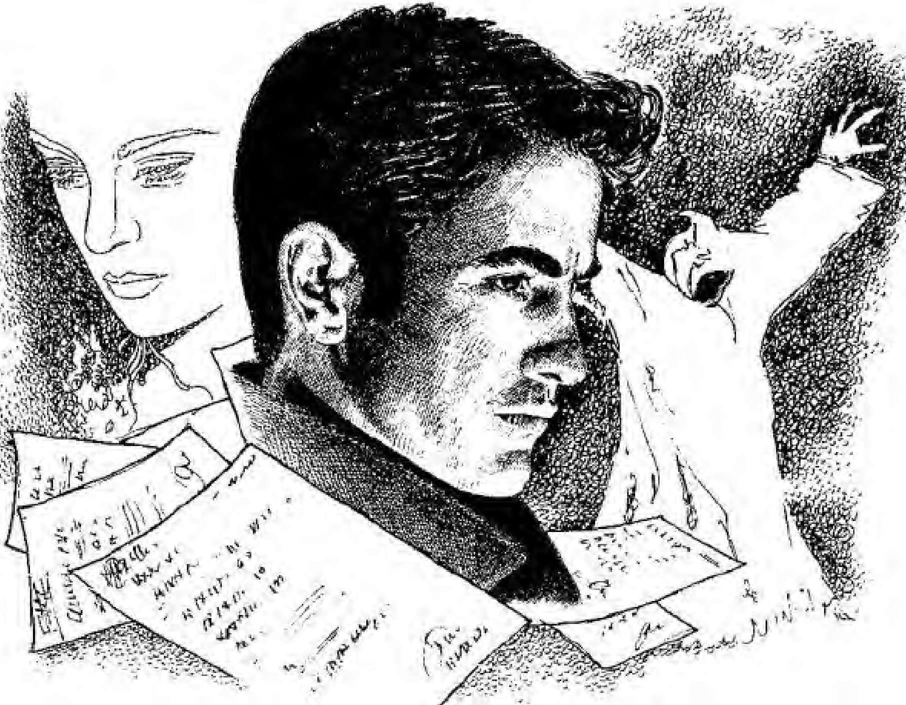
ہانٹیڈ

محترمہ عذرا رسول

سلام تہنیت

ایک عجیب و غریب سچ بیانی ارسال کررہی ہوں۔ واقعات ایسے ہیں کہ انہیں عقل کی کسوٹی پر پرکھا نہیں جاسکتا لیکن اسے جھٹلایا بھی نہیں جاسکتا۔ اگر پسند آجائے تو کسی نزدیکی اشاعت میں شامل کرلیں۔

تنزیلہ احمد
(اوکاڑہ)



میں داخل ہوئی کہ شاید وہاں اسے کوئی مدد مل جائے۔
اندھیرے میں موڑ مڑتے ہی اس کی چیخیں نکل گئیں۔ خوب موٹی موٹی کالی سیاہ بھینسیں اس کے راستے میں حائل تھیں۔ آہٹ پر کچھ بھینسیں اس کی طرف متوجہ ہوگئیں اور پھر اس کی جانب دوڑ پڑیں۔
سامنے بھینسیں اور بائیں جانب انجان مرد تھے۔ یا اللہ میں کہاں جاؤں؟ اس کی ٹانگیں جواب دے گئی تھیں۔ بے بس ہوکر وہ وہیں ڈھے گئی اور آنکھیں بند کرلیں۔ سب اس پر جھپٹنے ہی والے تھے کہ آنکھ کھل گئی اور وہ اٹھ بیٹھی۔ کمرے میں اے سی کی ٹھنڈک کے باوجود وہ پسینے میں شرابور تھی اور دل کی تیز دھڑکن اس کے زندہ ہونے کا ثبوت تھا۔ خدایا پھر وہی خواب! کون کہہ سکتا تھا کہ جواں سال پڑھی لکھی بظاہر بہادر نظر آنے والی وہ لڑکی ڈراؤنے خوابوں سے سہم کر جاگ جاتی ہے۔
ہاتھ بڑھا کر اس نے ساتھ لیٹی ماں کو محسوس کیا۔ دل میں سکون کی لہر اتری۔ دوسرا ہاتھ بڑھا کر اس نے موبائل اٹھایا اور ٹائم دیکھنے کی غرض سے اسکرین روشن کی۔ تین بج کے پندرہ منٹ ہوئے تھے۔ موبائل رکھ کر اس نے بے اختیار سر ہاتھوں میں تھام لیا۔ یہ بھی شاید کوئی اتفاق ہی تھا کہ وہ جب بھی ڈراؤنے خواب سے ڈر کر جاگتی تو ٹائم تین سے ساڑھے تین کے درمیان کا ہوتا تھا۔ اس نے جھرجھری لی اور کسی چھوٹے بچے کی طرح خوفزدہ ہوکر ماں میں سمانے کی کوشش کی۔
ماں کسمسائی۔ ”کیا مسئلہ ہے تانی؟“
”نہیں امی۔ آپ سوئیں بس میرے ساتھ ہی رہنا دور نہ ہونا۔“
نیند اس کی آنکھوں سے کوسوں دور تھی کئی سال بیت گئے تھے انہیں وہ پرانا گھر چھوڑے ہوئے مگر آج بھی وہی گھر، گلیاں اور ویرانی اس کے خوابوں میں شامل تھی۔ بچپن کی تلخ اور ڈراؤنی یادوں نے اسے پھر سے گھیر لیا تھا!

☆......☆

مختلف جزوئیات کے ساتھ وہ جو بھی خواب دیکھتی تھی اس میں ایک چیز کامن ہوتی اور وہ تھا پرانا ویران گھر، گلی کوچے اور مختلف شکلوں کے جانور۔ کبھی کتے، کبھی گائے بھینسیں اور کبھی مختلف رنگوں اور سائز کے سانپ۔ دو منہ والے، اڑنے اور رینگنے والے سانپ اس نے اصل زندگی میں نہیں بلکہ خوابوں میں بہت دیکھے تھے۔ کبھی وہ دروازے سے اندر داخل ہونے کی کوشش کرتے تو کبھی گھر کے مختلف حصوں سے نمودار ہوتے۔ وہ چھوٹی تھی جب اس کا باپ فوت ہوا مگر پھر بھی اسے اچھی طرح یاد تھا کہ جس مہینے اس کے باپ کی موت ہوئی وہ پورا مہینا اس نے خوابوں میں سانپ ہی سانپ دیکھے تھے۔
تانیہ کی زندگی عجیب وغریب ہولناک واقعات سے بھری پڑی تھی۔ اس کا سارا بچپن ڈر اور خوف کا آسیب کھا گیا تھا۔ اسے ٹھیک سے یاد بھی نہیں تھا کہ ڈراؤنے خوابوں کا سلسلہ کب شروع ہوا تھا۔ جب سے اس نے ہوش سنبھالا تھا پچھلے کمرے سے خوف کھاتی تھی۔ چھوٹا سا کمرا۔ عین دیوار کے ساتھ بچھی دو چارپائیاں۔ سامنے والی دیوار کے ساتھ کھڑی اس کے باپ کی موٹر سائیکل اور ساتھ ہی باہر کا دروازہ۔ اس نے اپنے سارے بچپن ایک ہی قسم کا خواب دیکھا تھا، سلسلہ وار خواب۔ جہاں سے سلسلہ ٹوٹتا اگلے دن وہیں سے شروع ہوجاتا۔
دیوار کے ساتھ لگی اس کے بابا کی موٹر سائیکل اور موٹر سائیکل کے اگلے پہیے پہ سوار مکروہ شکل والی بوڑھی چڑیل۔ کبھی وہ چڑیل اپنے ہاتھ میں پکڑے لمبے ڈنڈے سے اسے مارنے کی کوشش کرتی تو کبھی اسے اپنے پاس بلاتی۔ حیرت کی بات یہ تھی کہ وہ بوڑھی چڑیل کبھی اس کے پاس خود نہیں آئی تھی۔ ایک بار اس نے اپنی ماں سے خواب کے متعلق ذکر کیا تھا۔ تو ماں نے جواب دیا تھا کہ ڈراؤنی کہانیاں نہ پڑھا کرو اور نہ ہی ٹی وی پہ کوئی ڈراؤنا پروگرام دیکھا کرو۔ وہی چیزیں ذہن پہ سوار ہوتی ہیں انہی کے پھر خواب آتے ہیں۔“
اس نے ڈراؤنی کہانیاں یاد کرنے کی کوشش کیں مگر ایسا کچھ تو اس نے کبھی پڑھا ہی نہیں تھا!
وہ نو سال کی تھی جب بوڑھی چڑیل والے خوابوں کا سلسلہ خودبخود ختم ہوگیا تھا اس کے باپ کی اچانک موت کے ساتھ ہی!

☆......☆

ان کا بھرا پُرا گھر تھا۔ تانی، چھوٹی، ان کے ماں باپ، دادی، پھپھو سب ساتھ رہتے تھے۔ پھپھو کی شادی ہوئی تو وہ سسرال چلی گئیں پھر ابا کا انتقال ہوا تو دادی ٹوٹ کر رہ گئیں ان کو جوان بیٹے کی موت کا غم اندر ہی اندر کھا گیا۔ اگلے چند برسوں میں وہ بھی مرحوم بیٹے کے پاس چلی گئیں۔
آہستہ آہستہ گھر سنسان ہوتا چلا گیا اور اس کے ڈر

میں اضافہ ہوتا گیا۔ اب بس وہ، اس کی ماں، چھوٹی بہن اور انوکھی بلی اکیلے رہ گئے تھے۔
انہیں نہیں معلوم کہ وہ بلی ان کے گھر کہاں سے آئی تھی مگر وہ وہیں رہتی تھی۔ سال میں دو بار بچے بھی دیتی مگر کوئی نہ کوئی بلا آکر موقع دیکھتے ہی اس کے بچے ایک ایک کرکے مار دیتا تھا۔ انہوں نے بلی کے بچوں کو بچانے کی بہت کوشش کی تھی مگر ایک ایک کرکے بچے مرجاتے تھے۔ ہر بچے کے مرنے پہ بلی اتنا واویلا کرتی، اتنا روتی کہ دل دہل جاتا۔ تانی کو اس بلی کے واویلا کرنے کی آوازیں انتہائی کوفت میں مبتلا کرتی تھیں۔ بلی کی عجیب عادت یہ تھی کہ وہ چھپکلیاں کھاتی تھی۔ دیکھنے اور سننے والے حیران رہ جاتے۔ چھپکلی کو دیکھ کر بلی پتا نہیں کہاں سے جھپٹتی اور اتنی اونچی چھلانگ لگاتی کہ ایک ہی جست میں چھت تک پہنچ جاتی اور چھپکلی کھا کر ہی دم لیتی۔

☆......☆

سردیوں کا موسم تھا اور رمضان المبارک کا بابرکت مہینا تھا۔
”جلدی آجاؤ سحری کا ٹائم ہورہا ہے۔“ ماں نے انہیں اٹھایا تھا۔ وہ فوراً اٹھ گئی مگر اپنی جگہ سے ہل نہیں پائی۔ درد کی تیز لہر اس کی گردن کے دائیں جانب اٹھی تھی۔ دایاں حصہ جیسے کسی نے جکڑ رکھا تھا، وہ گردن ہلانے سے بھی قاصر تھی۔ چھوٹی بہن ابھی تک سو رہی تھی اسے بار بار جگانا پڑتا تھا۔ ساتھ سوئی بہن کو اس نے بازو سے ہلایا۔
”کیا ہے؟“ وہ کسمسائی۔
”اٹھ جاؤ امی اٹھا کے گئی ہیں، سحری کا وقت گزر رہا ہے۔“
وہ بمشکل اٹھی تھی۔ ڈائننگ ٹیبل تک بمشکل پہنچی تھی مگر نوالہ منہ میں ڈالتے ہی اسے احساس ہوا کہ گردن کی تکلیف کے باعث وہ ٹھیک سے کھا بھی نہیں سکتی ہے۔
”امی میری گردن نہیں ہل رہی، اکڑی پڑی ہے، بہت تکلیف ہے۔“ تانی بمشکل بولی۔
”کیوں رات تک تو ٹھیک تھی۔ الٹے سیدھے طریقے سے لیٹی رہی ہوگی۔ نسیں چڑھ گئی ہوں گی، خود ہی ٹھیک ہوجائے گی۔“ اماں نے نوالہ منہ میں رکھتے ہوئے سرسری انداز سے کہا۔
تکلیف سے اس کی آنکھیں آنسوؤں سے بھر گئیں۔
”اوہو، اس میں رونے کی کیا بات ہے۔ نہیں کھائی جارہی سحری تو نہ رکھو روزہ۔ جاؤ جاکے لیٹ جاؤ۔“ امی کے کہنے پہ وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ آنسو پیتے اور شدید تکلیف برداشت کرتے ہوئے اسے بے اختیار اپنے باپ کی یاد آئی تھی، جو اس کی ذرا سی تکلیف سے بے چین ہوجاتے تھے۔
سارا دن تانی اوندھے منہ پڑی رہی تھی۔ ماں نے اسے پین کلر دی مگر درد کم ہونے کی بجائے اور زور پکڑ گیا تھا۔ شام ڈھلے اس کے ماموں آئے اور وہ اسے دیکھ کے حیران رہ گئے۔ ستا ہوا پیلا چہرہ اور اندر کو دھنسی ہوئی آنکھیں۔
”کیا حالت ہے بچی کی؟“
”پتا نہیں اسے کیا ہوجاتا ہے ایک دم۔ رات سے گردن اکڑی ہوئی ہے۔ کچھ کھا پی بھی نہیں رہی۔ کہتی ہے نگلا نہیں جاتا۔ اب کھائے پیے تو ہی طاقت آئے گی نا۔“
”کوئی دوائی دی ہے؟“ ماموں نے اس کے سر پہ ہاتھ پھیرتے ہوئے پوچھا۔ دی تو ہے پر کہہ رہی تھی کہ تکلیف اور بڑھ گئی ہے۔“
”یہ کیا بات ہوئی۔“ ماموں کی آنکھوں میں تشویش تھی۔ وہ نمازی پرہیزگار تھے۔ اس وقت بھی ان کے ہاتھ میں تسبیح تھی۔ انہوں نے تسبیح پہ کچھ پڑھنا شروع کیا۔ جوں جوں وہ اس پر پھونکتے جاتے اسے سکون ملتا جاتا۔ انہوں نے اسے پانی کا گلاس دم کرکے پینے کے لیے دیا تھا۔ پانی پینے کے کچھ ہی دیر بعد اس میں زندگی لوٹنا شروع ہوگئی تھی۔ رات تک وہ بالکل نارمل تھی۔ گردن کا درد اور جکڑن یوں غائب ہوئی تھی جیسے کبھی تھی ہی نہیں۔

☆......☆

اسکول سے واپس آکر کھانا کھا کر اس کا آرام کرنے کو دل چاہتا تھا مگر امی عصر اور مغرب کے درمیان سونے سے منع کرتی تھیں۔ ماں چونکہ سرکاری اسکول میں ٹیچر تھیں اس لیے وہ کھانا اسکول سے آکر ہی بناتی تھیں۔ وہی سالن اگلے دن دوپہر کے کھانے میں بھی کھایا جاتا۔ پورا گھر خاموشی کی چادر میں لپٹا ہوا تھا۔ کمرے سے نکل کر تانی نے باہر جھانکا۔ برآمدے میں مٹی کے تیل کا چولہا رکھے ماں سالن بنانے کی تیاری میں تھیں پاس ہی چھوٹی بہن کاپی کھولے شاید ہوم ورک کر رہی تھی۔ چھوٹی پڑھائی میں تھوڑی بے پروا تھی اور لکھتی بھی بہت آہستہ آہستہ تھی اسی لیے ماں اسے اپنی نگرانی میں ہوم ورک کرایا کرتی تھیں۔ جائزہ لے کر وہ دبے پاؤں بیڈ پہ آچڑھی اور سونے کے ارادے

سے لیٹ گئی مگر نیند اسے نہیں آنے والی تھی۔

ابھی لیٹے تھوڑی دیر ہی گزری تھی جب اسے چھن چھن کی آواز سنائی دی۔ وہ نیند میں نہیں تھی نہ ہی کوئی خواب دیکھ رہی تھی مگر پھر بھی اس کے حواس اس کے کنٹرول میں نہیں تھے۔ دل نے کسی انہونی سے خبردار کیا۔

اس نے اٹھنے کی کوشش کی مگر تمام اعضا ساتھ چھوڑ گئے تھے۔ بس کان سن رہے تھے، آنکھیں دیکھ رہی تھیں اور دل دھڑک رہا تھا۔ زندہ لاش کی طرح لیٹے رہنے کے سوا اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چھوٹی نے شاید کوئی غلطی کی تھی۔ ماں نے اسے ڈانٹا تھا۔ تمام آوازیں اس کے کان میں پڑی تھیں تبھی چھن چھن کی آواز تیز ہو گئی تھی۔ جیسے کسی نے پازیبیں پہن رکھی تھیں اور چلتی ہوئی اسی کی طرف بڑھ رہی تھی۔ وہ اپنی ماں کی آواز سن رہی تھی مگر انہیں مدد کے لیے پکار نہیں سکتی تھی۔

بے بسی کے احساس سے اس کی آنکھیں بھر گئیں۔

اس نے آنکھیں زور سے میچ لیں اور دل میں آیت الکرسی پڑھنی شروع کر دی کہ اور کوئی چارہ نہیں تھا۔ چھن چھن چھن، آواز بہت پاس آ گئی تھی اور دل کی دھڑکن بھی اتنی ہی تیز ہو گئی تھی مگر وہ رکی نہیں اتنی ہی شدت سے دل میں آیت الکرسی پڑھنے لگی..... اس وقت اسے ایسا لگ رہا تھا جیسے کسی غیر مرئی وجود کی گرفت میں آ گئی ہے اور کمرے سے عین باہر برآمدے میں بیٹھے اس کے اپنوں کو خبر بھی نہیں تھی۔

شاید یہ آیت الکرسی کا ہی معجزہ تھا کہ کچھ دیر بعد اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ وہ اپنے ہاتھ کو جنبش دے پائی اور آنکھیں کھول دیں۔ کمرے میں وہ اکیلی تھی سب کچھ اپنی جگہ پر ہی تھا۔ اسے آزاد کر دیا گیا تھا۔ حواسوں میں واپس لوٹتے ہی وہ برآمدے کی طرف بھاگی تھی۔ تانیہ کے ساتھ ایسا پہلی بار ہوا تھا مگر یہ تسلسل سے ہونے والا ہے یہ اس کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا۔ ماں سے کچھ بھی کہنا بے کار تھا۔ اسے خود ہی سب کچھ سہنا تھا۔ اگلے کئی دنوں تک وہ عصر کے بعد سو نہیں پائی تھی یہ سوچ کر کہ کہیں پھر سے ایسا نہ ہو جائے۔

☆......☆

اس دن کے بعد سے گھر میں عجیب وغریب کھیل شروع ہو گیا۔ کوئی بھی ضروری چیز وہاں نہیں ملتی تھی جہاں رکھی ہوتی اور جب سب ڈھونڈ ڈھونڈ کے تھک جاتے تھے تو وہ چیز وہیں سے نظر آ.... جاتی جہاں رکھی گئی تھی۔

جیسے تیسے وقت گزرتا گیا۔ تانیہ اب کالج اسٹوڈنٹ تھی۔ کالج سے واپسی دوپہر میں ہوتی تھی۔ بس اسٹاپ پہ اتارتی تھی اور اسٹاپ سے پیدل چل کر گھر جانا بھری دوپہر میں تانی کو کسی عذاب سے کم نہیں لگتا تھا۔ سر پہ چلچلاتا سورج، دائیں طرف نہر، بائیں طرف بوسیدہ قبروں سے بھرا ہوا قبرستان اور آس پاس سے شاذ و نادر گزرتا ہوا کوئی ذی روح۔

اسٹاپ پہ اتر کے اس نے قبرستان کی طرف سرسری نگاہ ڈالی اور سیدھ میں چلنا شروع کر دیا۔ اپنے دھیان میں چلتے اسے اپنے پیچھے قدموں کی آواز سنائی دی۔ شاید کوئی پیچھے آ رہا تھا۔ وہ دیکھنے کے لیے پلٹی اور دھک سے رہ گئی۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ اس کے رکنے اور پلٹنے پر قدموں کی آواز بھی رک گئی تھی۔

"پاگل، امی ٹھیک کہتی ہیں تم بہت وہم کرتی ہو۔" دماغ نے ڈانٹا۔ "تمہارے اپنے ہی قدموں کی آواز ہو گی۔" گہری سانس خارج کرتے ہوئے اس نے دوبارہ چلنا شروع کر دیا۔ ٹھک ٹھک قدموں کی آواز پھر سے آنا شروع ہو گئی تھی۔ اس نے پروا نہیں کی۔ چند قدم چل کے وہ پھر رک گئی اور حیرانی سے اپنے پیروں کو دیکھا۔ اس کے پیروں میں جوگرز تھے اور مٹی کی زمین پہ چلنے سے جوگرز ٹھک ٹھک کی آواز پیدا نہیں کرتے۔ اسے خوف سا محسوس ہوا، دل کی دھڑکن اچانک بڑھ گئی تھی، کیونکہ آواز پھر سے سنائی دینے لگی تھی۔

وہ یکدم پلٹی مگر پہلے کی طرح اسے اب بھی کوئی دکھائی نہیں آیا تھا۔ اسے جو بھی کوئی سن رہا تھا وہ انسان نہیں تھا۔ گھر ابھی دور تھا اور اسے چلتے جانا تھا۔ بنا پیچھے دیکھے وہ تیز قدموں سے چلنے لگی۔ پیچھے آتے قدموں کی آواز بھی تیز ہو گئی تھی۔ قبرستان والا موڑ مڑتے ہی سامنے کالونی کے کوارٹرز نظر آنے شروع ہو گئے تھے۔

آبادی شروع ہوتے ہی پیچھا کرتے قدموں کی آواز تھم گئی تھی۔ دل میں سکون کی لہر اتری۔ پُرسکون ہو کے اس نے اپنے گھر کی طرف قدم تیز کر دیے تھے۔

اگلے چند دن تک یہ سلسلہ چلتا رہا تھا۔ اب وہ اسٹاپ سے اترتے ہی چلنے کی بجائے دوڑ لگا دیتی اس بات سے یکسر بے نیاز کہ کوئی بندہ دیکھے گا تو کیا کہے گا۔ خوف کا احساس ہر احساس پہ حاوی ہو جاتا ہے۔ کوئی جن یا چڑیل اس کا پیچھا کر رہا تھا اسے خوف زدہ کر رہا تھا، اس احساس

نے باقی تمام احساس بیک گراؤنڈ میں ڈال دیے تھے۔

"امی مجھے لگتا ہے جیسے کوئی میرے پیچھے ہے جب میں کالج سے واپس آ رہی ہوتی ہوں۔" ہمت کر کے اس نے ماں سے بات کی تھی۔

ماں چونکی۔ "کیا مطلب۔ کوئی لڑکا؟" ان کے ذہن میں آیا خیال زبان پہ آیا تھا۔

"نہیں امی۔ پیچھے کوئی بھی نہیں ہوتا مگر قدموں کی آوازیں آتی ہیں۔ مڑ کے دیکھو تو کوئی نظر نہیں آتا۔"

"اوہ اچھا۔" انہوں نے سکون کی سانس خارج کی۔ "میں سمجھی کوئی آوارہ پیچھے پڑ گیا ہے۔ خیر کوئی نہیں تمہارا وہم ہو گا۔ آیت الکرسی پڑھ کر پھونک لیا کرو۔ کچھ نہیں ہوتا۔" سرسری انداز میں کہہ کر وہ پھر سے کام میں لگ گئی تھیں۔

"امی نہیں سمجھیں گی کبھی۔" بھاری دل لیے وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔

☆......☆

پڑھائی ختم کر کے اس نے کتابیں سمیٹیں اور برآمدے میں بچھی چارپائی پہ ہی دھر دیں۔ عشا کی اذانیں ہونے لگی تھیں۔ "ہم ذرا خالہ کی طرف جا رہے ہیں تم نے جانا ہے؟" امی نے پوچھا۔

"خالہ کا گھر پاس ہی تھا اور دونوں گھروں کا بہت ملنا جلنا تھا۔ دکھ سکھ کے ساتھی تھے۔"

"نہیں آپ جائیں۔ مجھے کام ہے۔" کافی دنوں سے وہ سوچ رہی تھی کہ اس کے آئل پینٹ سوکھ رہے ہیں ان کا کیا کروں اور بیٹھے بٹھائے اس کے ذہن میں آئیڈیا آ گیا تھا۔ کچن کی کھڑکی پر باہر کی طرف چند روز قبل جالی لگوائی گئی تھی۔ کیوں نہ لکڑی کا فریم ہی پینٹ کر دوں۔ ادھر امی اور بہن گھر سے نکلی تھیں ادھر وہ چیزیں سنبھالے پینٹ کرنے پہنچ گئی تھی۔

پورے گھر میں وہ اکیلی تھی۔ کمرے میں ٹی وی چلا کے چھوڑ آئی تھی تاکہ آواز آتی رہے اور وہ خود کو اکیلا محسوس نہ کرے۔ پتا نہیں پینٹ کرتے ہوئے کتنی دیر گزری تھی جب اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اسے اپنا جسم ٹھنڈا پڑتا اور سن ہوتا محسوس ہوا۔ وہ اکیلی نہیں تھی کوئی ان دیکھا وجود اس کے پیچھے کھڑا تھا۔ عین اس کے کندھے کے پاس۔ پینٹ کرتے ہاتھوں میں لرزش ہوئی۔ وہ پیچھے مڑ کر نہیں دیکھنا چاہتی تھی۔ جو بھی تھا اسے محسوس کیا جا سکتا تھا دیکھا نہیں۔ ڈوبتے دل کو سنبھالتے ہوئے اس نے خود کو کوسا کہ کیوں اس نے گھر پہ اکیلے رہنے کا فیصلہ کیا۔

ٹی وی کی آواز جیسے بیک گراؤنڈ میں چلی گئی تھی۔ ہر طرف عجیب سی خاموشی چھا گئی تھی اس کے حواسوں پہ بھی۔ اللہ جی میری حفاظت کریں۔ پتا نہیں کہاں سے اس میں اتنی ہمت آئی کہ اس کے قدموں نے اس کا ساتھ دیا اور وہ باہر کے دروازے کی طرف بھاگی مگر باہر نکلی نہیں۔ دروازے کے ساتھ دیوار سے ٹیک لگا کے اس نے اپنی سانس نارمل کی اور ڈرتے ڈرتے ادھر دیکھا جہاں وہ کچھ دیر پہلے کھڑی تھی۔ تب ہی دروازہ کھلنے کی آواز آئی۔ ماں اور بہن اندر داخل ہو رہی تھیں۔

"دیوار کے ساتھ لگ کے کیوں کھڑی ہو؟" امی حیران ہوئی تھیں۔ شاید اندھیرے کی وجہ سے وہ اس کے چہرے کا اڑا رنگ نہیں دیکھ پائی تھیں۔

"ڈر گئی ہو گی پھر سے۔" چھوٹی نے اس کا مذاق اڑایا۔

وہ دل مسوس کے رہ گئی۔ انہیں کچھ بتا بھی دیتی تو وہ یقین نہ کرتیں۔ ڈری ڈری نگاہ ایک بار پھر برآمدے اور اندھیرے کمرے کی طرف اٹھی تھی۔ اس گھر میں ان تینوں کے علاوہ کوئی اور بھی تھا مگر موجودگی کا احساس صرف اسے ہی کیوں دلایا جاتا تھا؟ کیوں؟

☆......☆

انسانی فطرت ہے کہ وہ جس ماحول میں رہتا ہے دھیرے دھیرے اس ماحول کا عادی ہو جاتا ہے۔ وہ بھی اس دہشت زدہ ماحول کی عادی ہو گئی تھی۔ سب واقعات جیسے اس کی روٹین کا حصہ بن گئے تھے۔ وہ زیر اثر آتی، مزاحمت کرتی، قرآنی آیات کا ورد کرتی اور آزاد ہو جاتی مگر اس کا جو نقصان ہو رہا تھا اس سے وہ ابھی تک بے خبر تھی۔ اس کے مزاج میں چڑچڑاپن آ گیا تھا اور بات بے بات غصہ آ جاتا۔ کندھے ہر وقت بھاری رہتے خود کو تھکا تھکا محسوس کرتی مگر ڈاکٹرز کے مطابق وہ بالکل صحت مند تھی۔

اتنا تو تانیہ سمجھ گئی تھی کہ جو بھی قوت ہے، تب ہی اسے پریشان کرتی ہے جب وہ اکیلی ہوتی ہے۔ ٹھیک ہے اب میں کوشش کروں گی کہ اکیلی نہ رہوں۔ اپنی طرف سے عقلمندانہ فیصلہ کر کے وہ جیسے مطمئن ہو گئی تھی۔ گھر میں وہ وہیں بیٹھتی جہاں ماں یا بہن موجود ہوتیں۔ تانیہ کی حتی الامکان کوشش ہوتی کہ وہ اکیلے گھر میں رہنے سے گریز کرے۔ رات کو بھی اس نے اکیلے سونے کی بجائے چھوٹی

بہن کے ساتھ چارپائی پہ سونا شروع کردیا تھا۔

☆......☆

”تانیہ کو پتا نہیں کیا ہوگیا ہے۔ بہت ڈرتی ہے، اکیلے رہنے سے تو جان جاتی ہے۔ چھوٹے بچوں کی طرح اب تک اندھیرے سے گھبراتی ہے، پتا نہیں کیا بنے گا اس کا، رات کو خواب میں بھی روتی اور چیختی ہے۔“ وہ بیٹھی آٹا گوندھ رہی تھی جب اس کی امی خالہ جی سے دکھڑے رو رہی تھیں۔

”بچیاں ڈر جاتی ہیں۔“ خالہ جی نے بغور اسے دیکھا۔ ”ماشاءاللہ بڑی بھی تو ہو رہی ہے۔ دو قدم پہ قبرستان ہے اور برا نہ منانا تم لوگ احتیاط بھی نہیں کرتے کہ کب قبرستان کے پاس سے گزرنا ہے کب نہیں۔ خالہ جی نے اپنی سوچ کے مطابق پتے کی بات کی۔“

”اور کہاں سے گزریں؟ آنے جانے کا راستہ ہی وہی ہے۔“ امی نے کہا۔

”وہ تو ٹھیک ہے مگر مغرب کے بعد یا رات کو نوعمر بچیوں کا قبرستان کے باہر والے راستے سے گزرنا مناسب نہیں۔ تمہارے بھانجے بھتیجے آتے رہتے ہیں اور میں نے خود کئی بار سب کو رات میں قبرستان کے پاس سے آتے جاتے دیکھا ہے۔“ خالہ جی بولیں۔

تانی کے ہاتھ تھمے۔ واقعی ہم سب کزنز مل کر رات کو پارک جاتے تھے جھولے لینے تو کبھی باہر آئس کریم کھانے۔

”یہ بات تو آپ کی ٹھیک ہے مگر باقیوں کو تو کوئی مسئلہ نہیں، بس یہی ڈرتی ہے۔ اچھا ہے اب اس کو نہیں جانے دوں گی۔“ امی نے اپنی طرف سے مسئلے کا حل نکالا جو اسے ذرا نہیں بھایا تھا۔

خالہ جی نے اپنا رخ اس کی طرف موڑا۔ ”بچے نمازیں پوری پڑھا کرو۔“

”پڑھتی ہوں خالہ جی۔“ تانی نے جواب دیا۔

”اچھی بات ہے۔ رات کو سونے سے پہلے منزل پڑھا کرو، نہ نیند میں ڈرو گی نہ ویسے۔“ انہوں نے مزید کہا۔

”منزل کیا ہے؟“ اس نے پوچھا۔

”اس میں قرآن پاک کی سورتیں ہیں۔ رکھی ہے گھر میں۔ قرآن پاک والی رحل سے نکال لینا۔“ تانیہ کی بات کا تفصیلی جواب خالہ جی کی بجائے امی نے دیا تھا۔

”جی اچھا۔“ کہہ کر وہ اپنے کام میں مگن ہوگئی تھی۔

پہلی رات جب اس نے منزل پڑھی تو اسے اپنا آپ ہلکا پھلکا محسوس ہوا۔ رات کو نیند بھی اچھی آئی۔ کوئی ڈر خوف محسوس نہیں ہوا تھا۔ وہ بہت خوش تھی۔ ایک دم جیسے زندگی میں سکون آگیا تھا۔ کاش اسے پہلے پتا چل جاتا منزل کے بارے میں۔ خیر دیر آئے درست آئے۔ وہ مطمئن ہوگئی تھی مگر تانیہ کی زندگی میں آیا سکون و اطمینان عارضی تھا۔

☆......☆

کچھ دن سکون سے گزر گئے تھے۔ اس دن پھپھو ملنے آئیں اور جاتے ہوئے اپنی لاڈلی چھوٹی کو ساتھ لے گئیں کہ ان کے پاس ایک دو دن رہ لے۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی تھیں۔ ایک پہ امی سونے کے لیے لیٹ گئی تھیں۔ دوسری پہ آج رات اسے اکیلے سونا تھا چھوٹی جو نہیں تھی۔ آدھی رات کو اس کی آنکھ اچانک کھل گئی اور وہ ہڑبڑا کے اٹھ بیٹھی۔ بظاہر سب ٹھیک تھا۔ پورے گھر میں اندھیرا تھا بس کچن کی لائٹ آن تھی۔ وہی روشنی تھوڑی بہت صحن تک بھی پہنچ رہی تھی۔

امی گہری نیند میں تھیں۔ سو تو وہ بھی رہی تھی مگر اچانک سے آنکھ کھل گئی تھی؟ سونے سے پہلے وہ منزل اور آیت الکرسی پڑھ کر سوئی تھی۔ ماں کی چارپائی کی طرف منہ کر کے آنکھیں بند کر کے وہ سونے کے لیے دوبارہ لیٹ گئی اور پھر سے آیت الکرسی پڑھنے لگی۔ تھوڑی دیر بعد پٹ سے اس کی آنکھیں پھر کھل گئیں۔ اسے عجیب سا احساس ہوا۔ دل کی تیز دھڑکن اور کھڑے رونگٹے بتا رہے تھے کچھ سب نارمل نہیں ہے۔ اس نے ہراساں نظروں سے اپنے اردگرد دیکھا۔ جو ہمیں دکھائی نہیں دیتا وہ محسوس ضرور ہوتا ہے۔ اسے واضح طور پہ اپنی چارپائی کے اردگرد کسی نادیدہ قوت کی موجودگی کا احساس ہوا تھا جو اس پہ حاوی تو نہیں ہو پا رہی تھی مگر اپنی موجودگی کا احساس ضرور دلا رہی تھی۔

ڈر کے مارے اسے اپنی سانسیں رکتی محسوس ہوئیں۔ پنکھے کے عین سامنے چارپائی پہ ہونے کے باوجود تانی کے ٹھنڈے پسینے چھوٹ رہے تھے۔ وہ دبکی رہی۔ اتنی ہمت نہیں تھی کہ دو ہاتھ کی دوری پہ پڑی چارپائی پہ اپنی ماں کے پاس چلی جائے۔ ویسے بھی ماں کو پسند نہیں تھا کسی بچے کو ساتھ لٹانا، انہیں گرمی لگتی بے آرامی ہوتی تھی۔ وہ رات اس کے وجود اور دل پہ بہت بھاری تھی۔ گن گن کر اس نے گھڑیاں گزاری تھیں۔ جو بھی سورتیں اسے یاد تھیں وہ ان گنت بار پڑھ چکی تھی۔ پتا نہیں کتنے گھنٹے اسی ڈر اور خوف کے زیر اثر گزرے تھے۔ اس کے کانوں میں اذان کی آواز پڑی تھی۔ شاید فجر کا وقت ہو چکا تھا۔ اذان کی آواز کانوں

میں جیسے جیسے پڑتی گئی جسم اور دل سے خوف زائل ہوتا گیا تھا۔ بغیر کچھ سوچے اچھل کے وہ ماں کی چارپائی پہ منتقل ہوئی اور جیسے سکون کی چھاؤں تلے آلیٹی۔ نجانے کب اس کی آنکھ لگی تھی اور تب ہی اس نے وہ خواب دیکھا تھا۔

☆......☆

وہ عموماً خواب بھول جایا کرتی تھی مگر وہ خواب اسے پوری جزوئیات کے ساتھ یاد تھا۔

”امی رات کو میرے ساتھ بہت برا ہوا۔“ صبح اس نے ماں کو من وعن سب بتا دیا تھا۔ ”پھر جب آپ کے ساتھ آکر لیٹی تو تب نیند آئی اور خواب میں، میں نے ابو کو دیکھا۔ وہ پریشان تھے۔ سیدھے میرے پاس آتے ہیں اور کہتے ہیں کہ اپنی ماں کو کہو کہ تمہیں پہننے کے لیے تعویز لا کے دے۔ بس پھر وہ چلے گئے اور میری آنکھ کھل گئی۔“

ماں خواب سن کر چونکی۔ تانیہ اپنے باپ کی بہت لاڈلی تھی۔ وہ تکلیف میں تھی اور باپ کو خبر ہوگئی۔ ان کے لیے یہ ایک پیغام تھا۔ چاہے کسی اور کو تانی کے اس خواب پہ یقین آتا یا نہیں مگر انہیں آگیا تھا۔ انہیں اپنی بیٹی کی حفاظت کرنی تھی۔

دو دن تک انہوں نے اسے اپنے ساتھ سونے سے نہیں روکا تھا جب تک چھوٹی واپس نہیں آگئی تھی۔

☆......☆

ماں کی ایک کولیگ نے اسے روحانی علم جاننے والے ایک باباجی کے پاس لے جانے کا مشورہ دیا تھا۔ ”وہ دم بھی کردیں گے اور تعویز بھی دے دیں گے۔ بچی اتنا ڈرتی ہے تو اسے جلدی لے کر جاؤ ان کے پاس۔“

دوپہر ختم ہوتے ہی وہ دونوں بہنیں ماں کے ساتھ باباجی سے ملنے کے لیے نکل پڑی تھیں۔ باباجی کا گھر انہیں آسانی سے مل گیا تھا۔ بان کی چارپائی پہ ملگجا سا شلوار قمیص پہنے باباجی اس کے ذہن میں بنے باباجی کے خاکے سے بالکل مختلف تھے۔ اس نے سوچا تھا باباجی کی لمبی سی سفید داڑھی ہوگی، سفید کپڑے پہنے ہوں گے، ہاتھ میں لمبی سی تسبیح ہوگی اور بارعب شخصیت ہوگی۔

پاس ہی رکھے موڑھوں پہ چند عورتیں پہلے سے موجود تھیں۔ کوئی بیمار بچے کے لیے دعا کروانے آئی تھی تو کوئی بہت زیادہ رونے والے شیر خوار کو دم کروانے۔ بالآخر ان کا نمبر بھی آگیا تھا۔ ”باباجی یہ دونوں میری بیٹیاں ہیں، شوہر چند برس پہلے فوت ہوگئے ہیں۔ یہ میری بڑی بیٹی تانیہ ہے

اسے بہت ڈر لگتا ہے۔ آپ اسے تعویز دے دیں اور دم بھی کر دیں کہ ڈرے نہیں۔'' امی نے اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنا عندیہ بیان کیا۔

بابا جی نے سرسری نگاہ اس پہ ڈالی۔ ''کب سے لگتا ہے ڈر بیٹا، کیا محسوس ہوتا ہے، کیسے خواب آتے ہیں، خواب میں کیا کیا نظر آتا ہے؟'' وہ اس سے چھوٹے چھوٹے سوال پوچھتے گئے اور وہ جواب دیتی گئی۔ بیچ بیچ میں اس کی نظر چھوٹی کی طرف بھی اٹھ رہی تھی جو اس کے ڈرنے کی داستان پہ زیرِ لب مسکرا رہی تھی۔ وہ ایسے ہی اس کا مذاق اڑاتی تھی۔

''ہوں۔'' بابا جی نے گہری سانس خارج کی۔

''بی بی نام کیا ہے تمہارا اور بچی کا؟'' انہوں نے امی سے پوچھا۔

''میرا نام فاطمہ نادر اور اس کا نام تانیہ نادر۔'' نام سن کر بابا جی چپ چاپ کوئی حساب لگانے لگ گئے تھے۔ وہ بغور ان کا مشاہدہ کر رہی تھی۔ ''بی بی آپ کے گھر میں ہوائی چیز ہے، اسی کا اثر ہے بچی پر۔'' وہ کچھ دیر بعد بولے تھے اور اس کا رنگ فق ہو گیا تھا۔

کچھ تھا گھر میں اس کا اندازہ تو اسے بخوبی تھا مگر واشگاف الفاظ میں سن کے وہ پتھرا گئی تھی۔ ''مگر ہم بھی تو رہتے ہیں گھر میں ہمیں تو کبھی ایسا محسوس نہیں ہوا نہ ہی ڈر لگا جیسے اسے لگتا ہے۔'' اماں نے تانی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اپنے دل کی بات کہی۔

''ہر کوئی نشانہ نہیں ہوتا۔ زیادہ اس پہ ہی حاوی ہوتی ہے وہ چیز جن کا زائچہ ہلکا ہوتا ہے۔'' بابا جی نے تانی کی طرف دیکھ کر کہا اور ساتھ ہی سہمی ہوئی تانی کو پاس آنے کا اشارہ کیا۔

وہ آہستگی سے اٹھ کر ان کے پاس پڑے موڑھے پہ جا بیٹھی۔ وہ سفید کاغذ پر کچھ لکیریں کھینچ رہے تھے پھر انہوں نے اس پہ ترتیب وار اعداد تحریر کیے اور اچھی طرح سے فولڈ کر کے تعویز اس کو تھما دیا۔ یہ چاندی میں مڑھوا کے گلے میں پہننا ہے اور اتارنا نہیں۔ تعویز کو مٹھی میں دبا کر اس نے سر ہلا دیا۔'' وہ زیرِ لب اس پر دم کرنے کے لیے آیات پڑھنے لگے تھے۔

''اگر خود کچھ آیات پڑھ لوگی تو بتاؤں تمہیں۔'' تم لوگوں کو پتا بھی لگ جائے گا کہ کیا چیز ہے گھر میں۔ آیات پڑھ کے پانی پہ دم کر کے گھر کے سب کونوں میں چھڑک دینا، ہوائی چیز دور ہو جائے گی۔''

''ٹھیک ہے بابا جی میں پڑھ لوں گی۔'' وہ پُراعتماد تھی۔ اس کے گلے میں تعویز ہوتا تو وہ چیز اس پہ اثر نہیں کر سکتی تھی۔ دوسرا یہ کہ آیات پانی پہ دم کر کے چھڑکنے سے وہ اس پُراسرار چیز سے چھٹکارا پا لیتی۔

گھر پہنچ کر اس نے فاتحانہ نظروں سے گھر کے در و دیوار کو دیکھا خاص طور پہ ان مخصوص اندھیرے کونوں کو۔ عشاء کی اذان ہوتے ہی تانی نے نماز ادا کرنے کے لیے جاء نماز بچھائی۔ امی اس کی جلد بازی پہ مسکرائی تھیں۔ نماز ادا کر کے وہ فوراً قرآن پاک کھول کر بیٹھ گئی۔ مطلوبہ آیات طے شدہ تعداد میں پڑھ کر اس نے پانی سے بھرے گلاس پہ پھونک ماری اور پھر اپنے آپ پر۔ اب وہ پانی گھر کے کونوں میں چھڑکنے کے لیے تیار تھی۔

اس نے اپنے آپ میں عجیب سی پھرتی محسوس کی جیسے کوئی غیبی طاقت اس کی مدد کر رہی تھی اس غیر مرئی شے سے چھٹکارا دلانے کے لیے، اکیلے ہی وہ ہر کمرے کے تمام کونوں میں دم کیا پانی چھڑکنا شروع کر چکی تھی اور بالآخر پانی چھڑکتے چھڑکتے وہ پیٹیوں والے پچھلے کمرے تک آ پہنچی۔ اس کمرے میں ہمیشہ عجیب سا سناٹا اور پُراسراریت رہتی تھی۔ پیٹیوں والا کمرا نام بچوں کا دیا ہوا تھا۔ اس پچھلے کمرے میں پھپھو، امی اور دادی کی پیٹیاں اور چار پانچ ٹرنک پڑے تھے۔ اس کمرے میں ایک ہی کھڑکی تھی جو اسی چھوٹے کمرے میں کھلتی تھی جو بچپن میں تانی اور اس کے والدین کے استعمال میں تھا اور دلچسپ بات یہ تھی کہ جو چارپائی تانی اور اس کے باپ کے استعمال میں تھی کھڑکی عین اس کے اوپر کھلتی تھی۔ پیٹیوں والے کمرے کے دروازہ کی جگہ کپڑے کا صرف ایک پردہ تھا۔ دروازہ نہ ہونے کے باوجود اور کھڑکی ہونے کے باوجود بھی اس کمرے میں ہمیشہ عجیب سی سیلن زدہ بو رہتی۔ امی کا کہنا تھا کہ چونکہ پیٹیوں والا کمرا اتنا استعمال نہیں ہوتا اور نہ ہی روزانہ اس کی صفائی ہوتی ہے اسی لیے ایسی بو محسوس ہوتی ہے۔ بلا کوئی ڈر اور خوف وہ آج پیٹیوں والے کمرے میں داخل ہوئی تھی۔

آنکھوں میں فاتحانہ چمک لیے تانی نے پانی ایک کونے میں چھڑکا پھر دوسرے اور پھر تیسرے۔

''اب میں دیکھتی ہوں کیسے نہیں نکلتی ہے یہاں سے وہ چیز، ایسی کی تیسی، بہت ہو گیا ڈرانا دھمکانا۔'' آخری کونے میں پانی چھڑکتے ہوئے وہ اونچی آواز میں بولی۔

پتا نہیں وہ خود کو سنا رہی تھی یا کسی اور کو۔ پانی چھڑک کر مطمئن ہو کر وہ امی اور چھوٹی بہن کے پاس آ بیٹھی۔ گرمی کی چھٹیاں ختم ہونے والی تھیں جب کہ چھوٹی نے ابھی تک کام ختم نہیں کیا تھا۔ امی نے اسے کہہ رکھا تھا جب تک وہ آج کا کام مکمل نہیں کرے گی وہ اسے سونے نہیں دیں گی۔

''امی میں نے پانی چھڑک دیا ہے۔'' تانی نے جیسے کوئی کارنامہ بیان کیا تھا۔

''اچھا کیا۔'' امی نے نظریں اٹھائے بغیر کہا۔

''سونا نہیں ہے؟'' تانی نے اگلا سوال کیا۔

''نہیں تم سو جاؤ۔ اس کی نگرانی میں نہیں بیٹھوں گی تو کام پھر سے ادھورا چھوڑ دے گی۔'' امی نے چھوٹی پہ نظریں جما کر جواب انکار کی صورت میں دیا تھا۔

''ٹھیک ہے۔'' وہ اٹھ کھڑی ہوئی۔ صحن میں دو چارپائیاں بچھی ہوئی تھیں اور اسٹینڈ والا پنکھا بھی چل رہا تھا۔ تانی پہلی والی چارپائی پہ جا لیٹی۔ لیٹتے ہی اسے غنودگی محسوس ہوئی تھی اور اگلے ہی پل پورا گھر اس کی خوفناک چیخوں سے گونج اٹھا تھا۔ انہونی ہو گئی تھی۔

☆......☆

اسے سمجھ نہیں آ رہی تھی کہ کیا ہوا ہے۔ حواسوں میں لوٹنے میں اسے کچھ ٹائم لگا تھا۔ چیخیں تھم گئی تھیں۔ وہ چارپائی پہ اٹھ بیٹھی۔ برآمدے میں چھوٹی بہن امی سے لپٹے کھڑی تھی، سہمی ہوئی بلکہ ہلکا ہلکا کانپ بھی رہی تھی۔ امی کا رنگ بھی اڑا ہوا تھا اور خود وہ سنسناتے وجود اور پھٹی ہوئی آنکھوں سے چاروں طرف دیکھ رہی تھی۔ ساتھ والی دونوں دیواروں سے جھانکتے ہمسائیوں کے سوالیہ چہرے بھی اسے نظر آئے تھے۔

''کیا ہوا ہے؟ سب خیریت تو ہے؟'' سب کا ایک ہی سوال تھا۔

''کچھ نہیں بس بچیاں ڈر گئی ہیں۔ پتا نہیں کیا دیکھ لیا۔'' امی نے صفائی دی تھی۔

تو یہ اتنا ڈر گئیں؟ ان کی ہولناک چیخیں سن کے تو ہم ڈر گئے تھے۔ ایک ہمسائی مطمئن نہیں ہوئی تھی۔

''بچیاں ہیں۔ اللہ خیر کرے، ٹھیک ہو جائیں گی۔'' دوسری نے دلاسا دیا اور دیوار سے نیچے اتر گئیں۔

چھوٹی تو کبھی نہیں ڈری تو وہ چیخی کیوں؟ کیا دیکھا تھا اس نے؟ کیا وہی جو اس نے دیکھا تھا؟ اپنے بے دم وجود کو سنبھالتے ہوئے وہ سوچ میں گم برآمدے میں کھڑی ماں اور چھوٹی کے پاس جا کھڑی ہوئی۔

''امی آپ دونوں نے بھی کچھ دیکھا کیا؟'' اس کی ڈری ڈری سوالیہ نظریں ان پہ مرکوز تھیں۔

''ہاں۔'' جب ہم کھڑے ہوئے کام ختم کر کے تو کمرے سے بجلی کی تیزی سے ایک سیاہ سایہ نکلا۔ امی نے دھیمی آواز سے کہا۔

''اور تم نے بھی کچھ دیکھا کیا؟'' تانی نے کانپتے ہوئے چھوٹی سے پوچھا۔

''ہاں۔ وہ۔ وہ سیاہ سایہ ہمارے بیچ سے تیزی سے گزرا اور تمھاری چارپائی کی طرف بڑھ گیا۔ ہم نے دیکھا تم چارپائی سے اچھلی تھیں۔'' چھوٹی اٹک اٹک کر بولی تھی۔

آج تانی نے اسے پہلی بار ڈرا ہوا دیکھا تھا ورنہ وہ تو ہمیشہ اس کی ہنسی ہی اڑایا کرتی تھی۔ بابا جی کی کہی بات درست ہو گئی تھی۔ ان سب نے خود اپنی آنکھوں سے دیکھ لیا تھا۔ وہ ہوائی چیز سامنے آ گئی تھی بلکہ شاید گھر سے بھی نکل گئی تھی۔ یہی تو تانی نے دیکھا تھا۔ اسے بس اتنا یاد ہے کہ اس کی چارپائی الٹی تھی، چارپائی کے نیچے سے کوئی وجود اسے دھکیلتا ہوا گزر رہا تھا۔ تب ہی گھر کی باہر والی دیوار پہ اس نے ڈراؤنا سا غیر واضح سیاہ سایہ دیکھا اور پھر اگلے ہی لمحے دیوار کے اوپر وہ ڈراؤنی آنکھوں والی بلی جو اپنی شعلے برساتی آنکھوں سے اسے دیکھ رہی تھی پل میں وہاں سے غائب ہو گئی تھی۔

☆......☆

گھر میں سکون آ گیا تھا۔ اب اسے ڈر اور خوف محسوس نہیں ہوتا تھا اور نہ ہی ڈراؤنے خواب آتے تھے۔ کئی دنوں تک سب ایسے ہی رہا تھا۔ وہ بھول گئی تھی کہ گھر میں کیا ہوا اور انہوں نے کیا دیکھا تھا۔ تب ہی اچانک سے پہلے والی کیفیت اس پہ طاری ہونا شروع ہو گئی تھی۔ تانی پھر سے گھر میں اکیلے رہنے سے ڈرنے لگی تھی۔ بہت تکلیف دہ تھا یہ احساس کہ اسے آبزرو کیا جا رہا ہے۔ گھر میں چلتے پھرتے، مختلف کام کرتے اسے محسوس ہوتا تھا جیسے اسے کوئی دیکھ رہا ہے۔ یہاں تک کہ اسے نماز میں بھی سکون نہیں ملتا تھا۔ نماز ادا کرتے ہوئے بھی وہ بے چین رہتی خود کو نامعلوم حصار میں محسوس کرتی تھی۔

کالج سے وہ پہلے گھر آتی تھی اور آدھ پونے گھنٹے بعد امی اور چھوٹی بھی آ جاتی تھیں۔ جب تک امی گھر نہ آ جاتی وہ کمروں کے دروازے کھول کر برآمدے میں ہی

بیٹھی رہتی۔ روز کی طرح وہ خالی گھر میں داخل ہوئی۔ دوپہر کا وقت، تیز دھوپ اور سنسان گھر۔ اس کا دل بہت گھبرا رہا تھا۔ اس کی چھٹی حس کچھ گڑبڑ کا الارم بجا رہی تھی۔ کمرے کے دروازے کی کنڈی اس نے احتیاط سے کھولی۔ تمام کمروں کے دروازے ایک دوسرے کمرے میں بھی کھلتے تھے۔ جو کمرا زیادہ تر ان کے استعمال میں رہتا تھا اس کی کنڈی اندر سے لگی ہوئی تھی۔ کنڈی کھولنے کے لیے جب وہ دوسرے کمرے کے دروازے سے اندر داخل ہوئی تو کمرے میں ضرورت سے زیادہ اندھیرا محسوس ہوا تھا۔ وہ آگے بڑھی مگر بند کنڈی پہ نظر پڑتے ہی سٹپٹا گئی۔ کنڈی پہ بڑے بڑے بھڑ بیٹھے ہوئے تھے مگر وہ بند کمرے میں آئے کہاں سے اور تب ہی اس کی نظر دروازے کے پیچھے اٹھی اور وقت رک گیا تھا۔ وہی اندھیری رات کی طرح سیاہ اور پُراسرار ہیولا دروازے کے عین پیچھے تھا۔ اس کے تمام حواس جکڑے گئے تھے۔ وہ سایہ اس پہ جھپٹا تھا اس کی چیخیں گلے میں ہی کہیں دم توڑ گئی تھیں۔ گلے میں بابا جی کا دیا گیا تعویز جوں کا توں تھا۔ اس کے وجود پہ اس کا اپنا اختیار ختم ہو گیا تھا۔ سیکنڈ کے ہزارویں حصے میں سیاہ ہیولے نے اسے صحن کی دیوار کی طرف دھکیلا تھا۔ تیز دھوپ میں اس نے خود کو دیوار کے ساتھ لگا پایا۔ وہ تھر تھر کانپ رہی تھی۔ وہ نہیں جانتی تھی کہ کنڈی کیسے کھلی، بھڑ کہاں گئے، کمرے سے نکل کر برآمدہ اور پورا صحن کراس کر کے وہ دیوار تک کیسے پہنچی، اس کا ذہن اس معاملے میں بالکل بلینک تھا۔

پھٹی پھٹی آنکھیں پہلے کمرے کی طرف اٹھی تھیں اور پھر چھت کی طرف۔ تانی ٹک رہ گئی، وہی بلی جو اس رات اس نے دیکھی تھی شان سے چھت پہ بیٹھی اسے کھا جانے والی نظروں سے گھور رہی تھی۔ وہ آنکھیں نہیں ہٹا پائی تھی۔ کیا کیا نہیں تھا پُراسرار بلی کی آنکھوں میں۔ دہشت، تنبیہہ، غصہ، بدلہ، سبھی کچھ تھا۔ وہ ٹرانس کی کیفیت میں تھی جو آج اس کے ساتھ ہوا وہ شاید اس رات کے واقعے کا ردعمل تھا۔

اسے وارن کیا گیا تھا یا پھر شاید کوئی پیغام دیا گیا تھا۔ پتا نہیں کتنی دیر تک وہ دھوپ میں کھڑی رہی تھی۔ بلی کے اچانک غائب ہونے پر اس کے جسم نے اس کا ساتھ دینا شروع کیا۔ صورتِ حال کا ادراک ہوتے ہی اس نے بلا سوچے سمجھے باہر کا دروازہ کھول کر خالہ جی کے گھر کی طرف دوڑ لگا دی تھی۔ اگلے چند دن اس نے تیز بخار میں بھٹکتے ہوئے گزارے تھے۔ جب تک امی اسکول سے واپس نہیں آ جاتی خالہ جی اس کے پاس ہی رہتی تھیں۔ اپنی بساط سے بڑھ کر اپنے سے کئی گنا بڑی طاقت سے تانیہ انجانے میں لڑائی مول لے چکی تھی۔

☆......☆

اسے نارمل ہونے میں کافی وقت لگا تھا۔ یونیورسٹی میں ایڈمیشن اس کے لیے خوشگوار ہوا کا جھونکا ثابت ہوا تھا۔ میرٹ پہ ایڈمیشن ملنے کی خوشی ہی الگ تھی۔ اپنا آسیب زدہ گھر چھوڑ کر تانی ہاسٹل آ گئی تھی۔ اس کے کمرے میں پانچ لڑکیاں تھیں۔ اپنا ڈر وہ پیچھے کہیں چھوڑ آئی تھی۔ اکیلے ہونے کا تو سوال ہی پیدا نہیں ہوتا تھا۔ پڑھائی کی مصروفیت نے اس کا ذہن بھی بٹا دیا تھا۔ ویک اینڈ پہ گھر جا کر بھی اسے نارمل ہی فیل ہوتا۔ ہاسٹل میں ایک سال گزارنے کے بعد تانیہ کا خوف بالکل ہی ختم ہو تھا۔ وہ خوش تھی کہ اب وہ اپنی مرضی سے وقت گزار رہی ہے کوئی خوف کوئی دھڑکا نہیں ہے۔

اس دن بھی وہ پڑھتے پڑھتے تھک گئی کتابیں بند کر کے اس نے سائیڈ پر رکھیں اور ٹائم دیکھا ہے۔ رات کے گیارہ بج رہے تھے۔ اب سو جانا چاہیے۔ دروازہ اچھی طرح سے بند کر کے اس نے ہمیشہ کی طرح نیچے والی چٹخنی چڑھائی۔ ابھی وہ بیڈ پہ بیٹھی ہی تھی کی دھڑ کی آواز سے کمرے کا دروازہ خود بخود کھل گیا تھا۔ اس نے اپنی کمر میں سنسناہٹ محسوس کی۔ چٹخنی کا وہ حصہ ابھی بھی لگا ہوا تھا پھر بند دروازہ خود کیسے کھلا؟ وہ سوچ رہی تھی۔

کانپتے ہاتھوں سے اس نے چند روم کے فاصلے پہ رہنے والی اپنی دوست کو کال کی۔ عظمیٰ جلدی میرے کمرے میں آؤ۔

اگلے کچھ منٹوں میں وہ اس کے پاس موجود تھی۔ تانی کے افق چہرے کو دیکھتے ہی وہ گھبرا گئی۔ ”کیا ہوا؟“

تانی نے کنڈی کی طرف اشارہ کیا۔ ”یہ دیکھو اسے باہر تب ہی نکالتے ہیں جب دروازہ بند کرنا ہو۔ ابھی میں نے دروازہ بند ہی کیا تھا کہ یہ دھماکے سے کھل گیا۔“

عظمیٰ کے چہرے پہ حیرانی ابھری تھی۔ ”اوہ، آپ پریشان نہ ہوں۔ ہوا سے کھل گیا ہوگا۔“ عظمیٰ نے ادھر اُدھر کی باتیں کر کے اس کا موڈ خوشگوار کرنے کی پوری کوشش کی تھی۔ بیس منٹ بعد جب وہ اس کے کمرے سے نکلی تھی تو اسے اندازہ ہو گیا تھا کہ ابھی بھی اس کا پیچھا نہیں چھوٹا۔ جب بھی وہ ان باتوں کو بھولنے کی کوشش کرتی ہے، اپنے ہونے کا احساس اسے دلا دیا جاتا ہے۔ اس رات اس کے کمرے کی لائٹ آن رہی تھی۔ اس رات کے بعد جتنا عرصہ وہ ہاسٹل میں رہی اس کے کمرے کی لائٹ رات کو روشن ہی رہی تھی۔

کتنی راتیں اس نے خوف کے زیر اثر جاگ کے گزاری تھیں۔ سورتیں پڑھ پڑھ کے، موبائل پہ ٹائم دیکھ دیکھ کے۔ کتنی بار اس نے خواہش کی تھی کہ رات نہ ہو اور نہ ہی کسی کو نیند آئے۔ سوئے سوئے اچانک سے اسے اپنے جسم پہ دباؤ محسوس ہوتا تھا۔ وہ ہل نہیں پاتی تھی۔ کچھ دیر بعد وہ نارمل ہو جاتی۔ اس کی ٹانگوں پہ جگہ جگہ نیل کے نشان ابھرتے رہتے تھے اور حیرانی کی بات یہ تھی کہ نہ ہی وہ نیل تکلیف دیتے تھے اور نہ ہی اسے وہاں کوئی چوٹ لگی ہوتی تھی۔ عجیب و غریب خوابوں اور واقعات کا سلسلہ بھی نہیں تھم رہا تھا۔

☆......☆

ڈگری ملتے ہی اسے اپنے شہر میں ہی اچھی جاب مل گئی تھی۔ جاب ملتے ہی انہوں نے آسیب زدہ سرکاری کوارٹر چھوڑ کر اپنے ذاتی گھر منتقل ہونے کا فیصلہ کر لیا تھا۔ اس کے ابو نے اپنی زندگی میں ہی ذاتی گھر بنا لیا تھا۔ شوہر کی وفات کے بعد اس کی امی نے گھر کرائے پہ چڑھا دیا تھا۔ گھر کا کرایہ اور ان کی تنخواہ کی بدولت ہی وہ اسے پڑھانے میں کامیاب ہوئی تھیں۔ چھوٹی ابھی پڑھ رہی تھی۔

نئے گھر میں آ کر اسے لگا جیسے وہ ڈراؤنے خواب سے جاگی ہو۔ سب کچھ نیا اور اچھا تھا۔ کئی سال گزر گئے تھے، تانی کے لیے رشتہ تلاش کرتے ہوئے۔ خوبصورت، پڑھی لکھی اور اچھی فیملی سے ہونے کے باوجود وہ اکتیس برس کی ہو گئی تھی اور رشتے کا پتا نہ تھا۔ جو رشتے آتے یا تو وہ اتنے بے کار ہوتے کہ وہ خود ہی انکار کر دیتی اور اگر اچھا رشتہ آتا تو پسند ہونے کے باوجود بھی پایۂ تکمیل تک نہیں پہنچ پاتا۔ کتنی بار اس کی بات بنتے بنتے رہ گئی تھی۔ دنیا جہاں کے توڑ، دعائیں، وظیفے، تعویز کرنے کے باوجود اس کا رشتہ نہیں ہو سکا تھا۔ ابھی اس کی زندگی میں نجانے کتنے امتحان باقی تھے۔

☆......☆

گھپ اندھیرے میں ہاتھ کو ہاتھ سجھائی نہیں دے رہا تھا۔ وہ چت لیٹی تھی۔ اسے اپنا دم گھٹتا ہوا محسوس ہوا۔ نہ کہیں کوئی دروازہ تھا نہ ہی کہیں روشنی۔ کہیں وہ قبر میں تو نہیں تھی؟ زندہ بھی تھی یا نہیں؟ پریشانی میں اس نے جگہ کا اندازہ کرنے کے لیے ہاتھ پاؤں مارے مگر بے سود۔ ہواس باختہ ہو کر وہ بغیر پانی کی مچھلی کی طرح تڑپی تھی۔ تب ہی وہ کسی چیز سے ٹکرائی۔ درد کی لہر اس کے سر میں اٹھی تھی شاید۔ دماغ آہستہ آہستہ جاگ رہا تھا۔

وہ نیند میں دیوار سے ٹکرائی تھی۔ مگر وہ کہاں تھی؟ کس جگہ پر؟ دھیرے دھیرے سب واضح ہوتا چلا گیا۔ وہ اپنے بیڈ پہ سوئی تھی اور اپنے کمرے میں ہی تھی۔ راستہ تلاشنے اور روشنی کی تلاش میں وہ اپنے کمرے میں ہی ٹاک ٹوئیاں مار رہی تھی۔ ریڑھ کی ہڈی میں ابھی تک سنسناہٹ ہو رہی تھی۔ رات کے آخری پہر وہ اپنے کمرے میں ہی قبر کی سی وحشت چکھ چکی تھی۔ یہ کوئی نئی بات نہ تھی۔ وہ اکثر اس اذیت سے گزرتی تھی۔ صبح ہونے پر اس کا انگ انگ دکھتا تھا یوں کہ جیسے وہ مستقل تشدد کی زد میں رہی ہو۔ ساری زندگی جس کرب میں تانیہ نے گزاری تھی وہ ناقابل فراموش تھا۔

☆......☆

وہ کھانا بنا رہی تھی کہ وِنڈو کے شیشے کھڑکنے پر وہ ایک دم ڈر گئی۔ تھوڑی دیر گزری، اسے اپنا جسم ٹھنڈا پڑتا محسوس

موہسٹ

چوتھی اور تیسری صدی کے دوران حکومت کو متاثر کرنے والا گروہ موہسٹ (Mohists) تھا۔ یہ استاد موتزو کے شاگرد تھے جس کا دور پانچویں صدی قبل مسیح (390-468 اندازاً) تھا۔ موتزو نے کنفیوشس پسند کے طور پر آغاز کیا لیکن بعد میں اپنا منفرد فلسفہ تشکیل دینے کے لیے الگ ہو گیا۔ وہ اور اس کے شاگرد یقین رکھتے تھے کہ بہترین حکومت روایتی چینی مذاہب کی ہدایات کے تحت عمل کرتی ہے۔ ان مذاہب کے تحت لوگوں کو ایک دوسرے سے محبت کی تعلیم دی جاتی ہے۔ لہٰذا حکومت محبت سے عملدرآمد کرے۔ موہسٹ امن پسند تھے اور جنگ سے کتراتے تھے۔ اپنے دفاع کی ضرورت پڑنے پر وہ عمارتوں کی حصار بندی کی اجازت دے دیتے۔

مرسلہ: بصیر الدین۔ لاہور





ہوا۔ یہ کیفیت اس کے لیے نئی نہیں تھی۔ وہ ساکت ہوجانے کے لیے پلٹی تھی۔ اپنے سے کچھ فاصلے پہ لاؤنج میں اسے وہی ہیبت ناک سیاہ ہیولا دکھائی دیا۔ وہ چیخنا چاہتی تھی مگر چیخ نہیں پائی۔ صرف ایک لمحے کی بات تھی اور ادراک کے کئی در اس پہ کھلتے چلے گئے تھے۔ ڈوبتے دل اور کانپتی ٹانگوں کے ساتھ وہ وہیں زمین پہ ڈھے گئی۔ جگہیں بدلنے سے کچھ حاصل نہیں ہونے والا تھا۔ مسئلہ پرانے گھر، ہاسٹل یا نئے گھر میں نہیں تھا بلکہ ہانٹڈ تو تانیہ خود ہی تھی! یہ کلنک شاید اسے زندگی بھر کے لیے لگا تھا۔ وہ اب زندگی سے مایوس ہوچکی تھی کہ اس کی زندگی میں ایک انقلاب آگیا۔ ہوا یہ تھا کہ وہ کسی کام سے بازار آئی تھی۔ گروسری بھی کرنا تھا۔ گروسری کے لیے وہ اس سپر اسٹور پر آئی تھی، جیسے ہی وہ اسٹور میں داخل ہوئی کیش کاؤنٹر پر بیٹھا شخص چونک کر کھڑا ہوگیا۔ وہ تیز نظروں سے اسے گھور رہا تھا۔ یہ بات اسے ناگوار محسوس ہوئی تھی۔ وہ واپس ہونا چاہتی تھی کہ دکاندار نے کہا۔ ”تم فون کرکے اپنے کسی بڑے کو بلالو۔“

”کیوں؟“ اس نے پوچھا۔

”وجہ ہے۔“ کہہ کر دکاندار نے اپنا موبائل اس کی طرف بڑھا دیا۔

دکاندار کے لہجے میں کوئی ایسی بات تھی کہ وہ بلا چوں چرا کیے امی کا نمبر ملانے لگی۔

فون سنتے ہی وہ آگئیں، دکاندار نے اپنے نوکر کو اشارہ کیا کہ وہ کاؤنٹر سنبھالے پھر انہوں نے اس کی امی سے کہا۔ ”آپ کو اپنی بیٹی سے محبت نہیں ہے۔“

”ہاں کیوں نہیں میری دو ہی بیٹیاں ہیں، ان دونوں سے مجھے پیار ہے۔ انہی دونوں کی خاطر میں جی رہی ہوں۔“

”اگر سچ پیار ہے تو اس کمینے سے جان کیوں نہیں چھڑاتیں۔“ وہ سانس لے کر بولا۔ ”دکان کے عقب میں میرا کمرا ہے۔ آپ دونوں اندر چلیں۔“

”کمرے میں کیوں؟“ ماں نے پوچھا۔

”اگر اسے اس بندش کیے گئے علاقے سے باہر جانے دیا تو اس پر ٹوٹ رہے عذاب میں اضافہ ہوجائے گا۔“ کہہ کر اس نے کاؤنٹر کے بالکل سامنے والے دروازے کی طرف قدم بڑھا دیے۔

اس کمرے میں ایک بیڈ پڑا تھا اس پر انہیں بیٹھنے کے لیے اشارہ کیا اور بولا۔ ”میں کوئی عامل کامل نہیں ہوں۔ تھوڑا بہت عمل اپنے پیر سے سیکھا ہے اسی لیے اس کے سر پر سایہ دیکھ لیا۔ میں اپنی کوشش کرتا ہوں اگر کامیاب ہوگیا تو اسے آزادی مل جائے گی۔“ پھر وہ کونے میں رکھی ٹیبل کی طرف بڑھ گئے۔ اس کی دراز سے ایک نقش نکالا پھر اسے لے کر تانیہ کے پاس پہنچے۔ ”تم میری بیٹی کی جگہ ہو۔“ کہہ کر انہوں نے اس کی پیشانی کے اوپر جھول رہی لٹ کو پکڑ لیا۔ ساتھ ہی ساتھ کچھ پڑھ بھی رہے تھے۔

لٹ کو جیسے ہی انہوں نے پکڑا تانیہ کا چہرہ بگڑ گیا۔ وہ چیخی تھی کہ انہوں نے ماں سے کہا۔ ”بہن آپ اس کا منہ دبا کر رکھیں، آواز باہر جائے گی تو لوگ کچھ اور سمجھیں گے۔“

ماں نے منہ دبا دیا۔ وہ مسلسل ورد کررہے تھے۔ تانیہ بے دم ہوکر بیڈ پر گرگئی تھی۔ کچھ دیر کے بعد انہوں نے کہا۔ ”بہن یہ نقش اس کے گلے میں ڈال دیں۔“

جیسے ہی وہ تعویذ اس کے گلے میں پڑا تانیہ کے چہرے پر آرام کی کیفیت ابھر آئی۔ ان صاحب نے اس کی طرف پھونک ماری پھر کہا۔ ”بہن ابھی تو میں نے اس شریر جن کو مقید کرلیا ہے لیکن یہ بس ہفتے عشرے تک معذور رہے گا۔ اس مسئلے کا حل بس ایک ہے کہ آپ اسے لے کر کسی اور شہر منتقل ہو جائیں۔ کسی ایسے شہر جس کے بیچ میں دریا آتا ہو۔“

بیٹی کی زندگی کا سوال تھا۔ انہوں نے گھر پہنچتے ہی تیاری شروع کردی۔ لاہور میں ان کی ایک سہیلی نازلی رہتی تھی۔ انہوں نے اسے فون کرکے کہا کہ کچھ دنوں کے لیے ہم اس کے ہاں آرہی ہیں۔ نازلی نے خوش دلی سے کہا کہ فوراً آجاؤ۔

اگلے ہی دن وہ بیٹیوں کے ساتھ لاہور کے لیے نکل پڑیں۔

یہ سفر ان کے لیے خوشیاں لایا۔ لاہور پہنچتے ہی نازلی کی بہن نے تانیہ کو پسند کرلیا اور جھٹ منگنی پٹ بیاہ کے مصداق اس کی شادی جمال سے نہایت سادگی سے ہوگئی۔ جمال مستقل دبئی میں رہتا تھا۔ چار پانچ ماہ کے بعد اس نے تانیہ کو بھی دبئی بلالیا۔

جب سے تانیہ گئی ہے وہ لوٹ کر نہیں آئی، چھوٹی بہن کی شادی پر بھی نہیں۔ اسے یہ ڈر تھا کہ اگر وہ واپس گئی تو کہیں وہ سایہ پھر نہ آجائے کیونکہ دبئی میں اس پر کوئی دورہ نہیں پڑا تھا۔ اب تو وہ چار بچوں کی ماں ہے۔ پھر بھی جب اسے یہ واقعہ یاد آتا ہے خوف سے زرد ہوجاتی ہے۔